خطباتِ

حکیم الامّت

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۲۱

تدبیر و توکل

جدید ایڈیشن

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات

منشی عبدالرحمٰن خان رحمہ اللہ

تصحیح و تزئین	تخریج احادیث
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ	مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

تدبیر وتوکل

تاریخ اشاعت..............جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ

ناشر.......................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت....................سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ...چوک فوارہ...ملتان | مکتبہ الفاروق،معریال روڈ چوہڑ ہڑپال،راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور | دار الاشاعت.......اردو بازار.........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار......لاہور | مکتبۃ القرآن......بنوری ٹاؤن...........کراچی
مکتبہ رحمانیہ.......اردو بازار ......لاہور | مکتبہ دار الاخلاص...قصہ خوانی بازار.....پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۲۱ "تدبیر و توکل"
جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ
سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو
جائے۔ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد
محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور
فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا
کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر محمد اسحٰق عفی عنہ
جمادی الاول ۱۴۳۱ھ بمطابق 2010ء

ترتیب مواعظ

اجابۃ الداعی........	يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ
التوکل........	فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ
الاصابہ فی معنی الاجابہ..	وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ
الفصل والانفصال	لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ
شفاء العی	اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ
العمل للعلماء	اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ
التیسیر للتسییر	وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ
القرض	اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْلَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ
الشکر	اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ
تحقیق الشکر	اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ
التنبہ	وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ
فوائد الصحبۃ	وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ

فہرست مضامین

اجابۃ الداعی

یہ وعظ

۲۵ر صفر ۱۳۳۱ ہجری بمقام شاہی مسجد مراد آباد جو کہ حضرت والا نے ۳ گھنٹہ ۸ منٹ میں ارشاد فرمایا۔ جس کو مولانا سعید احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمَنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ یَغْفِرْلَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (سورہ احقاف آیت نمبر۳۱)

ترجمہ: اے قوم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تعالٰی تمہارے گناہ معاف کردیں گے اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھیں گے۔

تمہید

شان نزول

یہ ایک آیت ہے سورۂ احقاف کی اور یہ قول نقل کیا گیا ہے بعض جنوں سے جس کا قصہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے اور یہ آیت مکی ہے ہجرت سے قبل یہ واقعہ ہوا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قرآن شروع کیا تو ادھر سے جن گزر رہے تھے انہوں نے اس کو سنا اور چلے گئے۔ مگر اس دفعہ مکالمت (بات چیت کرنے) سے مشرف نہیں ہوئے۔ ہاں دوسری بار مکالمت سے بھی مشرف ہوئے۔ اس دفعہ صرف قرآن سن کر لوٹ گئے اور اپنی قوم کے پاس جا کر قرآن کی تعریف کی اور اس پر ایمان لانے کی رغبت دلائی۔ سو اس موقعہ کی یہ ایک آیت ہے اور ان جنوں کا مقولہ

ہے جوانہوں نے اپنی قوم سے جا کر کہا ہے گوظاہر میں یہ جنوں کا مقولہ ہے۔لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ جس بات کونقل کر کے اس پر حق تعالیٰ انکار نہ فرمائیں تو وہ درحقیقت انہیں کا فرمان ہوتا ہے کیونکہ جب نقل کر کے انکار نہیں کیا تو اس کو صحیح سمجھا تو ایسا ہوا جیسے مفتی فتویٰ لکھے اور کوئی دوسرا لکھ دے الجواب صحیح (جواب درست ہے) تو وہ فتویٰ اس مصدق کا بھی ہے۔خاص کر ایسی حالت میں جبکہ فتویٰ لکھنے والا ایک نوآموز شاگرد ہو اور اصل میں یہاں یہی مثال ہے کہ فتویٰ لکھنے والا ہو ایک نوآموز شاگرد اور مصدق (تصدیق کرنے والا) ہو استاد کیونکہ پہلی صورت میں جہاں مفتی شاگرد مصدق (تصدیق کرنے والا) استاد نہیں ہے وہاں تو بعض دفعہ اصل مجیب (جواب لکھنے والا) زیادہ ہوتا ہے مصدق سے مگر اس صورت کہ مفتی نوآموز شاگرد ہے۔جواب دینے والا اصل میں کچھ نہیں کیونکہ وہ خود اس میں متردد ہے۔استاد کو اس لئے دکھلاتا ہے تا کہ اس کی صحت پر اطمینان ہو جائے تو جب اس نے استاد کو دکھلایا اور استاد نے اس پر صاد بنا دیا تو اب اس کو اطمینان ہو گیا تو وہ حقیقت میں استاد کا مضمون ہے کیونکہ جس شان کا یہ مضمون اب استاد کے صاد ہونے پر ہو گیا ہے پہلے اس شان کا نہ تھا کیونکہ اب یہ حجت ہے اور اس سے پہلے حجت نہ تھا تو جب حجیت کی حیثیت سے دیکھا جاوے گا تو وہ فتویٰ استاد کا کہا جاوے گا نہ کہ شاگرد کا تو۔اس طرح جب حق سبحانہ وتعالیٰ کسی کا کلام نقل فرما ویں خاص کر ایسے کا کلام جو کہ فی نفسہٖ حجت نہ ہو جیسے کسی غیر نبی کا کلام اور نقل کر کے پھر اس کی تصدیق فرماویں تو وہ کلام حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا کہا جاویگا۔اور کسی کلام کو نقل فرما کر سکوت کرنا یہ اس کی تصدیق ہی کرنا ہے کیونکہ یہ بات غیر ممکن ہے کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے غلط کلام کو نقل کر کے سکوت کریں ہم میں تو دب جانے کا احتمال ہے کہ ضرر کے خوف سے غلط بات پر سکوت کریں گے مگر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تو یہ احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔خاص کر خدائے تعالیٰ میں کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کو کوئی کیا ضرر پہنچا سکتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم گو بشر ہیں لیکن حق تعالیٰ نے فرمادیا ہے

يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ. (کہ وہ احکام کے پہنچانے میں) پس خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کسی اور سے اندیشہ نہیں کرتے قرآن میں دیکھئے اور تواریخ میں بھی کہ کوئی نبی کسی سفاک (خونریز قتل کرنے والا) کے سامنے بھی لچکے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی دلیری

انبیاء علیہم السلام اتنے دلیر ہوتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا کہ فرعون کو ذرا نرمی سے کہنا۔ یعنی اس قدر صاف اور دلیر تھے کہ اگر یہ ارشاد نہ ہوتا تو جانے کیا اکھاڑ پچھاڑ کر آتے اور نرمی سے کہنے میں ضرور فائدہ ہوتا ہے گو خاص اس کو نہ ہو مگر دوسروں کو تو یقیناً ہوتا ہے۔ نیز اس میں یہ حجت باقی نہیں رہتی کہ مجھے سوچنے کا موقع نہ دیا اور خدا کو یہ منظور ہے لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔ (تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے آنے کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے) نرمی سے بات کرنے میں یہ مصالح ہوتے ہیں اس لئے یہ فرمایا تھا کہ نرم باتیں کرنا۔ غرض اس سے یہ معلوم ہوا کہ انبیاءؑ کس قدر صاف اور نڈر ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض انبیاءؑ کو قتل کی نوبت آئی۔ انہوں نے قتل ہونا گوارا کیا۔ مگر کسی احکام کو نہ چھپایا۔ حالانکہ اوروں کے لئے اجازت بھی ہے کہ ایسی حالت میں چھپالیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ یعنی جو شخص کہ کلمۂ کفر پر مجبور کیا جاوے اور قلب اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو تو وہ اس عہدے سے مستثنےٰ ہے۔ حضرت عمارؓ کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ پس اس وقت سے اس کی اجازت ہوگئی کہ ایسی حالت میں ایمان کو چھپالیں۔ سو امت کو تو اس کی اجازت دیدی گئی۔ گو واجب نہیں کیا گیا۔ لیکن انبیاء کو ایسی حالت میں بھی اجازت نہیں کہ حکم کو چھپائیں۔ چنانچہ ارشاد ہے يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللهَ (تبلیغ احکام میں) وہ صرف خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے تاکہ ڈر کی وجہ سے تبلیغ میں کچھ کوتاہی کرنے کا شبہ ہوسکے اور تبلیغ کی قید ترجمہ میں اس لئے لگائی کہ یہ مقتضائے مقام نہ اس لئے کہ غیر تبلیغ میں ڈرتے ہیں کیونکہ انبیاء کسی وقت میں بھی کسی سے نہیں ڈرتے معمولی اوقات میں بھی ان کو اندیشہ نہیں ہوتا چنانچہ واقعات سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کے واقعات پیش آئے مگر ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ چنانچہ ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ پیش آیا کہ دوپہر کو آرام فرمانے کیلئے ایک

درخت کے نیچے لیٹ گئے صحابہ آپ سے ذرا فاصلہ پر تھے اتفاق سے ایک کافر کا ادھر سے گزر ہوا۔اس نے اس موقع کو بہت ہی غنیمت سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنہا سو رہے ہیں اور تلوار لٹکی ہوئی ہے۔بس اس وقت جو ہو سکے کر لینا چاہیے۔مگر اس کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔اور تلوار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ کر لیا تو سخت مشکل ہو گی پھر اپنی ہی جان بچانی دشوار ہو گی۔اس لئے اس نے پہلے آپ کی تلوار پر قبضہ کر لیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جگایا۔اور کہا من یمنعک منی (کنز العمال ۳۱۸۲۳) اب آپ کو مجھ سے کون بچاوے گا یہ ایسا وقت تھا کہ شجاع سے شجاع آدمی بھی گھبرا جاتا کیونکہ اول تو ننگی تلوار سر پر دیکھ کر آدمی ویسے ہی بدحواس ہو جاتا ہے خاص کر جب نیند سے جاگ کر ایسا واقعہ ہو وہ وقت کتنا وحشت کا ہوتا ہے مگر آپ پر ذرا بھی وحشت کا اثر نہیں آیا اور آپ نے بالکل بے دھڑک جواب میں فرمایا کہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ بچاویں گے کیونکہ آپ کو تو پورا بھروسہ تھا خدا تعالیٰ پر ہم تو اسباب کو دیکھتے ہیں۔اور آپ کی نظر تھی مسبب پر پھر آپ کو اس سے کس طرح خوف ہو سکتا تھا۔

عقل در اسباب میدارد نظر   عشق میگوید مسبب را نگر

یعنی عقل تو اسباب پر نظر رکھتی لیکن عشق مسبب کو دیکھتا ہے

اس کی ایسی مثال ہے کہ گنوار آدمی تو انجن کو دیکھتا ہے اور جاننے والا انجن کو نہیں دیکھتا وہ ڈرائیور کو دیکھتا ہے۔اب اگر ڈرائیور کہہ دے کہ تم فلاں جگہ آ کر لین پر ٹھہر جانا میں انجن کو روک دوں گا۔تو اس شخص کو لین پر ٹھہر جانے میں کچھ خوف نہ ہو گا۔اسی طرح انبیاء علیہم السلام چونکہ مسبب کو دیکھتے ہیں اس لئے ان کو دوسروں سے نہ فکر ہوتی ہے نہ تردد نہ اندیشہ اب یہ بات کہ جب ان کو کسی سے ڈر نہیں ہے تو پھر اپنی حفاظت کیوں کرتے ہیں جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ آپ جنگ میں زرہ پہن کر تشریف لے جاتے تھے تو سمجھ لو کہ جو سبب ہے نہ ڈرنے کا وہی سبب ہے حفاظت اور تدبیر کا وہ جیسے حق تعالیٰ کے وعدے کو سچا سمجھتے ہیں ان کے حکم کو بھی واجب العمل سمجھتے ہیں۔جب ان کا حکم ہوا کہ زرہ پہن کر تشریف لے جایئے۔تو زرہ پہن لی۔تو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ آپ کی نظر اسباب پر تھی بلکہ حق تعالیٰ نے چونکہ تدبیر کو مشروع کیا ہے۔اس لئے آپ تدبیر کی رعایت فرماتے تھے۔خلاصہ یہ ہے کہ جیسے حق تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ کوئی کچھ نہ کر سکے گا آپ اندیشہ نہ کریں اسی طرح یہ بھی حق

سبحانہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اپنی حفاظت کیلئے تدابیر اختیار کریں تو انبیاء تدبیر مشروع محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے اور انبیاء کی تو بڑی شان ہے اس کو تو اولیاء بھی سمجھتے ہیں۔ اسباب کے اختیار کرنے میں ان کی بھی یہی نیت ہوتی ہے۔ بلکہ غلبہ حال سے اگر کوئی اسباب کو چھوڑ بھی دیتا ہے تو غیب سے اس کی اصلاح ہوتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کو تین باتوں کا حکم

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فیوض الحرمین میں لکھا ہے۔ کہ مجھ کو تین باتوں پر مجبور کیا گیا تو جو طبعاً مجھ پر گراں تھیں۔ مگر حکم مقدم ہے طبع پر ایک تمسک بالاسباب (یعنی اسباب کو اختیار کرنا) دوسرے عدم خروج عن المذاہب الاربعہ (مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی حنبلی سے خارج نہ ہونا) تیسرے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر شیخین کی تفضیل (ابوبکر و عمرؓ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر فضیلت دینا) اور حکمت اس میں یہ ہے کہ اسباب اختیار کرنے میں ایک تو شان افتقار (احتیاج) کہ ہم حق تعالیٰ کے اس درجہ محتاج ہیں کہ ان کے مقرر کئے ہوئے اسباب سے بھی بے نیاز نہیں ہیں دوسرے اس میں پردہ داری ہے کہ عوام کو خبر نہیں ہوتی کہ متوکل ہیں۔ اسباب کا اختیار کرنا توکل میں پردہ ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ کیا متوکل ہیں نوکری کر رکھی ہے۔ مباشرت اسباب میں دو مصلحتیں تو یہی ہیں اور ان کے علاوہ اور خدا جانے کیا کیا مصلحتیں ہوں گی۔ پس اسباب کو ہرگز ترک نہ کرنا چاہئے۔ حضرت علیؓ کا قصہ ہے کہ آپ سے ایک ملحد نے پوچھا کہ کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ بے وقت موت نہیں آتی آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس نے کہا کہ جب آپ کا عقیدہ ہے تو پھر چھت کے اوپر سے کود یئے آپ نے فرمایا کہ خدا کی جانچ کرنا بھی بے ادبی ہے۔ یہ تو خدا کی جانچ ہے۔ ہاں البتہ اگر اتفاق سے گر پڑیں گے تو گرتے وقت یہ عقیدہ لے کر چلیں گے کہ اگر اس وقت موت نہیں تو ہم مر نہیں سکتے۔ سو حضرت علیؓ کے اس جواب سے بھی معلوم ہوا کہ تدبیر کی مزاحمت کرنا ٹھیک نہیں تدبیر ہو اور اس کے ساتھ توکل۔

گر توکل مے کنی درکار کن　　　کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(اگر توکل کرو تو کام کے اندر توکل کرو یعنی کسب اور کام کرو۔ اور ان کے اثر بخشنے میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرو)

حتیٰ کہ جو تارک اسباب ہیں ان کیلئے بھی مطلق ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل کی ہے بعض اسباب کے ترک کی اجازت ہے اور بعض کی نہیں مثلاً امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جو ترک اسباب کرے اس کو دروازہ بالکل بند کر کے بیٹھنا جائز نہیں اگر ایسا کرے گا تو گنا ہگار ہوگا۔ پس دروازہ بند کرنا متوکل کیلئے بھی نا جائز ہے دروازہ تو کھلا رہے ہاں کواڑوں پر نظر نہ ہو۔ نظر صرف حق تعالیٰ پر ہو۔ لیکن ان دونوں باتوں کا جمع کرنا یہ ہے بہت دشوار ہر شخص کا کام نہیں ہے ؎

برکف جام شریعت برکف سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

(شریعت اور عشق دونوں کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں)

مباشرت اسباب (اسباب میں لگ جانا) کا حکم انسان کے واسطے تو ہے ہی خدا نے تو یہاں تک اس کی رعایت کی ہے کہ جانور جو کھاتے ہیں ان کو بھی اسباب ہی کے واسطے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم خدا پر نظر کرو تو تم کو ایسا رزق ملے کہ جیسے پرندوں کو ملتا ہے تغدو خماصا وتروح بطانا (فتح الباری ۱۱: ۳۰۶) صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو چھکے ہوئے آتے ہیں محققین نے لکھا ہے کہ تدبیر کی طرف یہاں بھی اشارہ ہے کہ گھونسلہ سے نکلنا ان کیلئے بھی شرط ہے تو جب رزق جانوروں کو بھی تدبیر ہی کے واسطے دیا جاتا ہے۔ تو خیال فرمایئے تدبیر کو کون باطل کر سکتا ہے۔ آخر وہ بھی تو سرکاری اوزار ہے، پھر اس کو معطل کرنے کی کب اجازت ہو سکتی ہے۔ پس جب توکل بھی حق تعالیٰ کی نعمت ہے اور تدبیر بھی تو دونوں کو جمع کرنا چاہئے۔ اب یہ بات کہ کس طرح سے جمع ہو۔ یہ ہر ایک کیلئے جدا ہے جیسی کسی میں قابلیت ہوگی اس کے موافق اس کو اسباب اختیار کرنے کا حکم ہوگا۔ متوکل کے لئے اس کے مناسب اور اہل اسباب کیلئے ان کے موافق مگر اسباب ہوں ضرور بلا اسباب کے کام نہیں چل سکتا۔ ہاں کسی سے کرامت یا معجزے کے طور پر بلا اسباب ہی کے کوئی کام ہو جاوے تو دوسری بات ہے مگر وہ معمول نہیں ہو سکتا۔ زیادہ اسباب نہ ہو تو اتنا ہی ہو کہ کواڑ کھول دے۔ مگر آمد رفت والوں پر نگاہ نہ ہو اسکی ایسی مثال ہے کہ تنخواہ دیتی ہے تو سرکار مگر ملتی ہے خزانچی کے ہاتھ سے تو نظر سرکار پر ہوگی خزانچی پر نہ ہوگی کیونکہ وہ تو محض محکوم ہے اپنے اختیار سے کسی کو کچھ

نہیں دے سکتا۔اب اگر کوئی حاکم خزانچی کو روک دے تو تنخواہ مل چکی۔بس تنخواہ دینے والی سرکار ہے اور خزانچی محض واسطہ ہے لہٰذا خزانچی سے نہ بعید ہونا جائز نہ اس پر نظر کرنا جائز۔نظر اسی دینے والے ہی پر کرو۔غرض اسباب کی رعایت تو سب کیلئے ضروری ہے۔البتہ اس کے درجات متفاوت (جدا) ہیں اہل اسباب کے لئے اور درجہ کے اسباب ہیں۔اور متوکل کیلئے اور درجے کے اسباب ہیں تو اسباب اور تدابیر چونکہ مشروع ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جامعیت

اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں زرہ پہنتے تھے۔لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو اندیشہ تھا یا اسباب پر نظر تھی سو آپ توکل اور تدبیر دونوں کو جمع فرماتے تھے اور واقعی تدبیر کو کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے۔یہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے خوان لگا ہے۔اس میں توکل بھی ہے تدبیر بھی ہے قسم قسم کی نعمتیں اس میں موجود ہیں۔پس سبب ہی سے منتفع ہونا چاہئے۔یہ نہیں کہ ایک کو لے کر دوسری کو چھوڑ دیں۔

دیکھو اگر کوئی حاکم ہماری دعوت کرے اور چار طرح کے کھانے دسترخوان پر لگائے اور ہم ان میں سے بعض کھائیں اور بعض نہ کھائیں تو اس پر ضرور عتاب ہوگا۔ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ روٹی کھا رہے تھے اس میں ایک ٹکڑا جلا ہوا تھا۔اس کو اٹھا کر انہوں نے علیحدہ رکھ دیا۔فوراً آواز آئی کہ کیوں صاحب کیا یہ فضول ہی بنا ہے۔تمام آسمانوں کو چکر ہوا فرشتوں کو چکر ہوا۔کرۂ ہوا کو حرکت ہوئی۔تب یہ بنا آپ کے نزدیک یہ فضول ہی ہے۔یہ آواز سن کر وہ بزرگ ڈر گئے اور اس جلے ہوئے ٹکڑے کو بھی کھا لیا۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جلے ہوئے ٹکڑے بھی کھایا کرو کیونکہ ہم کو اجازت دی ہے کہ جو مضر ہو اس کو نہ کھائیں۔بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس کو حقیر نہ سمجھو،غرض یہ کہ اس کا تو اختیار ہے کہ جو مضر ہو اس کو نہ کھاؤ۔لیکن حقیر سمجھ کر نہ چھوڑو۔جیسے کہ اگر کسی کے ہاتھ کا ٹکڑا گر جاتا ہے تو اس کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں اگر ہم اس کو کھا لیں گے تو لوگ ہم کو ندیدہ کہیں گے لوگوں کے ندیدہ سمجھنے کی پرواہ نہ کرنی چاہئے بلکہ یوں سمجھو کہ ہاں ہم ندیدہ ہیں۔جب حق تعالیٰ ہی کو یہ پسند ہے کہ ہم ان کی نعمتوں کے ندیدہ ہوں پھر ہم کیوں ندیدہ نہ ہوں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(یعنی جب حق تعالیٰ ہی ہم سے طمع خواہاں ہوں تو پھر قناعت پر خاک ڈالنی چاہئے)

اور جو چیز تم کو مضر ہو اس کو بھی اگر چھوڑ دو تو یوں سمجھو کہ یہ تو فی نفسہٖ ہی بڑی نعمت ہے لیکن ہم اس کے متحمل نہیں ہیں یہ دقیق ادب ہے۔

حکایت حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ

مجھے ایک حکایت یاد آئی، خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ کی کہ آپ کی نظر سے یہ حدیث گزری کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کی روٹی کھاتے تھے اور بغیر چھانے ہوئے۔ بس یہ طریقہ تھا کہ آٹے میں پھونک مار کر بھوسی اڑا دی جو رہ گیا اس کی روٹیاں پکا لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چھاننے کا طریقہ نہ تھا۔ جب آپ نے یہ حدیث دیکھی تو خدام سے فرمایا کہ سنت یہ ہے کہ جو کا آٹا بے چھنا ہو۔ یہ چھانا خلاف سنت ہے۔ پس آج سے چھانا نہ جاوے۔ چنانچہ آپ کے حکم کے بموجب ایسا ہی کیا گیا اور بے چھنے جو کے آٹے کی روٹی پکائی گئی۔ مگر اس کو جو کھایا تو سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اب وقت ہے امتحان کا کوئی بے ادب تو یہ کہتا کہ اچھا اتباع سنت کیا۔ جس سے تکلیف ہوئی مگر وہ لوگ نہایت مودب تھے کہنے لگے کے درحقیقت ہم نے بے ادبی کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برابری کا دعویٰ کیا کہ ہر عمل میں کمال حاصل کرنا چاہا اور ہم نے کامل اتباع سنت کا دعوی کیا ابھی ہم اس قابل نہیں۔ ہم ضعیف ہیں ہم کو رخصت پر عمل کرنا چاہئے ۔پس آٹا تو جو ہی کا ہو لیکن چھنا ہوا ہو، ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک درجے نیچے رہنا چاہئے سبحان اللہ کیا احترام ہے۔ اب مسلمانوں سے یہ بات کم ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ تو دقیق ادب تھا اب تو بہت موٹے موٹے موقع پر استخفاف (خفیف جاننا) کرتے ہیں، اور تحقیر کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ نے یہ ادب کیا کہ سنت میں کسی طرح کی کمی نہیں نکالی بلکہ خود اپنے اندر ضعف سمجھا۔

خلوت میں نیت

مجھے صوفیہ کا اس کے مناسب ایک لطیفہ نہایت پسند آیا کہ وہ کہتے کہ اگر کوئی خلوت اختیار کرے تو اس میں دوسروں کے ضرر سے بچنے کی نیت نہ کرے۔ بلکہ یہ نیت رکھے کہ میں

اپنے شر سے خلقت کو بچاتا ہوں اپنے کو سانپ سمجھ کر بھٹ میں رکھے اور واقعی اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو ہم سے دوسروں کو زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے تو دشمن کو دوست بنانے کا نسخہ بتایا ہے۔ کہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ برائی کو ایسے طریقہ سے رد کرو جو کہ عمدہ ہے۔ یعنی نرمی سے پس یکایک کہ وہ شخص کہ تمہارے اور اس کے درمیان عداوت تھی ایسا ہو جاوے گا کہ مخلص دوست ہے۔ تو جب ایسا نہیں ہوا اور پھر بھی وہ تمہارا دشمن ہی رہا۔ تو معلوم ہوا کہ ہم سے اس کو کوئی صدمہ پہنچا ہے یا آئندہ کسی ضرر کا اندیشہ ہے۔ بہر حال سبب اس کی عداوت کا جو ہے وہ ہم سے ضرر پہنچنا ہے خواہ وہ ضرر بالفعل (یعنی اسی وقت) ہو یا بالقوہ (آئندہ) پس ثابت ہوا کہ زیادہ تکلیف ہم ہی سے دوسروں کو پہنچی ہے۔ تو جب یہ بات واقع کے مطابق ہے تو سمجھ لے کہ میں چونکہ صاحب شر ہوں اس واسطے خلوت اختیار کرتا ہوں تا کہ مخلوق میرے شر سے مامون ہو جاوے۔ خلاصہ یہ کہ نقص اپنے اندر سمجھے نہ دوسروں میں تو جیسے صوفیہ کی یہ تعلیم ہے۔ اسی طرح خواجہ بہاؤالدینؒ نے یہ نہیں کہا کہ سنت میں کوئی کمی ہے بلکہ اپنے کو ضعیف اور غیر متحمل فرمایا پس اسی طرح ہم کو بھی مضر چیز کے چھوڑنے میں بھی نیت کرنی چاہئے۔ کہ ہم ضعیف ہیں۔ بہر حال ایسی شے کے ترک کی اجازت تو ہوئی خواہ تم میں تضرر (نقصان پانا) کا مادہ زیادہ ہو یا اس میں اضرار کا مادہ ہو۔ باقی محض شان اور تفاخر کے لئے کسی چیز کا چھوڑ دینا یہ سمجھ کر کہ یہ تہذیب کے خلاف ہے جائز نہیں۔ چنانچہ بعضے لوگ اس خیال سے انگلیاں نہیں چاٹتے کہ یہ خلاف تہذیب ہے حالانکہ یہ سنت ہے۔ تو ایسا سمجھنا نرا تکبر ہے۔ پس اس خیال سے کسی چیز کا چھوڑنا ہرگز جائز نہیں ہے ،ہاں اگر مضر ہو تو چھوڑ دو اور اگر چھوڑنے میں کوئی ادب کی نیت نہ ہو تو مضر ہی ہونے کی نیت سہی ہم لوگوں کیلئے یہ بھی کافی ہے اور بڑے لوگوں کی حالت دوسری ہے۔ ان کو ہر بات میں ادب کی رعایت لازم ہوتی ہے۔ اگر ان سے ذرا بھی کوتاہی ہوتی ہے تو اس پر مواخذہ ہوتا ہے۔ غرض یہ مضمون تو استطراداً بیان ہو گیا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ ان بزرگ پر چلے ہوئے ٹکڑے چھوڑنے پر عتاب ہوا۔ پس وہ اس سے کب خوش ہوں گے کہ تدبیر جوان کیلئے ایک بڑی بھاری نعمت ہے اس کو بالکل چھوڑ دیا جاوے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ تدبیر حق تعالیٰ نے مشروع کی ہے ہر کام کے اندر تدبیر کی رعایت رکھی ہے، حتیٰ کہ معجزات بھی جو کہ بلا اسباب ہوتے ہیں اکثر

صورتاً ان کا بھی اقتران (ملنا نزدیک ہونا) اسباب ہی سے ہوتا ہے۔ گو وہ اسباب موثر نہیں ہوتے مگر اقتران ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیثوں میں موجود ہے کہ حضرت جابرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی انہوں نے غزوہ خندق میں دیکھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ بھوک لگی ہے۔ بس وہ جا کر اپنی بیوی سے کھانا پکانے کو کہہ آئے۔ اور آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے آپ کیلئے کچھ کھانا تیار کرایا ہے تشریف لے چلئے، آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جابرؓ نے دعوت کی ہے ان کے یہاں کھانے کیلئے یہ سن کر جابرؓ بہت گھبرائے۔ کیونکہ انہوں نے کھانا تھوڑا ہی تیار کرایا تھا۔ اور آ کر بیوی سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہؓ کے تشریف لا رہے ہیں۔ اور کھانا ہے تھوڑا، اب کیا کرنا چاہئے۔ بیوی نے کہا تم گھبراؤ نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری حالت خوب معلوم ہے۔ آپ نے کچھ سمجھ کر ہی صحابہ کو ساتھ لیا ہوگا۔ غرض آپ تشریف لائے اور اپنا لعاب دہن آٹے میں اور ہنڈیا میں ڈال دیا پھر فرمایا اب پکانا شروع کر دو غرض روٹیاں پکتی گئیں اور سب لوگ کھاتے گئے حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ تمام آدمی کھانا کھا چکے اور جتنا کھانا تھا اس میں کچھ بھی کمی نہیں آئی۔ یہ معجزہ ہے لیکن اس میں بھی یہ بات دیکھنے کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر دعا فرماتے کہ ویسے ہی روٹیاں پیدا کر دے تو کیوں قبول نہ ہوتی ضرور ہوتی، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے دعا کی تھی رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ (اے رب! آسمان سے ہم پر مائدہ نازل کیجئے) اور وہ قبول ہوئی تھی تو اسی طرح اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تو روٹیاں یہاں بھی غائب سے آتیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ انہیں روٹیوں میں سے نکلیں اور اسی سالن میں سے تو دیکھئے کہ خدا تعالیٰ کی حکمتوں کی آپ نے کتنی رعایت کی ہے کہ معجزہ میں بھی ایک گونہ تدبیر کی رعایت فرمائی تو چونکہ تدبیر خدا تعالیٰ کی مشروع کی ہوئی ہے اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں زرہ پہنتے تھے۔ نہ اس وجہ سے کہ آپ کو اندیشہ تھا یا اسباب پر نظر تھی۔ غرض کہ اس کافر نے جب آپ سے کہا کہ من یمنعک منی (کنز العمال: ۳۱۸۲۳) (اب آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا) تو آپ نے بے دھڑک فرمایا اللہ۔ اس کہنے سے کافر کے بدن پر لرزہ پڑ گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھالی اور فرمایا من یمنعک منی کہ اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ مگر اس کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ بچائیں گے اس

کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ یہ جواب دے حالانکہ اگر وہ کہہ دیتا کہ اللہ کیا اللہ تعالیٰ کا نام سنکر آپ اس کو قتل کرتے ہرگز نہیں۔اور آپ کی بڑی شان ہے بعض اولیاء اللہ کی آپ کو حکایت سناتا ہوں۔

مسلمانوں کی حضرات اہل بیتؓ سے محبت

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ فرماتے ہیں کہ مجھے وہم ہوا کرتا تھا کہ حضرات اہل بیت سے مجھے محبت نہیں ہے۔اور اکثر اہل سنت کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کو جتنی محبت صحابہ سے ہے اتنی اہل بیت سے نہیں ہے۔چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے یہ شبہ کیا بھی تھا کہ میں نے کہا کہ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں صحابہ کے منکر تو ہیں۔اس لئے ان کی نفرت اور حمایت میں اہتمام کیا جاتا ہے اور اہل بیت کے منکر نہیں اس لئے ان کے متعلق اس قدر اہتمام نہیں کیا جاتا۔اس وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ اہل بیت سے محبت نہیں تو جیسے اکثر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب کو بھی یہ خیال ہوا اور اس کی وجہ سے پریشان ہوئے۔آخر ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے صحابہ کی شان میں گستاخی کی آپ سن کر غصہ سے بے تاب ہوئے۔اور تلوار نکال کر چاہا کہ اس کا کام تمام کر دیں اس نے کہا کہ امام حسینؓ کے واسطے مجھ کو چھوڑ دو۔بس امام حسینؓ کا نام سنکر آپ کی یہ حالت ہوئی کہ بدن پر لرزہ پڑ گیا اور پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھ سکا اس سے آپ کو تسلی ہوئی کہ مجھ کو اہل بیت کے ساتھ بھی محبت ہے تو جب امام حسینؓ کا نام سن کر حضرت مرزا صاحب کی یہ کیفیت ہوئی تو کیا خدا کا نام سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قتل کر دیتے کبھی نہیں اور یہ اس کو بھی معلوم تھا۔مگر چونکہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ پر بھروسہ نہ تھا اس وجہ سے اس زبان سے بھی نہ نکلا۔غرض یہ حالت تھی انبیاء کی شجاعت کی کہ ایسے سخت سخت سے موقعوں میں بھی ذرا نہ ڈرتے تھے۔حالانکہ اس وقت تبلیغ کا وقت بھی نہ تھا۔ تو اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تبلیغ کے اندر وہ کسی سے کیا اندیشہ کریں گے۔پس اگر ان کے سامنے کسی کا قول نقل کیا جاوے اور ساکت ہو جاویں تو ان کا سکوت اس وجہ سے ہوگا کہ وہ قول ان کے نزدیک صحیح ہے انکی نسبت دب جانے کا احتمال ہرگز نہیں ہوگا۔

حدیث تقریری:

غرض یہ مسئلہ ثابت ہے کہ اگر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی کلام پر سکوت فرما

ویں تو وہ دلیل اسکی صحت کی ہے چنانچہ جس کو حدیث تقریری کہتے ہیں وہ یہی ہے کہ اگر کسی بات کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انکار نہ فرماویں تو محدثین اسکی نسبت کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اور اسی طرح اگر خدا تعالیٰ نقل فرما کر انکار نہ فرماویں وہ خدا تعالیٰ ہی کا قول ہے پس یہ مقولہ گو جنوں کا ہے مگر جب حق تعالیٰ نے نقل فرما کر انکار نہیں کیا تو یہ حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہوا۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید ترجمہ دیکھ کر کسی کو شبہ ہو کہ استدلال جنوں کے قول سے کیا ہے تو سمجھ لو کہ یہ خدا تعالیٰ ہی کا قول ہے۔

تفسیر آیت متلو:

غرض وہ جن قرآن سنکر اپنی قوم کے پاس گئے اور جا کر وہ مقولہ کہا جو یہاں مذکور ہے۔ اور اب وہ ارشاد ہو گیا خدا تعالیٰ کا تو فرماتے ہیں کہنا مانو خدا کی طرف سے پکارنے والے کا آگے اجیبوا (کہنا مانو) کی تفسیر ہے کہ اٰمنوا بہ تصدیق کرو آپ کی یہ نہیں کہ زبان سے کہہ لیا کہ ہاں صاحب اور آگے کچھ بھی نہیں بہت سے لوگوں کی اجابت اس قسم کی ہوتی ہے کہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب احکام سنے تو ہٹنے لگے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ اٰمنوا بہ کہ دل سے مانو اگر ایسا کرو گے تو کیا ثمرہ ملے گا۔ یہ ملے گا کہ یَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ اور تمہارے گناہوں کو بخش دیں گے وَيُجِرْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيمٍ اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ دیں گے۔ یہ مضمون گو ظاہراً اس مجلس کے مناسب نہ تھا اس لئے کہ آیت میں تو خطاب ان کو تھا جو ایمان لائے تھے۔ اور یہاں تو سب مومن ہی ہیں۔ مگر میں نے اس کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ مجھے لفظ داعی سے ایک مرض کا ازالہ کرنا ہے۔ جو بعض مومنوں میں بھی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل احکام شرعیہ میں نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ بعض تو کرتے ہیں ان کو احکام اجتہاد سمجھ کر رد کرنے کیلئے اور بعض محققانہ طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہر چیز کی فلسفی اور راز معلوم کرنا چاہتے ہیں اور علماء کو مکلّف کرتے ہیں کہ احکام کے اسرار بتلائیں۔ اور یہ مرض عام ہو رہا ہے مگر اس کا الزام جیسا زیادہ حصے ہیں مریض پر ہے۔ تھوڑا سا طبیب پر بھی ہے کیونکہ مرض بڑھتا ہے۔ کبھی تو مریض کی بد پرہیزی سے اور کبھی طبیب کی بے جا رعایت سے مثلاً اگر کسی کو مٹھائی مضر ہو اور مریض کی درخواست پر طبیب اس کو مٹھائی کی اجازت دے دے تو ظاہر ہے کہ مرض بڑھے گا۔ اور ایسی رعایت یا تو اپنی مصلحت سے ہوتی

یا اخلاق کی وجہ سے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ بڑے سخت ہیں اس الزام سے بچنے کیلئے طبیب کہے کہ اچھا بھائی کھالو۔ سو خوب سمجھ لو کہ طبیب کو اس کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہئے کہ مجھے کوئی خوش اخلاق کہے گا یا نہیں پس طبیب اگر اس قصد سے مریض کو مضر چیز کی اجازت دیدے تو مرض بڑھنے کا الزام خود اسی پر ہے اور اگر یہ قصد نہیں بلکہ وہ اس کو مضر نہیں سمجھتا تو وہ اس قسم کی تو غلطی نہیں ہوگی۔ مگر طبابت کی غلطی ضرور ہوگی۔

اب سمجھئے کہ میرا مقصود اس وقت بیان کرنا یہ ہے کہ عوام نے تو یہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ ہر چیز کے اسرار تلاش کرتے ہیں خواہ ان کا مقصود اس سے کچھ ہی ہو رد کرنا ہو یا تحقیق۔

علماء کو اسرار احکام نہ بتلانے کی نصیحت:

اور علماء نے اپنے اخلاق سے ان کے ساتھ چلنا شروع کیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے پوچھا وہ بتلانے لگے یہ کہنا ہی نہیں جانتے کہ یہ سوال فضول ہے تو اس کے سبب دو ہیں اور دونوں میں غلطی ہے کبھی تو یہ سبب ہوتا ہے کہ علماء یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر میں نے اس کو تسلی کا جواب نہ دیا اور کہہ دیا کہ یہ سوال فضول ہے تو یوں سمجھے گا کہ علماء کچھ نہیں جانتے مجھے سمجھا نہ سکے۔ اس خیال کا اثر اچھا نہ ہوگا تو علماء اس مصلحت کے خیال سے عوام کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور یہ علماء کی وہ نیت ہے کہ ممکن ہے دینی نیت ہو۔ یعنی ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں بتلاؤں گا تو دین کا ضرر لازم آئے گا اس لئے ایسا کرتا ہوں تو سمجھ لو کہ اگر کوئی جاہ کیلئے ایسا کرتا ہے وہ تو برا ہے ہی لیکن اگر دینی مصلحت کی نیت سے کرتا ہے۔ جب بھی غلطی ہے کیونکہ **حفظت شيئا وغابت عنك اشياء** (تمہاری ایک مصلحت کی رعایت سے بہت سی مصلحتیں فوت ہوگئیں) اس مصلحت کی رعایت سے دوسری دینی خرابیاں جو پیدا ہوتی ہیں انکو بھی تو دیکھنا چاہئے وہ یہ کہ ایسا کرنے سے باب سوال وسیع ہوتا ہے اور اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ بھی تحمل نہ کرسکیں گے یعنی جب آپ نے ان کی ہر بات کا جواب دے دے کر اور اسرار بتلا بتلا کر عادی کر دیا سوال کا تو ممکن ہے کہ کل وہ یوں کہیں کہ زکوٰۃ چالیسواں حصہ کیوں مقرر ہوئی تو اس وقت آپ کو بھی یہی کہنا پڑے گا کہ یہ تو ہم کو معلوم نہیں اور یہ سوال فضول ہے تو جب آخر ایک مرتبہ یہ کہنا ہی ہے تو ایسے سوال کی کیوں نوبت

آنے دیجئے۔ ابھی سے کیوں نہ ایسا کیجئے اور اس وقت ان کو عادی بنا کر اس طرح کہنے میں بڑی مشکل ہوگی۔ اس وقت تو ان کو یقین ہو جائے گا کہ آپ اس کی مصلحت نہیں جانتے ورنہ جیسے اور چیزوں کی مصلحتیں تھیں۔ اس کی مصلحت بھی بتلا دیتے اور اسی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ اکثر لوگ ہر حکم کی دلیل قرآن سے طلب کرتے ہیں۔

داڑھی کا ثبوت:

چنانچہ ڈاڑھی کے متعلق ایک استفتاء چھپا تھا کہ داڑھی رکھنا قرآن سے ثابت کرو۔ میں نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے کہ قرآن ہی سے ثابت ہو۔ ضرورت تو دلیل صحیح کی ہے۔ خواہ قرآن سے ہو یا حدیث سے یا قیاس یا اجماع سے کیونکہ یہ چاروں ادلۂ شرعیہ (شرعی دلیلیں) ہیں تو جس دلیل سے بھی ثابت کر دیا جاوے اسکے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ اس دلیل سے نہیں فلاں دلیل سے ثابت کرو جیسے عدالت کے گواہ کہ وہاں ضرورت اس کی ہے کہ معتبر گواہوں سے دعوے کو ثابت کیا جائے۔ پس جب معتبر گواہوں سے دعوے کو ثابت کر دیا تو مدعا علیہ اگر یوں کہے کہ میں تو ان کی گواہی نہیں جانتا فلاں ہی شخص گواہی دے گا تو مانوں گا تو یہ بات اس کی ہرگز نہیں سنی جائے گی۔ کیونکہ گواہ معتبر ہونے چاہئیں یہ کیا واہیات کہ گواہ ہیں تو معتبر مگر میں ان کی نہیں مانتا تو اسی طرح شرعی ادلہ (شرعی دلیلیں) گواہ ہیں ہم کو اختیار ہے کہ خواہ قرآن سے ثابت کریں۔ خواہ حدیث سے خواہ قیاس سے خواہ اجماع سے سائل کو حق نہیں ہے کہ وہ فرمائش کرے کہ قرآن ہی سے ثابت کرو سائلوں کو خبط ہے ہی مجیبوں کو بھی خبط ہے وہ بھی اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر بات کو قرآن سے ثابت کر دیں۔ چنانچہ ایک صاحب ملے کہنے لگے کہ مجھ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ داڑھی کا ثبوت قرآن سے ہونا چاہئے تو میں نے داڑھی کو قرآن سے ثابت کر دیا وہ اس طرح کہ حضرت ہارونؑ کے قصہ میں ہے لاتاخذ بلحیتی یعنی میری داڑھی نہ پکڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہارونؑ داڑھی رکھتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کو سن کر وہ سائل کیا بولا کہنے لگے کہ وہ مان گیا میں نے کہا کہ اس سے تو داڑھی کا وجود ثابت ہوتا ہے وجوب کہاں ثابت ہوا تو آپ کیا جواب دیتے کہنے لگے کہ اس کو اتنی عقل کہاں تھی کہ یہ پوچھتا۔ سو آج کل مجیبوں نے یہ طرز اختیار کر رکھا ہے۔ مگر

سمجھو کہ یہ بنیاد کو کھوکھلی کرنا ہے اگر ایسی بنیاد پر مکان بنائیں گے تو بہت جلد مکان گر پڑے گا مثلاً اگر وہ اسی وقت یہ کہہ دیتا کہ اس سے تو داڑھی کا صرف وجود ثابت ہوا وجوب کیسے ثابت ہوا۔ تو اب ان کے پاس کیا جواب تھا تو اگر ایسے جواب دیئے جاویں گے تو اس پر شبہات ہوں گے اور اس سے سائل سمجھے گا کہ شریعت کے دلائل ایسے ہی ہوتے ہیں سو اس طرز کے اختیار کرنے میں یہ ضرر ہے پس اصلی جواب یہ ہے کہ تم کو اس کے کہنے کا منصب نہیں ہے کہ قرآن سے ثابت کرو۔ ہم چاروں دلیلوں میں سے جس دلیل کو چاہیں گے ثابت کریں گے۔ ایک جماعت آج نکلی ہے کہ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن سے ہر چیز ثابت ہے حدیث کچھ نہیں۔ پہلے ایک جماعت فقہ کی منکر نکلی تھی۔ یہ حدیث کے منکر نکلے اور عجب نہیں کہ کچھ دنوں میں لوگ کہنے لگیں لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ خود ہم سے کیوں نہیں کلام فرماتے) کہ ہم اس وقت مانیں گے جب کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود کلام کریں۔

مجیب کو مصلحت دینیہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت

ایک مرتبہ ایسے شخص سے جو کہ اس بات کے مدعی ہیں کہ ہر چیز قرآن سے ثابت ہے ایک صاحب نے پوچھا کہ رکعات کی تعداد کہاں سے ثابت ہیں تو وہ نہ بتلا سکے لیکن دوسرے صاحب نے بتلایا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ (تمام تر حمد اللہ کے لائق ہے جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر دار بازو ہیں) کہ اس میں اعداد رکعت کی طرف اشارہ ہے کہ بعض نمازیں دو رکعت والی ہیں اور بعضی تین اور بعضی چار رکعت والی ہیں میں نے کہا کہ فضول اتنی دور گئے اول ہی کے پاروں میں ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ (نکاح کرو عورتوں سے جتنی کہ اچھی معلوم ہوں تم کو دو دو اور تین تین اور چار چار) اگر ایسا ہی ثبوت ہے تو اس کو پیش کر دیا ہوتا۔ پھر اس کو تو کچھ جوڑ بھی ہے کہ جیسے نماز ہمارا فعل ہے ایسے ہی نکاح بھی ہمارا فعل ہے اگرچہ یہ جوڑ ایسا ہے جیسے ایک مولوی نور الحسن واعظ تھے انہوں نے کہیں وعظ کہا۔ وعظ میں ایک دیہاتی بھی شریک تھا۔ اس نے پوچھا کہ مولوی تیرا کیا نام ہے انہوں نے کہا

نور الحسن اس نے کہا کہ باپ کا کیا نام ہے کہا مہدی الحسن یہ سن کر آپ کہتے ہیں کہ نون لحسن کا تو جوڑ ہے مگر مہدی لحسن کا تو کچھ جوڑ نہیں ۔تمہارے نام میں تو جوڑ ہے لیکن تمہارے باپ کا نام بے جوڑ ہے۔تو ایسا ہی یہ جوڑ ہے غرض کہ ہر بات کا ثبوت قرآن سے دیں گے تو کہیں نہ کہیں تو ضرور تھکیں گے اور ایسا تھکیں گے کہ اتنا بھی نہ بنے گا مثلاً چالیسواں حصہ زکوۃ میں اس کو قرآن سے کس طرح ثابت کریں گے غرض علماء جو ہر بات کا جواب دیتے ہیں تو بعضوں میں تو یہ وجہ ہوتی ہے کہ ہم کو کوئی بے علم نہ سمجھے۔اس وجہ سے برابر جواب دیئے جاتے ہیں جیسے بعض پڑھانے والوں نے بھی یہ وتیرا اختیار کر رکھا ہے کہ بعض مرتبہ طالب علم محض اپنی ذہانت ظاہر کرنے کیلئے سوال کرتا ہے تو اس کو برابر جواب دیئے جاتے ہیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے ۔اول تو وقت ضائع ہوگا۔دوسرے وہ طالب علم بھی برابر جواب دینے کا سبق لیکر جاویں گے۔ حتیٰ کہ اگر کبھی کوئی غلط مسئلہ منہ سے نکل جاوے گا تو ان کے اندر بھی وہ تاویلیں کریں گے۔ اپنی غلطی کا اقرار کبھی نہ کریں گے چنانچہ ایک صاحب نے رضاع کے مسئلہ میں غلطی کی اور جب اور علماء نے اس پر متنبہ کیا تو آپ نے اس غلطی پر اصرار کیا۔اور اس کی تائید میں ایک رسالہ لکھا اور اپنے استاد کے پاس لے گئے کہ اس پر دستخط کر دیجئے۔ان کے استاد نے کہا کہ یہ مسئلہ تو غلط ہے کہنے لگے کہ اب تو منہ سے نکل گیا ہے اب تو تصدیق کر ہی دیجئے میری آبرو رکھ لیجئے انہوں نے کہا کہ شاگرد کی خاطر ایمان تو نہیں کھویا جاتا۔غرض یہ کہ مجیب (جواب دینے والا) کو چاہئے کہ سائل کے مذاق کا اتباع نہ کرے مصلحت دینیہ کو دیکھے۔

غرض بعض تو اس لئے بات کا جواب دیتے ہیں تا کہ ان کو کوئی بے علم نہ سمجھے اور بعض کو یہ وجہ ہوتی ہے کہ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی تسلی نہ کی تو یہ ہم کو خلیق نہ سمجھیں گے مگر یہ بھی غلطی ہے اور بعض لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہ طریقہ مضر ہے بلکہ وہ اس کو مفید سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سائل کی تسلی ہو جاوے اگر یہ ہے تو طبابت کی غلطی ہے۔کیونکہ اس سے مصالح مستقبلہ ضائع ہوتے ہیں اور فساد کی جڑ پیدا ہوتی ہے تو ایسا نہ کرنا چاہے تو مرض عوام میں کچھ تو بڑھا ہوا تھا ہی کچھ مجیبوں کی خوش اخلاقی سے بڑھا۔تو ان کو چاہئے کہ دلائل ہرگز نہ بتلاویں ہاں اگر کسی کو اس میں شبہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے یا نہیں تو اس کو سمجھا دے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ مرض چونکہ بہت بڑھ رہا ہے۔اس لئے اس کا علاج کرنا مقصود ہے اور وہ

علاج مذکور ہے لفظ داعی میں اس لئے اس کو بیان کرنے کی ضرورت پڑی ورنہ اس مجمع میں اس کو بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ جب آپ سنیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مخاطب آیت میں کفار ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منادی نہ سمجھتے تھے۔ پس مسلمانوں کو اس کا مخاطب بنانا جو کہ آپ کو منادی سمجھتے ہیں نہایت درجہ شرم کی بات ہے کیونکہ منادی اعتقاد کرنے والے کو اس خطاب کی ضرورت ہی کیا ہے غرض کہ داعی کے معنی ہیں منادی کے چنانچہ دوسرے مقام پر منادی فرمایا ہے اور یہ خدا کا فضل ہے کہ ایسا لفظ مل گیا کہ ترجمہ اپنی زبان میں کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ اردو میں لفظ منادی خود مستعمل ہے، سو دوسرے مقام پر فرماتے ہیں رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ (یعنی وہ یوں کہتے کہ اے اللہ ہم نے ایک منادی کرنے والے کو سنا کہ وہ ندا کر رہا ہے اور منادی کرنے والے اس واسطے کہا کہ ہمارے محاورے میں منادی مصدر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ تو دیکھئے اس آیت میں منادی فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ منادی اور داعی ایک ہی بات ہے۔ منادی سے مراد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں تو لفظ داعی سے اس بات کو بتلا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ساتھ کیا عمل کرنا چاہئے ایک مختصر لفظ میں بہت بڑی بات بتلائی اور وہ ایسی صاف بات ہے کہ روزمرہ دیکھتے ہو۔ مثلاً ابھی کوئی شخص سامنے سے یہ کہتا ہوا نکلے کہ صاحب کلکٹر کا یہ حکم ہے تو آپ کی کیا حالت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کو جھوٹا سمجھا اور سرکاری حکم ہونے کا یقین نہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس کو سچا سمجھا اور یقین ہو گیا کہ سرکاری حکم ہے۔ خواہ یہ یقین کسی وجہ سے ہو عقل سے ہو یا اس وجہ سے کہ اس کو آپ جانتے ہیں کہ معتبر شخص ہے، یا اس وجہ سے کہ اس کو کہتے ہوئے پولیس سن رہی ہے اور کسی نے اس کو روکا نہیں یا کلکٹر کے بنگلہ سے کہتا ہوا نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ سرکاری منادی ہے۔

خبر قطعی کا حکم

اور یہاں سے ایک اور بات یاد آ گئی، حدیث میں ہے کہ جب تحویل قبلہ ہوا تو قبا میں اس وقت خبر ہوئی جبکہ لوگ صبح کی نماز میں تھے ایک شخص نے آ کر خبر دی کہ اب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہو گیا ہے وہ سنتے ہی کعبہ کی طرف پھر گئے یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ پہلا حکم تو قطعی تھا اور یہ دوسرا خبر واحد سے معلوم ہوا جو کہ ظنی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حکم ظنی حکم قطعی کا

ناسخ نہیں ہوسکتا پھر اہل قبا نے اس خبر پر کیسے عمل کیا تو میری تقریر سے اس کا جواب ہو گیا کہ کلکٹر کے بنگلہ سے کہتا ہوا نکلا۔ خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ یہ خبر قطعی تھی کیونکہ قطعیات صرف خبر دینے والوں کی تعداد ہی سے نہیں ہوتی بلکہ قرائن مقامیہ سے بھی ہوتی ہے اور وہ قرینہ اس جگہ یہ ہے کہ عہد نبوت میں ایک شخص علی الاعلان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسا کہے کہ آپ نے یہ حکم دیا ہے اس طرح جھوٹ کہنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوسکتی۔ نیز اس میں دلائل نبوت کا بھی ذکر ہو گیا کہ جب ایک شخص دعویٰ نبوت کا کرے اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکذیب نہ ہو بلکہ معجزات اس کے ہاتھ پر ظاہر فرما کر اور اس کی تصدیق کر دی جائے تو وہ واقعی نبی ہے۔ یہ حقیقت ہے نبوت پر معجزات سے استدلال کی اور دوسرا استدلال اخلاق سے بھی ہوتا ہے کہ اس شخص کے اخلاق ایسے ہوں کہ غیر محقق میں نہ پائے جا سکتے ہوں چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی دونوں دلیلیں ہیں معجزات بھی اور اخلاق بھی اور تمام انبیاء کو بھی یہ دونوں دلیلیں دی گئی تھیں۔ بس حضرات انبیاءؑ کی یہ شان ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد ۔۔۔ برنگ اصحاب صورت را بو اصحاب معنی را

(تیرے عالم حسن کی بہار دل و جان کو تر و تازہ رکھتی ہے رنگ سے ظاہر پرستوں کے دل و جان اور بو سے حقیقت پرستوں کے)

ان حضرات کو جیسا کہ حسن باطنی دیا گیا ہے۔ ایسا ہی حسن ظاہری بھی عطا ہوا ہے۔ ان کی صورت ہی دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے یہ جھوٹے نہیں ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جب آپ نے ایمان لانے کو کہا تو انہوں نے فوراً مان لیا کسی معجزہ کا انتظار نہیں کیا۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے ایمان لانے کا واقعہ:

خیر ان کی تو بڑی شان ہے حضرت عبداللہ بن سلام نے بھی ایسا ہی کیا۔ گو کچھ سوال بھی کئے مگر یقین صورت دیکھتے ہی ہو گیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں فلما تبینت وجهه عرفت ان وجهه ليس بوجه كذاب (جبکہ آپ کا چہرہ انور دیکھا تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہوسکتا)

نور حق ظاہر بود اندر ولی ۔۔۔ نیک بینی باشی اگر اہل دلی

(ولی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے) تو جب نور حق ولی میں ہو تو نبی میں کیوں نہ ہوگا۔ اس کے ترجمے میں کہتے ہیں۔ ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور ۔۔۔ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

(حق تعالیٰ فرماتے ہیں سِیمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِالسُّجُوْدِ (ان کے چہروں میں سجدوں کے نشان ظاہر ہیں) تو ان حضرات کو معجزات کی ضرورت ہی نہیں ہوئی اور بعض کو معجزات کی ضرورت ہوئی۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل دونوں طرح کے ہیں معجزات بھی اخلاق بھی خیر تو طبعا بیان ہو گیا۔ مقصود یہ تھا کہ سرکاری منادی کو سن کر دو حالتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ منادی کے سچے ہونے کا یقین نہ ہو سو ایسے شخص پر تحقیق کرنے کا کچھ تعجب نہیں کہ اس کے سچے ہونے کی تحقیق کرے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ یقین ہو گیا کہ یہ منادی حاکم کی طرف سے ہے تو اب رعیت ہونے کی حیثیت سے حق کیا ہے کیا یہ کہ اس منادی سے جا کر الجھیں تو ضرور باغی کہلائیں گے۔ اگر آپ دوسرے کو ایسا سوال کرتے دیکھیں تو کیا اس سائل کو ناداں نہ کہیں گے کیا آپ ہی اس سے نہ کہیں گے کیا پاگل ہوا ہے یہاں تو آپ کا یہ فیصلہ ہے کہ سرکاری حکم میں لم کیف (چوں و چرا) کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے خاص کر منادی سے الجھنا کہ یہ تو سراسر حماقت ہے پر ہم تو محکوم ہیں جو حکم سن لیا مان لو بس ہو چکا۔ تو صاحبو! کتنے غضب کی بات ہے کہ حکام مجازی کے ساتھ تو سب کا یہ معاملہ ہے کہ چون و چرا کرنا ناجائز ہے صرف سن کر مان لینا چاہئے اور بس لیکن حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ الجھتے ہیں اور جو جواب کہ سرکاری حکم کے اندر چون و چرا کرنے والے کو خود دیتے ہیں اگر یہی جواب کوئی عالم دے تو اس کو جواب سے عاجز بتلاتے ہیں بڑے غضب کی بات ہے۔ صاحبو! ہم نے حق تعالیٰ کے احکام سمجھا دیئے دلائل کیوں سمجھائیں اول تو ہم بآواز دہل کہتے ہیں کہ ہم کو معلوم ہی نہیں۔ اگر صاحب جج کسی واقعہ کی رو سے مقدمہ ہرا دیں اور ملزم کے اس سوال پر کہ قانون کی کیا وجہ ہی جواب دیں کہ ہم واضع قانون نہیں ہیں ہم تو عالم قانون ہیں۔ تو جواب معقول ہوگا یا نہیں خواہ وہ اس کی وجہ جانتا ہی ہو، مگر منصب کے اعتبار سے اس کو یہ کہنے کا حق ہے پس اگر ایک عالم بھی یہی جواب دے کہ ہم وجہ اور سبب نہیں جانتے ہیں۔ ہم قانون کے واضع نہیں ہیں تو کیوں معقول نہیں سمجھا جاتا۔ ایک بزرگ سے کسی نے ایک ایسی بات پوچھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں   بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(کسی کی ہستی ہے جو باغباں سے یہ دریافت کرے کہ بلبل نے کیا کہا گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا یعنی کسی کی کیا مجال ہے جو احکام الٰہی کے اسرار اور حکم دریافت کرے)

صاحبو! اگر آپ کا کوئی نوکر خانگی امور کے مصالح دریافت کرنے لگے تو کیسا ناگوار ہو

گا۔ اگر آپ نے نوکر کو حکم دیا کہ کچوریاں لاؤ اب اگر وہ کہے کہ بازار میں شیر مال بھی ہے اور مٹھائی بھی ہے۔ پھر آپ کچوری ہی کیوں منگاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرے تو آپ ضرور اس پر ناراض ہوں گے اور اسے گستاخ بتلائیں گے اللہ اکبر آپ کا نوکر تو آپ کے حکم میں چون و چرا کرنے سے گستاخ ہو جاوے اور آپ خدا تعالیٰ کے حکم میں چون و چرا کرنے سے گستاخ نہ ہوں بلکہ محقق شمار ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کا اپنے ذمے اتنا بھی حق نہیں سمجھا جاتا۔ جتنا کہ اپنا حق اپنے نوکر کے ذمے سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس علاقہ پر جو نوکر کے ساتھ ہے نوکر کے اس سوال کو جائز نہیں سمجھتے اور خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اس سوال کو ضروری سمجھتے ہیں اور آقا جو اپنے حکم کی وجہ نہیں بتلاتا تو کیا وہ جانتا نہیں ضرور جانتا ہے۔ مگر نہیں بتلاتا اسی طرح خدا تعالیٰ نہیں بتلاتے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی جانتے ہیں مگر نہیں بتلاتے اور عالم بھی کچھ جانتے ہیں مگر نہیں بتلاتے اور عالم کا تو جاننا ضروری بھی نہیں جو اس سے احکام کی علل (علتوں وحکمتوں) کا مطالبہ کیا جاوے لیکن خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو حکم اور اسرار پر مطلع بھی کر دیتے ہیں۔ مگر مصالح دینیہ کی حفاظت کیلئے پھر بھی ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(یعنی ان کو اسرار و حکم کا علم ہے مگر مصلحت کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتے)

کوئی ایسی بات نہیں کہ ان کو معلوم نہ ہو۔ معلوم ہے مگر نہیں بتلاتے اور اگر کوئی کہے کہ گو آپ کے ذمے ضروری نہیں ہے لیکن پھر بھی بتلا دو تو اگر خلاف مصلحت نہ سمجھیں گے بتلا بھی دیں گے مگر جبکہ پہلے ان علوم کے مبادی (شروع کی باتیں جن پر علوم کا جاننا موقوف ہے) حاصل کرلو مجھے ایک صاحب گنگوہ میں ملے انہوں نے ایک بات پوچھی جو علم بلاغت سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے کہا کہ اسکو آپ نہیں سمجھ سکتے اس کیلئے علم درسیات کی ضرورت ہے، کہنے لگے وہ عالم ہی کیا ہوا جو ہر شخص کو اس کے مذاق کے موافق نہ سمجھا سکا میں نے کہا آپ تو انجینئر ہیں اگر ایک سائیس جو کہ نہ حدود سے واقف ہو نہ اصول موضوعہ سے نہ علوم متعارفہ سے وہ آپ سے کہے کہ مجھے مقالہ اولیٰ کی پانچویں شکل سمجھا دو تو کیا آپ اس کی فرمائش پوری کر دیں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ آپ کہیں گے کہ تجھے حدود اور علوم متعارفہ تو معلوم

ہی نہیں تجھے پانچویں شکل کیسے سمجھا دوں۔ اب وہ کہتا ہے کہ وہ عالم ہی کیا ہوا کہ جو گھس کھدوں کو نہ سمجھا سکے تو آپ اس کو کس طرح سمجھا دیں گے وہ تقریر مجھے بھی سنا دیجئے کہ جس سے آپ اس کو سمجھا دیں گے کہنے لگے تو اب بڈھے طوطے ہو کر مدرسہ میں پڑھیں میں نے کہا کہ پھر اس کے سمجھنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ ایک پٹواری نے پوچھا کہ ایک متوفی شخص کا ایک بھتیجا ہے اور ایک بھتیجی تو میراث کس کو ملے گی۔ میں نے کہا کہ بھتیجے کو ملے گی۔ کہنے لگے کہ دونوں برابر کے رشتہ دار ہیں پھر بہن کیوں محروم ہوئی میں نے کہا کہ اگر اس کی وجہ سمجھنا چاہتے ہو تو اول نوکر چھوڑ کر مدرسہ میں پڑھنا شروع کرو جب درسیات پڑھ لو گے پھر ہم اس کی وجہ سمجھا ئیں گے۔ بس یہ سن کر چپ رہ گئے اور ایک صاحب تشریف لائے کہ مجھے تقدیر کے مسئلہ میں شبہ ہے اس کی تقریر کر دو اور وہ اسکول میں مدرس تھے میں نے کہا کہ تقدیر کے مسئلہ کی تقریر تم نہیں سمجھ سکتے اس کیلئے ضرورت ہے علم کی۔ تم کسی طالب علم کو بلا لاؤ۔ اور اس سے اپنے شبہات ظاہر کر دو دیکھو ہم اس کو سمجھاتے ہیں یا نہیں سمجھاتے غرض یہ کہ اگر اسرار جاننا چاہتے ہو تو اس کی اہلیت پیدا کر لو۔ ایک ڈپٹی کلکٹر بریلی میں بھائی صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ دلائل تو بہت متعارض ہیں ایک شخص دلائل سے ایک شے کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔ دوسرا دلائل سے اس کے عدم کو ثابت کر دیتا ہے۔ پس دلائل سے تو اطمینان ہو نہیں سکتا کسی بزرگ کا نام بتلاؤ جو ارواح کو دکھلا دے۔ ہمیں آخرت کے وجود میں شبہ ہے۔ ہم ارواح سے گفتگو کر لیں تب ہمیں یقین ہوگا۔ بھائی نے کہا کہ ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اگر عالم ارواح دیکھنا چاہتے ہو تو اول اپنے اندر اس کی استعداد پیدا کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول ڈپٹی کلکٹری کو چھوڑ دو اور جنگل میں تنہا بیٹھ کر ایک چلہ کھینچو اور اس میں بہت تھوڑا کھاؤ پھر اس کے بعد میں تمہیں کسی بزرگ کا نام بتلاؤں گا کہنے لگے کہ یہ تو بہت مشکل ہے، بھائی نے کہا کہ شرم تو نہیں آتی اتنی بڑی چیز کے طالب اور ذرا سی محنت سے گھبراتے ہو یہ آج کل حالت ہو رہی ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صاحب حج کیلئے گئے جب جہاز میں بیٹھے اور سمندر کو دیکھا تو گھبرا گئے اور گھر کو واپس ہوئے۔ تو اس طرح بھلا حج کیسے ہوگا حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک شخص نے بمبئی میں کہا کہ دعاء کیجئے کہ مجھے حج نصیب ہو فرمایا کہ ایک دن کیلئے اپنے اوپر مجھے پورا اختیار دو کہنے لگے اس سے کیا ہوگا میں نے کہا کہ میں ٹکٹ لے کر تمہیں جہاز میں بٹھا دوں گا۔ ان شاء اللہ

تعالیٰ حج نصیب ہوگا۔ اور اس طرح تو حج ہونے سے رہا کہ میں دعا کرتا ہوں اور تم بمبئی بیٹھے رہو۔ غرض یہ کہ ہر کام اس کے طریقے سے ہوتا ہے فرماتے ہیں وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا کہ گھر کے اندر اس کے دروازے سے داخل ہو پس اول طالب علمی کر و اس وقت دلائل سمجھ آویں گے اور اس وقت یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہر بات سمجھنے کی نہیں ہوتی۔

مسئلہ تقدیر اور کنہ باری تعالیٰ کی معرفت تامہ جنت میں بھی معلوم نہ ہوگی

حتیٰ کہ بعض باتیں جنت میں بھی معلوم نہ ہوں گی جیسے تقدیر کا مسئلہ اور کنہ باری تعالیٰ کی معرفت تامہ۔ خوب کہا ہے ۔

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں   کا نیجا ہمیشہ باد بدست ست دام ما

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال لگانا اور کوشش کرنا لا حاصل ہے۔ اسی طرح کنہ ذات بحت کو کوئی ادراک نہیں کر سکتا۔ فکر و سوچ بالکل بیکار ہے)

ہاں رویت ہوگی مگر احاطہ اس کی کنہ کا نہ ہوگا۔ تو جب بعض علوم وہاں بھی مخفی رہیں گے ۔ تو یہاں کل کیسے منکشف ہو جاویں۔ پس خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سن کر بے چون و چرا مان لینا چاہئے اور اس میں لم کیف (چون و چرا) نہ کرنا چاہئے اور میں کہتا ہوں کہ آپ نسخہ میں کیوں ایسا نہیں کہتے کہ میں تو اس وقت عمل کروں گا کہ اجزاء نسخہ کی لم پوری طور پر معلوم ہو جاوے۔ جو برتاؤ آپ احکام شرعیہ میں کرتے ہیں وہ یہاں کس لئے نہیں کیا جاتا بس بات یہ ہے کہ یہاں تو جان بچانی مقصود ہے اور وہاں ایمان بچانا مقصود نہیں۔ غرض یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منادی ہیں اور اب علماء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں تو جب سرکاری منادی سے وجہ نہیں پوچھ سکتے تو ان سے کیوں پوچھتے ہیں۔ اگر کہو کہ اس لئے پوچھتے ہیں کہ منکروں کو جواب دیں تو میں کہتا ہوں کہ اگر اس سرکاری ندا کے وقت ایک سرکار کا باغی آوے اور وہ اس حکم پر اعتراض کرے تو کیا آپ اس کو قانون کے اسرار بتلا دیں گے، ہرگز نہیں بلکہ یہ کہیں گے کہ اول اس قانون کے واضع کو صاحب سلطنت مانو پھر اس کے ہر قانون کو مانو۔ اس طرح اگر کوئی غیر مذاہب والا ہم سے الجھے تو ہم اول توحید اور نبوت کو دلائل عقلیہ سے ثابت کریں گے اور کہیں گے کہ اب سارے قانون کو مانو یعنی پہلے قرآن

وحدیث کا سچا ہونا ثابت کریں گے پھر تمام احکام کا حوالہ قرآن وحدیث پر کر کے بحث کو ختم کریں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ احکام میں کبھی عقلی گفتگو نہ کیجئے صرف توحید ورسالت میں گفتگو کیجئے اور رگو یہ جواب خشک ہے اور مزیدار نہیں مگر سچا جواب یہی ہے سچے جواب میں مزہ کم ہوتا ہے۔ داغ کے شعر پر بہتوں کے سر ہلے ہوں گے مگر حکیم محمود خان کے نسخہ کو سن کر کبھی کسی صوفی کا سر نہ ہلا ہوگا۔ حالانکہ مفید وہی ہے مشہور ہے کہ ایک شخص ایک شاعر کے پاس جایا کرتا تھا وہ بھی اس کے خوش کرنے کیلئے کہہ دیتا کہ یہ ایک ہزار روپے کا شعر ہے۔ یہ دو ہزار روپے کا کا شعر ہے۔ بس یہ خوش ہو کر اس کو لکھ لیتا ایک مرتبہ اس کی ماں نے کہا کہ تو بیکار کام کرتا ہے کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس میں کچھ آمدنی ہو۔ اس نے کہا کہ میں بے کار کیوں رہتا مجھ کو تو بڑی آمدنی ہے کسی روز دو ہزار کی ہو جاتی ہے اور کسی روز ہزار روپے کی ہو جاتی ہے۔ ماں نے کہا اچھا تم ایک آنہ کی ترکاری لا دو بس آپ اپنے اشعار کی کاپی لے کر بازار میں پہنچے اور کنجڑن سے ایک آنہ کی ترکاری خریدی اور کاپی میں سے ایک شعر نکال کر کہا کہ لو یہ دس روپے کا شعر کنجڑن نے کہا کہ کیسا دس روپے کا شعر تم اسے اپنے ہی پاس رکھو مجھے تو ایک آنہ دیدو۔ اب آپ بہت گھبرائے کہ لو اسے تو کسی نے ایک آنہ میں بھی قبول نہیں کیا۔ بس آپ استاد کے پاس پہنچ گئے اور کہنے لگے واہ حضرت بس معلوم ہوئی آپکی شاعری کی حقیقت آپ کے شعر کو تو کسی نے ایک آنہ میں بھی نہیں لیا۔ تو اشعار مزیدار تو ہوتے ہیں مگر مفید کچھ بھی نہیں ہوتے سو یہ جواب جو میں نے دیا ہے مزیدار کم ہے مگر ہے بالکل سچا۔ آج لوگ مزہ کو ڈھونڈتے ہیں اس لئے ایسے جوابوں کی قدر نہیں کرتے۔ میں اپنی ایک حکایت بیان کروں کہ میں شاہجہان پور سے آرہا تھا تو جس درجہ میں بیٹھا تھا۔ اس کے پاس درجے میں ایک صاحب جنٹلمین بھی بیٹھے ہوئے تھے ان کے پاس ان کا نوکر آیا اور کہا کہ وہ نہیں ٹھہرتا انہوں نے کہا کہ اچھا اسے یہیں پہنچا دو۔ نوکر ان کے پاس ایک کتے کو پہنچا گیا آج کل کے فیشن میں کتے کا رکھنا بھی لازمی ہو گیا ہے۔

کتا پالنا ناجائز کیوں ہے

چنانچہ ایک مولوی صاحب کا قصہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ سوار تھے جس درجہ میں وہ جا کر بیٹھے اس درجہ میں ایک جنٹلمین صاحب بھی بیٹھے تھے۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی کوٹ پتلون پہنے ہوئے کتا بغل میں مولوی صاحب نے اس سے سلام علیک نہ کی وہ کہنے لگے کہ مسلمان سے

سلام علیک تو ضرور کر لینی چاہئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں تم کو مسلمان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہنے لگے کیوں میرے اندر کونسی ایسی بات ہے جس سے آپ مجھ کو مسلمان نہیں سمجھے مولوی صاحب نے کہا کہ بھلے آدمی ڈاڑھی تمہاری منڈی ہوئی ہے کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہو کتا بغل میں ساری وضع تو کافروں کی سی ہے پھر میں مسلمان کس طرح سمجھتا کہنے لگا کہ کتا ساتھ رکھنے کی تو یہ وجہ ہے کہ آپ ہی لوگ فرماتے ہیں کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں ملائکہ نہیں آتے تو میں کتے کو اس لئے پاس رکھتا ہوں تاکہ ملک الموت میرے پاس روح قبض کرنے کیلئے نہ آویں۔ یہ جواب دے کر وہ بہت خوش ہوئے مولوی صاحب نے کہا کہ صاحب آخر کتے بھی تو مرتے ہیں انکی روح بھی تو کوئی فرشتہ قبض کرتا ہوگا وہی آپ کی کرے گا۔ اگر انسان کا ملک الموت آپ کے پاس نہ آسکے گا تو کتے کا ملک الموت تو آسکے گا۔ آپ کتے کی موت مرنا پسند کرتے ہیں۔ غرض آجکل کتا رکھنا داخل فیشن ہوگیا ہے سوان صاحب کے پاس ملازم کتا پہنچا گیا تھوڑی دیر بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے کہنے لگے کہ صاحب کتا ایسا وفادار جانور پھر کیا وجہ ہے اس کا پالنا ناجائز ہے۔ میں نے کہا کہ اسکی دو وجہ ہیں ایک تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر قومی ہمدردی نہیں ہے۔ پہلا جواب تو ان کو پسند نہ آیا۔ لیکن دوسرا جواب سن کر پھڑک گئے کہنے لگے کہ ہاں صاحب یہ ہے جواب میں نے کہا کہ خاک پتھر ہے۔ جواب تو اصل وہی ہے کہ **نهانا عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم** (ہم کو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے) ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں ہمارا مذہب تو یہ ہونا چاہئے کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(زبان سے اقرار کرنا چاہئے مصلحتیں اور حکمتیں نہ ڈھونڈھنا چاہئیں) اور ہماری یہ حالت یہ ہونی چاہئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندگی عطا کریں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر قربان ہیں دل آپ فریفتہ ہے جو کچھ تصرف کریں ہم ہر طرح راضی ہیں)

یہ تو ایک موٹی سے بات ہے کہ بدون اتباع محض کے کام نہیں چلتا مثلاً عساکر (لشکر)

لڑ رہے تھے اگر عین موقع پر افسر لڑنے کا حکم دے اور سپاہیوں کے ذہن میں یہ آوے کہ اس وقت مناسب نہیں تو کیا اس صورت میں افسر کی عدول حکمی سپاہی کو جائز ہو جاوے گی ہرگز نہیں حضرت اس مذاق پر فوج کے لوگ عمل کریں تو کیا درست ہے اگر یہ درست ہے تو کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ اس کو سپاہ میں پھیلا دیا جائے کہ بے سمجھے ہرگز کوئی کام نہ کرو۔ اگر فوج اس پر عمل کرنے لگے تو کبھی فتحیاب نہ ہو۔ پس معلوم ہوا کہ دنیا کا بھی کوئی کام بے اتباع کے نہیں چل سکتا۔ اور آپ دین میں بھی اتباع نہیں کرتے حالانکہ دنیاوی معاملات میں تو خلاف کی کسی قدر گنجائش بھی ہے۔ دیکھئے بعض مرتبہ سپاہی افسر سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بعض مرتبہ ایک ہی تاریخ میں افسر ماتحت اور ماتحت افسر ہو جاتا ہے تو ماتحت علم میں بڑھا ہوا ہے یا اتنا مساوی ہے کہ اسی تاریخ میں افسر ہو گیا تو جب ماتحت کو باوجود مساوی ہونے یا بڑھے ہوئے ہونے کے چون و چرا کرنے کی اجازت نہیں تو ہمارے علم کو تو خدا تعالیٰ کے علم کے ساتھ کوئی مناسبت ہی نہیں جب سمجھنے والے کو مزاحمت کا منصب نہیں تو نہ سمجھنے والے کو کیا ہوگا احکام خداوندی میں ہم کو وہی معاملہ کرنا چاہئے کہ جو اس وقت سرکاری منادی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اگر اسی وقت حکم ہو کہ بارہ بجے کے بعد سب منتشر ہو جاؤ تو بلا چون و چرا سب منتشر ہو جاویں تو منادی دنیا کے ساتھ جب معاملہ کرتے ہیں تو منادی دین کے ساتھ کیوں یہ معاملہ نہیں کرتے تو لفظ داعی سے اس مرض کا علاج کیا ہے، اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مجھے اس مضمون کے بیان کرنے سے کیوں شرم آتی تھی ایسی موٹی بات کو سمجھانے کی ضرورت پڑی جس کو عام لوگ اپنے احکام کے ساتھ برت رہے ہیں واقعی کہتے ہوئے حیا آتی ہے مگر ضرورت مجبور کرتی ہے۔ آجکل لوگوں کا مذاق فاسد ہو رہا ہے۔ اس لئے اس کا بیان کرنا ضرور معلوم ہوا تو الحمد للہ لفظ داعی علاج ہے اس مرض کا کتنا بڑا مرض اور ایک لفظ کے اندر اس کا علاج۔ جب اطبائے کاملین مفرد دوا سے علاج کرتے ہیں تو خدا کے کلام میں کیوں نہ ہوگا خلاصہ یہ کہ علماء کو منادی دین سمجھئے اور ان کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو سرکاری منادی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور مخالف کو سمجھانے کے عذر کا میں جواب دے چکا۔

عقل پرستی کا دور

اب ایک شبہ جو کہ مجھ پر سندھ میں کیا گیا تھا آج کل لوگ عقل پرستی کا زمانہ بتلاتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ اکل (کھانا) پرستی کا زمانہ ہے فہم کی اس قدر کمی ہے کہ ایک معمولی بات بھی نہیں سمجھ سکتے غرض انہوں نے عقل سے نکال کر یہ شبہ کیا کہ آپ نے جو مثال دی

ہے گورنمنٹ کے قانون کی وہ اس تشبیہ کے معنی نہیں سمجھے مطلب میرا یہ ہے کہ جہاں حکم قطعی ہوتا ہے گورنمنٹ کا وہاں نہیں بولتے اور جہاں بولتے ہیں وہاں بولنے کی اجازت ہوتی ہے اور اگر کوئی ایسا بہادر ہو کہ باجود حکم قطعی کے بھی اس میں چون و چرا کرے تو پھر میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے احکام میں تب بھی چون چرا نہیں کی جاسکتی آپ نے دونوں کو برابر سمجھ لیا ہے حالانکہ اس میں بڑا فرق ہے **حفظت شیئاً و غابت عنک اشیآ** (ایک تو پڑھ لی اور بہت سی باتوں کو چھوڑ دیا) کیونکہ یہاں تو احتمال ہے کہ شاید گورنمنٹ نے ہماری مصالح کی رعایت نہ کی ہو اس لئے چون چرا کرتے ہیں لیکن اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ مصالح کی پوری رعایت کی ہے تو پھر بولنے کی گنجائش نہیں تو کیا خدا تعالیٰ پر بھی یہ شبہ ہے اگر ہے تو **بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (یہ افعال بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے) پس اس مثال پر اگر شبہات ہوتے ہیں تو لیجئے میں مثال بتلائے دیتا ہوں۔ ایک باپ اور دو سالہ بچہ ہے باپ حکم دیتا ہے دودھ چھڑا دینے کا بوجہ ماں کے مرض کے جب دودھ چھوٹتا ہے بچہ کیسا مچلتا ہے او ماں کو دشمن سمجھتا ہے اور ماں کیا کرتی ہے کہ ایلوا لگاتی ہے اور اگر نہیں مانتا تو مارتی ہے۔ اس وقت بچہ سمجھتا ہے کہ پکی دشمن یہ ہے اور وہ شخص جو بچہ کا دشمن ہو اور کہے کہ پلا بھی دو تو بچہ اس کو دوست سمجھے گا۔ تو اگر بچہ کا یہ سمجھنا غلط ہے تو کیا وجہ غلط ہونے کی اگر آپ کو اور کوئی وجہ معلوم نہ ہو تو محض اس وجہ سے کہ باپ بچہ کی مصلحت کو زیادہ سمجھتا ہے بچہ کی رائے کو غلط سمجھتے ہیں حالانکہ باپ بھی بشر ہے اس سے غلطی ہونا ممکن ہے تو خدا تعالیٰ کا علم تو ہم سے بہت ہی زیادہ ہے کہ ہمارے علم کو اس کے ساتھ کچھ نسبت ہی نہیں ہے اتنے تھوڑے تفاوت میں تو آپ نے فیصلہ کر لیا کہ بچہ غلطی پر ہے اور اتنے بڑے تفاوت میں آپ یہ فیصلہ نہیں کرتے غضب کی بات ہے اور جب آپ وہیں کہتے ہیں کہ اگر بچہ سمجھنا بھی چاہے تو نہیں سمجھ سکتا تو پھر آپ یہاں یہ کیوں نہیں خیال کرتے کہ مصالح اور علل احکام کے ہم نہیں سمجھ سکتے۔

حدیث مطرب و می گوا ز دہر کمتر جو   کہ کس نکشود نہ کشاید بحکمت ایں معمارا

(محبت و معرفت احکام الٰہی پر عمل کرنے کی طرف متوجہ ہو اور اسرار و حکم احکام میں تلاش نہ کرو۔ حکمت سے یہ معمہ نہ کسی سے حل ہوا اور نہ ہو)

اب ایک مثال پر وہ شبہ نہیں ہوتا کہ گورنمنٹ سے تو بعضے لوگ الجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ

سے الجھنا بھی جائز ہو اور گورنمنٹ سے جو بعض لوگ الجھتے ہیں تو وجہ یہی ہے کہ گورنمنٹ کو تو معلوم نہیں ہے کہ ان کی ضروریات کیا ہیں اس وجہ سے کبھی قانون کے اندر ان کی رعایت میں فروگذاشت ہو جاتی ہے مثلاً پہلے سرکاری ملازموں کو جمعہ کے واسطے چھٹی نہیں ہوئی تھی جب اس کیلئے درخواست دی گئی اور ہمت ظاہر کی گئی تو گورنمنٹ نے کہا کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ یہ اتنی ضروری بات ہے تو خدا تعالیٰ کی نسبت تو یہ احتمال نہیں کہ شاید ان کو ہماری کسی ضرورت کی خبر نہ ہو۔ پس یہ شبہ بھی جاتا رہا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں کہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (سنا ہم نے اور طاعت کی) کہیں مولانا فرماتے ہیں۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ مے نگیرد فضل شاہ

(فہم و خاطر تیز کرنا یہ حق تک پہنچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے ہے بجز شکستہ دلوں کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا)

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(یعنی جس جگہ پستی ہوتی ہے اسی طرف کو پانی جاری ہوتا ہے، جہاں مشکل پیش آتی ہے اس جگہ جواب کی ضرورت ہوتی ہے۔)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجار نجے شفا آنجا رود

(جہاں درد ہوتا ہے وہیں دوا کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں بیماری ہوتی ہے شفا کی خواہش وہیں ہوتی ہے اسی طرح جہاں اطاعت و شکستگی ہوتی ہیں وہیں نور پیدا ہوتا ہے۔ اور فضل خداوندی ہوتا ہے)

سالہا تو سنگ بودی دل خراش آزمودم را یک زمانے خاک باش

(سنگ دلخراش تو مدت سے بنے رہے ہو بھلا آزمائش ہی کی نظر سے تھوڑے دنوں خاک بن کر دیکھو)

اب تک بہت مزاحمتیں کی ہیں اور دیکھا کیا ظلمت پیدا ہوئی۔ اب اطاعت کر کے دیکھ کیا اس سے نور پیدا ہوتا ہے۔

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ برنگ

(بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتا ہے خاک ہو جاؤ تا کہ رنگ برنگ کے پھول پیدا ہوں یعنی تکبر کو چھوڑ کر اتباع نہ کرو گے تو فیضان الٰہی سے محروم ہو گے)

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ہمچو او باگریہ و آشوب باش

(یعنی جب تم یوسف (یعنی مطلوب) نہیں ہو تو یعقوب یعنی طالب رہو اور ان کی طرح گریہ و آشوب (یعنی درد و طلب میں رہو)

شاید کوئی کہے کہ ہم تو ناز کرتے ہیں چنانچہ بعض کو یہ خبط ہوتا ہے تو فرماتے ہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بد خوئے مگرد

(ناز کیلئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب ایسا چہرہ نہیں رکھتے بد خوئی کے نزدیک بھی نہ جاؤ یعنی جب تم مخصوصین میں سے نہیں ہو تو تم کو ناز نہ کرنا چاہئے بلکہ نیاز مند ہو کر رہو)

عیب باشد چشم نابینا و باز زشت باشد روئے نازیبا و ناز

(یعنی جس طرح کور چشم کا کھلا ہونا عیب ہے اور بد صورت ہو کر ناز کرنا برا ہے اسی طرح ناقصین کو ناز کرنا نازیبا ہے)

بجائے ناز کے حاجت نیاز:

ناز پر مجھے یاد آ گیا کہ ایک شخص تھا گنوار اس نے ایک گھوڑے کو ناز کرتے ہوئے دیکھا اور مالک اس کو پیار کر رہا تھا آپ نے کہا کہ آج ہم بھی ناز کریں گے۔ بس آپ گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ ہم کو گھوڑا بناؤ وہ بھی ایسی ہی تھی کہنے لگی اچھی بات ہے اور انہیں رسی سے باندھ دیا اور ایک جھاڑو پیچھے باندھ کر دم لگا دی۔ پھر آپ نے کہا کہ اب ہمیں دانہ کھلاؤ، اس نے دانہ لا کر سامنے رکھا بس آپ نے ناز کرنا شروع کیا کبھی اس طرف منہ پھیر لیتے ہیں۔ کبھی دولتیاں پھینکتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ وہاں قریب ہی میں آگ بھی تھی جب آپ نے بہت دولتیاں پھینکیں تو جھاڑو میں آگ لگ گئی۔ بیوی نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ارے دوڑو کہ میرا گھوڑا جلا جاتا ہے لوگوں نے خیال کیا کہ اس کے یہاں گھوڑا کہاں ہے یہ ویسے ہی ہنسی کرتی ہے اس وجہ سے کوئی نہ گیا۔ بس آپ جل کر رہ گئے تو حضرت بعض ناز ایسا بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بد خوئی مگرد۔

(یعنی ناز کیلئے خصوصیت و کمال کی ضرورت ہے جب تم ناقص ہو تو ناز نہ کرنا چاہئے)

مطلب یہ ہے کہ جب آپ مخصوص نہیں تو نیاز مند ہو کر رہنا چاہئے۔ گستاخی نہ کرنا چاہئے۔ واللہ یہ کھلی ہوئی بغاوت ہے کہ خدا کا حکم سن کر کہیں کہ یہ کیوں ہوا۔ اب اگر کوئی کہے

کہ ہم جو اعتراض کرتے ہیں تو مولویوں پر کرتے ہیں خدا تعالیٰ پر نہیں کرتے کیونکہ ہمارا گمان ہے کہ مولویوں نے یہ مسئلے گھڑ لئے ہیں تو سنئے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ہائی کورٹ سے فیصلہ ہوا اور امین آکر قرقی کردے اور آپ اس سے الجھیں اور کہیں کہ یہ فیصلہ غلط ہوا ہے مجھے تسلیم نہیں جب اس کی وجہ سے آپ پر مقدمہ قائم ہو تو آپ عدالت میں جائیں اور کہیں کہ میں نے پارلیمنٹ پر اعتراض نہیں کیا بلکہ میں نے ہائیکورٹ کے ججوں پر اعتراض کیا ہے کہ وہ قانون کو سمجھے نہیں تو کیا عذر آپ کا مسموع ہوگا۔ ہرگز نہیں ضرور آپ کو یہی جواب ملے گا کہ یہ اعتراض حقیقت میں پارلیمنٹ ہی پر ہے کیونکہ پارلیمنٹ ہی نے یہ تجویز کردیا ہے، کہ ہائی کورٹ کے جج قانون کو دوسروں سے زیادہ سمجھتے ہیں پس جو مطلب قانون کا وہ سمجھیں پارلیمنٹ کا وہی حکم ہے تو اسی طرح علما ورثۃ الانبیا (انبیاؑ کے وارث) ہیں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو وہ زیادہ سمجھتے ہیں اگر ان کے ساتھ آپ الجھتے ہیں تو وہی نتیجہ ہوگا جو کہ ہائی کورٹ کے جج کے ساتھ الجھنے سے ہوتا ہے کیونکہ جب ہائی کورٹ کے جج کوئی حکم اپنی طرف سے دیتے تو علماء کیا اپنے گھر سے لائے ہیں۔

نیاورم از خانہ چیزے نخست   تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(یعنی علماء اپنے گھر سے کوئی حکم نہیں لائے جو کچھ بیان کرتے ہیں خدا تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ بیان کرتے ہیں)

یہ بھی جو کہتے ہیں حدیث قرآن سے کہتے ہیں پھر ان سے کیوں الجھتے ہو ہم لوگ مولوی کہلاتے ہیں مگر ہم کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ ہم ملکی قوانین کو نہیں جانتے تو اوروں کو یہ کہتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے کہ ہم علوم شرعیہ میں ماہر نہیں اور جیسا کہ جب ہمیں ضرورت ہوتی ہے بلا تکلف وکلاء سے دریافت کر لیتے ہیں ایسا ہی اور لوگ وقت ضرورت مسئلہ شرعیہ ہم سے پوچھ کر عمل کرلیا کریں۔ اور جبکہ ہم ان سے نہیں الجھتے تو اور لوگ ہم سے کیوں الجھیں۔ آجکل لوگ کہتے ہیں کہ مل کر کام کرنا چاہئے۔ مولوی چونکہ الگ الگ رہتے ہیں اس لئے ترقی نہیں ہوتی میں کہتا ہوں کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ مولوی آپ کی ہر بات میں تابع ہو کر رہیں اس طرح تو وہ آپ کے شریک ہو نہیں سکتے۔ مل کر اگر کام کرنا چاہتے ہو تو طریقہ سے کرو اور اس کا فیصلہ میں نے یہ کیا ہے کہ جو ہم کو معلوم نہ ہو وہ ہم آپ سے پوچھ کر کریں اور جو آپ کو معلوم نہ ہو وہ ہم سے پوچھ کر کریں۔ طریقہ تو تمدن کا یہ ہوسکتا ہے یہ نہیں کہ علوم شرعیہ

میں بھی آپ ہی کی رائے کو مانا جاوے کیونکہ جیسا کہ قانون کے سمجھنے میں ہم غلطی کریں گے ایسا ہی علم شریعت میں آپ غلطی کریں گے۔ آپ ہی بتلایئے کہ جس نے پچاس برس دین کی خدمت کی ہو وہ دین کو زیادہ سمجھے گا یا جس نے دین کی خدمت ہی نہیں کی یا کی ہے مگر کم وہ زیادہ سمجھے گا۔ عجب بات ہے کہ مقدمات تو سب صحیح نتیجہ غلط ہے تو تبت اور رواں لطخ ہمارے بھائی مقدمات تو سب مانتے ہیں مگر نتیجہ مسلم نہیں غرض یہ کہ علماء جو مسئلہ بتلائیں وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حکم ہے اس پر اعتراض کرنا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم پر اعتراض کرنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علماء سے غلطی نہیں ہوتی مگر جب تک کہ وہ خود اپنی غلطی کو نہ سمجھیں آپ کو یہ حق نہیں کہ اس کو غلط سمجھ کر رد کریں۔ اگر علماء سے غلطی ہوگی تو علماء ہی اس کو سمجھیں گے اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ہر مولوی کے معتقد ہو جاؤ۔ ہر بات کو مان لو۔ ہاں جس پر بھروسہ ہو اور اطمینان ہو اس کا اتباع کرو ہاں جو خود صاحب علم ہو اور کسی بات کو سمجھنا چاہے تو اس کو حق ہے سمجھنے کا لیکن جن کو علوم دینیہ کی مہارت نہیں ہے ان کو یہی چاہئے کہ علماء کا جو فتویٰ ہو اس پر عمل کرے سمجھ میں آوے یا نہ آوے چون و چرا نہ کرے۔ ہاں اگر کسی بات میں شبہ ہو کہ یہ حکم شریعت کا ہے بھی یا نہیں اس کے بارے میں ایک عالم سے تسلی نہ ہو دوسرے سے معلوم کرلیں یہ ہے مضمون اس لفظ داعی میں کوئی مضمون باہر سے نہیں لیا گیا۔ اسی لئے ارشاد ہے۔ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یعنی کہا مانو اللہ کے منادی کا اور اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ تو اٰمِنُوْا بِهٖ تفسیر ہے داعی اللہ کی کہ اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ اور امنوا به کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ داعی پر ایمان لاؤ اور یہ معنی زیادہ چسپاں ہیں کیونکہ وہ جن یہودی تھے حق تعالیٰ کے ساتھ پہلے ہی سے ایمان رکھتے تھے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تھے۔ اس لئے ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو کہا گیا۔

عقیدہ توحید نجات کے لئے کافی نہیں:

اور یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صرف توحید کا قائل ہونا نجات کیلئے کافی نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق بھی ضروری ہے مسلمانوں کے مجمع میں یہ مضمون بھی مستنبط کرتے ہوئے شرم آتی ہے مگر افسوس کہ آج کل مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو رسالت کے ماننے کو ضروری نہیں سمجھتے ایک صاحب نے لکھا کہ اصل مقصود توحید ہے۔

اگر کوئی نبوت کا منکر ہو تو وہ ناجی ہے اس کے آگے اور ترقی کی ہے کہ بلکہ جو توحید کا منکر ہو وہ بھی ناجی ہے۔ کیونکہ توحید امر طبعی ہے امر طبعی کا کوئی منکر ہو نہیں سکتا جو زبان سے اس کا انکار کرتا ہے وہ بھی درحقیقت اس کا قائل ہے خیال کیجئے کہ کیا آفت نازل ہو رہی ہے ایک صاحب اس مسئلہ کے قائل مجھے ملے ہیں میں نے اس سے کہا کہ اس کے تو آپ قائل ہیں کہ بدوں توحید کے نجات نہیں محض نبوت کے مسئلہ میں آپ کو کلام ہے تو سنئے توحید بغیر نبوت کے مانے ہوئے ہو نہیں سکتی۔ پس نبوت کا انکار کر کے توحید بھی نہ رہے گی کیونکہ توحید کے معنی ہیں حق تعالیٰ کو جمیع صفات کا کمال کے ساتھ متصف ماننا اور ان میں سے ایک صفت صدق بھی ہے، تو جب خدا تعالیٰ نے فرمایا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ نے انکار کیا نبوت کا تو انکار کیا اس فرمان کا اور اس کا انکار صفت صدق کا انکار ہے توحید کا انکار ہو گیا۔ تو اگر اصل مقصود توحید ہی ہو تب بھی نبوت کا ماننا اس لئے ضروری ہوگا کہ بغیر اس کے توحید ہو نہیں سکتی۔ میں نے کہا اس کا جواب آپ قیامت تک نہیں دے سکتے، آج کل وہ زمانہ ہے کہ ہر شخص مجتہد بن رہا ہے۔ گو علم دین سے ذرا بھی مس نہ ہو

تو ندیدی گہے سلیمان را	چہ شناسی زبان مرغاں را

(تم نے سلیمان کو کبھی نہیں دیکھا تم پرندوں کی زبان کیسے سمجھ سکتے ہو یعنی تم نے علم دین کبھی حاصل نہیں کیا تم شریعت کو کیا سمجھ سکتے ہو) اس لئے ضرورت ہے کہ ان کا جہل ان پر ظاہر کیا جاوے بلکہ مجھے تو اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ مولوی کبھی ایسا بیان بھی کر دیا کریں کہ کوئی نہ سمجھیں تاکہ ان لوگوں کا اپنے فہم پر ناز تو ٹوٹے۔

غیب سے مرض کا علاج:

ایک مرتبہ دیوبند سے ایک وفد علماء کا شملہ گیا تھا میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہاں ہم میں اس ایک صاحب کا وعظ ہوا۔ وہ مضمون نہایت دقیق تھا۔ اس لئے کوئی نہیں سمجھا سمجھایا۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی نہیں سمجھا اور لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ اس وعظ کی یہاں کیا ضرورت تھی۔ طلباء ہی کے مجمع میں بیٹھ کر تقریر کر دی ہوتی۔ میں نے کہا کہ ہم کو غرور توڑنا تھا کہ آپ سمجھ لیں کہ آپ ایسے محقق ہیں کہ سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ سکتے اس لئے وہ لوگ بہت شگفتہ ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی ہمارے مرض کا علاج ہو گیا

اور غیب سے علاج ہوا اور یہی بہتر ہے باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند (کبھی غیب سے بھی علاج ہو جاتا ہے) تو اس لئے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ بیان مشکل ہوا اب غریب علماء تو اپنے اوپر دقت اختیار کر کے آسان کرتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی مجتہد بننے لگے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ جن چونکہ بوجہ یہودی ہونے کے توحید کے پہلے ہی سے قائل تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے قائل نہ تھے اس لئے امنوا بہ کی یہ تفسیر مناسب ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔

ایمان کے لئے عمل صالح لازم ہے:

اور ایک بات یہ بھی سمجھ لینے کی ہے کہ امنوا بہ کے ساتھ واعملوا صالحاً (اور نیک کام کرو) کیوں نہیں فرمایا یہاں سے تو گویا سہارا ملے بعض کو کہ ایمان کافی ہے اعمال صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھو کہ اس کے ذکر نہ کرنے سے یہ بتلانا ہے کہ عمل صالح تو ایمان کے لئے لازم غیر منفک (جدا نہیں) ہے کہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں دیکھو اگر حاکم کہے کہ رعیت نامہ داخل کردو تو اس کہنے کی ضرورت نہیں کہ قانون پر عمل بھی کرنا میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی شخص نے قاضی کے کہنے سے کہا کہ کیا میں نے اس عورت کو قبول کیا کچھ دنوں تک دعوتیں ہوتی رہیں اس لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوئی لیکن دو چار روز کے بعد نمک لکڑی کی ضرورت ہوئی تو بیوی نے فرمائش کرنی شروع کیں۔ اب وہ گھبرایا اور پہلوتہی کرنی شروع کی جب بیوی نے بہت دق کیا تو کہنے لگا سنو بیوی میں نے صرف تمہیں قبول کیا تھا نمک لکڑی کو قبول نہیں کیا تھا تو اگر آپ کے سامنے اس کا فیصلہ آوے تو آپ فیصلہ میں کیا کہیں گے ظاہر ہے کہ بیوی کا قبول کرنا ان سب چیزوں کا قبول کرنا ہے تو اسی طرح ایمان لانا سب چیزوں کا قبول کرنا ہے اس لئے اٰمِنُوْا بِہٖ (اس پر ایمان لاؤ) کہنا کافی ہو گیا اور وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (اور نیک کام کرو) کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانے گا اس کو سب کچھ کرنا پڑے گا آگے اس کا ثمرہ مرتب کرتے ہیں کہ یَغْفِرْ لَکُمْ مِنْ ذُنُوْبِکُمْ (اگر ایسا کرو گے تو تمہارے گناہوں کو معاف کردیں گے اس آیت میں من یا تو ابتدائیہ ہے کہ گناہوں سے مغفرت شروع ہوگی اور اس میں اشارہ ہے کہ اتصال ہوگا یعنی ایک سرے سے گناہ معاف ہوتے چلے جائیں گے یا من تبعیضیہ ہو کہ جن گناہوں کا اب تدراک

نہیں ہوسکتا مثلاً شراب خوری وغیرہ وہ معاف ہو جائیں گے باقی جن کا تدارک ہوسکتا ہے معاف نہیں ہوں گے جیسے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی سے ہزار روپے چھین لئے اور اگلے دن ہو گئے مسلمان تو وہ روپیہ ادا کرنا پڑے گا۔ معاف نہ ہوگا۔ اب میری تقریر سے یہ اشکال جاتا رہا کہ کیا نرے ایمان پر گناہ معاف ہو جاویں گے کیونکہ معلوم ہوگیا کہ ایمان کیلئے عمل لازم ہے اور یہ بھی ایک جواب ہے کہ صرف ایمان پر بھی کبھی نہ کبھی تو مغفرت ہوگی گو دخول نار کے بعد ہی سہی مگر یہ طالب علمانہ جواب ہے آگے فرماتے ہیں وَيُجِرْكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (اور دردناک عذاب سے تم کو محفوظ رکھیں گے) اگر ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی کیا جاوے تو عذاب الیم سے عذاب مطلق مراد ہوگا کہ ہر طرح کے عذاب سے پناہ دیں گے اور اگر نرا ایمان لیا جاوے اور اس کے ساتھ عمل صالح نہ ہو تو عذاب سے مراد عذاب مخلد ہوگا کہ ہمیشہ عذاب نہیں ہوگا۔ یہ تو آیت کی تفسیر ہوگئی اب اس آیت کے متعلق ایک مسئلہ بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ یہاں جنوں کا مکالمہ ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنوں کا وجود ہے جو آج کل اس میں بھی اختلاف ہے اور اختلاف ایسا عام ہوگیا ہے کہ ہر چیز میں اختلاف ہے جیسے ایک مولوی صاحب کے شاگرد بد استعداد تھے جب وہ کتابیں ختم کر کے جانے لگے تو استاد سے کہنے لگے کہ مجھے کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں لوگ مجھ سے مسئلہ پوچھیں گے تو میں کیا بتلاؤں گا استاد نے کہا کہ تم یہ کہہ دیا کرنا کہ اس میں اختلاف ہے غرض یہ کہ جب وہ وطن پہنچے تو انہوں نے یہی طرز اختیار کیا کہ جو شخص ان سے کوئی مسئلہ پوچھتا وہ یہی کہہ دیتے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے لوگ ان کے بڑے معتقد ہوئے کہ یہ بہت وسیع النظر ہیں۔ آخر ایک شخص یہ راز سمجھ گیا اس نے کہا کہ لا الٰہ الا اللہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں انہیں تو وہی ایک جواب یاد تھا کہنے لگے اس میں اختلاف ہے بس لوگ سمجھ گئے کہ انہیں کچھ نہیں آتا۔ سو اس وقت تو یہ بات ہنسی کی تھی مگر آج سچی ہوگئی۔ لا الٰہ الا اللہ میں بھی اختلاف ہے، خدا تعالیٰ تو کہیں کہ جن ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں اور بناء انکار کی کیا ہے محض یہ کہ ہم نے نہیں دیکھے میں کہتا ہوں کہ جب تک ہم نے امریکہ نہ دیکھا تھا کیا اس وقت امریکہ معدوم تھا یا غیر معلوم تھا۔ سو معدوم تو نہ تھا۔ اگر آدمی کسی چیز کو نہ دیکھے تو اس کا نہ دیکھنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ موجود نہیں تو اگر حق تعالیٰ جنوں کی خبر نہ دیتے تو بھی محض غیر مرئی ہونے پر انکار کی گنجائش نہ تھی۔ دیکھئے مادہ کو کسی نے دیکھا نہیں اور پھر

مانتے ہیں اور لطف یہ کہ مادہ کو خالی عن الصورۃ مان کر قدیم مانا ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس کو دیکھا ہے ہرگز نہیں بلکہ محض دلیل سے قائل ہوئے ہیں، گو وہ دلیل بھی لچر ہے تو اگر ہم خدا کے فرمانے سے کسی چیز کے قائل ہوں تو کیا حرج ہے ایک اور بات کہتا چلوں کہ جنوں کے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہر بیماری بھی جن ہیں آج کل جہاں کوئی بیماری ہوتی ہے بس لوگ سمجھتے ہیں کہ جن کا اثر ہے۔ اگر یہ خیال ہو کہ جن انسان کے دشمن ہیں۔ اس کے اثر سے کیا تعجب ہے تو سمجھ لو کہ اگر دشمن ہیں تو ہوا کریں خدا تعالیٰ حافظ ہیں فرماتے ہیں لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (واسطے اس کے فرشتے ہیں یکے بعد دیگرے حفاظت کرنے والے بندہ کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے حفاظت کرتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے) پس اگر وہ ضرر پہنچانا بھی چاہیں تو خدا تعالیٰ حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی حفاظت عبث نہیں۔

حکایت مکر

مگر عورتوں کے اندر اس کا بہت چرچا ہے کہ ہر مرض کو جن سمجھتی ہیں مگر اکثر تو مکر ہوتا ہے مجھے مکر پر یاد آیا کہ ایک گاؤں سے خط آیا کہ فلاں شخص حج کر کے آیا ہے اس پر جن ہے رحمت اللہ نام بتلاتا ہے اور جدہ کا رہنے والا بتلاتا ہے لوگوں سے مار مار کر نماز پڑھاتا ہے میں نے سوچا کہ اگر یہ جن نیک ہے تو اس شخص کو کیوں ستاتا ہے اور اگر نیک نہیں تو نماز کا کیوں کہتا ہے۔ میں نے لکھا کہ یہ جن نہیں ہے بلکہ یہ اس کی حرارت اور کچھ شرارت ہے چنانچہ کچھ دنوں بعد وہاں سے خط آیا واقعی اس پر جن نہ تھا بلکہ نماز پڑھوانے کیلئے اس نے یہ تدبیر کی تھی۔ سو اس نے تو ایک مصلحت کیلئے مکر کیا تھا بعض تو بالکل پریشان کرنے کو اور دھمکی دینے کو کہتے ہیں۔ دھمکی پر یاد آیا کہ ایک بڈھے نے مولوی صاحب کے کہنے سے نماز شروع کر دی تھی اتفاق کی بات کہ دو چار روز کے اندر ان کے یہاں کئی جانور مر گئے بیٹوں نے کہا کہ بڈھے نے نماز شروع کی ہے خدا خیر کرے آخر سب مشورہ کر کے باپ کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ بابا تو نے جب سے نماز شروع کی ہے اس وقت سے گھر پر تباہی آ رہی ہے تو نماز چھوڑ دے بڈھے نے کہا کہ میں تو نہیں چھوڑتا۔ بیٹے خوشامد کرنے لگے۔ بڈھے نے کہا کہ اچھا اگر میری خدمت اچھی طرح کیا کرو تو چھوڑ دوں گا بیٹوں نے منظور کر لیا غرض بڈھے کی خوب خاطر ہونے لگی اب جب کبھی بڈھے کی خدمت میں کمی ہوتی

تو کہتا لاؤ میرا کلھڑا میں وضو کر کے نماز پڑھوں۔ بس یہ سنتے ہی بیٹے ڈر جاتے اور خوشامد کر کے راضی کر لیتے تو جیسے یہ نماز کی دھمکی دیتا تھا ایسے ہی بعض جنوں کی دھمکی نکالتے ہیں اور کہیں مرض ہوتا ہے اور کہیں واقعی جن بھی ہوتا ہے۔ بعض جگہ تو ایسی دلیلیں ہیں کہ انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے اطراف میں ایک اللہ بخش ہیں کہتے ہیں کہ وہ بھوت ہو گیا ہے خیر یہ تو غلط خیال ہے کیونکہ بھوت کوئی چیز نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لاغول و لا صفر (المصنف لابن ابی شیبة ۹: ۴۳) یعنی نہ آدمی مر کر بھوت ہوتا ہے نہ صفر کی نحوست کوئی چیز ہے۔ مگر جنوں کا انکار نہیں۔ جنوں سے بیشک ایسے واقعات ہوتے ہیں گو بعض لوگوں نے اس کا بالکل انکار کیا ہے۔

جن بھگانے کے لئے اذان:

مگر حدیث میں ہے۔ اذا تغولت الغیلان نادیٰ بالاذان (الکامل لابن عدی ۵: ۱۷۶۰ بلفظ آخر) یعنی جبکہ جن کسی شکل کے اندر ظاہر ہو تو اذان پکار کر کہہ دے اس پر مجھے یاد آیا کہ بعض لوگ طاعون پر اذان کہتے ہیں اور استدلال یہ کرتے ہیں کہ طاعون ہے جن سے اور تغول جن (جن کی شکل میں ظاہر ہونے) کے لئے اذان کہنا آیا ہے۔ یہ تو استدلال صحیح نہیں کیونکہ تغول دفعۃً ہوتا ہے اور اس سے دفعۃً ہی ضرر پہنچتا ہے تو اگر اس کے لئے نماز کی اذان کا انتظار کریں تو اتنی دیر میں وہ تباہ کر دے گا۔ اور طاعون کا ضرر دفعۃً نہیں ہوتا پس اس میں جو جن ہیں وہ نماز مغرب کی اذان سے اور دوسرے اوقات کی نماز کی اذان سے بھاگ جائیں گے تو اس کیلئے مستقل اذان کی کیا ضرورت ہے خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا اصل بات یہ ہے کہ جب حدیث میں اذا تغولت الغیلان ہے تو لاغول کے معنی یہ ہیں کہ آدمی مر کر بھوت نہیں ہوتا اب رہی یہ بات کہ وہ تو مرے ہوئے شخص کا نام بتلاتے ہیں کہ میں فلانا ہوں تو وہ جھوٹ اپنا نام بدل کر بتلا دیتے ہیں

ہمزاد کی حقیقت:

اور اگر کہئے کہ وہ اس کا ہمزاد ہے تو سنئے ہمزاد کے معنی لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ انسان کے ساتھ اس کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے سو یہ تو محض لغو بات ہے حدیث میں اتنا آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے۔ سو اگر ہمزاد اس کو کہا جاوے تو خیر یہ بات صحیح ہو سکتی ہے اور ہمزاد اس کو اس لئے کہہ سکتے کہ وہ اپنی ماں سے اس کے ساتھ ایک وقت میں پیدا ہوا ہے تو اس کا ہمزاد ہو یا اور کوئی جن ہو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں فلاں ہوں تو وہ دراصل اس شخص کی روح نہیں ہوتی بلکہ وہ جن ہوتا ہے، کیونکہ حدیث میں بھوت کا انکار آیا ہے دوسرے وہ مر کر امعا الی

الجنة واما الی النار (یا تو جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف) چلا جاتا ہے تو اسے اس کی فرصت کہاں کہ لوگوں کو لپٹتا پھرے۔ پس وہ درحقیقت وہ شخص نہیں ہے جس کا نام بتلا رہا ہے۔ بلکہ وہ جن ہے اور اس کا نام بتلاتا ہے غرض یہ کہ وہ اللہ بخش جاہلوں پر آتا ہے اور وہ جاہل قرآن پڑھنے لگتا ہے۔ اور ایک عجیب قصہ ہے کہ ایک جاہل پر وہ آیا اور اس کیلئے ایک عامل نے تعویز لکھا تو وہ کہنے لگا کہ یہ چال تو غلط ہے پھر غور کر کے دیکھا تو وہ چال غلط تھی۔ اب ایک شبہ یہ ہے کہ جو منکر ہیں ان کو کیوں نہیں لپٹتا تو سمجھو کہ انسان میں ایک قوت دافعہ بھی ہے اس کا خاصہ یہ ہے کہ اگر تخیل کرے کسی چیز کے دفعہ کا تو وہ چیز اسے نہیں ستا سکتی انسان کی قوت فاعلہ بھی جن سے زیادہ ہے اور قوت دافعہ بھی تو اگر کوئی شخص یہ خیال کر کے بیٹھ جاوے کہ مجھے کوئی نہ ستاوے گا تو اس کو کوئی نہیں ستا سکتا اور اگر کوئی کہے کہ پھر اس سے تو منکر ہی اچھے وہ انکار کی بدولت ان کے ضرر سے تو بچے ہوئے ہیں۔ پس ہم بھی انکار سے یہ کام لیں تو میں کہتا ہوں کہ ہم آیۃ الکرسی سے یہ کام کیوں نہ لیں اور سورۂ جن سے کیوں نہ لیں۔ اب بحمداللہ اس کے متعلق سب باتیں محقق ہوگئیں۔ اب اس میں یہ تاویل کرنا کہ آیت میں جن سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے یہ نری تحریف ہے ذرا کسی تاریخ سے یہ تو بتلاؤ کہ جو چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے انہوں نے اپنی قوم میں جا کر اسلام پھیلایا ہو۔

جنات کے جنتی ہونے کا ثبوت:

اب وہ مسئلہ بتلاتا ہوں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہوا ہے وہ یہ کہ اگر جن عمل صالح کریں تو ان کو جنت ملے گی یا نہیں ایک قول امام صاحبؒ کا ہے عذاب سے تو بچیں گے لیکن جنت میں جانے کا حکم نہیں کیا جا سکتا اور اسی آیات سے استدلال کیا ہے کہ اس میں ایمان لانے پر مغفرت اور عذاب سے نجات کا وعدہ ہے جنت کا وعدہ نہیں تو امام صاحب نے بہت احتیاط کی ہے کہ جس کی تصریح نہ تھی اس میں توقف فرمایا اصل قول تو امام صاحب کا اتنا ہے اور یہ بھی احتیاط کی بنا ہے کہ اثبات بھی نہ کریں اور انکار بھی نہ کریں مگر اب مشہور قول یہ ہے کہ وہ جنت میں نہ جاویں گے۔ باقی پھر کہاں ہوں گے۔ تو اس کے متعلق مختلف احتمال ہیں بعض نے کہا ہے یہ ہے امام صاحب کے مذہب کا حاصل مگر جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ ظاہراً یہ امام صاحب کی احتیاط ہے اور یہ بھی ثابت نہیں کہ آخر تک امام صاحب اسی قول پر رہے کیونکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جن اچھے عمل کریں گے تو جنتی ہوں گے۔ میں تو اس کو قریب قطعی سمجھتا ہوں ایک تو سورۂ رحمٰن میں جنت کی نعمتیں ذکر کر کے

فرمایا ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (پھر تم (اے جن وانس اپنے رب کی کونسی نعمت کا انکار کرتے ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتیں دونوں کو ملیں گی نیز یہ بھی فرمایا کہ لَمْ یَطْمِثْھُنَّ اِنْسٌ قَبْلَھُمْ وَلَا جَآنٌّ (یعنی حوروں کو ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا نہ کسی جن نے) تو اگر جن کا احتمال ہی نہ تھا۔ تو یوں کیوں فرمایا اور اس سے بھی صاف لیجئے کہ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ایک فریق جنت میں ہوگا۔ اور ایک فریق دوزخ میں ہوگا تو دو فریق فرمائے ہیں تیسرا فریق نہیں فرمایا اور یہ یقین ہے کہ دوزخ سے بچے رہیں گے۔ تو اب اگر وہ جنت میں جاویں تو تیسرا فریق ہونا لازم آتا ہے نہ فریق فی الجنۃ (جنت کے فریق) میں داخل ہوئے نہ فریق فی السعیر (دوزخ کے فریق) میں اب رہی یہ بات کہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اعراف میں بھی رہیں گے۔ پس تیسرے فریق کا بھی ثبوت ہوا۔ مگر یہ شبہ بہت جلد زائل ہو جاوے گا کیونکہ اسی مقام پر فرماتے ہیں اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَاخَوْفٌ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۔ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہو گے) اس میں دو تفسیریں ہیں۔ ایک تو وہ جو میں اختیار کرتا ہوں کہ یہ اہل اعراف کا قول ہے وہ دوزخیوں کو چڑانے کے لئے اہل جنت کے بارہ میں کہیں گے

اہل اعراف امیدوار جنت ہوں گے:

اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُھُمُ اللّٰہُ بِرَحْمَةٍ (کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں کرے گا۔

قِیْلَ لَھُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ الخ دیکھو انہیں تو یہ کہہ دیا گیا کہ تم جنت میں چلے جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہو گے۔ دوسرا ایک قول اور ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اہل اعراف کیلئے اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ یعنی تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ سو اس آیت میں تو دونوں احتمال ہیں۔ مگر میں دوسری آیت سے استدلال کرتا ہوں فرماتے ہیں وَبَیْنَھُمَا حِجَابٌ وَعَلَی الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ کُلًّا بِسِیْمَاھُمْ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ لَمْ یَدْخُلُوْھَا وَھُمْ یَطْمَعُوْنَ . (ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہنچائیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے السلام علیکم ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے) اس سے معلوم ہوا کہ اہل اعراف کو جنت میں داخل ہونے کی

امید ہوگی اور عالم آخرت عالم انکشاف حقائق ہے وہاں غلط امید نہیں ہوسکتی دوسرا استدلال اور ہے کہ سورۂ حدید میں ہے فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ . (پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کردی جاوے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا کہ اس کے اندرونی جانب رحمت ہوگی اور بیرونی جانب عذاب ہوگا۔)

اہل اعراف:

مگر اس سے قبل سمجھئے کہ حدیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ کہ ان کے حسنات زیادہ ہوں گے سیئات سے وہ تو جنت میں جائیں گے۔ یہ لوگ اعراف میں ہوں گے اب سنئے بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ کو مفسرین نے بالا جماع اعراف کہا ہے تو اس کے دو رخ میں۔ ایک طرف عذاب ہے اور ایک طرف رحمت ہے تو وہاں دونوں طرف کا اثر ہے۔ اور اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ مؤمن میں سے جو جاویں گے وہ گناہوں کی سزا ملنے کے بعد جنت میں نہ جاویں گے۔ تو اہل اعراف جو ان سے اصلح حالاً ہیں وہ کیوں جنت میں نہ جاویں گے اور گفتگو ان جنوں میں ہورہی ہے جو صالح ہوں ہاں اس کے ہم بھی قائل ہوں گے کہ جنوں میں بھی تین قسم کے لوگ ہوں گے اس میں سے ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہیں جن کے حسنات وسیئات برابر ہوں گے اور وہ اولاً اعراف میں ہوں گے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر جنت میں جاویں گے اور اعراف کے متعلق ایک اور بات یاد آئی جو عوام میں مشہور ہے اور بالکل غلط ہے وہ یہ کہ رستم اور نوشیرواں اور حاتم طائی یہ سب اعراف میں رہیں گے۔ لوگوں کی بھی عجیب حالت ہے اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں گویا یہ اس محکمہ کے حاکم ہیں کہ ان کے اختیار میں ہے جس کو جہاں چاہیں بھیج دیں۔ خوب سمجھ لو کہ اگر ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے تو محض سخاوت یا شجاعت یا عدالت کی وجہ سے جنت کے مستحق نہیں ہوسکتے کسی کے اندر کتنی ہی خوبیاں ہوں جب تک ایمان نہ ہوگا سب بیکار ہیں۔ مجھے یہ شعر یاد آتا ہے

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد   بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جو پتلی کمر اور عمدہ بال رکھتا ہو بلکہ محبوبیت ایک آن اور ادا میں ہوتی ہے) آجکل بعض لوگ کفار کی ظاہری خوبیاں دیکھ کر ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں مگر سمجھئے کہ ان کا ایک ایمان سب کے مقابلہ میں ہے ان میں ایک ایمان کی آن ایسی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دوسروں کی ساری خوبیاں ہیچ ہیں کیونکہ

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جس کے عمدہ بال اور پتلی کمر ہو بلکہ محبوب وہ ہے جس کے ایک آن اور ادا ہو)

ایک شخص نے مجھ سے خود اپنا مرض بیان کیا کہ مجھ کو ایک عورت سے تعشق ہو گیا ہے میں نے کہا کیا وہ عورت خوبصورت ہے کہنے لگا کہ میں اس کی ایک آن پر عاشق ہوا ہوں اس سے یہ کہنا کہ اس کی ناک تو چپٹی ہے حماقت ہے۔ آپ تعجب کریں گے کہ بعض کو بڈھوں کے ساتھ بھی عشق ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ لیلیٰ بڑھیا ہو گئی تھی مگر مجنوں اسی کے پیچھے دیوانہ تھا ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے حسن پر عاشق نہ تھا کیونکہ

عشقہائے کز پئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں ہوتا محض ننگ و نام ہوتا ہے)

تو بات کیا ہے لیلیٰ میں کوئی آن تھی جو مجنوں کو پسند آ گئی تھی ورنہ صورت تو اس کی یہ تھی

گفت لیلیٰ راخلیفہ کاں توئی　　　کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

(لیلےٰ سے خلیفہ نے پوچھا کہ تو وہی ہے جس سے مجنوں پریشان اور عقل گم کردہ ہو گیا ہے۔)

از دگر خوباں تو افزوں نیستی　　　گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

(دوسرے حسینوں سے تو کسی بات میں زیادہ تو ہے نہیں پھر کیا بات ہے اس نے جواب دیا جب تو مجنوں نہیں تو خاموش ہی رہ)

حلاوت اعمال

تو مسلمانوں کی یہ ادا جس کو ایمان کہتے ہیں ایسی ہے کہ حق تعالیٰ کو یہ پسند ہے آپ دوسرے اخلاق کو لئے پھرتے ہیں۔ تو حاتم طائی وغیرہ میں گو اخلاق تھے لیکن اگر ایمان نہ تھا تو اللہ میاں کو ہی اخلاق نرے پسند نہیں تو ان کے لئے زبردستی اعراف تجویز کرنا یہ غلطی ہے ۔غرض اعراف کا ذکر اس پر آ گیا تھا کہ بعض لوگوں نے جنوں کو اعراف میں کہا ہے کہ تو امام صاحبؒ نے اول نظر میں ممکن ہے فرما دیا ہو۔ یہ ہے میرا خیال اس کے متعلق خیر یہ تو متعلقات تھے۔ اب میں اصل مقصود کا پھر اعادہ کرتا ہوں اور بیان کو ختم کرتا ہوں کہ غور کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نائب داعی ہیں تو ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو کہ داعی سے کرتے

ہو۔ پھر میں ایک بشارت دیتا ہوں کہ اگر ان کا اتباع کر کے عمل کرو گے تو دو لتیں ملیں گی ایک تو حلاوت اعمال میں کہ وہ مغنی (بے پرواہ کرنے والی) ہو گی اسرار کے دریافت کرنے سے اس مزہ میں ایسے مستغرق ہوں گے کہ پر اسرار کی طرف توجہ بھی نہ کریں گے۔ دوسری دولت ہی نصیب ہو گی کہ جن اسرار پر مرتے پھرتے ہیں ان کا دروازہ بھی کھلے گا پھر آپ حکماء امت سے اور فقہائے امت سے ہوں گے اور یہ کمال تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے کیا کسی دوسرے عالم سے زائد پڑھا تھا نہیں پھر ان میں کیا بات تھی۔ یہی تقویٰ کی برکت تھی۔ حدیث میں ہے کہ **من عمل بعلم علمه الله مالم يعلم** (الدر المنثور ۱: ۲۷۳ بلفظ آخر) (جو شخص کہ عمل کرے گا اس علم کے ساتھ جو خدا تعالیٰ نے اس کو سکھلایا ہے تو سکھلائیں گے اس کو اللہ تعالیٰ وہ کہ نہیں جانتا ہے) مولانا فرماتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیا ۔۔۔ بے کتاب و بے معید و اوستا

(بے کتاب و بے معین واستاد کے انبیاء جیسے علوم اپنے اندر پاؤ گے)

ہماری پریشانی کا راز

اب میں ختم کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ دعا کرو کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر دین کی ضرورت سے نہیں تو تمدن ہی کی ضرورت سے ان حجتوں کو ترک کرو اس سے ہمارے اجتماع کا شیرازہ منتشر ہے جب تک آپ اس لم اور کیف کو نہ چھوڑیں گے۔ مذہب کو نہیں پکڑ سکتے اور جب تک مذہب نہ ہو گا اجتماع نہ ہو گا۔ یہی راز ہے ہماری پریشانی کا۔ اب دعا کرو خدا عمل کی توفیق دے۔

وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه

محمد وآله واصحابه اجمعين

التوکل

یہ وعظ ۴ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۴ھ بمقام جامع مسجد تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ۳ گھنٹے پندرہ منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی جس کو مولوی محمد عبداللہ گنگوہی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ م بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ . (آل عمران ۱۵۹-۱۶۰)

ترجمہ:۔ بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے۔

تمہید: یہ دو آیتیں ہیں جو اپنی خصوصیت شان نزول کے اعتبار سے ایک خاص مقصود کے

واسطے نازل ہوئی تھیں جس کا حاصل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطا معاف کرانا ہے بعض مقصرین صحابہؓ کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ میں سے بعض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے نا خوش ہو گئے تھے کہ ان سے کچھ کوتاہی جس کا حاصل کسی قدر تجاوز ہے حدود شرعیہ سے ہو گئی تھی گو صحابہ اس میں معذور تھے اس لئے کہ بقصد تجاوز ان سے وہ کوتاہی نہیں ہوئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی حق بجانب تھے اس لئے کہ گو تعمد نہ تھا لیکن تاہم غفلت تو تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم قدرے ناخوش ہو گئے تھے مگر حق تعالیٰ کی تو بڑی رحمت ہے اور نیز نظر ہے بندے کے عذروں پر بلکہ بندہ کو اپنے بعضے وہ عذر معلوم بھی نہیں جو حق تعالیٰ کو معلوم ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو اپنے نفس پر وہ رحمت نہیں ہے جو خالق تعالیٰ شانہٗ کو اس کے حال پر ہے۔

حقوق العباد بھی دراصل حقوق اللہ ہیں:

اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو معذور فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خطائیں معاف کرنے کا امر فرماتے ہیں اور ہر چند کہ وہ حقوق جن میں صحابہ سے کوتاہی ہوئی تھی حقوق اللہ ہی تھے کہ قانون کے اعتبار سے ان کے معاف کرنے کا حق تعالیٰ کو اختیار ہے اور قانون کے اعتبار سے میں نے اس لئے کہا کہ واقع کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اختیار ہے اور قانون کے اعتبار سے میں نے اس لئے کہا کہ واقع کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اختیار ہے کہ بندہ کے حقوق بھی خود ہی معاف فرما دیں اس لئے کہ وہ حقوق العباد درحقیقت اللہ ہی کے حقوق ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے مالک ہیں تو بندے کے اموال اور انفس اور عزت وآبرو کے مالک بھی وہی مالک ہیں تو جو کوئی کسی بندے کو مالی یا جسمانی ضرر پہنچائے گا تو اس نے فی الواقع اللہ کے ملک میں تصرف کیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کسی کا غلام ہو اور اس کے پاس مال ہو اتو اگر کوئی اس غلام کا وہ مال لے گا تو واقع میں اس نے اس کے مولا کی حق تلفی کی پس اس واقعیت کے لحاظ سے حقوق العباد کو حقوق اللہ کہنا صحیح ہے لیکن کیا انتہا ہے رحمت کا کہ ان حقوق اللہ کا نام حقوق العباد رکھ دیا ہے جیسے اپنے غلام یا اپنے بچہ سے اپنی کسی شے کی نسبت یہ کہیں کہ یہ شے تمہاری ہے اس کہنے سے وہ شے اس کی نہیں ہو جاتی لیکن ان کی دلجوئی کے واسطے کہتے ہیں کہ یہ شے تمہاری ہے بلکہ بچہ کو تو اگر کوئی شے ہبۃً دیدیں تو وہ بھی مالک ہو جاتا ہے اور غلام مملوک تو کسی

شے کا کسی صورت سے مالک ہی نہیں ہوتا یہی راز ہے شریعت کا کہ شارع نے غلامی کو موانع ارث سے قرار دیا ہے یعنی اگر کوئی شخص مرجائے تو ایک بیٹا جو کسی کا غلام ہے وارث چھوڑ دے تو اس کو میراث نہ ملے گی اس لئے اگر اس کو میراث ملے تو وہ مالک نہ ہوگا بلکہ اس کا مولا مالک ہو گا جو اس مورث سے اجنبی ہے تو توریث اجنبی کی لازم آوے گی اس لئے غلام کو میراث نہ ملے گی دیکھئے شریعت کا کیا عدل ہے غلام کو میراث نہیں دی اس لئے کہ وہ جب مالک ہی نہ ہوگا تو اس کی حسرت ہی حسرت ہوگی پس یہ مسئلہ بھی فرع ہے اسی کی کہ غلام کسی شے کا مالک نہیں ہوتا اور بیٹا ہبہ سے مالک ہوجاتا ہے اور اسی فرق کی وجہ سے میں نے مثال میں یہ قید لگائی تھی کہ اپنی شئے ی نسبت کہا پس بیٹے سے مثلاً جو کہا جاتا ہے کہ یہ چارپائی مثلاً تمہاری ہے یا یہ کٹورہ تمہارا ہے اس سے کیا مقصود ہوتا ہے ظاہر ہے یہ مقصود نہیں کہ تم اس کے مالک ہو محض دلجوئی مقصود ہے اسی طرح نسبت ہے حق تعالیٰ کے بعض حقوق کے ہماری نسبت ورنہ وہ بھی واقع میں ان ہی کے حقوق ہیں اس سے اندازہ کیجئے حق تعالیٰ کی محبت کا اپنے بندہ کے ساتھ ورنہ ہماری کیا شئے ہے۔

خودکشی کے حرام ہونے کا سبب:

بلکہ ہماری جان بھی ہماری نہیں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے خودکشی کو حرام فرمایا ہے اگر جان ہماری ہوتی تو ہم اس میں جس طرح چاہتے تصرف کرسکتے یہی وجہ ہے کہ جن معاصی میں دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے وہ تو ظاہر ہے کہ حرام ہیں ہی اور ان کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کی چیز میں تصرف کرے لیکن جن معاصی سے خود اپنے آپ کو ضرر پہنچتا ہے ان معاصی کا حاصل خود اپنے جوارح اور حواس میں تصرف ہے جیسے کسی کو بری نگاہ سے دیکھنا کسی نامشروع آواز کا سننا یہ بھی حرام ہے اس لئے کہ نہ کان ہمارے ہیں نہ آنکھیں ہماری ہیں سب سرکاری چیزیں ہیں جس موقع پر صرف کرنے کیلئے اجازت دی گئی ہے۔ ان ہی مواقع پر ان کو صرف کرنا چاہیے ورنہ مجرم ہوں گے الحاصل اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ ہم نہ اپنی جان کے مالک ہیں نہ مال کے مالک ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ملک ہے۔ اس پر بھی جو بعض حقوق کو حقوق العباد فرمایا تو یہ محض رحمت ہے اور پھر یہ نہیں کہ محض حقوق العباد برائے گفتن ہی فرمادیا ہو بلکہ اس پر آثار اور احکام بھی مرتب فرمائے۔

حق تعالیٰ شانہ' کی بے انتہا رحمت:

بچوں کے نام زدتو جو شے مجازاً کی جاتی ہے وہ برائے نام ہی ہے محض دلجوئی کیلئے ہی ہے آثار اور احکام اس پر ملک کے مرتب نہیں ہوتے اس لئے کہ اس کو اس شئے میں تصرف کا اختیار نہیں ہوتا مثلاً وہ کسی کو دے نہیں سکتا، کسی کے ہاتھ بیچ نہیں سکتا اور غلام کے پاس جو شئے ہے وہ اس سے بھی ضعیف درجہ میں ہے اور خدا تعالیٰ ایسے مولیٰ ہیں کہ باوجود اس کے کہ ہر شئے کے مالک حقیقی وہی ہیں مگر پھر بھی جس شئے کی نسبت فرمادیا کہ یہ تمہاری ہے تو برائے نام نہیں کیا بلکہ اس میں تصرف کا بھی اختیار دیدیا گیا ہے کہ خواہ اس شئے کو تم استعمال کرو یا کسی کو دیدو یا بیچ دو یہ سب ہمارے نزدیک معتبر ہے اگر تم کسی کو دیدوگے تو ہم بھی یہی کہیں گے کہ اب یہ شئے اس شخص کی ہوگئی کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا ایک تو دلجوئی کیلئے ہماری طرف منسوب کیا دوسرے اگر کسی کو ہم دیدیں تو اس کو نافذ قرار دیا اور اس کو معتبر قرار دیا بخلاف ماں باپ کے کہ وہ اتنی دلجوئی نہیں کرسکے اگر وہ بچہ کسی کو شئے دینے لگے تو روک دیں گے پس جب یہ ثابت ہوا کہ حقوق العباد واقع میں حقوق اللہ ہی ہیں تو اگر اس واقعیت کے اعتبار سے وہ معاف کرنے لگیں تو کرسکتے ہیں لیکن قانون شریعت کے اعتبار سے ان حقوق سے اپنا تعلق بالکل اٹھالیا اور یہ فرمادیا کہ جب تک کہ اصحاب حقوق معاف نہ کریں گے انکے حقوق کو ہم استقلالاً معاف نہ کریں گے پس اس نسبت کے باوجود اس کے ضعیف بلکہ اضعف بلکہ نہ ہونے کے جو اسقدر قوی کیا ہے تو اس میں کیا حکمت ہے پورا علم تو حکم کا حق تعالیٰ ہی کو ہے۔

قانون شریعت کی ایک حکمت:

مگر ایک حکمت اسکی مجھ جیسے نادان کی سمجھ میں بھی آتی ہے اور اس سے قدر ہوگی شریعت کی کہ شریعت کا وجود ہمارے لئے کس قدر نعمت ہے کہ اگر قانون شریعت نہ ہوتا تو زندگی گزارنا مشکل ہوجاتا تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر اشیاء کی نسبت عباد کی طرف نہ ہوتی اور یہ قانون مقرر نہ کیا جاتا تو حقیقت اور واقعیت کا مقتضا تو یہ تھا کہ کوئی شخص کسی شئے کا مالک نہ ہوتا کیونکہ واقع میں حق تعالیٰ ہی سب کے مالک ہیں۔

جائیداد کی نسبت تملیک میں حکمت:

پس اس صورت میں مثل مباحات عامہ کے ہر شخص کو اختیار ہوتا کہ جس شئے سے چاہے متمتع ہوتا میں تمہارے پاس کی چیز چھین لیتا تم میری چیزیں لے بھاگتے پس اگر اس حقیقت کا ظہور ہوتا تو تمام عالم میں فساد برپا ہو جاتا۔ ہاں اگر فنا کا سب پر غلبہ ہوتا اور سب کے سب مغلوب الحال ہوتے اور اضمحلال وجود کی حالت سب پر ہوتی تو البتہ اس صورت میں کوئی مفسدہ نہ تھا لیکن تمام عالم تو اہل حال نہیں ہے حالت تو یہ ہے کہ انانیت کے دعوے کرنے والے اور اپنے حظوظ کو پورا کرنے والے اور اپنے نفس کو دنیاوی نعم سے متمتع کرنے والے مقدار میں زیادہ ہیں تو اس حالت میں اگر اس حقیقت کا ظہور ہوتا تو روک تو کچھ ہوتی نہیں تم میری شئے چھین لیتے میں تمہاری شے لے لیتا کوئی کسی کے مکان پر قابض ہو جاتا کوئی کسی کا مال لے بھاگتا کوئی کسی کو قتل کر دیتا اور یہ کتنا بڑا مفسدہ تھا پس اس صورت میں امن کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ قانون شریعت کا جاری ہوا اور اس نسبت کی حفاظت کی جاوے کہ فلاں شئے میری ہے اور فلاں شئے زید کی اور فلاں مکان اس شخص کا اور فلاں جائداد عمرو کی ہے یہاں سے معلوم ہوگا کہ شریعت کیا چیز ہے کہ اس نے بڑے بڑے مفاسد کو روک رکھا ہے اور یہی معنے ہیں مولنا رومیؒ کے اس شعر کے

سر پنہان است اندر زیر و بم   فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(ہر نشیب و فراز میں ایک ایسا راز پنہاں ہے جس کو اگر صاف صاف کہوں تو دنیا تہہ و بالا ہو جائے)

مطلب یہ ہے کہ یہاں حقائق و اسرار میں ایک سر پنہاں ہے اگر ظاہراً اس کو بیان کردوں تو جہاں میں فساد برپا کر دوں بظاہر یہ مضمون شاعرانہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے حقائق کو بیان کیا ہے انہوں نے کونسا فساد مچا دیا ہے منصور نے انا الحق کہا تو کیا ہوا یا کوئی کلمہ توحید بیان کر دے تو عالم میں کیا تغیر ہو بہت وہ اپنی جان سے جائے بس اس کے معنی یہی ہیں کہ سر پنہاں سے مراد حقیقت و توحید کا راز ہے اور توحید کا مقتضے یہ ہے کہ کوئی وجود کوئی ہستی موجود حقیقی کے سامنے موجود اور ہست کہنے کے قابل نہیں ہے چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے **الممکنات ماشمت رائحة الوجود** اور مالک کا ہونا اور اسی

طرح تمام اضافات یہ سب ہستی کے آثار ہیں پس مولنا رومیؒ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں حقیقت کا راز بیان کردوں اور عام خیالات پر اس کا اثر ہو جاوے اور اس لئے یہ سب اضافات باطل ٹھہریں تو عالم میں فساد برپا ہو جاوے جیسا کہ مذکور ہوا اور اس کا میں سبب ہو جاؤں اس سے شریعت کی قدر کرنا چاہیے کہ اس نے کتنے بڑے فساد کو روکا ہے کہاں ہیں وہ صوفی اور کہاں وہ شاہ صاحب جو کہتے ہیں کہ شریعت کوئی چیز نہیں ایسے صوفی اور شاہ صاحب کا علاج یہ ہے کہ ان کے کپڑے اور لنگی اتاری لی جاوے اگر کچھ تعرض کریں تو کہنا چاہیے کہ صرف شرعی قانون کے اعتبار سے یہ چیزیں تمہاری ہیں اور وہ آپ کے نزدیک کوئی شئے نہیں ہے اور اس کو تم تسلیم ہی نہیں کرتے پھر کیوں تعرض کرتے ہو مولانا رومیؒ نے ایک ایسے جاہل کی حکایت لکھی ہے کہ وہ باغ میں گیا اور وہاں جا کر بے تکلف میوے توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ باغ والا آیا اور اس نے مؤاخذہ کیا کہنے لگا میں بھی خدا کا پھل بھی خدا کا درخت بھی خدا کا باغ بھی خدا لا فاعل الا اللہ لا موجود الا اللہ پھر تو کون ہوتا ہے روکنے والا اس نے کہا کہ اچھا اور نوکر سے پکار کر کہا لائیو میرا سوٹا اور رسا اور رسے سے باندھ کر خوب ٹھوکا وہ فریاد کرنے لگا کہا چلاتے کیوں ہو، ڈنڈا بھی خدا کا رسا بھی خدا کا مارنے والا بھی خدا کا اور تو بھی خدا کا پھر شکایت کے کیا معنے اس وقت تو مدعی صاحب کو ہوش آیا اور توبہ کی

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار   اختیار است اختیار است اختیار

(اس نے کہا اے عیار میں نے جبر سے توبہ کی اختیار ہے اختیار ہے اختیار)

شریعت ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت ہے:

واقعی ایسوں کا یہی علاج ہے کہ لوگوں کا مال لوٹنے کے واسطے موحد اور جبری بنے ہیں اور اپنے مال کو حفاظت سے رکھتے ہیں جیسے ایک پیشہ ور واعظ کی حکایت مشہور ہے کہ وعظ میں کہا کہ خدا کے واسطے مال خوب دینا چاہئے کوئی شئی پاس نہ رکھے وعظ کہہ کر جب گھر آئے تو دیکھا کہ بیوی ننگی بیٹھی ہے۔ ایک چھلا تک بدن پر نہیں پوچھا کہ زیور کیا ہوا کہا تم نے ہی تو وعظ میں کہا تھا کہ مال خدا کے واسطے دینا چاہئے سب فقراء کو دے آئی کہنے لگے ارے بیوقوف میں نے وعظ اس لئے نہیں کہا تھا کہ تو لوگوں کو دے آئے میں نے اس لئے کہا تھا کہ لوگ ہم کو دیں

پس جب شاہ صاحب کے کپڑے گئے اس وقت ان کو شریعت کی قدر ہوئی اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ شریعت ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت ہے کہ شریعت نے بعض چیزوں کو ہماری طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ واقع میں مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہیں تا کہ کوئی کسی کے مال پر دست برد نہ کرے اور نیز کسی کے ساتھ احسان کرنے میں دریغ نہ کرے اس لئے کہ واقع میں تو کوئی شئے ہماری ہے نہیں تو بڑی بے مروتی ہے کہ ہمارے پاس کوئی شئے زائد ہو اور ہمارے دوسرے بھائیوں کو ضرورت ہو اور ہم اسکو نہ دیں اگر چہ عدل کا مقتضی تو یہ تھا کہ سب کے پاس یکساں مقدار میں مال اسباب ہوتا لیکن اس میں بڑی بے انتظامی ہوتی اس لئے کہ ہم کو مثلاً ضرورت ہوتی خط بنوانے کے لئے نائی کی اور اس کو بلاتے تو ہر گز نہ آتا اور کہتا کہ تم ہی میرا خط بنا دو مجھ کو کیا ضرورت یا ضرورت ہوتی مثلاً معماروں کی تو کہیں نہ ملتے دھوبی بھنگی نہ ہوتے کپڑے میلے ہو جاتے اور سڑ جاتے حق تعالیٰ کی رحمت ہوئی کہ اول تو اشیاء کو ہماری طرف منسوب کیا اور پھر باہم تفاوت رکھا کسی کو عمل کا محتاج کر دیا کسی کو مال کا اس طور سے تمام عالم کا انتظام فرما دیا لیکن اصل فطرت اور حاجت پر نظر کر کے انسان کو سمجھنا چاہیے کہ میرے پاس جو زائد ہے اور یہ دوسرے حاجتمندوں کا حصہ ہے مجھ کو ان سے دریغ نہ کرنا چاہیے یہ نسبتیں تو حق تعالیٰ نے اس لئے مقرر فرما دی ہیں۔ تا کہ تمہارے مال کو کوئی زبردستی نہ لے سکے اس لئے نہیں ہیں کہ جس کی یہ نسبتیں پیدا کی ہوتی ہیں اس ہی کے حکم سے انحراف کرنے لگو اگر وہ یہ نسبت قطع کر دیں تو پھر کیا کر لو اور اگر کہو کہ اب تو جو قواعد مقرر ہو گئے ہیں ان کا کوئی منسوخ کرنے والا نہیں ہے اس لئے کہ نبوت تو ختم ہو گئی ہے۔ پھر یہ نسبتیں کیسے قطع ہو سکتی ہیں تو اس پر اگر ناز ہے تو اللہ تعالیٰ کو دوسرا طریقہ بھی آتا ہے اور وہ تکوینی طریقہ ہے باوجود حفاظت قانون نسبت کے اور وہ یہ کہ مال تمہارے پاس رہا نہ رہے لیجئے وہ نسبت یوں منقطع ہو سکتی ہے مثلاً آگ لگ کر سب متاع جل جاوے یا چور لیجاویں۔

ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا قبضہ اور تصرف تام ہے:

یاد رکھو تم ان اضافات اور نسبت کے اندر کسی طرح حقیقت کا شائبہ مت سمجھو یہ تو محض انتظام عالم کے لئے ہے ورنہ فی الواقع ہر شئے پر حق تعالیٰ کا قبضہ اور تصرف تام ہے اسی لئے ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کیلئے ہے) لفظ میراث اس لئے فرمایا کہ اگر ملک فرماتے تو شبہ ہو سکتا تھا کہ بظاہر ملک تو ہماری ہے اس لئے علی سبیل التسلیم ارشاد ہے کہ اگر مان لیا جاوے کہ تمہاری ملک ہے تو جب تم سب مرجاؤ گے پھر بتلاؤ اس وقت یہ سب چیزیں کس کی ملک ہونگی اس وقت تو سب ہماری ہیں پھر ہم سے کیوں دریغ کرتے ہو الحاصل اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کو حقوق العباد کے معاف فرمادینے کا بھی پورا حق ہے لیکن قانون میں تفصیل کردی پس اس قانون کی رو سے بھی صحابہؓ سے جو اس موقعہ پر کوتاہی ہوئی تھی کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق نہیں کہہ سکتے بلکہ خالص حق اللہ کہیں گے ہاں اس معنے کو حق الرسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ سکتے ہیں کہ احکام شریعت کی مخالفت کرنا آپ کے بتلائے ہوئے اور امر کیے ہوئے احکام کی مخالفت ہے مگر اصطلاح شرع میں اس کو حقوق الرسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا جاتا اس کے احکام جداگانہ نہیں ہیں وہی حقوق اللہ کے احکام ہیں۔

حقوق الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دو اقسام:

حاصل یہ ہے کہ حقوق الرسول کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ حق جو خود ذات رسول کی طرف راجع ہے جیسے کوئی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مال کی چوری کرلے یا ان کو کوئی اذیت پہنچائے دوسرے وہ کہ انہوں نے جو احکام الٰہی تعلیم فرمائے ہیں ان کی مخالفت کرے قسم اخیر کو حق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہنا مجازاً ہوگا اس لئے کہ وہ احکام خود رسول کے بنائے ہوئے نہیں ہاں بتائے ہوئے ہیں شارع تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہیں اور پہلی قسم حقیقۃً حق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے پس صحابہؓ کی کوتاہی قسم ثانی سے ہے جو حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا حق اور مجازاً رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے تو اس کوتاہی کو اللہ تعالیٰ خود معاف کرسکتے تھے چنانچہ کر بھی دیا چنانچہ ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ لیکن کیا انتہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کا کہ آپ سے بھی فرمائش ہے کہ ہم نے تو معاف فرمادیا آپ بھی معاف فرمادیں اگر کوئی کہے جبکہ وہ کوتاہی محض حق اللہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف بھی کردیا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معاف کرانے کے کیا معنے اور وہ کون چیز باقی رہ گئی جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی متعلق ہوگی۔ بات یہ ہے کہ ایک تو توبہ ہے دوسرے تکمیل توبہ تو حق تعالیٰ کے معاف فرمانے سے توبہ تو متحقق ہوگئی لیکن تکمیل اس توبہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاف کرنے سے ہوگی۔

گناہ کے دو اثر:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھو کہ گناہ کے دو اثر ہیں ایک آجل یعنی عذاب کا ہونا دوسرے عاجل یعنی گناہ سے قلب میں ایک ظلمت پیدا ہو جانا جو سبب ہوتا ہے آئندہ دوسرے معاصی کے صدور کا اور جب بندہ توبہ کرتا ہے تو قبولیت توبہ کے بھی دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ عذاب سے نجات ہو جاوے دوسرے یہ کہ قلب میں ظلمت اور کدورت جو گناہ سے ہوئی تھی وہ نہ رہے تو یہ محض توبہ سے نہیں جاتی بلکہ بار بار توبہ کرنے سے ندامت سے گھل جانے اور مجاہدات اور مراقبات طویلہ کرنے سے جاتی ہے ہاں توبہ بشرائطہا کرنے سے عذاب سے نجات ہو جاوے گی۔ باقی یہ کدورت اور ایک قسم کی رکاوٹ اور حجاب جو فیما بین اللہ و بین العبد پیدا ہو گیا ہے سو نفس توبہ اس کیلئے کافی نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بزرگ کے حق میں ہم سے کوتاہی ہو جاوے مثلاً ان کو ٹھوکر لگ جاوے اور پھر ان سے اس بے ادبی کو معاف کرایا اور انہوں نے معاف کر دیا لیکن اس معاف کرنے سے تسلی نہیں ہوتی بار بار کہتے ہیں کہ حضرت بڑی حماقت ہوئی بہت قصور ہوا اور وہ برابر کہہ رہے ہیں کہ میں نے معاف کر دیا تم اس قدر کیوں پریشان ہوتے ہو مگر دل ہے کہ مانتا نہیں جب بہت کہہ سن لیں گے اس وقت اطمینان ہوتا ہے جب ادنیٰ سی عظمت کا یہ اثر ہے تو حق تعالیٰ کی عظمت تو غیر محدود ہے اتنا جلدی قلب صاف ہونا مشکل ہے وہاں تو یہ حالت ہوتی ہے

بردل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

(اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاوے تو سالک کے دل میں ہزاروں غم ہوتے ہیں)

اور ایسے غم کے موقعہ پر ضرورت ہوتی ہے شیخ مبصر کی کیونکہ بعض مرتبہ اس غم مفرط میں ضرر بھی ہو جاتے ہیں۔ تو شیخ اس وقت غم کو منع کرتا ہے اگر چہ مقتضی اصل معصیت کا یہی ہے کہ بے حد غم ہونا چاہیے مگر کبھی اس سے ہلاکت اور کبھی مایوسی کا احتمال ہو جاتا ہے اس لئے شیخ تعدیل کرتا ہے۔ غرض یہ ہے وہ اثر جو بعد قبول توبہ بھی کانٹا سا کھٹکتا ہے تو اگر چہ حق تعالیٰ نے توبہ اس کی قبول فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ لیکن صحابہؓ چونکہ جان نثار تھے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کے اس لئے ان کا دل ابھی اس لئے صاف نہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مکدر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تکدر بمقتضائے بشریت تھا۔

عبد کامل:

اور اس کا ہونا خاصہ بشریت کا ہے اور یہ سراسر رحمت ہے اس لئے کہ اگر اس قسم کا تکدر و نیز دوسرے خواص بشریہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت نہ ہوتے اور ہم کو آپ کی بشریت کے اعتقاد کا مکلف نہ بنایا جاتا تو بدون اس کے ہماری توحید کامل نہ ہوتی افسوس ہے کہ ہمارے زمانہ کے بعض لوگ اسکی نفی کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو درجہ الوہیت تک پہنچاتے ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس ایک استفتا آیا تھا اس میں سائل نے یہ پوچھا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا بھی کھاتے تھے ایک شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم والدہ شریفہ کے بطن سے ایسے پیدا ہوئے تھے جیسے اور بچے پیدا ہوتے ہیں یا ران سے پیدا ہوئے ہیں غرض یوں چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر الوہیت ثابت کردیں۔ لیکن یہ کتنی ہی کوشش کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم الوہیت کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے اور اگر بالفرض پہنچیں بھی تو کیسے الٰہ ہوں گے ظاہر ہے کہ الٰہ ناقص ہوں گے۔ رسالت کا حق ان لوگوں نے اچھا ادا کیا کہ آپ کے اندر نقص ثابت کیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ عبد تھے لیکن عبد کامل تھے بالکل عقل مسخ ہوگئی ہے اور پھر اس کو محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں عبدیت کا اعتقاد سراسر رحمت ہے اور ایکی بشریت و عبدیت کے آثار سے یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ان حضرات کی طرف سے ایک قسم کی طبعاً کدورت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کدورت سے ان حضرات کے قلوب پر بھی تکدر کا اثر تھا اور ایسا تکدر اگرچہ حالاً مضر نہیں ہے لیکن احیاناً سبب بعد کا ہو جاتا ہے اس لئے کہ جب اس کا اثر زیادہ بڑھتا ہے تو قلب ضعیف ہو کر تعطل کی نوبت آجاتی ہے شیطان کہتا ہے کہ تیرا کوئی عمل قبول تو ہے نہیں پھر کیوں بے فائدہ مشقت اٹھاتا ہے۔

تکدر کا خاصہ:

اور راز اس کا یہ ہے کہ عمل کے اندر بشاشت قلب کی معین ہے اور تکدر کا خاصہ ہے کہ قلب میں بشاشت نہیں رہتی ہے اور بشاشت ہی معین و محرک تھی جب وہ جاتی رہی تو نرا اعتقاد رہ گیا اب عمل کے اندر اس شخص کو بڑا بھاری مجاہدہ کرنا پڑتا ہے جس پر دوام دشوار ہے

پس اگر یہ کدورت بڑھی اور اس کو استقرار ہو گیا تو رفتہ رفتہ اعمال چھوٹ جاتے ہیں اور جو ہمت کر کے اس حالت میں بھی عمل کرتے ہی رہے تو یا تو وہ بشاشت عود کر آتی ہے اور اگر اس نے عود نہ کیا تو یہ ہمت زیادہ نہیں چلتی اعمال رخصت ہو جاتے ہیں غرض اس کدورت وانقباض کے ہوتے ہوئے دوام علی العمل سخت دشوار ہے بھلا اور کوئی تو کس شمار میں ہے۔

صبر موجب بسط بنتا ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون مستقل مزاج ہوگا تین سال تک جو قبض رہا یعنی وحی منقطع ہو گئی اس مدت کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کلفت آئی کہ کئی مرتبہ ارادہ فرمایا کہ پہاڑ سے گر کر جان دے دوں لیکن جب ایسا ارادہ فرماتے جبرائیلؑ ظاہر ہوتے اور تسلی فرماتے کہ آپ نبی ہیں آپ سے حق تعالیٰ کو بہت کام لینا ہے آپ ایسا ارادہ نہ فرماویں تین سال کے بعد وحی نازل ہوئی اور قلب مبارک سے یہ بوجھ زائل ہوا جسکی نسبت ارشاد ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ (کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی)

وزر سے یہی حالت مراد ہے نہ کہ گناہ پس جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کوہ وقار و استقلال بھی اس کے متحمل نہیں ہوئے تو اور تو کیا کسی کا منہ ہے جو اس کے تحمل کا دعویٰ کرے مگر ایسی حالت میں شیوخ کی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ صبر کرو اور یہ جواب محض ٹالنے کے لئے نہیں ہے بلکہ راز اس میں یہ ہے کہ صبر کرنا سبب ہو جاتا ہے بسط کا مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں   تازہ باش وچیں میفگن بر جبیں

(جب تیری روح میں انقباض پیدا ہو جائے تو اس کے اندر بھی کشادگی تلاش کر تازہ رہ اور اپنی پیشانی پر شکن مت ڈال)

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو   آں صلاح تست آتش دل مشو

(اے راہ رو جو تجھکو انقباض ہو تو وہ تیری بہتری کیلئے ہو اس پر چراغ پا ہونیکی ضرورت نہیں)

دوسرے بزرگ اس کے بعد بسط کی بشارت دیکر تسلی کرتے ہیں ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور　　کلبہ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

(کھویا ہوا یوسف ایک روز کنعان واپس آجائے گا غم مت کرو اور تیرا غم کا جھونپڑا گلستان بن جائے گا)

یوسف گم گشتہ سے مراد بسط ہے جو قبض آنے سے مفقود ہو گیا ہے ایک اور بزرگ کہتے ہیں۔

اگر چہ دور افتادم بایں امید خورسندم　　کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اگر چہ میں دور ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا ہاتھ دوبارہ پکڑے)

بہر حال یا تو بسط ہو اور امید بسط کی ہو تو عمل پر استقامت کر سکتا ہے اور اگر دونوں نہ ہوں تو قلب ضعیف ہونا شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ چھوٹ جاتا ہے غرض بعض اوقات اس تکدر سے یہ ضرور ہوتا ہے۔

تفسیر آیت تلاوت کردہ:

اس لئے باری عزاسمہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اس سے بھی پاک ہو جاویں اور یہ کیفیت ان میں نہ رہے اس لئے ارشاد ہے کہ آپ بھی معاف فرماویں پس فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ اس کی تمہید ہے اور فَاعْفُ عَنْهُمْ مقصود ہے سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اسی پر اقتصار نہیں فرمایا آگے اس کے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ بڑھایا یعنی آپ ہی معاف فرما دیجئے اور ہم سے بھی درخواست کیجئے کہ ہم معاف کر دیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی معاف فرما دیا تھا تو وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اب تحصیل حاصل ہے بات یہ ہے کہ وہ معافی تو قانونی ہے اس کا اثر تو یہ ہے کہ عذاب سے نجات ہو جاوے گی اب دوسری قسم جو معافی کی ہے یعنی دفع کدورت جس کا سبب فَاعْفُ عَنْهُمْ ہو گا لیکن سبب کا وجود تو وجود مسبب کے لئے علت تامہ نہیں یعنی آپ کے معاف کر دینے سے بدون حق تعالیٰ کے تصرف کے رفع کدورت تو ضروری نہیں کیونکہ وہ آپ کے اختیار میں تو نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا امر فرمایا یعنی مغفرت کی قسم دوم کے وجود کی ہم سے درخواست کیجئے اور یہاں تک دونوں قسمیں متحقق ہو گئیں لیکن اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ حالت اصلی انشراح کی لوٹ آئی مگر یہاں اور چیز کی بھی ضرورت ہے وہ کیا یعنی اس انشراح کی ترقی کیونکہ اعمال میں آیندہ کو

ترقی موقوف ہے۔زیادہ انشراح پر پس رحمت پر رحمت اور نعمت پر نعمت حق تعالیٰ کی دیکھئے کہ آگے اس کی تدبیر بھی ارشاد فرماتے ہیں تا کہ ہماری یہ مقبول جماعت کسی پہلو سے ناقص نہ رہے چنانچہ فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی ان سے کام میں مشورہ بھی کیجئے کہ اس سے ان کا انشراح ترقی پذیر ہو کر وسیلہ ترقی مراتب کا ہوگا اس لئے کہ مشورہ کے اندر جو مصلحتیں خاص نفس مشورہ کے اعتبار سے ہیں ان کے علاوہ ایک اور عجیب خاصہ ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ مشورہ کس سے لیا کرتے ہیں مشورہ اس شخص سے لیا کرتے ہیں کہ جس میں دو وصف پائے جاویں اول تو اس پر پورا وثوق اور نہایت اطمینان اور اعتماد ہو اور اس کو اپنا خیر خواہ اور اس سے خصوصیت سمجھی جاوے دوسرے جس امر میں مشورہ کیا جاوے اس کے اندر وہ صاحب بصیرت ہو اسی واسطے بعض مرتبہ بھائی سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ دوست سے کرتے ہیں۔غرض مشورہ ہر شخص سے نہیں لیا جاتا پس جس شخص سے مشورہ لیا جاوے گا تو اس کو پہلے سے اور زیادہ تعلق بڑھ جاویگا اس لئے کہ وہ اس سے استدلال کرے گا کہ ہماری بات پر اس کو پورا اطمینان ہے ہماری دیانت پر اس کو اعتماد ہے اور ہم کو اس قابل سمجھتا ہے کہ ہم سے امر خاص میں مشورہ لیا جاوے اس سے دل بڑھ جاوے گا اور دل کے بڑھ جانے کو بڑا دخل ہے اعمال صالحہ کی ترقی میں پس یہ راز ہے اس کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرمایا کہ ان سے مشورہ لیجئے تا کہ وہ انشراح ان کا اور زیادہ بڑا ہو کر سبب ہو جاوے اعمال صالحہ کے اندر ترقی کا جو سبب ہے قرب کا یہاں سے۔

شیخ کامل مربی کی پہچان:

یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ کامل مربی وہ ہے جو طالب کے دل کو بڑھاتا رہے اور دلجوئی اور تسلی کرتا رہے اس بارہ میں تو ہم نے اپنے حضرت مرشد علیہ الرحمۃ کو دیکھا ہے کہ رحمت کے مجسمہ تھے ہر شخص کی تسلی کرتے تھے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ کسی کو دل شکستہ کیا ہو اسی واسطے جو نفع اور جگہ برسوں میں ہوتا تھا وہ وہاں لحوں اور منٹوں میں ہوتا تھا ایسے ہی شیخ کی نسبت حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است　　زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

(میں پیر میخانہ کا غلام ہوں کیونکہ اسکی مہربانی ہمیشہ ہے اور شیخ اور زاہد کی مہربانی کبھی ہے کبھی نہیں ہے)

یعنی ہم تو اس کے غلام ہیں جس کا لطف دائمی ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی وقت عتاب نہیں کرتے امر ناجائز اور خلاف شرع پر عتاب بھی ضرور فرماتے ہیں مگر واللہ ان کے عتاب میں بھی لطف ہوتا ہے۔

شیخ کے جذب کا اثر:

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ شیوخ جو کبھی کبھی اپنے خدام سے ناراض ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ نکال بھی دیتے ہیں تو زبان سے تو ناراض ہوتے ہیں لیکن دل سے کشش کیا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نکالنے سے وہ جاتا نہیں اور معذرت کرتا ہے اور معافی چاہتا ہے ان کے ہی جذب کا اثر ہے پس اکثر محبت اول شیخ کو ہی ہوتی ہے ورنہ ان کی نفرت کی صورت میں دوسرے کا انجذاب عادتاً مستبعد ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

نفرت فرعون تو میدان از کلیم (فرعون کی نفرت تو موسیٰ سے سمجھ)

(یعنی فرعون جو موسیٰ پر ایمان نہیں لایا اور ان سے عداوت رکھتا تھا اس کی وجہ یہ نہیں کہ موسیٰ چاہتے تھے کہ ایمان لے آوے اور فرعون انکار کرتا تھا بلکہ خود موسیٰ کو ہی اس سے نفرت تھی فرعون کو ان کا قلب دفع کرتا تھا اور اگر ان کے قلب میں کشش ہوتی تو بعادت غالبہ فرعون کی مجال نہ تھی کہ وہ منجذب نہ ہو لیکن حق تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ ایمان لاوے اس لئے اس کے اسباب جمع کر دیئے اور موسیٰ کے قلب کو اس کی طرف سے سخت کر دیا یہ بھی اسباب حرمان سے ہوگیا اور عادت غالبہ اور اکثر اس لئے کہا گیا کہ کبھی اس میں تخلف بھی ہوتا ہے تاکہ حق تعالیٰ اپنی مشیت کا اثر دکھلادیں جیسا ابوطالب کے لئے ارشاد ہے اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کرسکتے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے) اور اس عادت غالبہ پر مبنی کرسکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کیلئے چاہتے تھے کہ ایمان لے آویں اللہ تعالیٰ نے اس تقاضا کے آپ کو قلب سے دفع فرمایا کہ آپ کا تقاضا اسباب انجذاب سے ہوتا تو اس سبب کو مرتفع فرمادیا چنانچہ ارشاد ہے لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ (آپ ان پر مسلط نہیں ہیں) دوسری جگہ فرماتے ہیں لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ ایک اور مقام پر خطاب ہے

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بہت زیادہ توجہ اس جانب تھی کہ آپ کو شب وروز اس کا غم رہتا تھا۔ اس کو ان خطابات سے ہلکا کیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کشش وجذب قلب کو گھٹایا گیا ہے رہی بات یہ کہ ایسا کیوں کیا گیا اگر آپ کے جذب کو کم نہ کیا جاتا اور سب ایمان لے آتے تو کیا حرج تھا بلکہ دین کی ترقی زیادہ تھی۔

دنیا میں کفر کا وجود بھی حکمت خداوندی ہے

بات یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی حکمت کا مقتضا ہے کہ عالم میں کفر کا رہنا بھی ضرور ہے اسی کی نسبت حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر است　　　آتش کرابسوزد گر بولہب نباشد

(عشق کے کارخانے میں کفر بھی ناگزیر ہے کیونکہ آگ کس کو جلائے گی اگر ابولہب نہ ہو)

اگر کوئی کہے کہ اگر آگ ابولہب کو نہ جلاتی تو کیا حرج ہے جواب یہ ہے کہ راز دان حقائق نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جمیل ہیں اور جمال کی سبب ہر اسم مقتضی ظہور کو ہے اور ان ہی اسماء میں سے منتقم بھی ہے وہی ظہور کو چاہتا ہے اور اس کے ظہور کی یہی صورت ہے کہ دنیا میں کفر ومعصیت کرنے والے بھی ہوں تا کہ وہ دوزخ میں جاویں علیٰ ہذا غفور بھی نام پاک باری تعالیٰ کا ہے اس کے ظہور کا مقتضے یہ ہے کہ معاصی کا وجود بھی عالم میں ہو (لیکن اس سے کوئی شخص معصیت وکفر کے ارتکاب سے معذور نہ قرار دیا جاوے گا اس لئے کہ رضا اور شے ہے اور مشیت دوسری چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سب کچھ تعالیٰ کی مشیت اور تخلیق سے ہوتا ہے لیکن رضا کا تعلق ایمان اور اعمال صالحہ سے ہے اور ہم کو خیر وشر دونوں راہ بتا دیئے گئے ہیں پس جس راہ کو ہم اختیار کریں گے اس کے خواص ولوازم آثار اس پر مرتب ہوں گے ۱۲ جامع)

پس جبکہ تکوینا کفر اور کفار کے وجود کی ضرورت ثابت ہوئی پس اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے فکر فرما دیا گیا اور آپ کے قلب سے ان کی طرف میلان کو کم کر دیا گیا ورنہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کشش رہتی تو بعادت غالبہ ضرور ایمان لے آتے اس لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر شیخ کشش نہ کرے تو مرید آ نہیں سکتا۔ ؎

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود　　　تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود

(عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے جب تک شمع نہ جلائے پروانہ اس کا عاشق نہیں ہوتا۔

دوسرے بزرگ کا قول ہے ؎

اگر از جانب معشوق نباشد کششے — طالب عاشق بیچارہ بجائے نرسد

(اگر معشوق کی طرف سے کشش نہ ہو تو عاشق کبھی معشوق تک نہیں پہنچ سکتا)

پس چونکہ شیوخ اور مربین کشش کرتے ہیں اس لئے ان کے عتاب میں بھی لطف ہوتا ہے چنانچہ غصہ ہو رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اتنا نہ ہو سکا کہ معذرت ہی کر لو پس ایسے مشائخ کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دایم ست — زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

(میں پیر میخانہ کا غلام ہوں جس کی عنایت پیہم ہوتی ہے نہ کہ شیخ اور زاہد کا) غلام جس کی عنایت کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں)

پس شیخ کی طرف سے اگر کشش ہو تو مرید خواہ زیادہ مجاہدہ بھی نہ کرے بہت جلد عروج ہوتا ہے اور ترقیات محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں بفضلہ تعالیٰ یہ بات ہے کہ مجاہدہ ریاضت زیادہ نہیں کراتے اور نفع اس قدر ہوتا ہے کہ دوسری جگہ برسوں کے مجاہدہ میں نہیں ہوتا خیر یہ سب امور وجدانی ہیں من لم یذق لم یدر کسی نے خوب کہا ہے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست — گفتم کہ چو ماشوے بدانی

(ایک شخص نے پوچھا کہ عاشقی کیا ہوتی ہے میں نے جواب دیا کہ جب تو ہماری طرح ہو جائے گا تو پتہ چل جائے گا)

مشورہ دلجوئی کا سب سے بڑا سبب ہے

مجھے تو اس مقام پر صرف اس قدر بیان کرنا ہے کہ تسلی شیخ کو بڑا دخل ہوتا ہے ترقی باطن میں اور دلجوئی اور تسلی کا سب سے بڑھ کر طریقہ مشورہ ہے چنانچہ کسی شاگرد یا مرید کی اگر دعوت کر دو یا کوئی شے دیدو مگر کسی شے سے وہ اس قدر استدلال عنایت و مہربانی پر نہیں کر سکتا جس قدر کہ اس سے کر سکتا ہے کہ اس کو بلا کر کہہ دو کہ ہم کو تم سے ایک صلاح کرنا ہے سنتے ہی

اس کا دل ہاتھوں بڑھ جائے گا کہ ہم کو انہوں نے اپنا مخصوص سمجھا ہے اور ہم آج سے وزیر بن گئے ہیں میرے نزدیک تو کوئی شے تسلی کے اندر اس قدر دخیل نہیں جس قدر کہ صلاح لینا ہے جس کی دلجوئی کرنا ہو سیدھی بات ہے کہ بلا کر یہ کہہ دو کہ ہم کو تم سے کچھ صلاح کرنا ہے فوراً اس کو خیال ہوگا یہ ہم سے بہت خوش ہیں ورنہ اگر ناراض ہوتے تو مشورہ کیوں لیتے اس لئے ارشاد ہوا کہ **وشاورھم فی الامر** لوگ آج کے تمدن کو گاتے پھرتے ہیں۔

تمدن قرآن سے سیکھو

قرآن سے کوئی سیکھ لے کہ تمدن کیا شے ہے اور اس کی تحصیل کا کیا طریقہ ہے لیکن قرآن مجید کا لطف صدر انشس بازغہ پڑھنے والے کو نہیں آسکتا۔ قرآن میں لطف اس کو آوے گا جس کی نظر واقعات پر ہو اور اس میں غور کرنے کی عادت ہو اس کو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ہم کو معاش و معاد کے وہ طریقے سکھائے ہیں کہ ہماری بہبودی کا انحصار ان ہی طرق میں ہے اور اس سے اگر ذرہ برابر بھی تجاوز ہوگا تو دنیوی اور دینی مصائب کا سامنا ہے واللہ اس کی ہر تعلیم میں ایسی دلکشی ہے کہ طبع سلیم ہو تو بے اختیار دل کھینچتا ہے۔

زفرق تابقدم ہرکجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(پیشانی سے پیر تک جہاں بھی دیکھتا ہوں کرشمہ اور رعنائی دامن دل کھینچتی ہے کہ سب سے زیادہ پرکشش جگہ یہی ہے)

اس کا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے جیسے بعض محبوبوں میں ایسی دلربائی ہوتی ہے کہ ان کی ہر ادا دلربا ہوتی ہے اور ہر بات ان کی پیاری معلوم ہوتی ہے حتی کہ رونا بھی تو پیارا نظر آتا ہے اسی طرح قرآن و حدیث کی تعلیم ہے چنانچہ اس آیت میں تمدن کی ایسی بے نظیر تعلیم فرمائی گئی ہے کہ اگر ارسطو اور افلاطون اور تمام حکماء بھی جمع ہو کر سوچتے تو یہاں تک رسائی نہ ہوتی۔

دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے قریب چھپنا مسنون ہے

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو قرآن و حدیث سے تمدن اور اخلاق تعلیم کے استنباط کا بڑا ملکہ تھا۔ ایک روز فرمایا کہ دیکھو حدیث سے ایک قاعدہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی

شخص کسی کے شر سے بھاگے اور یہ چاہے کہ میں ہاتھ نہ آؤں تو بہت دور نہ جاوے نزدیک ہی کہیں چھپ جاوے اس لئے کہ ڈھونڈ جب پڑتی ہے تو دور دور تو دیکھنے جاتے ہیں اور پاس کوئی نہیں دیکھتا اور اس قاعدہ کو ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے سمجھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو مکہ معظمہ سے تشریف لے گئے ہیں تو تین میل پر جا کر غار ثور میں چھپے ہیں حالانکہ تمام عالم دشمن اور اونٹنیاں ایسی تیز موجود کہ اگر دھاوا فرماتے تو کم سے کم مدینہ طیبہ کی آدھی منزل پر تو قیام فرماتے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون دانشمند ہوگا آپ تین میل جا کر چھپ گئے لوگوں نے دور دور ڈھونڈا اور قریب کسی نے نہ ڈھونڈا اور جب لاچار ہو گئے تو ایک قائف کو لائے اس زمانہ میں قیافہ شناس غضب تھے اس قائف نے غار ثور پر لا کر کھڑا کر دیا کہ اس سے آگے نہیں گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جن سے حضرات شیعہ بہت خفا ہیں بلکہ اس میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے کہ جن حضرات کی خاطر یہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے خفا ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں یہ لوگ ان سے ناراض ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس واسطے کہ انہوں نے اسکا حق کیوں نہ دیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس واسطے کہ انہوں نے اپنا حق کیوں نہ وصول کیا۔ ایک جاہل متعصب شیعی کی حکایت ظرافت آمیز یاد آ گئی کہ نماز کے واسطے سنیوں کی مسجد میں گیا وہاں لکھا دیکھا۔

چراغ مسجد ومحراب منبر ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وحیدر

دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہ ہم تو تمہارے واسطے جان کھپاتے پھرتے ہیں اور تم کو جب دیکھتے ہیں ان ہی کے ساتھ بیٹھا دیکھتے ہیں اور غصہ میں چھری لے کر چڑھ گیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسم مبارک چھری سے چھیل دیا گویا اپنے نزدیک ان کو وہاں سے علیحدہ کر دیا خدا بچاوے جہل سے ایسی محبت سے بھی خدا محفوظ رکھے اور ایسی عداوت سے بھی مامون رکھے غرض ایسے وقت بھی حضرت صدیق اکبرؓ نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا کوئی ان سے پوچھے کہ اگر ابوبکرؓ دشمن تھے تو کیا ایسے وقت دشمن کو ساتھ رکھا کرتے ہیں القصہ جب وہ لوگ غار پر آئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو دیکھا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ اپنے قدموں کو دیکھیں تو ہمکو پالیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا حضرات شیعہ میں ایک شخص اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ مطلب اس کا

یہ ہے کہ شور وغل مت کرو اول تو حزن کے معنے شور وغل کے نہیں دوسرے آگے اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کے کیا معنے ہوں گے یہ توجیہ تو جب صحیح ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کو بھی (نعوذ باللہ) دشمن قرار دیں اور معنے یہ کئے جاویں کہ شور وغل مت کرو اللہ میاں ہمارے ساتھ ہیں وہ سن لیں گے سبحان اللہ کیا اچھا حق ادا کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن گردانا الحاصل ان لوگوں نے ادھر ادھر تلاش کیا ادھر حق تعالیٰ کی یہ قدرت ظاہر ہوئی کہ اسی وقت غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا اور کبوتر نے انڈے دیئے۔ انہوں نے قائف سے کہا کہ تو احمق ہوا ہے اس غار میں تو کسی طرح جا نہیں سکتے اس لئے اس کے منہ پر مکڑی کا جالا ہے اور کبوتر نے انڈے دے رکھے ہیں کبوتر وحشی جانور ہے یہ انڈے بچے ویرانہ میں دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو مجنون ہے قائف نے کہا کہ کچھ کہو واللہ آگے نہیں بڑھے حق تعالیٰ نے عقلوں پر ان کی ایسا پردہ ڈال دیا کہ اتنا سننے کے بعد بھی اتنا نہ ہوا کہ علی سبیل الاحتمال ہی غار کے اندر دیکھ لیتے اگرچہ احتمال بعید تھا لیکن جو شخص کسی شئے کو تلاش کیا کرتا ہے تو ایسی ایسی جگہ بھی دیکھتا ہے جس میں بالکل احتمال نہ ہو سکے جیسے کسی بنئے کی تھالی کھو گئی تھی تو اس نے سب جگہ دیکھا حتیٰ کہ گڑھے کے اندر شاید اس میں نہ ہو حالانکہ اس میں کسی درجہ بھی احتمال نہ تھا تو احتیاطاً غار میں بھی دیکھ لیتے لیکن عقل اور وہم اور خیال سب قوتیں حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں جس طرف چاہیں ان کو پھیر دیں۔ دیکھ بھال کر چلے گئے غرض اس قصہ سے یہ نکلا اگر چھپنا ہو تو قریب جگہ چھپنا چاہیے۔

انبیاء اور اولیاء کی ایک شان:

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاءؑ بھولے بھالے نہیں ہوتے عقل کامل ان کو عطا ہوتی ہے اور بعض بزرگوں کی نسبت جو بھولے ہونے کو صفت کمال شمار کیا جاتا ہے تو یہ صفت ان بزرگوں کی ہے جن کے متعلق ارشاد اور تربیت نہیں ہے اور جن حضرات کو ارشاد اور تربیت اور ہدایت کا کام سپرد ہوتا ہے وہ بھولے نہیں ہوتے وہ سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار ہوتے ہیں انبیا کی بھی یہی شان تھی کہ بڑے عاقل ہوتے تھے۔ کوئی شخص ان کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

بعض بھولے بزرگوں کی حکایات:

اور جو بزرگ یکسو ہیں اور ہدایت ان کے سپرد نہیں وہ البتہ بھولے ہوتے ہیں، چنانچہ

ہمارے دوستوں میں ایک شخص تھے بہت بھولے تھے اور فطرۃً ایسے ہی تھے ان سے کسی نے کہہ دیا کہ جب کنکوا اڑاؤ گے جب نجات ہوگی ورنہ نہ ہوگی بیچارے کنکوا اڑانے کیلئے تیار ہوگئے۔ ایک اور بزرگ تھے ان کو کسی نے کہہ دیا کہ ڈھول گلے میں ڈال کر بجاتے پھرو تو نجات ہوگی چنانچہ مستعد ہوئے اور ان کنکوے والے کی ایک اور حکایت ہے کہ ایک عورت جارہی تھی کسی ظریف نے کہا کہ میاں صاحب دیکھتے ہو اس کے سینے پر دوا بھری ہوئی کیا چیزیں ہیں اس کے پھوڑے ہورہے ہیں جب تک تم ہاتھ نہ پھیرو گے تو اچھے نہ ہوں گے بہتر ہے کہ ہاتھ پھیر دو کسی کو تم سے نفع ہو تو کیا حرج ہے ورنہ قیامت میں پکڑ ہوگی کہ ایک شخص تمہارے سبب تندرست ہوجاتا مگر تم نے بخل کیا بیچارے ہاتھ پھیرنے کو مستعد ہوگئے۔ دوسرے شخص نے اس مشورہ دینے والے کو دھمکایا کہ میاں کیوں ان کو پٹواتے ہو۔ ایک اور حکایت ان کی یاد آئی ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی میں نے پوچھا تمہاری بی بی عورت ہے یا مرد کہنے لگے تھے پھن رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہے آج کل لوگ ایسے لوگوں کو بہت بزرگ جانتے ہیں اور جو عاقل ہیں ان کو سمجھتے ہیں۔ کہ یہ تو ایسے ہی ہیں جیسے ہم ہیں غرض بھولے بھالوں کی بزرگی کا انکار نہیں لیکن یہ حکایتیں ان بزرگوں کی ہیں جن کے متعلق خلق اللہ کی ہدایت نہیں ہے اور جو ورثۃ الانبیاء ہیں وہ کامل العقل اور تام الفہم ہوتے ہیں کسی کی مجال نہیں کہ ان کو دھوکا دے سکے۔

شان فاروق اعظمؓ:

حضرت عمرؓ نے قیصر روم کے پاس قاصد بھیجا تھا قیصر نے پوچھا تمہارا خلیفہ کیسا ہے اس قاصد نے کیا جامع مختصر جواب دیا ہے یہ کہا کہ ہمارے خلیفہ کی شان یہ ہے لا یخدع ولا یخدع یعنی نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے اور نہ کسی دوسرے کے دھوکے میں آتا ہے ہرقل سنکر متحیر رہ گیا اور اپنے لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی تائید اس کے ساتھ ہے اس لئے کہ دھوکہ نہ دینے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین اس کا کامل ہے اور دھوکہ نہ کھانا یہ علامت ہے عقل کے کامل ہونے کی پس جس شخص کے اندر یہ دونوں صفتیں ہوں اس پر ہم غالب نہیں آسکتے اس کا ارادہ ایمان لانے کا تھا لیکن قوم نے مخالفت کی اس لئے رہ گیا ایک اور قصہ حضرت عمرؓ کا ہے کہ ایک مرتبہ اونٹ تقسیم فرمارہے تھے اور دو دو آدمیوں کو ایک ایک اونٹ دے رہے تھے ایک اعرابی آیا اور اس نے عرض کیا یا امیر المومنین احملني وسحيما علي

بعیر واحد یعنی مجکو اور تحیم کو ایک اونٹ دیجئے تحیم آدمی کا نام زیادہ ہوتا تھا اور مشک کو بھی کہتے ہیں مگر اس کے معنے میں مشہور نہیں تو بظاہر وہ دھوکہ سے چاہتا تھا کہ مجھ کو ایک اونٹ سالم مل جاوے اور یہ سخت تھا غریب لیکن حضرت عمرؓ فوراً سمجھ گئے اور فرمایا میں تجھ کو قسم دیتا ہوں سچ بتلاؤ تحیم سے مراد مشک ہے۔اس نے عرض کیا یا امیر المومنین مشک ہی مراد ہے۔فرمایا ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہو غرض حضرت عمرؓ بھی کسی کے دھوکہ میں نہیں آئے اہل ارشاد کی یہی شان ہوتی ہے پس انبیاؑ بھولے بھالے نہیں ہوئے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیدار مغزی اور کمال عقل اس قصہ سے سمجھی گئی کہ ایسے تشویش کے وقت اس قدر قریب جا کر چھپے غرض ہم کو حق تعالیٰ نے ایسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائے ہیں کہ اخروی فلاح تو ان کے اتباع میں منحصر ہے ہی دنیوی کامیابی بھی ان کی اطاعت کے ساتھ وابستہ ہے کسی نے خوب کہا ہے

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(یوسف کا حسن،عیسیٰ کی پھونک اور موسیٰ کا ید بیضا تیرے پاس ہے جو کچھ معشوق فرداً فرداً رکھتے تھے تو تنہا رکھتا ہے)

اور دوسرا شعر کہتا ہے

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

الحاصل قرآن مجید کی تعلیم سے معلوم ہوا کہ مشورہ دلجوئی کا بڑا سبب ہے یہ تمام تر تقریر اس آیت کی شان نزول میں تھی میرا ارادہ اس قدر تطویل کا نہ تھا لیکن اتفاق سے بیان طویل ہو گیا مگر بہت سی کام کی باتیں اس سے معلوم ہو گئیں باقی مجھ کو اس وقت اصل مقصود آیت وشاورھم فی الامر (ان سے کام میں مشورہ لیجئے) سے ایک کوتاہی اور غلطی کا بیان کرنا ہے اگرچہ وہ کوتاہی کوئی بڑی معصیت نہیں ہے تاہم غلطی ضرور ہے اور اس میں عوام تو کیا خواص بلکہ اخص الخواص مبتلا ہیں وہ مضمون میرے ذہن میں اولاً آیا اس کے بعد دل چاہا کہ کسی آیت میں بھی یہ مضمون مل جاوے۔

اسباب کو مؤثر حقیقی سمجھنا کفر ہے

دفعتہً یہ آیت ذہن میں آئی اس میں جو غور کیا تو وہ مضمون بہت صاف اور واضح نکلا اول وہ غلطی سنئے وہ غلطی ہے توکل کے متعلق شرح اس کی یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں بہت سے متوکل عملاً بھی ہیں اور یوں علماً اور اعتقاداً تو سب ہی مسلمان متوکل ہیں یعنی اس بات کا اعتقاد

ہر مسلمان کو ہے کہ جو کچھ عالم میں ہوتا ہے وہ موثر حقیقی کی طرف سے ہوتا ہے اور اسباب کا تعلق مسببات سے محض ظاہری تعلق ہے کوئی مسلمان بھی اس اعتقاد سے خالی نہیں ہے اور اگر خالی ہو تو وہ مسلمان نہیں کافر ہے چنانچہ افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض نام کے مسلمان ایسے بھی ہیں کہ اسباب کو موثر حقیقی جانتے ہیں سو یہ لوگ نام کے مسلمان ہیں۔

احمقوں اور ملحدوں کی چند حکایات:

ایک صاحب تھے جو بڑے معزز مشہور ہیں اور اعلیٰ طبقہ میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کی نسبت سنا ہے کہ ایک شخص نے ان کے سامنے کسی امر کے بارہ میں یہ کہا خدا چاہے گا تو اس معاملہ میں کامیابی ہوگی کہنے لگے کہ اس میں خدا کے چاہنے کی کیا بات ہے ہم تدبیر کرتے ہیں تدبیر سے یہ کام ہو جاوے گا عقل تو مسخ ہو ہی گئی تھی مگر بات بھی برت گئی باوجود صاحب زبان ہونے کے بات بھی کرتے ہیں تو غلط بولنے والے انگریزوں کی طرح سے اور خیر بات کا تو کچھ نہیں مگر عقائد کفریہ سے تو بچنا چاہئے لیکن ان کا اسلام کچھ ایسا مضبوط ہے کہ کفر و شرک کرلو جب بھی نہیں جاتا صاحبو اسلام تو ایسے ناز اور دماغ کا ہے کہ اس کا ذرا اعراض کرو تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اس حکایت مذکورہ کے مناسب ایک اور لطیفہ یاد آیا ایک احمق چلا جا رہا تھا کسی نے پوچھا کہاں جا رہے ہو کہا بازار جاتا ہوں گدھا خریدوں گا اس نے کہا انشاء اللہ کہہ لو کہنے لگا روپیہ میری جیب میں ہے گدھا بازار میں پھر انشاء اللہ کہنے کا کیا موقع ہے آگے گیا تو کسی نے جیب کتر لی اور روپیہ اڑا لیا اپنا سا منہ لے کر واپس آئے پھر وہ شخص ملا پوچھا کہاں سے آرہے ہو کہا میں بازار گیا انشاء اللہ اور میرا روپیہ چوری ہو گیا انشاء اللہ اور گدھا میں نے نہیں خریدا انشاء اللہ اور اب میں مفلس ہوں انشاء اللہ اب اس کو انشاء اللہ کا ایسا سبق یاد ہوا کہ واقع میں جو موقع انشاء اللہ کا نہ تھا اس میں بھی انشاء اللہ داخل کر دیا ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہ تو احمقوں اور ملحدوں کی حکایتیں ہیں لیکن مسلمان کوئی ایسا نہیں ہے جو علماً و اعتقاداً اس کا قائل نہ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے چاہنے سے ہوتا ہے۔

جن اسباب کا ترک کرنا حرام ہے:

مگر گفتگو اس توکل میں نہیں ہے بلکہ گفتگو توکل خاص میں ہے جو بمعنے ترک اسباب ہے

اور ترک اسباب مطلقاً مراد نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ جو اسباب ایسے ہیں کہ عادتا مسبب اسی پر مرتب ہوتا ہے ایسے اسباب کو ترک کرنا حرام ہے ہاں اس کی تقلیل کر دے جیسے کھانا پیٹ بھرنے کے لئے پینا سیرابی کے لئے سونا راحت کے واسطے اگر کسی نے یہ اسباب ترک کر دیئے اور مر گیا تو گناہگار ہوگا ہاں اگر کسی کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ عادت ہو جاوے کہ اس کے بغیر کھائے بھوک نہ لگے اور ضعف نہ ہو تو مستثنیٰ ہے جیسے بعض بزرگوں نے سال سال بھر نہیں کھایا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متواتر کئی کئی روز بدون شب کو افطار کیے ہوئے روزہ رکھتے تھے صحابہؓ نے بھی دیکھ کر شروع کیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا ایکم مثلی انما یطعمنی ربی ویسقینی یعنی تم میں مجھ جیسا کون ہے مجھ کو تو میرا رب کھلا پلا دیتا ہے ذکر اللہ سے ایسے حضرات کو ایسی سیری حاصل ہو جاتی ہے جیسے غذا سے کسی نے خوب کہا ہے

وذکرک للمشتاق خیر شراب وکل شراب دونہ کسراب

کثرت ذکر کا ایک خاصہ

اور کثرت ذکر کا یہ تو خاصہ مشترکہ ہے کہ بھوک کم لگتی ہے بیقراری نہیں ہوتی آجکل عقل پرستی کا بہت زور ہے شاید اس پر کوئی سوال کرے کہ یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی اس لئے اس کی میں وجہ عقلی بھی بیان کئے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ جب خیال آدمی کا دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے تو بھوک پیاس کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ دیکھ لو جو لوگ کسی کے کام میں منہمک ہوتے ہیں اور غایت مشغولی ہوتی ہے تو کھانے کا وقت گزر جاتا ہے۔ یاد بھی نہیں آتا کہ ہم نے کھانا نہیں کھایا۔ پس جب دنیوی مشاغل میں یہ حالت ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کی محبت کی شراب تو ایسی ہے کہ بھوک پیاس تو علیحدہ آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے عوام کے مسلمات سے ہی اس کا پتہ چلتا ہے عورتیں کہا کرتی ہیں کہ ان کو بھوک نہیں لگتی انکا پیٹ تو اللہ کے نور سے بھرا ہوا ہے تو یہ واقعی بات ہے کہ نور ذکر وہ شئے ہے کہ طبعیات اس سے مغلوب ہو جاتی ہیں۔ میرے ایک ذاکر دوست کہتے تھے کہ میں نے آزمایا تھا کہ دیکھوں کتنے دن نہیں کھا سکتا دس بارہ دن تک متواتر نہیں کھایا تو کچھ زیادہ ضعف محسوس نہیں ہوا پس یہ لوگ تو مستثنیٰ ہیں لیکن جو ایسا نہ ہو اور پھر کھانا پینا ترک کر دے

اور مر جاوے تو حرام موت مرے گا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو ہم پر ہم سے زیادہ رحم ہے کہ اس طور سے اپنے کو ہلاک کر دینے کو حرام فرما دیا۔

توکّل کا مفہوم:

پس ایسے اسباب کو ترک کر دینا جائز نہیں ہاں ایسی تقلیل جو مفضی الی الضعف المفرط نہ ہو جائز ہے اور جس طرح ترک اسباب ناجائز ہے اسی طرح اسباب میں انہماک بھی ناجائز ہے۔ مثلاً کھانے ہی کی صورت میں نہ یہ جائز ہے کہ بالکل ترک کر دے اور نہ ایسا انہماک جائز ہے جو ملے کھا جائے، نہ حرام کی تمیز کرے نہ حلال کی ایسے امور میں اسی توسط کا نام توکل ہے ایک قسم اسباب کی یہ ہوئی اور بعض اسباب وہ ہیں کہ مسبب ان پر بلا اسباب کے بھی مرتب ہو جاتا ہے جیسے کسب مال کے ذرائع مال تحصیل کے لئے مسبب ان ذرائع پر موقوف نہیں ہے بلا ان اسباب کے بھی بکثرت ترتب ہو جاتا ہے۔

اسباب میں توکّل:

ایسے اسباب میں توکل یہ ہے کہ اگر اپنے نفس میں قوت پائے اور پریشانی نہ ہو تو ترک کر دینا جائز ہے تیسرے اسباب وہمیہ کہ مسبب کا مرتب ہونا ان پر بہت بعید ہے جیسا دور دراز کا سامان کرنا کہ فلاں جگہ سے روپیہ مل جاوے تو جائیداد خریدوں گا۔ اور اس جائیداد کی آمدنی سے ایک تجارت کا کارخانہ کھولوں گا اس کے بعد فلاں کام کروں گا یہ سوچ کر ان اسباب میں ایسا مشغول و منہمک ہو گیا کہ حلال و حرام کی بھی تمیز نہ رہی ایسے اسباب کا ترک واجب ہے۔

اسباب کے تین اقسام:

پس اسباب کی کل تین قسمیں ہوئیں اسباب قطعیہ، اسباب ظنیہ، اسباب وہمیہ اسباب قطعیہ کا ترک حرام اور اسباب ظنیہ کا ترک بشرط قوت نفس مندوب اور اسباب وہمیہ کا ترک واجب صوفیہ کرام توکل سے مراد اسباب ظنیہ کا ترک لیتے ہیں اور قرآن مجید اور احادیث میں جہاں توکل کا امر ہے اس سے کہیں تو تقلیل یا ترک اسباب ظنیہ مراد ہے اور کسی جگہ ترک اسباب وہمیہ مقصود ہے یہ تقریر تو نفس توکل کے متعلق تھی۔

خواص متوکلین کی ایک غلطی:

اس کے بعد سنئے کہ توکل کہ متعلق بعضے خواص متوکلین ایک غلطی میں مبتلا ہیں وہ غلطی یہ ہے کہ متوکلین کی حالت باعتبار توکل کے تمام احوال میں یکساں نہیں دیکھی جاتی حالانکہ توکل کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام احوال میں حق تعالیٰ پر یکساں نظر ہو لیکن ان کے مختلف احوال میں بڑا فرق دیکھا جاتا ہے اور اس فرق کا احساس خود ان کو بھی نہیں ہوتا اور وہ فرق یہ ہے کہ اسباب کے ترک میں جتنی انکی نظر حق تعالیٰ پر ہے اس قدر نظر اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں نہیں ہوتی حالانکہ دونوں مواقع توکل کے ہیں کہ دونوں میں تفویض الی الحق یکساں ہونا چاہیے گو اسباب کے اختیار کرنے کو اصطلاحاً توکل نہیں کہا جاتا۔

توکل کی حقیقت:

لیکن توکل کی حقیقت جو تفویض الی الحق ہے وہ اختیار اسباب اور عدم اختیار اسباب دونوں میں یکساں ظاہر ہونا چاہیے اس لئے کہ الشیء اذا ثبت ثبت بلوازمہ تو توکل کے لوازم بلکہ حقیقت اس کی یہی تفویض الی الحق ہے کہ ہر موطن میں اس کا ظہور ہونا ضروری ہے گو اعتقاداً تو یکساں حالت ہے لیکن حالاً یکساں نہیں ہے دیکھ لیجئے اور اپنے وجدان کی طرف رجوع کر لیجئے متوکلین اور غیر متوکلین سب اس بات کو احساس کر سکتے ہیں کہ ترک اسباب جو کیفیت قلب کی تفویض کے اعتبار سے ہوتی ہے اس درجہ کی کیفیت اسباب کے اختیار کرنے میں نہیں ہوتی مثلاً ایک شخص نوکری یا تجارت چھوڑ کر بیٹھ گیا تو جیسی نظر اس صورت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اس مرتبہ کی نظر اس صورت میں نہیں ہے کہ کھانا کھا رہے ہیں اس صورت میں حالاً نظر اس پر ہے کہ کھانا کھانے سے یہ شبع ہوگا یہ حالت نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اگر چاہیں گے تو شبع اور قوت حاصل ہوگی ورنہ نہیں۔ یا مثلاً مکان بنوا رہے ہیں یہاں اس قسم کی نگاہ حق تعالیٰ پر نہیں بلکہ اسباب پر نظر ہے جتنا روپیہ پاس ہے اس پر نظر ہے اور آئندہ کے لئے فکر ہے کہ کیسے اس کی تکمیل ہوگی پس اس فرق کے کیا معنے، یہ ہے وہ غلطی جو اوّل میرے ذہن میں آئی اس کے بعد تلاش ہوئی کہ کہیں شریعت میں بھی اس کا پتہ ہے یا نہیں چنانچہ بعد تلاش کے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ صریح

دلالت اس مضمون پر اس آیت کو ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ یعنی ان سے کام میں مشورہ کیجئے پھر جب آپ عزم کریں گے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اس آیت میں ایک مرتبہ تو ہے مشورہ کا اور دوسرا مرتبہ ہے عزم کا یعنی جب مشورہ میں پختہ ارادہ ایک جانب کا طے ہو جائے اس کے بعد حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے یہ ظاہر بات ہے کہ مشورہ ایک تدبیر ہے پس مشورہ کا محل وہ امر ہوگا جو محل تدبیر ہو اور اس کا تعلق اسباب اور تدبیر سے ہو غیر اختیاری نہ ہو نیز عزم کا حاصل ہے ترجیح احد المقدورین اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امر اختیاری کے متعلق یہ ارشاد ہے پس حاصل یہ ہوا کہ جن امور کا تعلق اسباب سے ہے انکی نسبت ارشاد ہے کہ ان کے اسباب اور تدبیر میں اول آپ مشورہ فرمایئے اور مشورہ میں جو امر طے ہو یعنی جس سبب کی مباشرت قرار پائے جب آپ اس سبب کا عزم فرماویں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے پس اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ توکل کچھ اسی موقع کیساتھ خاص نہیں ہے کہ جس میں اسباب کو ترک کر دیا جاوے بلکہ اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں بھی توکل مع اپنے آثار ولوازم کے ہونا چاہئے اب دیکھ لیجئے کہ اس حالت میں توکل کس کے اندر ہے عوام تو عوام خواص جو تارک اسباب یا مقلل اسباب ہیں ان میں بھی یہ کوتاہی دیکھی جاتی ہے جیسے ان کی نظر ترک اسباب کی صورت میں اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے اس درجہ کی نظر اسباب کے اختیار کرنے کی حالت میں نہیں ہوتی تو یہ بڑی کوتاہی ہے۔

صفت توکل میں کمی:

اور حقیقت میں توکل کی صفت میں کمی ہے اور اپنی اس غلطی پر تنبیہ نہیں ہے مجھ کو خود اس پر تنبہ نہیں تھا سفر میں یہ بات محسوس ہوئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سفر میں تو توکل کی صفت کا ظہور زیادہ ہوتا ہے یعنی جب کہیں سفر ہوتا ہے تو قلب خوف ورجا میں ہوتا ہے کہ دیکھئے کہ گھر واپسی ہوگی یا نہیں اگر حق تعالیٰ خیر وعافیت رکھیں گے تو ہو جاوے گی ورنہ ممکن ہے کوئی عارض ایسا پیش آ جاوے کہ جو راہ ہی میں ختم ہو جائیں حالانکہ اسباب گھر پہنچنے کے موجود ہیں لیکن ان اسباب پر نظر نہیں ہوتی صرف حق تعالیٰ پر ہوتی ہے پس اس مقام پر تو حالی توکل حق تعالیٰ نے نصیب کر دیا اور ممکن ہے کہ یہ امر میرے ضعف قلب سے ہو اور میں اس کو

توکل سمجھتا ہوں بہر حال جو کچھ بھی ہو اس حالت میں نظر حق تعالیٰ پر ہوتی ہے یہ تو سفر کی حالت تھی اور مسجد سے گھر جانے تک یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ قلب کے اندر خوف ورجا کی کیفیت ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو پہنچیں گے ورنہ نہیں جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت ہر وقت تھی چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب سے فارغ ہو کر فوراً تیمم فرما لیتے تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی تو موجود ہے آپ فرماتے ہیں کہ شاید پانی تک نہ پہنچ سکوں پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہر وقت اور ہر حال میں حق تعالیٰ پر تھی یہ بات ہم لوگوں کو میسر نہیں ہماری جو حالت کلکتہ جانے سے ہوتی ہے اسٹیشن پر جانے میں وہ کیفیت نہیں ہے یا مثلاً مکان بنوا رہے ہیں جتنا روپیہ پاس ہے اس کا نقشہ تو سامنے ہے اور آگے کا کھٹکا ہے گویا روپیہ کا اختتام کے بعد حق تعالیٰ پر نظر ہے اور روپیہ ہونے تک اسباب پر نگاہ ہے توکل کا مقتضا تو یہ تھا کہ اسباب کے ہوتے ہوئے بھی حق تعالیٰ ہی پر نظر ہوتی کہ اگر وہ چاہیں گے تو مکان بنوا دیں گے ورنہ نہیں سو یہ حالت نہیں ہے اور لیجئے دوا پی کر صحت کی امید میں حق تعالیٰ پر نظر ہوتی ہے ایسی نظر اس وقت تک نہیں ہوتی کہ جوشاندہ پک کر ہمارے پاس آرہا ہے اس وقت یہ احتمال نہیں ہوتا کہ شاید راستہ ہی میں گر جائے اور ہم تک نہ پہنچے خلاصہ یہ ہے کہ خوف ورجا ہر وقت ہونا چاہیے اس لئے کہ خوف ورجا توکل کے لوازم سے ہے حالانکہ ہماری یہ حالت نہیں بے شک یہ کمی ہے حال کی اور بڑی بھاری کمی ہے کہ جس کی طرف آج تک التفات بھی نہ ہوا تھا۔ اسی ہفتہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر تنبہ ہوا اور سفر کی بدولت یہ بات سمجھ میں آئی میں کہا کرتا تھا کہ سفر عذاب جان ہے مگر اس سفر میں اس علم کے حاصل ہونے سے یہ خیال بدل گیا اور معلوم ہوا کہ سفر بسا اوقات سبب بہت سے فوائد کا ہوتا ہے مگر اس کا احساس چھوٹے سفر میں نہیں ہوا بڑے سفر میں ہوا یہ ریل کی برکت ہے کہ اس کے سبب توجہ الی اللہ ہوئی اسی طرح ریلوے کے قصے جو سنے گئے کہ ٹکرا جاتی ہیں اس روز سے جب ریل میں سوار ہونے کا اتفاق ہوتا ہے تو خوف معلوم ہوتا ہے کہ دیکھئے کہ صحیح سلامت گھر پہنچتے ہیں یا نہیں۔ اور حق تعالیٰ پر نظر ہوتی ہے کہ وہی چاہیں گے تو پہنچائیں گے اس اعتبار سے ان ریلوں کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہو گیا اس لئے کہ جو شئے توجہ الی اللہ کا سبب ہو جاوے اس کی رحمت ہونے میں کیا شک ہے۔

حکایت حضرت عمر بن عبدالعزیز:

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکایت یاد آ گئی کہ اس کے مکان میں ایک زینہ تھا جب وہ اس پر چڑھتے تھے اس کی ایک اینٹ ہلا کرتی تھی ایک لونڈی نے اس کو گارا لگا کر مضبوط ودرست کر دیا ایک بار جو وہ چڑھے تو وہ ہلی نہیں پوچھا کہ اینٹ کیوں نہیں ہلی عرض کر دیا گیا کہ اس کو درست کر دیا گیا ہے فرمایا کہ اس کا ہلنا ہمارے لئے رحمت تھا کہ جب ہم اس پر قدم رکھتے تھے تو ہم کو پلصراط یاد آتا تھا کہ اے اللہ اس اینٹ سے ہم کو جب اندیشہ ہوتا ہے تو پلصراط پر کیا حال ہوگا پس منشا میری اس اندیشہ وخوف کا جو کہ ریل میں ہوتا ہے اگر ضعف قلب ووہم بھی ہو تو جو ضعف سبب ہو جاوے استحضار کا تو وہ مبارک ہے اور بہتر ہے اس قوت سے جو کہ غفلت کا باعث ہو ایسی قوت کس کام کی ہے۔

ہر وقت مسبب پر نظر رکھنے کی ضرورت:

ایک مختصری بات تھی جس کو میں مختصر ہی بیان کرنا چاہتا تھا لیکن مضمون طویل ہو گیا یہاں سے بھی یہ مسئلہ جس کا ذکر کر رہا ہوں ثابت ہو گیا اور اپنی بصیرت کی کمی بھی معلوم ہو گئی کہ اختصار کے قصد کے وقت نظر ہونا چاہیے تھا حق تعالیٰ پر کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو گی تو اختصار ہو گا ورنہ نہیں مگر اس سے غفلت ہوئی اور میرا مقصود اس مضمون کے اظہار سے یہ نہیں کہ اسباب کو ترک کر دیا جاوے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جیسے ترک اسباب میں خدا تعالیٰ پر نظر ہے اسی طرح اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں بھی ہونا چاہیے غرض کسی وقت مسبب سے غفلت نہ ہو، ایک بزرگ کہتے ہیں ۔

عقل دراسباب می دارد نظر   عشق می گوید مسبب را نگر

(عقل اسباب پر نظر رکھتی ہے اور عشق مسبب پر نظر رکھتا ہے)

یعنی اسباب سے نظر متجاوز کر کے خالق الاسباب کو دیکھو اسباب پر جس طرح اعتقاداً نظر نہیں ہے حالاً بھی نظر نہ ہو مثلاً ایک شخص لکڑی سے کسی کو مار رہا ہے تو جو کوتاہ بیں ہے وہ تو کہے گا لکڑی مار رہی ہے اور جس کی نظر اس سے آگے ہے وہ کہتا ہے کہ بے وقوف لکڑی کیا مارتی ہے ہاتھ مارتا ہے اور حقیقت میں ضارب کی طرف نسبت کرے گا۔ پس اسباب کو ایسی حیثیت سے مت دیکھو جس حیثیت سے اس ظاہر بیں شخص نے لکڑی کو دیکھا مولانا فرماتے ہیں۔

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے یک دہاں پنہان ست در لبہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے وہوئے درفگندہ در شما

(بانسری کی طرح ہم دو منہ رکھتے ہیں ایک منہ اس کے لبوں میں چھپا ہوا ہے اور دوسرے منہ کا رخ تمہاری طرف ہے اور اس سے ہائے ہو کا شور برپا ہو رہا ہے)

قال الجدار للوتد لم تشقني، قال الوتد انظر الی من يدقني

(یعنی دیوار نے میخ کو کہا کہ تم مجھ کو کیوں چیرتی ہے میخ نے کہا کہ اس شخص کو دیکھ جو مجھ کو ٹھونکتا ہے مولانا فرماتے ہیں ۔

من چو کلکم درمیان اصبعین نیستم درصف طاعت بین بین

(میں طاعت کی صف میں جو بیچ میں ہوں وہ طاعت کی وجہ سے نہیں ہوں بلکہ قلم کی طرح دو انگلیوں کے درمیان پھنسا ہوا ہوں)۔

بنگرائے دل گر تو اجلا لیتی درمیان اصبعین کیتی

(اے دل اگر تو بزرگی چاہتا ہے تو تو بھی غور کر کہ تو کن دو انگلیوں کے درمیان پھنسا ہے)۔

رشتہء درگردنم افگندہ دوست می برد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست

(میری گردن میں دوست نے رسی باندھ رکھی ہے اور جدھر جو اس کی طبعیت چاہتی ہے مجھے کھینچ کر لے جاتا)

حقیقت میں اگر غور کیا جاوے تو کوئی شئے بھی اپنے قبضے میں نہیں ہے اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی ذات پر تو قبضہ ہے ہی نہیں دوسری شے تو علیحدہ باقی رہی یہ بات کہ یہ حالت کس طرح میسر ہو سکتی ہے تو اس کا طریقہ کثرت مراقبات و مجاہدات اور شیخ کامل کی صحبت ہے۔

تردّد اور سکون میں فرق:

اب یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تمہاری تقریر کا حاصل تو یہ ہوا کہ توکل کی شان یہ ہے کہ آدمی ہر وقت ایسے ہی خوف رجا کے اندر رہے جیسے ترک اسباب کی صورت میں رہتا ہے پس تم تو تردد اور تذبذب اور پریشانی اور بے اطمینانی کی تعلیم کرتے ہو حالانکہ بزرگوں کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے معنے یہ ہیں کہ خلجان بالکل نہ ہو قلب مطمئن ہو اور بعض آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ۔قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ

مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ غرض قرآن حدیث اور بزرگوں کے اقوال سے تو قرار کی تعلیم ہوتی ہے اور کہ تم بیقراری سکھلاتے ہو دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کو کافی ہے یہ آیت بھی سکون کی تعلیم کرتی ہے اور تمہاری تقریر سے حرکت اضطراب کی تعلیم معلوم ہوتی ہے بات یہ ہے حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء حق تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب کو قرار دے لو یہ کہیں کہ وعدہ نہیں ہے کہ جو جانب تمہاری مرضی کے موافق ہے اس کا ہی وقوع ہوگا كَمْ مِّنْ فِئَةٍ میں خود اس کی طرف ارشاد ہے کہ بعض جماعتیں مغلوب بھی ہوتی ہیں اسی طرح وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، کفایت کا مطلب یہ نہیں کہ حسب مرضی سب کام ہوا کریں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو مناسب ہوگا اس کا ظہور ہوگا اور جو کچھ واقع ہوگا وہی مصلحت ہوگا کارسازی ان کی شان ہے کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند جیسے بچہ کو طبیب کے سپرد کیا جاتا ہے اور اس پر کفایت ہو جاتی ہے اور تردد نہیں رہتا اس لئے کہ جانتے ہیں کہ جو اس کے لئے بہتر ہوگا وہی تجویز کریگا یہ مقصود نہیں ہوتا کہ جو بچہ چاہے گا وہ ملے گا حلوا مانگے گا تو حلوا ملے گا اور مٹھائی چاہے گا تو مٹھائی ملے گی بلکہ جو شے اس کے لئے مفید اور نافع ہوگی خواہ اس کو گوارا ہو یا ناگوار وہ ملے گی پس تردد تو تصور کے درجہ میں ہے اور سکون ہے حال کے مرتبہ میں یعنی تردد اس معنے کو ہے کہ دیکھئے قضاوقدر سے کیا واقع ہوتا ہے اور سکون اس پر ہے کہ کچھ واقع ہوگا بہتر اور مناسب ہوگا چنانچہ جو شق بھی ظاہر ہوتی ہے اس پر یہ حضرات اسی طرح مطمئن ہوتے ہیں جس طرح دوسری شق کے وقوع پر دونوں حالتوں میں سکون کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا ہاں طبعی رنج اور غم امر آخر ہے پس سکون اور حرکت دونوں اس طرح جمع ہو گئے حاصل یہ ہوا کہ توکل یہ ہے کہ خواہ اسباب کو ترک کرے یا اختیار کرے ہر وقت اس پر نظر ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ چاہیں گے تو یہ کام ہوگا ورنہ نہ ہوگا اور سکون یہ ہے اگر کام نہ بھی ہو تو اس پر قلب کو راضی ہونا چاہیے کہ یہی بہتر تھا لیکن باوجود اس حالت کے اسباب کو پھر بھی نہ چھوڑے۔

دعا بھی اسبابِ توکل میں شامل ہے:

اور انہیں میں دعا بھی داخل ہے جس پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب یہ امر متعین ہے کہ

جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا پھر ایک جانب کی درخواست اور دعا کرنے کے کیا معنے بات یہ ہے کہ اس میں اظہار ہے افتقار کا اور اسی لئے دعا کرتے وقت تردید نہ کرو بلکہ جس جانب کو تم خیر سمجھتے ہو اور تمہارے علم میں وہ مصلحت ہے اس کو باتعیین خداتعالیٰ سے مانگو ہاں جس کے خیر ہونے میں شبہ ہو وہاں قید لگا دی جاوے اور تنگ چشموں کے نزدیک اس میں بھی بظاہر سخت تعارض معلوم ہوتا ہے کہ مانگی ہوئی چیز بھی خیر ہو اور جب اس کے خلاف واقع ہو تو اس مانگی ہوئی چیز کے مقابل خیر ہو مگر فی الواقع تعارض کچھ نہیں اس لئے کہ جس جانب کو تم مانگ رہے ہو۔ وہ تمہارے علم کے اعتبار سے خیر ہے اور جو واقع ہوگا وہ نفس الامر کے لحاظ سے خیر ہے۔

بندہ کو علم غیب عطا نہ ہونے میں حکمت:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو غیب کا علم جو عطا نہیں کیا گیا اس میں بڑی مصلحت ہے اور حکمت ہے ورنہ جس چیز کا نہ ہونا معلوم ہو جاتا اس کو یہ کیوں کر مانگ سکتا اور اس صورت میں کہ دعا کا جو مقصود ہے عبدیت کا اور تذلل اور افتقار اس سے یہ محروم رہتا پس رضا بالقضا اور دعا اور حرکت اور سکون سب جمع ہو گئے اور کوئی اشکال نہ رہا جیسے گھڑی کے کل پرزے جب علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاویں تو ناواقف اگر ان کو بے ٹھکانے جوڑ دے تو گھڑی نہ چلے گی اور واقف ہر پرزے کو اس کے ٹھکانے پر رکھ دیگا تو گھڑی چل جاوے گی۔

شیخ کامل کا کام شبہات اور تعارض کو دور کرنا ہے:

شیخ کامل کا یہی کام ہے کہ وہ ایسے شبہات اور تعارض کو دفع کرتا ہے اور یہی ہے وہ بات جو کتابوں کو دیکھنے سے حاصل نہیں ہوتی اب اس کے بعد جو اشکالات اور شبہات کئے جاویں یا تو منشاء ان کا اعتراض اور عناد ہے یا غلبہ حال سے جیسے کسی کا شعر ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ　　　بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(دریا کی گہرائی میں تختہ میں باندھ کر مجھے ڈال دیا ہے اور اس کے بعد پھر یہ کہتا ہے کہ ہوشیار رہنا دامن بھیگنے نہ پائے)

اگر یہ شاعر حیرت اور غلبہ حال میں ہے تو معذور ہے مگر جاہل اور اگر معترضانہ کہتا ہے تو ایمان دے بیٹھا لوگ ایسے ہی اقوال سے ابطال شریعت پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حقیقت اور شریعت کو کیسے جمع کریں مولانا ایسے ہی بے باکوں کے بارہ میں فرماتے ہیں

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند　　از سخنہا عالمے راسوختند

ظالم وہ ہیں جنھوں نے آنکھیں بند کرلیں اور تمام دنیا کو اپنی باتوں سے جلاتے رہے ایسے اقوال اکثر یا سڑی اور دیوانوں کے ہوتے ہیں اور یا ملحدوں کے عمر خیام کی رباعیاں بہت مشہور ہیں ان میں بہت رباعیاں ایسی ہی ہیں آج کل جاہل لوگ ایسے اشعار بڑے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ یاد رکھو ادب بڑی چیز ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

از خدا جوئیم توفیق ادب　　بے ادب محروم گشت از فضل رب

ہم خدا سے ادب کی توفیق مانگتے ہیں کیونکہ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم ہو جاتا ہے۔

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد　　بلکہ آتش درہمہ آفاق زد

(بے ادب خود ہی برا نہیں رہتا بلکہ تمام دنیا میں بے ادبی کی آگ لگا دیتا ہے)

اور ایسی گستاخی و بے ادبی جہل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی واسطے بڑی ضرورت شیخ کامل کی ہے جو جہل کو دور کرے ایسے جاہل صوفیوں سے تو وہ لوگ بہت اچھے ہیں جو سیدھا سادا نماز روزہ کر لیتے ہیں اور اپنی عمر ختم کر دیتے ہیں الحاصل یہ مسئلہ توکل اچھی طرح محقق ہو گیا اور سب شبہات دفع ہو گئے اور مجھ کو جو کچھ مقصود تھا اس کا بیان شافی کافی ہو گیا اب جس طرح مقصود سے پہلے ایک تمہید تھی اسی طرح مقصود کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند فوائد اس آیت کے بطور لواحق کے بیان کر دیئے جاویں گو مقصود میں ان کا دخل زیادہ نہ ہو۔

تقدیر و تدبیر میں منافات نہیں:

سو من جملہ ان فوائد کے ایک امر اس آیت سے یہ (مستنبط اخذ ہونا) نکلا کہ تقدیر و تدبیر میں منافات (آپس میں نفی کرنا) نہیں ہے چنانچہ مفصل اس کا بیان گزر چکا اور ایک فائدہ یہ معلوم ہوا کہ مشورہ دلجوئی کا بہت بڑا آلہ ہے اور یہ معلوم ہوا کہ مشورہ فی نفسہ مطلوب ہے چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى (اور ان کا ہر کام مشورہ سے ہوتا ہے) یہاں مشورہ اور امر کو متحد قرار دینے سے یہ بتلا دیا کہ کوئی امر بغیر مشورہ نہ ہونا چاہیئے اس لئے بغیر مشورہ جو کام ہوتا ہے اس کا انجام اگر اچھا ہو گیا تو خیر ورنہ ملامت ہوتی ہے اور اگر چار آدمیوں کے مشورہ سے ہو تو ندامت اور ملامت نہیں ہوتی گو انجام بخیر نہ ہو۔

اہل یورپ کے نزدیک جمہوری سلطنت بہتر ہے:

ایک فائدہ یہ ہے کہ آجکل جن لوگوں کو لیڈر کہا جاتا ہے وہ ایک خاص مسئلہ کے اندر اکثر کلام کیا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ سلطنت جمہوری بہتر ہے یا شخصی ان لوگوں کی وہی مثل ہے" رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا اپنی حد پر نہیں رہتے مولانا فرماتے ہیں ۔

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ   برنتا بدکوہ را یک برگ کاہ

(آرزو کر لیکن اعتدال کے ساتھ کیونکہ گھاس کا ایک تنکا پہاڑ کو موڑ نہیں سکتا)

اے صاحبو! اپنی بساط سے زیادہ مت کو دو ۔ حد سے زیادہ مت اچھلو تم سلطنت جمہوری و شخصی کا کیا فیصلہ کرو گے تم اپنا ہی فیصلہ کرلو ۔ تمہارے اندر رات دن ایک معرکہ رہتا ہے مولانا فرماتے ہیں ۔

موسیٰ و فرعون در ہستی ست

ایک مصرعہ یاد نہیں رہا ۔ اور خاص کر یہ زمانہ تو بہت زیادہ سکوت کا ہے ۔ ھذا وقت السکوت و ملازمۃ البیوت جو بالکل ساکت رہتے ہیں اگر ان کو سلطنت نہیں ملتی تو یہ لوگ جو دن رات بیٹھکوں میں بیٹھ کر سلطنتوں کے فیصلے کیا کرتے ہیں ان کو بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا بلکہ ایسے لوگوں کی ان خرافات سے قوم کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ رہتا ہے ۔ ان پر وہی مثل صادق ہے ۔ گھر کا نہ گھاٹ کا ۔ ادب مانع ہے ورنہ پہلا فقرہ بھی اس مثل کا میں کہہ دیتا خیر یہ مسئلہ ان لوگوں کے زیر بحث ہے اور لوگوں کے یہاں فتویٰ اس پر دیا گیا ہے کہ جمہوری سلطنت اچھی ہے اور اصل وجہ تو اس کی صرف یہ ہے کہ یہ لوگ ہر بات میں یورپ پر ایمان لائے ہوئے ہیں یورپ ہی ان کا قبلہ ہے گو ٹیڑھا قبلہ ہے ۔ غرض دلیل کا ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ اہل یورپ سلطنت جمہوری کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ملایا کہ یورپ جو کہتا ہے وہ حق ہے اس لئے کہ وہ معصوم ہے بس نتیجہ نکال لیا کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو تو نہ شخصی ملتی ہے نہ جمہوری تم کو اس فیصلہ سے کیا ملا ہاں جمہوری سلطنت البتہ مل جاوے گی جس کی نسبت کسی نے کہا ہے ۔

گربہ میروسگ وزیرو موش راد یواں کنند   ایں چنیں ارکان دولت ملک راویراں کنند
(اگر بلی میر بنی ہوئی اور کتاوزیر اور چوہامنشی تو اس قسم کے ارکان حکومت ملک کو ویران کردیتے ہیں۔)

آج لوگوں کو حکومت کا بڑا شوق ہے کوئی انجمن بناویں گے اس میں عہدہ دار ہوں گے اور عشق تقلید یورپ میں عہدوں کا نام بھی انگریزی میں رکھیں گے مثلاً ایک سیکرٹری ہوگا کوئی گورنر بنے گا۔ میں کہتا ہوں بجائے سیکرٹری کے اگر آپ ناظم یا مہتمم یا خادم لقب رکھتے تو کیا حرج تھا اور پھر سیکرٹری ہی پر بس نہیں بلکہ اس کو انگریزوں کی طرح سیکرٹری کہتے ہیں تشبہ نے ناس کردیا ہے ہر شے میں یورپ کے ساتھ تشبہ کا شوق ہے۔

گورنر یتیم خانہ:

میرے پاس ایک شخص کا خط آیا اپنے نام کے ساتھ اس نے لکھا تھا کہ گورنر یتیم خانہ میں حیران ہوا کہ میرے پاس گورنر کا خط کیوں آیا جب آگے یتیم خانہ کا لفظ دیکھا اس وقت معلوم ہوا کہ یتیم خانہ کے آپ منتظم ہیں گورنر صاحب نے اس میں ایک مسئلہ پوچھا تھا۔ لیکن گورنری کے گھمنڈ میں آکر خط میں ٹکٹ بھی نہیں رکھا ہم تھے اپنی مولویت کے غرہ میں ہم نے بیرنگ جواب بھیج دیا۔ گورنر صاحب نے واپس کردیا۔ ایک آنہ دینا پڑا۔ جس شہر کا وہ خط تھا اتفاق سے وہاں میرا جانا ہوا تو میں نے اپنے ایک عزیز سے جس کے پاس ٹھہرا تھا پوچھا کہ وہ کون گورنر صاحب ہیں میں ان سے ملنا چاہتا ہوں اور اپنا ایک آنہ وصول کروں گا اور میں نے تمام قصہ ان کی اس حرکت کا ذکر کیا اتفاق سے اسی وقت ان گورنر صاحب کے ایک بیٹے بھی بیٹھے تھے جو ولایت سے ڈاکٹری پاس کرکے آئے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو بھائی نے کہا کہ یہاں ہی گورنر کے بیٹے ہیں ایک گلی میں ایک جھونپڑا ہے اس میں رہتے ہیں رہتے تو ہیں جھونپڑے میں اور دماغ ایسا عالی مجھ کو صرف ان کی حماقت ظاہر کرنا تھی ایک آنہ تو ان سے وصول ہوتا غالب تو ہے کہ ان کے بیٹے نے سارا قصہ نقل کردیا ہوگا یہ حالت ہے گورنری کے مدعی کی کوئی اپنے کو پلیڈر لکھتا ہے مقصود صرف ہیبت اور عظمت بتلانا ہے۔

صاحبو تم لوگ مسلمان ہو تم نے اپنی قومی شعار کو کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھو انگریزوں کو اتنا

زمانہ ہندوستان میں ہو گیا مگر انہوں نے اپنا لباس اپنی وضع نہیں بدلی اگر ان کی ہی اقتدا کا تم کوشوق ہے تو ان کی اقتدا تو یہ ہے کہ تم بھی اپنی وضع کو نہ بدلواپنے عربی کے پاکیزہ الفاظ چھوڑ کر دوسری زبان بلاضرورت کیوں اختیار کرتے ہو اور عربی سے کیوں اس قدر توحش کرتے ہو۔ ہر عاقل کے فعل کی کوئی نہ کوئی غایت ہوتی ہے آخر اس انگریزی الفاظ کے اختیار کرنے کی بھی کوئی غایت ہے بس اس کی غایت غائط بالطاً معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ اس سے شہرت ہوتی ہے اور شہرت سے روپیہ آتا ہے اور روپیہ کا کھانا پکتا ہے اور کھانے کی غایت ظاہر ہے کہ غائط (پاخانہ) ہے یہ سب لغو اور فضول باتیں ہیں۔ چھوڑو ان قصوں کو اور اپنی قدیمی وضع اختیار کرو، بہرحال ان حضرات نے یہ فتوے دیدیا اور فیصلہ کر دیا کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے خیر اسی پر رہتے تو کچھ نہ تھا۔

قرآن پاک سے سلطنت جمہوری کا اثبات نہیں ہوتا:

غضب یہ ہے کہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے اور دلیل میں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کو پیش کرتے ہیں اس استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص نے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا سے یہ فتوی لکھا تھا۔ اور وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا تھا کہ جمع ہو کر کھانا واجب ہے۔ اگر سلطنت جمہوری کی حقیقت صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ جس میں صرف مشورہ ہو تو بے شک یہ استنباط صحیح تھا سلطنت جمہوری میں تو یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی رائے دو رائے کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اس آیت سے اس کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کے بعد ارشاد ہے فَاِذَا عَزَمْتَ صیغہ مفرد مخاطب سے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشورہ تو کیجئے لیکن مشورہ کے بعد عمل اس پر کیجئے۔ جس کا آپ عزم کرلیں اور اس میں کوئی قید ہے نہیں تو اس میں سب مختلف صورتیں آ گئیں ان صورتوں میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ سب کی رائے ایک جانب ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ایک طرف تو اس صورت میں بھی آپ ہی کی عزم اور ترجیح پر مدار رہا پس اس سے تو سلطنت جمہوری کا اثبات نہیں ہوتا بلکہ سلطنت جمہوری کی بناء ہی اس سے منہدم ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں ایسا نہیں ہوتا غرض اس

آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا بلکہ سلطان مشورہ کے بعد مستقل و مستعد ہے کہ اپنی بصیرت خداداد سے جس صورت کو چاہے اختیار کر لے۔

مشورہ کا فائدہ:

اور مشورہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کرنے والے کی نظر سے کوئی پہلو اس امر کا مخفی نہ رہے گا ورنہ بسا اوقات ایک شخص کی نظر تمام پہلوؤں کو محیط نہیں ہوتی ہے اور ایک دوسری آیت سے بھی سلطنت جمہوری کا ابطال اور سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْ مَعَہٗ عَلٰۤی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ اُوْلٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْکَ لِبَعْضِ شَاْنِھِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ اس اخیر جملہ سے سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے اس لئے کہ فرض کرو کہ مجلس میں دس آدمی ہیں اور وہ دس اعلیٰ طبقہ کے ہیں اور سردار قوم ہیں ان سب آدمیوں نے اجازت چاہی تو سلطنت جمہوری کا مقتضا تو یہ ہے کہ چونکہ سب اہل مجلس ایک طرف ہو گئے تو بادشاہ کو اجازت دینا واجب ہوگا حالانکہ اس صورت میں بھی ارشاد ہے فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ کہ جس کو آپ چاہیں اجازت دیں یہ صاف دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل بادشاہ ہیں اگر قرآن حدیث میں اور زیادہ غور کیا جاوے تو بہت دلائل نکلیں گے ایک فائدہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آیت میں مشورہ کا بھی ذکر ہے اور عزم کا بھی جو کہ منجملہ تدابیر کے ہیں۔

تدبیر کے وقت اللہ پر نظر رکھنے کا حکم:

لیکن آیت کو ختم فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ پر جس سے مفہوم ہوا کہ تدبیر تو کرے لیکن اصل مقصود تدبیر کے وقت بھی توکل اور خدا پر نظر رکھنا ہے تدبیر کی مشروعیت کی علت تو محض ہمارا ضعف ہے اور اظہار ہے غایۃ افتقار کا کہ اے اللہ ہم ایسے مضبوط نہیں ہیں کہ آپ کی بنائی ہوئی چیزوں کے محتاج نہ ہوں۔

افتقار الی اللہ منافی توکل نہیں:

اور یہاں سے راز معلوم ہو گیا ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا کہ کھانا

تناول فرما کر آپ دعا فرماتے الحمد للّٰہ الذی اطعمنا وسقانا غیر مستغنی عنه ربنا یعنی اے اللہ اس روٹی کے ہم محتاج ہیں ہم اس سے مستغنی نہیں ہیں ۔غرض حق تعالیٰ کے سامنے اسباب کی احتیاج کا اظہار اس نظر سے کہ اپنا افتقار (اللہ تعالیٰ کی طرف محتاجی کا اظہار) الی اللہ ظاہر ہو توکل کے منافی نہیں ہے ہاں اگر خود ان اسباب ہی کو مطلوب بنا لیوے تو یہ البتہ منافی توکل ہے غرض اسباب اور تدابیر کی مشروعیت (شرع کے مطابق جائز) ہمارے ضعف اور افتقار کے اظہار کے لئے ہے نہ کہ ان کو مقصود بالذات بنانے کے واسطے۔

تدابیر کی مشروعیت میں حکمت:

اور بعض اہل اللہ نے تدابیر کی مشروعیت کی عجیب حکمت لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ تدبیر کرنا اس لئے جائز کیا گیا ہے کہ ہم تدبیر کریں اور وہ اس کو توڑتے رہیں تا کہ ہم کو یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارے اسباب اور تدابیر کوئی چیز نہیں ۔موثر حقیقی حقیقت میں ذات واحد ہے چنانچہ بعض اہل حال کے ساتھ عجیب معاملہ ہوتا ہے کہنے کی بات تو نہ تھی لیکن زبان پر آئی ہوئی بات کہہ دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ عوام کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنی تدابیر میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے شاذ و نادر تدبیر خطا بھی ہو جاتی ہے۔

بعض اہل حال وخواص سے معاملہ:

اور اہل حال وخواص عباد کیساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ جو تدبیر وہ کرتے ہیں اکثر توڑ دی جاتی ہے۔وہ عزم کرتے ہیں کہ فلاں کام نہ کریں گے وہی ان سے صادر ہوتا ہے آخر رفتہ رفتہ ان کو واضح ہو جاتا ہے کہ ہماری حول اور قوت اور ارادہ لاشئے محض ہے اور اس کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں اور تفویض محض ان کی شان ہو جاتی ہے حضرت ابراہیمؒ بن ادہم کی تہجد کی نماز قضا ہو گئی بہت افسوس کیا بہت روئے دوسرے روز بڑا اہتمام آنکھ کھلنے کا کیا کھانا کم کھایا پانی کم پیا اور سویرے سے سوئے اس روز صبح کی نماز بھی اڑ گئی وہ فرماتے ہیں ففوضت واسترحت کہ اس کے بعد میں نے اپنے کو تفویض کر دیا اور راحت سے ہو گیا ،پس وہ کہتے ہیں کہ تدبیر اس واسطے ہے کہ ہم کریں وہ توڑیں بہر حال تدبیر کی بھی یہ ایک حکمت ہے

مگر یوں نہیں کہہ سکتے کہ یہی ہے جو حکمت میں نے بیان کی ہے وہ بھی ہے اس میں کوئی تنافی نہیں ایک شے میں حکمتیں متعدد بھی ہوا کرتی ہیں یہ وہ فوائد ہیں جو ملحقات کے طور پر ذکر کئے گئے باقی مقصود بالذات وہ نئی بات تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے بڑے کام کی اور یاد رکھنے کی بات ہے اور عملی مضمون ہے یہ نہیں کہ صرف مزہ لینے ہی کے واسطے ہو۔

توکّل کے لئے ایک ضروری دستور العمل:

بلکہ اس کو اپنا دستور العمل بنالو کہ جو کام کرو کم از کم ایک ہی مرتبہ ضرور سوچ لیا کرو کہ اے اللہ یہ کام آپ کے اختیار میں ہے اگر آپ چاہیں گے تو ہوگا ورنہ نہیں ہوگا یہ ایسی سہل اور آسان بات ہے کہ کچھ اس میں مشقت نہیں اور نفع اس کا کثیر ہے چند روز کر کے تو دیکھو کیا رنگ لاتی ہے۔ اب میں ختم کر چکا ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عمل کی عطا فرماویں۔

آمین یا رب العالمین۔

الاصابہ
فی
معنی الاجابتہ

یہ وعظ ۱۸ شوال ۱۳۳۶ھ بعد نماز عصر بمقام مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے مصلّٰی پر بیٹھ کر ڈیڑھ گھنٹہ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً تیس عدد تھی جس کو حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْالِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ.

ترجمہ:۔ جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں ۔منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ میرے حضور میں درخواست دے پس انکو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ بھلائی حاصل کرسکیں۔

تمہید

شانِ نزول آیت متلوہ

اس آیت سے مجھ کوایک مضمون بیان کرنا ہے آیت کی تفسیر کرنا مقصود نہیں گو تبعاً تفسیر بھی ہو جائے مگر دراصل مجھ کو ایک غلطی عام پر تنبہ کرنا ہے جو علمی غلطی ہے اور اس علمی غلطی سے عملی غلطی بھی ناشی ہے اور اس کی وجہ سے لوگ ایک دولت سے محروم ہیں جو بڑی دولت ہے۔

ترجمہ:۔آیت کا یہ ہے کہ جب میرے بندے آپ سے دریافت کریں میرے متعلق ۔کیا دریافت کریں؟ اس کا ذکر نہیں ہے مگر آگے جواب سے معلوم ہو جائے گا کہ سوال کس بات

کے متعلق تھا، نیز حدیثوں سے بھی معلوم ہوگیا ہے کہ سوال قرب و بعد خداوندی سے تھا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں یا بعید حدیث میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اقریب ربنا فنناجیہ ام بعید فنناديه کیا اللہ تعالیٰ ہم سے نزدیک ہیں تو آہستہ سے عرض معروض کرلیا کریں یا دور ہیں کہ زور سے پکارا کریں اس پر آیت نازل ہوئی اور اس سوال کو بعید نہ سمجھا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کمالات کا علم اگرچہ بدیہی ہے مگر اسکی تفصیل نظری ہے سائلین کو یہ تو معلوم تھا کہ حق تعالیٰ اس کی سنتے ہیں اور کوئی بات ان سے مخفی نہیں رہتی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ قریب سے ہی سنتے ہیں یا بعید سے بھی کیونکہ عام لوگ دور سے سننے کو عیب نہیں سمجھتے چنانچہ سلاطین بواسطہ ذرائع (ٹیلیفون و تار و قاصد) کے دور سے ہی سنتے ہیں۔ غرض جہل مطلق تو سب کے نزدیک عیب ہے مگر علم و سمع بواسطہ ان کے نزدیک عیب تھا اس لئے کہ سلاطین عالم کا علم و سمع بواسطہ ہی ہے اور انسان کی عادت ہے قیاس الشاہد علی الغائب کی۔ اور اسی کو شریعت نے بہت سختی سے منع کیا ہے کہ قیاس شاہد علی الغائب کی اور اسی لئے حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو حتیٰ کہ نمک اور جوتہ کا تسمہ بھی اللہ ہی سے مانگو یہ اس واسطے فرمایا کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے معمولی چیزوں کے مانگنے کو عیب سمجھتے ہیں اور اس کا منشاء بھی وہی قیاس الشاہد علی الغائب ہے کیونکہ سلاطین سے پیسہ مانگنا عرفاً عیب ہے تو وہ یہ سمجھے کہ خدا سے بھی پیسہ اور نمک عیب ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلطی کو رفع کردیا کیونکہ اس غلطی ہی سے شرک پیدا ہوا کہ مشرکین نے چھوٹے کاموں کیلئے دوسرے معبود تجویز کر لئے منشاء تو ہر جہل کا ہوتا ہے مگر اسکا رفع کرنا بھی تو ضروری ہے اور تعلیم کی خوبی تو یہی ہے کہ رفع جہل کے ساتھ اس کے منشا کو بھی رفع کردے بہر حال یہی قیاس منشا ہوا اس سوال کا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں یا بعید سائلین یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ سنتے ہیں سب کی اور ان کے نزدیک سلاطین عالم سے خدا تعالیٰ کو یہی ایک امتیاز تھا کہ سب کی سنتے ہیں کیونکہ سلاطین دنیا تک ہر شخص کی بات نہیں پہنچتی ہے مگر اس سوال کرنے والوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ زور کی آواز کو سنتے ہوں آہستہ کو نہ سنتے ہوں یا تو اس لئے کہ وہ ہم سے دور ہیں اور بعد کا خیال بوجہ عظمت کے ہوا۔ (وایضا فان کونه تعالى فوق العرش منصوص و اثبات العلوله لازم شرعاً كما هو عقيدة السلف من غير بيان كيفية علوه وفوقيته)

(اور نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عرش کے اوپر ہونا نص سے ثابت ہے اور شرعاً بلند ہونے کا ثبوت لازم ہے جیسا کہ اسلاف کا عقیدہ ہے اس کے بلند ہونے اور اوپر ہونے کی کیفیت نہیں معلوم) یا اس لئے کہ وہ بہت سے کاموں میں مشغول ہیں اور شغل کی حالت میں آہستہ آواز مسموع نہیں ہوتی گو سامع قریب ہی ہو آگے اس سوال کا جواب ہے فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ظاہر حال کا مقتضا یہ تھا کہ یہاں فقل انی قریب ہوتا کیونکہ اوپر وَاِذَا سَاَلَکَ میں سوال بواسطے حضور کے ہے تو جواب بھی حضور کے واسطہ سے دیا جاتا کہ آپ اس سوال کے جواب میں فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں دور نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے جواب بلا واسطہ دیا ہے کہ یہاں قل کو حذف کر دیا گویا یہ جواب پہنچے گا بواسطہ رسول ہی کے مگر حذف قل میں اس بات کو ظاہر فرما دیا کہ ہم تمہارے سوال کا جواب بلا واسطہ دیتے ہیں گو یہ سوال ہماری شان و عظمت کے خلاف ہے مگر ہم اس خطا کو عفو کر کے بلا واسطہ جواب دیتے ہیں اس طرز و عنوان میں جو کچھ عنایت و کرم مزید ہے ظاہر ہے

قرب کی دو قسمیں

آگے جواب کے بعد ارشاد ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ اس میں ایک دوسری عنایت کا اظہار ہے کیونکہ سوال کا جواب تو اس سے ہو گیا کہ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس کے بعد سائل کو کسی اور بات کا انتظار نہ تھا مگر کلام علی اسلوب الحکیم کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ جس میں اس پر تنبیہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک قرب علمی یہ تو فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ سے معلوم ہو چکا ہے دوسرے قرب تعلق خصوصیت جیسے اردو میں ہم کبھی تو یوں کہتے ہیں کہ میں پاس ہی ہوں کہو کیا کہتے ہو یعنی سن رہا ہوں اس میں تو پاس ہونے سے قرب علمی و قرب سماع کا بیان مقصود ہے اور کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں تو ہمارا قریب ہے یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے نیز کہتے ہیں کہ تم تو دور رہ کر بھی پاس ہی ہو یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے ۔ پس اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں دوسرے قرب کو یعنی تعلق اور قرب خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے کہ میں باعتبار علم کے بھی قریب ہوں کہ سب کی بات سنتا ہوں اور باعتبار شفقت و رحمت و توجہ و عنایت کے بھی قریب ہوں کہ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں ۔ اب میں مضمون مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں دعا کے متعلق ایک غلطی

علمی وعملی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں اور اس غلطی ہی کی وجہ سے لوگ دعا میں کوتاہی کرتے ہیں حالانکہ اس کے برابر کی کوئی چیز نہیں کیونکہ ہر نافع شئی میں یا منافع دینیہ ہوتے ہیں یا منافع دنیویہ اور دعا میں یہ امتیاز ہے کہ اس میں دونوں منافع ہیں یعنی تدابیر دنیا میں سے یہ بھی ایک تدبیر ہے اور سب سے بڑی تدبیر ہے۔ دوسرا امتیاز دعا میں یہ ہے کہ دوسری تدابیر دنیا من حیث التدبیر پر کچھ ثواب نہیں اور دعا میں گو دنیا ہی مانگی جائے (بشرطیکہ ناجائز اور حرام شے کی دعا نہ ہو) ثواب ملتا ہے۔ پس دعا میں ایک امتیاز تو یہ ہوا کہ وہ جامع بین الدین والدنیا یعنی دین و دنیا دونوں کے منافع کو جامع ہے دوسرا امتیاز یہ ہے کہ دعا ہر حال میں ثواب و عبادت ہے۔ دیگر عبادات میں اگر دنیا کی آمیزش ہو جائے تو وہ عبادت نہیں رہتی اور اگر مقصود ہی دنیا ہو پھر تو بطلان عبادت ظاہر ہے مگر دعا سے اگر دنیا ہی مطلوب ہو جب بھی وہ عبادت ہے اس میں مقصودیت دنیا سے وصف عبادت باطل نہیں ہوتا کیونکہ دعا میں عبدیت کی شان ہر حال میں باقی رہتی ہے۔ حدیثوں میں اسی لئے دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عقلاً بھی یہ بھی سب سے بڑی چیز ہے کہ کیونکہ اس کا حاصل اللہ تعالیٰ سے سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں یہ دیدے اور یہ ہر تدبیر سے بڑھ کر تدبیر ہے کیونکہ دوسری تدبیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان اس میں اپنے مثل کے سامنے اپنی احتیاج کو ظاہر کراتا ہے جیسے ملازمت وغیرہ میں اور زراعت میں گو کاشتکار حق تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے مگر اسباب ظاہرہ کی طرف بھی احتیاج ہوتی ہے۔ بغیر اسباب ظاہرہ کے زراعت غیر مکمل ہے اور ان اسباب میں غیر حق کا محتاج بننا پڑتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے حضرت مسیح اور ان کی والدہؑ کے عدم الوہیت پر كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ سے استدلال فرمایا ہے کیونکہ جو شخص طعام کا محتاج ہے وہ سارے عالم کا محتاج ہے۔ زمین کا بھی آسمان کا بھی چاند سورج کا بھی بادل اور بارش کا بھی لکڑی کا بھی لوہے کا بھی جانور کا بھی اور لوہار و بڑھئی اور بالدی کمہروں کا بھی کیونکہ ان سب سے مل کر زراعت ہوتی ہے پھر کسی نے آٹا پیسا کسی نے گوندھا کسی نے پکایا تب کھانا تیار ہوا تو طعام میں تمام عالم کی طرف احتیاج ہے پھر ایسا محتاج الہٰ کب ہو سکتا ہے اسی کو سعدیؒ فرماتے ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند	تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار	شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرمان نہ بری

(بادل' ہوا' چاند اور سورج کام میں مصروف ہیں تا کہ تو اپنے ہاتھوں میں روٹی دیکھے اور غفلت نہ کرے۔ سب تیری فرمانبرداری میں پریشان ہیں انصاف کی شرط نہیں کہ اس کے باوجود تو اللہ کی اطاعت نہ کرے)

غرض ہر تدبیر میں انسان اپنے عاجز کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے خواہ قالاً یا حالاً اور دعا میں ایسے سے مانگتا ہے جو سب سے کامل القدرۃ ہے اور جس کے سب محتاج ہیں پس یقیناً یہ تدبیر ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے کیونکہ اور تدابیر بھی حق تعالیٰ کی مشیت وارادہ ہی سے کامیاب ہوسکتے ہیں تو شخص حق تعالیٰ سے مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا اب عقل سے پوچھو تو وہی یہی کہے گی کہ جو سب سے قادر تر ہے اسی سے مانگنا اکمل وانفع ہے۔ جب عقل اور نقل سے دعا کی فضیلت ثابت ہوگئی تو اب اپنی حالت میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ متروک دعا کو کر رکھا ہے لوگ سب تدبیریں کرتے ہیں مگر دعا نہیں کرتے بجز اس کے کہ دو تین دعائیں یاد کرلی ہیں نماز کے بعد آموختہ کے طور پر ان کو پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں میں نے عمر بھر میں ایک شخص کے سوا کسی کو دعا کرتے نہیں دیکھا وہ بہت بھولے تھے ان کا بھولا پن اس سے معلوم ہوگا کہ جمعہ کے دن ایک جنازہ لایا گیا تو وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ یہ دن سب کو نصیب ہو۔ لوگ اس پر بگڑ گئے وہ سمجھے کہ کوستا ہے کہ سب مرجائیں حالانکہ ان کی مراد یہ تھی کہ جب موت آوے جمعہ کا دن ہو مگر اپنے اس مطلب کو اس عنوان سے ادا کیا جس پر سب بگڑ گئے تو میں نے ان کو دیکھا ہے کہ ایک ایک دعا میں ایک ایک گھنٹہ لگا دیتے تھے اور اچھی طرح ہاتھ پسار پسار کر منہ بنا بنا کر دعا کرتے تھے اس طرح دعا کرتے بہت کم لوگوں کو دیکھا گیا ہے۔ یہ تو لوگوں کی عملی غلطی تھی۔

دعا سے متعلق ایک علمی غلطی:

اور علمی غلطی یہ ہے کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شیطان یہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ تدبیر تو تدبیروں سے کمتر ہے دیکھو ایک مہینہ دعا کرتے ہوگیا قبول ہی نہیں ہوئی اب یہ شخص کسی مولوی صاحب کے پاس جاتا ہے انہوں نے اس کی یوں تسلی کی کہ قبول دعا کیلئے کچھ شرائط مگر عدم قبول فقدان شرائط ہی پر موقوف نہیں بلکہ بعض دفعہ باوجود اجتماع شرائط کے بھی عدم قبول متحقق ہوتا

ہے تو اب وسوسہ پھر پیدا ہوگا اور آئندہ کو دعا سے ہمت ٹوٹ جائے گی اور بعض لوگوں کو ممکن ہے کہ نصوص میں شبہات پیدا ہونے لگیں اس لئے یہ جواب ناکافی ہے اس سے وساوس وشبہات کا استیصال نہیں ہوتا اس لئے ضرورت ایسے جواب کی ہے کہ جس سے حقیقت واضح ہوکر شبہات و وساوس کی جڑ کٹ جائے تو اس شبہ کا ایک جواب آج ذہن میں آیا جو شاید پہلے بھی آیا ہو مگر اس تفصیل سے غالباً نہ آیا تھا جیسا آج آیا اس لئے احباب کو وہ جواب سنانا چاہتا ہوں تاکہ شیطان کے اس دھوکہ سے نجات کلی ہو جائے پھر دعا میں کوتاہی نہ ہو۔

اجابت دعا کے دو درجے:

وہ جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ درخواست لے لی جائے اور اس پر توجہ کی جائے دوسرے یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کر دیا جائے۔ صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے آپ نے مقدمات میں دیکھا ہوگا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے تو وہاں بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ اپیل کو لے لیا جائے اور اس میں غور کیا جائے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ بڑی ناکامی اس شخص کی جس کا اپیل لیا ہی نہ جائے اس کے بعد دوسرا درجہ کامیابی یہ ہے کہ اپیل منظور کر لینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کر دیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کر دیا جائے اور جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھئے کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ منظوری کی قسم اول پر محمول ہے قسم ثانی پر محمول نہیں جس کی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں کیونکہ اس کو مرتب فرمایا ہے اِنِّیْ قَرِیْبٌ پر اور اس جملہ میں قرب تعلق کو بیان فرمایا ہے اور قرب تعلق کا مقتضا یہی ہے کہ درخواست کو لے لیا جائے اس پر توجہ کی جائے خواہ فیصلہ دیر میں ہو یا جلدی ہو موافق ہو یا نہ کیونکہ فیصلہ تو قانون کے موافق ہوگا یا سائل کی مصالح پر نظر کر کے اور مقدمہ کی روئے داد دیکھ کر حاکم کے تعلق اور توجہ کا مقتضا صرف اتنا ہے کہ سائل کی درخواست کو واپس نہ کرے بلکہ اس کی درخواست کو توجہ کیساتھ سنے اور اس کو فیصلہ کے واسطے لے لے پس اجیب کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ہر دعا کرنیوالے کی درخواست کو لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے بے توجہی نہیں کی جاتی ہے۔ تو یہ کیا تھوڑی بات ہے۔

درخواست لینے کی عجیب مثال:

صاحبو! دنیا میں تو اتنی ہی بات کیلئے بہت سی تدبیریں اور خوشامدیں کی جاتی ہیں کہ بادشاہ ہماری درخواست کو لے لے۔ اس کے بعد جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر فیصلہ قانون کے موافق ہوا تو ہماری مرضی کے موافق ہوگا ورنہ نہیں۔ ایسے ہی یہاں بھی دل کو سمجھانا چاہئے کہ جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اسی کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہ ہوا تو ضرور پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا یہ اس واسطے کہا کہ اللہ تعالیٰ دعا کے پورا کرنے میں کسی قانون کے تو پابند نہیں ہاں بندہ کی مصالح پر ضرور نظر فرماتے ہیں کہ اس دعا کو پورا کرنا اس کیلئے مضر نہ ہو سو یہ تو عین کامیابی ہے دیکھو بچہ باپ سے پیسہ مانگتا ہے تو ایک درجہ تو قبول کا یہ ہے کہ باپ اس کی درخواست کو سن کر محبت سے اس کو پیار کرے کہ ہاں ہاں ہم نے تمہاری درخواست سن لی اب کبھی تو وہ اس کو پیسہ دیدیتا ہے اور کبھی اس خیال سے کہ پیسہ لیکر یہ بازار میں جائے گا اور نہ معلوم کیا خرید کر کھالیگا جس سے نقصان پہنچے یا بازار جانے سے عادت خراب ہو جائے تو وہ اس کو بجائے پیسہ دینے کے کوئی چیز اس کو اپنے ہاتھ سے خرید کر دیتا ہے تو کیا اس کو یوں کہا جائے گا کہ درخواست پوری نہیں کی ہرگز نہیں کہا جائے گا کہ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ گو صورتاً پوری نہیں کی مگر حقیقتاً درخواست پوری کردی گئی کیونکہ اس کو پیسہ سے بہتر چیز دیدی گئی اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ حکیم بھی ہیں قادر بھی ہیں رحیم و مہربان بھی ہیں۔ باپ ماں سے زیادہ بندہ پر مہربان ہیں۔ اسکے بعد بھی جو کچھ طلب کے موافق عطا نہیں ہوتا تو دل کو سمجھانا چاہے کہ ضرور ہماری درخواست کا بجنسہ پورا کرنا حکمت کے موافق نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ بجائے اس کے ہم کو کچھ اور نعمت عطا فرمائیں گے حکام دنیا تو درخواست منظور کرنے کے بعد فیصلہ کرنے کے وقت صرف اسناد دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا قانون کے خلاف تو نہیں اگر قانون کے خلاف ہوا تو اس کو رد کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ اور کچھ نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ اس قانون کے ساتھ اس کو بھی دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا بندہ کی مصالح کے خلاف نہیں اور اس صورت میں درخواست کا پورا کرنا عین کامیابی ہے۔

اجابت کے معنی درخواست لے لینا ہے:

پس اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ انشاء سے مقید ہے کہ اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہو جائے گا ورنہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَاتَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ (بلکہ خاص اسی کو پکارنے لگو۔ پھر جس کے لئے تم پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے) بعض علماء نے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ کو بھی انشاء سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں نے حذاقت میں شمار کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (تمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا) یہاں سیاق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا ترتب امر پر ضروری ہے اس میں انشاء کی قید خلاف ظاہر ہے۔ نیز یہ بھی اِنِّیْ قَرِیْبٌ کے بعد اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ کو بیان فرمانا جس میں قرب کو محقق و مؤکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اجابت مشیت کیساتھ مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قرب ہونا محقق ہے علما بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی۔ (لقولہ سبقت رحمتی وغضبی وھو المراد بالتعلق ۱۲) (اتحاف السادة المتقین ۸:۵۵۶) پس میرے نزدیک اجابت بالمعنی الاول نہیں ہاں اجابت بالمعنی الثانی انشاء سے مقید ہے جب دعا اس طرح سے مقبول ہے پھر دعا میں کوتاہی کیوں ہے ۔ اور اگر کسی کے ذہن میں تحقیق نہ ہو تو وہ دعا میں اس طرح بھی تو دل کو سمجھا سکتا ہے کہ دنیا میں تو نفع موہوم پر بھی بہت سے کام کر لیتے ہیں گو آخر میں خسارہ بھی ہو جائے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے جیسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے اور دعا میں تو خسارہ کا احتمال ہی نہیں پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے دعا میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا پس دعا کے بعد اگر مطلوب بعینہ حاصل نہ ہو تو

یہ بات تو اسی وقت حاصل ہو جائے گی کہ دل میں قوت اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ برکت اس کی ہے کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو تعلق ہو جاتا ہے عشاق کو تو دعا سے یہی مطلوب ہے اور کچھ مطلوب نہیں مولانا فرماتے ہیں

از دعا نبود مراد عاشقاں ۔ جز سخن گفتن باشیریں دہاں

(دعا سے عاشقوں کو مراد مطلوب نہیں سوائے اپنے محبوب حقیقی سے راز و نیاز اور بات چیت سے کچھ اور مقصود نہیں) اس لئے عشاق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کے لئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی باتیں سن لے عاشق کے لئے یہی بات بہت کافی ہے اسکے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے تو چاہئے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت دور نظر آتا ہے۔ صاحبو! پھر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ ہے اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا اور ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں بس ہم دور ہو رہے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ، کا قرب علمی:

اسی لئے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ) انتم اقرب الینا (تم ہمارے بہت قریب ہو) نہیں فرمایا کیونکہ یہاں قرب علمی مراد ہے اور قرب علمی میں طرفین سے قرب لازم نہیں ہے بخلاف قرب حسی کے کہ یہاں طرفین سے قرب لازم ہے پس اس وقت ہماری حالت سعدیؒ کے شعر کی مصداق ہے۔

دوست نزدیک تر از من بمن ست ۔ دین عجب تر کہ من از وے دورم

(دوست مجھ سے نزدیک تر ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ میں اس سے دور ہوں) اس مقام پر استطراداً میں ایک شبہ کو بھی رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ بعض لوگوں کو پوری آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ سے یہ شبہ ہو گیا کہ وساوس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ پوری آیت یہ ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ

الْوَرِیْدِ (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو اس کے دل میں بطور وسوسہ کے آتی ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ) ان لوگوں نے نَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ کو وعید پر محمول کیا ہے اور منشا شبہ کا یہ ہوا کہ بہت سی آیتوں میں جیسے وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور وَھُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. وَاِنَّہٗ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ علم وعید کیلئے وارد ہے انہوں نے وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ کو بھی اسی پر قیاس کیا حالانکہ یہاں سیاق وسباق میں نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے اس کو وعید سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ دراصل یہاں اوپر سے حق تعالیٰ معاد کو ثابت فرما رہے ہیں جس کے لئے کمال قدرت اور کمال علم کی ضرورت ہے پس اولاً کمال قدرت کو ثابت فرمایا اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا الآیات میں اور اس کے بعد وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ سے کمال علم کو ثابت فرما رہے ہیں کہ ہم کو انسان کے وسواس تک کا علم ہے جو دل میں جمتی نہیں پھر عیان خارجہ واجزا اجسام کا علم کیونکر نہ ہوگا۔ اس کے بعد وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ میں قرب علمی کو بیان فرمایا ہے کہ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اور یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ہمارا اور ہماری حالت کا جس قدر علم ہے ہم کو حق تعالیٰ کا اس قدر علم نہیں بلکہ یوں کہئے کہ ہم کو بجز اسماء کے حق تعالیٰ کا کچھ بھی علم نہیں بلکہ ہم کو خود اپنی حالت کا بھی پورا علم نہیں کہ ہمارے اندر کتنی رگیں ہیں اور ان سے کیا کیا کام لئے جا رہے ہیں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا کہ آیت میں قرب علمی مراد ہے پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے قرب علمی اس درجہ ہے کہ ہم کو بھی اپنے ساتھ نہیں۔ اسی کو اس طرح تعبیر فرمایا کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہیں اور دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ خالق ہیں تمام اعضاء اور تمام قویٰ انہی کے عطا کئے ہوئے ہیں پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے ہمارے اعضاء سے زیادہ قرب ہے پہلے اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ تعلق ہوا پھر ہمارے اعضاء وغیرہ کو ہم سے تعلق ہوا (۱۲) بہر حال یہ بات واضح ہوگئی کہ قرب علمی میں شیئین میں ایک شئی قریب ایک بعید ہو سکتی ہے۔ پس ہم کو جو اللہ تعالیٰ سے بعد ہے اس کو قرب سے بدلنا چاہئے جس کی ایک تدبیر تو وہ مراقبات واشتغال ہیں جو مشائخ کے یہاں معمول بہ ہیں

اور سب سے زیادہ آسان اور نزدیک طریقہ دعا ہے کیونکہ طریقہ دعا میں انسان اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے عرض معروض کرتا ہے اور جب تمام باتیں کروگے تو یہ تمہارا ایک خاص فعل ہوگا۔ جس میں تم خود یہ تصور کروگے کہ اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں اور وہ ہم سے قریب ہیں تو اس سے تم اللہ تعالیٰ کا قرب اور ان کے ساتھ تعلق خصوصیت زیادہ ہوگا اور یہ دعا کا وہ ثمرہ ہے جو کبھی مختلف نہیں ہوتا اس کے بعد اس دعا کی اجابت بالمعنی الاول کا ثمرہ الگ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری درخواست کو لے لیتے ہیں وراس پر توجہ فرماتے ہیں اور شفقت ورحمت کے ساتھ تمہاری عرض ومعروض کو سنتے ہیں اس کے بعد اجابت بالمعنی الثانی کا ثمرہ الگ ہے جو کبھی مرتب نہیں ہوتا۔ پس دعا کے متعلق علمی غلطی کو تو میں نے رفع کردیا۔

دعاء کی عملی کوتاہی دور کرنے کا طریق

اب عملی کوتاہی رہ گئی اس کو آپ رفع کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر حاجت میں دعا کیا کریں اور دل سے دعا کیا کریں اور اس کے ساتھ تدبیر بھی کرو کیونکہ تدبیر امر مشاہد ہے اور مشاہدے سے تسلی زیادہ ہوتی ہے اور دعا کو تدبیر کہنا تو برائے ظاہر ہے ورنہ حقیقت میں اس کا درجہ تدبیر سے آگے ہے۔ دعا کو تقدیر سے زیادہ قرب ہے کیونکہ اس میں اس ذات سے درخواست وسوال ہے جس کے قبضہ میں تقدیر ہے باقی اسباب وتدابیر کا درجہ صرف اتنا ہے جیسے ریلوے کا ملازم جھنڈی دکھلادے جس سے ریل گاڑی فوراً رک جائے گی۔ ظاہر ہے کہ لال جھنڈی میں تاثر کی قوت نہیں اگر ڈرائیور انجن کو نہ روکے تو ہزار لال جھنڈیاں بھی پامال ہوجائیں گی پس لال جھنڈی کا درجہ صرف اتنا ہے کہ یہ ڈرائیور نے اصطلاح مقرر کرلی ہے کہ ہم ایسی جھنڈی سے گاڑی کو روک دیں گے۔ اور دوسری قسم سے چلادیں گے لیکن اگر کسی وقت وہ اس قرارداد کے خلاف کرنا چاہے تو جھنڈی میں اس کو روکنے کی اصلاً طاقت نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر فرمادیا ہے کہ جو شخص اسباب کو اختیار کرے گا ہم مسببات کو ان پر فائض کردیں گے لیکن اگر کسی وقت وہ مسببات کو پیدا نہ کرنا چاہیں تو اسباب سے کچھ نہیں ہوسکتا اسی لئے حقیقت شناس یوں کہتا ہے

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت راتہمتے برآہوئے چیں بستاند

(اسباب کا نام ایک مصلحت وحکمت کیوجہ سے ہے ورنہ سب کچھ وہی کرتے ہیں اور بندہ کا نام ہو جاتا ہے کہ حکیم صاحب کے ہاتھ سے شفا ہوئی یا فلاں صاحب کی تقریر کا یہ اثر ہوا۔

اسباب میں تاثیر کی طاقت نہیں

صاحبو! اثر اور تاثیر سب خدا کی طرف سے ہے وعظ کہہ کر جب یہ وسوسہ آتا ہے کہ آج اچھا مضمون بیان ہوا تو میں یہ شعر پڑھتا ہوں

بوئے نافہ کاخر صبازاں طرہ بکشاید ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتادردلہا

ایک شعر اردو کا بھی اس معنی میں اچھا ہے

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

مولانا فرماتے ہیں

عشق من پیدا و معشوقم نہاں یار بیروں فتنہ اودر جہاں

(میرا عشق ظاہر ہے اور میرا معشوق پوشیدہ ہے۔یار تو جہاں سے باہر ہے مگر خوف جہاں کے اندر ہے) حقیقت میں موثر وہی ہیں اسباب میں تاثیر کی طاقت نہیں وہ صرف علامات ہیں جیسے میں نے ابھی لال جھنڈی کی مثال دی ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک جگہ بہت تصریح کے ساتھ فرماتے ہیں۔ اَفَرَءَیْتُم مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ

ترجمہ بھلا دیکھو جو تم بوتے ہو کیا تم کرتے ہو اس کو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کرنے والے اگر ہم چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندا گھاس پھر تم رہو سارا دن باتیں بناتے ہم تو قرض دار رہ گئے بلکہ ہم بے نصیب ہو گئے بھلا دیکھو پانی جو تم پیتے ہو کیا تم اس کو بادل سے برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں اگر چاہیں اسکو کڑوا کر ڈالیں سو تم شکر نہیں کرتے ہو اچھا دیکھو وہ آگ جو تم

سلگاتے ہو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں ہم نے اس کو یاد رکھنے اور مسافروں کے فائدے کی چیز بنایا ہے پس آپ اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ کھیتی کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اگر وہ چاہے تو ہرے بھرے کھیت ایک دم میں خشک ہو جائیں اور کاشتکار ہاتھ ملتے رہ جائیں گے بادل سے شیریں پانی وہی برساتا ہے اگر وہ چاہیں تو سمندر کا شور پانی اسی شوریت کے ساتھ نازل ہوا کرے جو سمندر میں ہے مگر وہ اپنی رحمت سے اس کو صاف کر کے شیریں کر کے نازل کرتے ہیں ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بار بار سوال فرمایا ہے کہ بتلاؤ یہ کام تم کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں جس کا جواب کسی کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ تو اعیان کے متعلق گفتگو تھی میں کہتا ہوں کہ ہمارے افعال بھی ظاہر میں ہمارے معمول نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں ان کی علت بھی وہی ہیں اور ہماری طرف ان اعمال کی نسبت ایسی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں قلم دے کر پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر لکھا جائے اور دو چار حرف خوشنما لکھ کر بچہ کی تعریف کی جائے کہ شاباش بہت اچھا لکھا اب اگر بچہ سمجھدار ہے وہ جانے گا کہ میرا کمال کچھ نہیں بلکہ اس کا کمال ہے جس نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ لے رکھا تھا اور ناداں ہے تو جہالت سے ناز کرنے لگے گا۔ مگر جس وقت وہ دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ ہو جائیگا اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ وہ لکھنے پر کتنا قادر ہے اور اس میں کتنا کمال ہے۔ صاحبو! اسی طرح اپنے اعمال صالحہ واوصاف کمالیہ پر نادان ہی ناز کر سکتا ہے جس کو اپنا ہاتھ تو نظر آتا ہے اور دوسرا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اور جن کو دوسرے ہاتھ کا مشاہدہ ہو گیا ہے۔ ان کی نظر اپنے کمالات پر اصلاً نہیں ہوتی بلکہ یہ حال ہوتا ہے جیسے دیوار میں کسی نے میخ ٹھونکی دیوار نے میخ سے کہا کہ میرا سینہ کیوں پھاڑتی ہے میخ نے کہا کہ جو مجھ کو ٹھوک رہا ہے اس سے کہہ مجھ سے کیا کہتی ہے اور بعض پر یہ مشاہدہ اس درجہ غالب ہو جاتا ہے کہ وہ وحدۃ الوجود میں پھنس جاتے ہیں مگر محقق وہ ہے جو دونوں ہاتھوں کا مشاہدہ کرے خالق کا بھی کاسب کا بھی نہ صرف کاسب پر نظر کرے نہ صرف خالق پر بلکہ خالق و کاسب دونوں پر نظر کر کے فعل کو دونوں کی طرف منسوب کرے خالق کی طرف خلقاً اور کاسب کی طرف کسباً خوب سمجھ

لو۔ پس اس حقیقت کو حاصل کرنا چاہیئے جس کا سہل طریق دعا ہے کہ حق تعالیٰ سے ہر حاجت کو عرض کرو۔ آج سے اس کا التزام کرلو کہ جو بات ہوگی حق تعالیٰ سے عرض کیا کریں مگر آموختہ سا نہ پڑھو بلکہ جیسا حکام دنیا کے سامنے لجاجت اور خوشامد سے عرضی دیتے ہو اور حاکم کے سامنے زبانی عرض و معروض کرتے ہوئے ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہو اس طرح توجہ و خشوع کے ساتھ دعا کرو اور پختگی کے ساتھ درخواست کرو کہ اے اللہ ایسا کر ہی دیجئے یوں نہ کہو کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو ایسا کر دیجئے کیونکہ ان پر اکراہ کرنے والا کون ہے وہ تو بدون تمہارے اس سے کہے بھی اپنی مرضی کے موافق ہی کریں گے پس تم پختگی کے ساتھ درخواست کرو کیونکہ حدیث میں ہے ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء (فتح الباری :۱۱: ۹۵) (بے شک اللہ تعالیٰ دعا میں اصرار اور گڑگڑا کر دعا کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں) اور الحاح سے جو یہ وسوسہ مانع تھا کہ نہ معلوم دعا قبول ہو یا نہ ہو اس کو میں رفع کر چکا ہوں اور بتلا چکا ہوں کہ ایک اجابت تو یقینی ہے یعنی عرضی کا لے لینا اور اس کو توجہ سے سننا کیونکہ اجابت کو آیت میں قرب پر مرتب فرمایا گیا ہے اور قرب تعلق کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عرضی لے لی جاوے پس آیت میں اس کا وعدہ ہے اس سے آگے کا وعدہ نہیں بلکہ وہ انشاء کے مقید ہے۔ اب شبہات سب رفع ہو گئے تو عمل شروع کر دینا چاہئے۔

معمولی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو: اور کسی حاجت کے لئے بھی مت سوچو! کہ یہ تو معمولی سی بات ہے اس کے واسطے اللہ تعالیٰ سے کیا دعا کریں کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نمک تک مانگو اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شبہ کو رفع کیا ہے وہ یہ کہ بعض لوگ چھوٹی سی چیز مانگنی شان خداوندی کے خلاف سمجھتے ہیں جیسے سکندر سے کسی نے ایک روپے کا سوال کیا تھا سکندر نے کہا کہ۔ ایک روپیہ مانگنا میری شان کے خلاف ہے سائل نے کہا پھر سلطنت دیدو کہا یہ تیری شان کے خلاف ہے سلاطین دنیا کے مذاق پر قیاس کر کے بعض کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ بھی چھوٹی چیز کے سوال سے ناخوش ہوں گے مگر یہ غلط ہے کیونکہ سلاطین چھوٹی چیز کے سوال سے اس واسطے ناخوش ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک کوئی چیز بڑی بھی ہے اور حق تعالیٰ کے سامنے کسی چیز کی بھی کچھ وقعت نہیں ان کے

نزدیک عرش اور نمک کی ڈلی برابر ہے حالانکہ عرش اتنا بڑا ہے کہ ساتوں آسمان زمین اس کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ شیخ عبدالکریم جیلی بڑے صاحب کشف ہیں ان کو ایک دریا مکشوف ہوا ہے جس کی ایک ایک موج اتنی بڑی ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کو غرق کر دے مگر ملائکہ محافظ ہیں وہ اس کی موجوں سے زمین وآسماں کو بچاتے ہیں مگر عرش اس سے بھی بڑا ہے عرش کی برابر کوئی چیز نہیں ہے عرش کا پیدا کرنا اور نمک کی ڈلی کا پیدا کرنا خدا تعالیٰ کے نزدیک برابر ہے کیونکہ ان کو تو صرف حکم کرنا پڑتا ہے ایک کلمہ کن سے وہ عرش بھی بنادیتے ہیں اور نمک کی ڈلی بھی۔ پس جو شخص نمک کی ڈلی مانگنے کو شان خداوندی کے خلاف سمجھتا ہے وہ کسی چیز کو خدا تعالیٰ کے سامنے عظیم و وقیع بھی سمجھتا ہے اور یہ خیال غلط ہے اس لئے حق تعالیٰ سے ہر چیز مانگو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چھوٹی چیز کو بڑی سمجھ کر مانگو بلکہ مطلب یہ ہے کہ بڑی کو بھی چھوٹی سمجھو۔ صاحبو! جب خدا تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز آسان ہے کوئی چیز دشوار و مشکل نہیں تو اس سے کیوں نہیں مانگتے اصل یہ ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی قدر ہی نہیں مَا قَدَرُو االلّٰهَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ یہ گفتگو تو اعیان کے متعلق تھی کہ حق تعالیٰ کے نزدیک بڑی سے بڑی سے چیز بھی بے حقیقت ہے اور اب اعراض کے متعلق یہ بتلاتا ہوں کہ گناہ بھی بڑے سے بڑا حق تعالیٰ کی مغفرت ورحمت کے سامنے بے حقیقت ہے حدیث میں حق تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **یا ابن ادم لو اتیتنی بقراب الارض ذنوباً ثم استغفرتنی لغفرتھا لک ولا ابالی او کما قال** (الترغیب والترھیب للمنذری ۲: ۴۶۷ بلفظ آخر) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم اگر تو روے زمین کی برابر میرے پاس گناہ لیکر آئے پھر مجھ سے مغفرت چاہے تو میں سب گناہوں کو بخش دوں گا اور ذرا بھی (اس کثرت کی) پرواہ نہ کروں گا ہاں یہ ضرور ہے کہ توبہ استغفار کے وقت گناہ کا عزم کرلیا جائے کہ آئندہ گناہ نہ کریں گے مگر محققین کے نزدیک یہ بھی شرط نہیں بلکہ یہ عزم مستقل طاعت ہے صحت توبہ کا موقوف علیہ نہیں محققین کے نزدیک توبہ کی حقیقت صرف ندامت ہے جیسا حدیث میں ہے التوبۃ الندم (کنز العمال : ۱۰۲۸۳) ہاں یہ ضرور ہے کہ توبہ کے وقت مضاد توبہ کا عزم نہ ہو یعنی جس گناہ سے توبہ کررہا ہے توبہ کے وقت دل میں قصد نہ ہو کہ یہ گناہ پھر بھی کروں گا کیونکہ اس صورت میں ندامت کا تحقق نہ ہوگا پس

اگر اس وقت عزم ترک فی المستقبل نہ ہو تو عزم عمل فی المستقبل بھی نہ ہو بلکہ عزم عمل سے ذہن خالی ہو اگر خالی الذہن ہو کر بھی تو بہ ندامت کے ساتھ ہو تو توبہ صحیح ہوگی۔ پس توبہ کرتے ہوئے گناہوں کی کثرت کو نہ دیکھو نہ اس کو دیکھو کہ یہ گناہ تو آئندہ پھر بھی ہوگا بلکہ آئندہ سے ذہن کو خالی کر کے صرف ماضی پر نادم و پشیمان ہو کر توبہ کرو یہ بھی دعاء کی ایک اعلیٰ فرد ہے اس کا التزام کرو میں دعاء کی برکات کو بیان نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عملی شئے ہے اس کی برکات عمل کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے۔

دعا کا ایک حسی فائدہ

ہاں ایک حسی فائدہ بتلاتا ہوں کہ دعا سے یہ اثر ہر شخص کو فوراً محسوس ہوگا کہ پریشانی رفع ہو جائے گی اور باطنی نفع یہ محسوس ہوگا کہ حق تعالیٰ سے قرب خاص مشاہد ہوگا اللہ تعالیٰ سے جی لگیگا اللہ تعالیٰ کی یاد سے وحشت نہ ہوگی اللہ تعالیٰ سے بعد محسوس نہ ہوگا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِي کہ جب میں بندہ کہ ہر درخواست کو لے لیتا ہوں قبول کر لیتا ہوں تو بندوں کو بھی میری بات ماننا چاہئے۔ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ مجھ پر ایمان لانا چاہئے ۔اس پر شاید آپ یوں کہیں کہ جب اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں اجابت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ درخواست لے لیتے ہیں اور اس کو توجہ سے سنتے ہیں اور اعطاء مراد مقصود نہیں تو ہم استجابت کی بھی یہی معنی لیں گے کہ اللہ میاں آپ کے احکام سر آنکھوں پر ہم سب کو مانتے ہیں رہا عمل بالا حکام سو اس کی طلب آیت میں کہاں ہے۔

تلاوت کردہ آیت کی تفسیر

میں کہتا ہوں کہ استجابت کے یہی معنی لیجئے میں اپنی تفسیر سے رجوع نہ کروں گا میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس آیت میں صرف اتنی ہی بات کا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مان لو۔ اور وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ تفسیر ہے فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِي کی پس استجابت سے مراد ایمان لانا اور احکام الٰہیہ کو مان لینا ہے اب یہ آیت نظیر ہے دوسری آیت کی یعنی يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ.
(اے قوم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ

معاف کردینگے اور عذاب دردناک سے بچائیں گے۔) یہاں بھی اُجِیْبُوْا کی تفسیر آمِنُوْا سے وارد ہے اور اجابت و استجابت دونوں متحد المعنی ہیں پس آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہاں استجابت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کو مان لو یہاں عمل کا ذکر نہیں لیکن عدم ذکر سے یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ یہاں اعمال کی نفی کی گئی ہے ہرگز نہیں ہاں یوں کہو کہ سکوت ہے اس کا مضائقہ نہیں کیونکہ ایک آیت میں سب باتوں کا ذکر ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک بات کا حکم ایک آیت میں ہے دوسری باتوں کا دوسری آیتوں میں ہے پس فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ کو اجابت بالمعنی الاول پر محمول کرنا تو صحیح مگر اس سے عمل کی نفی کرنا غلط جیسا کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں ہم نے بھی اجابت بالمعنی الثانی کی نفی تو نہیں کی بلکہ اس سے اس آیت کو ساکت مانا ہے پھر تم نفی کے عمل کی زیادت کیسے کرتے ہو۔ دوسرے اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں تو سکوت عن عطاء المراد کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ تمہاری درخواست بعض دفعہ مناسب خلاف مصلحت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں یہ بات نہیں ہے تو ہم کو یہ بھی حق ہے کہ ہم فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ کو طلب عمل سے ساکت نہ مانیں کیونکہ جو احکام سراپا خیر اور سراپا مصلحت ہیں ان کے ماننے کے معنی یہی ہیں کہ ان کے موافق عمل کیا جائے۔ اس کے بعد ارشاد ہے لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ بظاہر یہ سب امور مذکورہ کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ بندوں کو میرے قرب علمی اور قرب تعلق سے اطلاع دیدی جائے تا کہ وہ اس کو معلوم کر کے میرے پاس احکام کو بھی مانیں اور اس مجموعہ سے توقع ہے کہ ان کو صواب و رشد حاصل ہو جائے گا۔ یہ جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ صواب و رشد یہی ہے کہ حق تعالیٰ سے اس طرح معاملہ کیا جائے کہ اعتقاداً ان کو اپنے پاس سے قریب سمجھے اور عملاً اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور دعا کرنے کی عادت کی جائے اب یہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد

وعلی الہ واصحابہ اجمعین واخردعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

الفصل والانفصال
فی
الفعل والانفعال

یہ وعظ ۲۲ شوال ۱۳۴۶ھ بمقام مکان حضرت حکیم الامتؒ تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے کرسی پر بیٹھ کر ساڑھے تین گھنٹے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی مستورات بھی تھیں جس کو مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اس کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر داروگیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے۔ جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب ہم پر کوئی ایسا بار (دنیا یا آخرت کا نہ ڈالئے جسکی ہم کو سہار نہ ہو اور درگزر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں آپ ہمیں کافروں پر غالب کیجئے۔

تمہید

یہ مضمون اہل علم، اہل عمل اور اہل حال سب کیلئے مناسب ہے

میں نے برکت کیلئے سب آیتیں پڑھ دی ہیں مگر مقصود بالبیان صرف اول کے جملے

ہیں ہر چند کہ یہ مضمون اہل علم کے زیادہ مناسب ہے اور ان میں سے بھی زیادہ مناسب ان کے ہے جو اہل عمل ہیں اور اہل عمل میں بھی اہل حال کے زیادہ مناسب مگر سب مسلمان فی الجملہ علم و حال سے متصف ہیں ہی اس لئے فی الجملہ یہ مضمون سب کے مناسب ہے گو بظاہر خشک مضمون ہے مگر ضرورت کی وجہ سے تر مضامین پر مقدم اور ان سے اہم ہے اور یہ مضمون مختصر بھی ہے اور عمل میں سہل بھی ہے ان وجوہ سے بھی یہ اہم ہے کہ ضرورت کا بھی ہے مختصر بھی ہے سہل بھی ہے اس لئے بھی اختیار کیا گیا کہ طبیعت کسلمند ہے بیان کا قصد تو بالکل نہ تھا مگر بعض مہمانوں کی خاطر قصد کر لیا گیا۔ اور ارادہ کے بعد خیال یہ ہوا تھا کہ مدرسہ میں بیان کروں مگر بعض مہمان مستورات بھی ہیں ان کو بھی سنانا چاہا اس لئے گھر میں بیان تجویز ہوا گو مستورات سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اس کو سمجھ سکیں گی مگر توکلا علی اللہ یہ ارادہ کر لیا گیا کیونکہ مستورات کو بعض احوال تکوینیہ ایسے پیش آتے ہیں جن کی تعدیل کیلئے یہ مضمون زیادہ مناسب ہے گو ان کی سمجھ میں بھی نہ آئے تاہم احکام شرعیہ میں کچھ ایسا لطف ہے کہ جس کی وجہ سے ہر سننے والے پر ان کا اثر ہوتا ہے گو وہ کسی کے سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ احکام شرعیہ طبعاً دل میں گھر کر لیتے ہیں اس لئے مجمع مستورات کو بھی فائدہ کی امید ہے کیونکہ مضمون فی نفسہ سہل ہے گو بعض مقدمات دقیق ہیں جو غیر اہل علم کی فہم میں نہ آئیں مگر اصل مضمون کچھ دقیق نہیں اور عملاً تو بہت ہی سہل ہے۔ یہ ایک اجمالی حاصل ہے مضمون کا اور اس کے محرک کا اور اسکے سبب اختیار کا اب میں وہ مسئلہ بیان کرتا ہوں اور جو غلطی اس میں کی جاتی ہے اس کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ جو آیات میں نے تلاوت کی ہیں یہ مسئلہ ان کے ابتدائی جملوں کا مدلول ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو میں اکثر بیان کیا کرتا ہوں گو جس طرح آج اس آیت کے تحت میں سمجھ میں آیا ہے اس طرح کبھی بیان نہیں ہوا اس لئے اس میں گونہ جدت بھی ہے کیونکہ طرز بیان کے جدید ہونے سے بھی مضمون میں کسی قدر جدت آجاتی ہے مگر جدت فی نفسہا مطلوب نہیں۔

مضمون میں جدت کا نہ ہونا فی نفسہ رحمت ہے

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جدت نہ ہونا رحمت حق ہے۔ کیونکہ جدید محض ذہن سے مانوس نہیں ہوتا اور غیر جدید مانوس ہوتا ہے اور جس بات سے ذہن کو انس ہوتا ہے وہ جلدی دل میں

گھر کرلیتی ہے پس تعلیمات شرعیہ کا پرانا ہونا اور سبق کہنہ ہونا ہمارے لئے رحمت ہے اگر احکام شرعیۃ جدید محض ہوتے تو ذہن سے مانوس نہ ہوتے اور غیر مانوس سے طبیعت اچٹتی ہے پس جو لوگ بیان میں جدت کے طالب ہیں وہ گویا مضمون غیر مانوس کے طالب ہیں۔ اب مقصود کو سنئے کہ حاصل اس مضمون کا جن کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ امور اختیاریہ قابل توجہ ہیں اور امور غیر اختیاریہ غیر قابل توجہ ہیں اس کے بعد سمجھئے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں ایک اعمال یہ تو اختیاری ہیں جن میں بعض اعمال تو کرنے کے ہیں اور بعض بچنے کے ہیں مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج وغیرہ یہ اعمال تو کرنے کے ہیں اور غیبت نہ کرنا تکبر نہ کرنا کسی کا مال غصب نہ کرنا قرض نہ مارنا یہ اعمال کف کے متعلق ہیں کیونکہ کسی عمل سے بچنا بھی عمل ہے اعمال عدمیہ من حیث العدم تو عمل نہیں لیکن من حیث الکف عمل ہیں۔ دوسرے احوال ہیں یہ اختیاری ہیں۔

احوال قابل توجہ نہیں

پس حاصل ہوا کہ اعمال قابل توجہ ہیں اور احوال قابل توجہ نہیں کیونکہ اعمال سب اختیاری ہیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنہ۔

لوگ اعمال باطنہ کا اہتمام نہیں کرتے

یہ تعمیم اس لئے کی کہ بعض لوگ اعمال ظاہرہ کا تو اہتمام کرتے ہیں مثلاً نماز، روزہ کا مگر اعمال باطنہ کا اہتمام نہیں کرتے مثلاً خدا سے محبت کرنا حالانکہ شرعاً یہ بھی مثل نماز کے ضروری ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ اور انکے رسول ﷺ سے محبت کی کمی پر اظہار افسوس

بدوں محبت حق کے نماز بھی نماز نہیں مگر لوگوں کو اس کا اہتمام نہیں چنانچہ دل کو ٹٹول کر نہیں دیکھتے کہ اس میں خدا کی محبت کتنی ہے اور یہ بہت بڑی کوتاہی ہے۔ حدیث میں ہے

لایکون احدکم مؤمنا حتی یکون اللّٰہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما۔

ترجمہ:۔ کوئی تم میں سے مومن نہ ہوگا جب تک اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس کے نزدیک سب ماسوائے یعنی اپنے نفس اور مال اور اہل وعیال سب سے زیادہ محبوب نہ بن جائیں۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس میں کوئی تاویل نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ کسی نص کے معارض نہیں

اور تاویل تعارض ہی کی وجہ سے کی جاتی ہے اب ہر شخص دیکھ لے کہ اس کے دل میں اللہ ورسول کی محبت زیادہ ہے یا برادری واہل وعیال کی بعض کو تو اس کی فکر ہی نہیں اور جن کو انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ محبت تو غیر اختیاری ہے۔ جب ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہے تو کیا کریں اور بعض نے سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی صورت تو یہ ہے کہ گھر بار بیوی بچے چھوڑ کر ایک حجرہ میں بیٹھ جاؤ اور یہ نہیں ہو سکتا پس محبت الٰہی کا حاصل ہونا محال ہے اور محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ پس یہ حساب اپنے دل میں لگا کر بیٹھ گئے اور تحصیل محبت الٰہیہ میں سعی چھوڑ دی۔ رہا یہ کہ ترک محبت پر اللہ تعالیٰ مواخذہ فرمائیں گے سو اس کا اول تو ان کو وہم ہی نہیں ہوتا اور کچھ خیال ہوتا ہے تو دل کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ قیامت میں کہہ دیں گے کہ یا اللہ جیسے اور گناہ آپ معاف فرمائیں گے ویسے ہی اس گناہ کو بھی معاف فرما دیجئے مگر افسوس دنیا کے متعلق کسی نے یہ حساب نہیں لگایا جس طرح عذاب آخرت کے متعلق دل کو یہ سمجھا لیا ہے کہ کٹ پٹ کر ایک دن نجات ہو ہی جائے گی اسی طرح دنیا کے متعلق دل کو سمجھانا چاہئے تھا کہ اگر دنیا میں راحت نہ ہوتی تو بلا سے ایک دن سب تکالیف کا خاتمہ ہو ہی جائے گا بلکہ دنیا کے متعلق یہ حساب اھون تھا کیونکہ دنیا کا زوال وانقطاع قریب وقت میں مشاہدہ ہے اور آخرت میں ایک دن کو بھی عذاب ہو گیا تو آخرت کا ایک دن ہزار سال کے برابر ہے۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. اور اگر خدانخواستہ دو چار دن کے لئے تو عذاب ہوا تو پھر کیا ٹھکانا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ دنیا کی تکالیف کا تو تحمل نہیں اور یہاں ہر شخص اپنے لئے راحت ہی تجویز کرتا ہے حالانکہ دنیا کی راحت و تکلیف چندروزہ ہے اور آخرت کی تکلیف وعذاب سے اس قدر یہ بے فکری ہے کہ اس کے لئے ہر شخص نے اپنے دل میں ایک حساب لگا رکھا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا سے ترک تعلق کر کے جنید وشبلی بن جاؤ میں تو اس کا متمنی ہوں کہ مسلمان بن جاؤ۔ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ آجکل اکثر مسلمانوں کا ایمان کمزور ہے کہ نہ خدا ورسول کی محبت کی فکر ہے نہ آخرت کا خوف ہے۔ ایک مہینہ کی جیل سے جتنی وحشت ہے۔ عذاب جہنم کا اتنا بھی خوف نہیں۔

اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کے بغیر کوئی آدمی مومن نہیں ہو سکتا

اب سنئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس حدیث میں مطلقاً فرماتے ہیں

لایؤمن احدکم جس کا مطلب یہ ہے بدوں اللہ و رسول کی محبت کے آدمی مومن ہی نہیں ہوتا۔ اگر خوارج و معتزلہ نہ ہوتے جو مرتکب کبیرہ کو کافر یا لامومن و لاکافر کہتے ہیں تو علماء کو اس حدیث کی تقیید کی کچھ ضرورت نہ تھی کیونکہ تقیید کے بعد وہ اثر نہیں ہوتا جو اطلاق کا اثر ہوتا ہے مگر حضرات علماء جو تقیید بضرورت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دوسرے نصوص کو ملا کر یہ معلوم ہو گیا کہ مقصود مقید ہے تو اعتقاد تقیید کا رکھو مگر اثر اطلاق کا لو۔ رہا یہ کہ لفظی اطلاق کا اثر ہی کیا ہو گا جب کہ اعتقاد تقیید کا ہے۔

تاثیر الفاظ کے دلائل

تو میں کہتا ہوں کہ الفاظ کا اثر بھی بہت ہوتا ہے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجائے من ترک الصلوة متعمدا فقد کفر کے فقد عصیٰ (کنز العمال: ۵۰۰۸) فرماتے میرے پاس تاثیر الفاظ کے دلائل موجود ہیں کہ باوجود اتحاد معنی کے الفاظ کا اثر جدا ہوتا ہے جیسے باپ کو قبلہ و کعبہ کہو تو اور اثر ہے۔ ابا کہو تو اور اثر ہے اور ماں کا خصم کہو تو جدا اثر ہے۔ بتلایئے یہ کس چیز کا اثر ہے معنی کا اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ معنی سب کے متحد ہیں یہ اختلاف اثر محض اختلاف لفظ کی وجہ سے ہے۔ مجھے خود ایک واقعہ پیش آ چکا ہے کہ ایک زمانہ میں مجھے اختلاج قلب کا مرض ہوا اور قوت اس درجہ سلب ہو گئی کہ ایک طبیب نے قارورہ دیکھ کر یہ کہا کہ حیرت ہے یہ شخص زندہ کیونکر ہے قارورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرارت غریزیہ بالکل فنا ہو گئی۔ قارورہ لے جانے والے میرے ایک دوست تھے انہوں نے یہ قول مجھ سے آ کر کہہ دیا میں ان پر بہت خفا ہوا کہ تم کو مریض سے ایسی بات نہیں کہنا چاہئے تھی وہ نادم ہوئے اور کہنے لگے کہ اب تو غلطی ہو گئی اس کا تدارک کیونکر ہو میں نے کہا اس کا تدارک یہ ہے کہ تم یہاں سے واپس جاؤ اور کچھ دور سے لوٹ کر آؤ اور مجھ سے یوں کہو کہ میں نے پہلے جو بات کہی تھی وہ غلط تھی حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ حالت اچھی ہے خطرہ نہیں ان شاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ وہ دوست کہنے لگے میرے اس کہنے سے کیا تدارک ہو گا جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ ہی کا پڑھایا ہوا سبق آ کر سنا دوں گا۔ میں نے کہا تم نہیں جانتے اللہ نے الفاظ میں بھی خاص اثر رکھا ہے چنانچہ وہ گئے اور تھوڑی دیر میں آ کر وہی الفاظ کہے جو میں نے سکھلائے تھے۔ تو میں

نے اس وقت اپنے اندران الفاظ کا اثر خود محسوس کیا اور دیکھتا تھا کہ ان الفاظ کے سننے سے وہ وحشت جاتی رہی جو پہلے حکیم صاحب کا قول سنکر پیدا ہوئی تھی پھر خدا کے فضل وکرم سے چند روز ہی مجھے صحت ہوگئی۔ تو جب اپنے پڑھائے ہوئے الفاظ میں اتنا اثر ہے تو غور کیجئے کہ جو الفاظ اپنے سکھلائے ہوئے بھی نہیں ہیں ان کا کیا اثر ہوگا گو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مراد کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے فقد کفر فرمایا ہے فقد عصی نہیں فرمایا گو مطلب وہی ہے جو فقد عصی کا ہے مگر فقد کفر میں خاص اثر ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا ورسول کی محبت کے متعلق لایؤمن فرمایا ہے کہ اس کے بغیر آدمی مومن نہیں ہوتا اب بتلایئے اس کی فکر کیوں نہیں ہے۔

دل میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ٹٹولنے کا معیار

ٹٹول کر دیکھو کہ دل میں اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت زیادہ ہے یا بیوی بچوں کی شاید تم کہو کہ تعارض آثار سے دونوں طرف ذہن جاتا ہے اس کا معیار بتلاؤ جس سے فیصلہ کیا جائے تو وہ معیار یہ ہے جس معاملہ میں ایک طرف اللہ اور رسول کا حکم ہو اور ایک طرف اپنے نفس کی یا بیوی بچوں کی خواہش ہو تو اس وقت یہ دیکھو کہ تم کس کو ترجیح دیتے ہو اگر تم نے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ترجیح دی تو بے شک تم کو اللہ ورسول کی محبت ہے گو جوش وخروش نہ ہو کیونکہ محبت کے الوان ہیں اس کو صوفیہ نے اچھی طرح سمجھا ہے ورنہ اہل ظاہر تو سب کو کافر ہی بنادیتے کیونکہ ان کے نزدیک تو محبت جوش وخروش ہی کا نام ہے اگر جوش نہ ہو تو ان کے نزدیک محبت ہی نہیں تو وہ سب کو محبت سے خالی کہتے۔

محبت کے دو الوان

مگر صوفیہ نے کہا ہے کہ محبت کے دولون ہیں ایک شوق کا رنگ ہے اس میں جوش وخروش ہوتا ہے ایک لون انس کا ہے اس میں جوش وخروش نہیں جیسے ایک محبت چھوٹے بچہ سے ہوتی ہے ایک بڑے لڑکے سے دونوں کا لون مختلف ہے۔

انس سے متعلق احادیث مختلفہ میں تطبیق

ایسی تحقیق سے محققین نے احادیث مختلفہ میں تطبیق دی ہے کہ بعض احادیث میں ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا من احب الناس الیک کہ آپ کو دو آدمیوں میں کس سے محبت بہت زیادہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں کبھی تو فرمایا کہ حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور کبھی حضرت فاطمہ کا نام لیا اور بعض روایات میں ابوبکر صدیقؓ کا نام آیا ہے۔ محققین نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ محبت کے الوان وانواع ہیں۔ ایک نوع محبت کی وہ ہے جو بیوی سے ہوتی ہے اس نوع میں حضرت عائشہؓ کے مساوی کوئی نہیں۔ ایک نوع محبت کی وہ ہے جو اولاد سے ہوتی ہے۔ اس میں حضرت فاطمہؓ کے برابر کوئی نہیں ایک نوع وہ ہے جو دوستوں سے ہوتی ہے اس نوع میں حضرت صدیقؓ کے برابر کوئی نہ تھا وعلی ہذا القیاس۔

محبت کے لئے جوش وخروش کی ضرورت نہیں

غرض محبت کیلئے جوش وخروش کی ضرورت نہیں بدوں اس کے بھی محبت ہو سکتی ہے پس جو شخص اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو اپنی نفسانی خواہش اور بیوی بچوں کی خواہش پر ترجیح دے اس کو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی درجہ کی محبت حاصل ہے گو جوش نہ ہو اور جو اپنے نفس یا اہل وعیال کی خواہش کو ترجیح دے اس کو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ محبت نہیں تو کیا اب کیا یہ بات فکر کی نہیں کہ ہم کو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہے یا نہیں۔

اعمال کی دو قسمیں

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اعمال دو قسم کے ہیں ظاہرہ ہوں یا باطنہ اور آجکل بہت لوگوں کو اعمال باطنہ کی فکر نہیں نیز میں نے کہا تھا کہ اعمال سب اختیاری ہیں۔ اس لئے اعمال سب کے سب قابل توجہ ہیں اور جو لوگ محبت الٰہی کو دشوار یا محال سمجھے ہوئے ہیں یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ انہوں نے محبت الٰہی کی حقیقت یہ سمجھی ہے کہ تعلقات دنیویہ کو کلیتہً ترک کر دیا جائے بیوی بچوں کو چھوڑ کر ایک حجرہ سنبھال لیا جائے یہ خیال جاہلانہ ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کسی کو اللہ تعالیٰ سے محبت نہ تھی اور انبیاء علیہم السلام اکثر صاحب ازواج وذریۃ تھے اور کسی نے بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ نہیں سنبھالا بلکہ سب ان کے حقوق کو اہل دنیا سے زیادہ ادا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ

اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً وقال وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ اورحدیث میں ہے ۔ان من اکمل المؤمنین ایما نا احسنهم خلقا والطفهم باهله. (سنن الترمذی: ۲۶۱۲) (رواہ الترمذی) تم میں کامل الایمان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ خلق ولطف سے پیش آوے۔

بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ سنبھالنا معصیت ہے

پس خوب سمجھ لو کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ سنبھالنا محبت الٰہی نہیں بلکہ معصیت حق ہے محبت الٰہیہ ان کو چھوڑنے کا امر نہیں کرتی بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی دل داری دلجوئی کا امر کرے گی۔ یہ گفتگو تو اعمال کے متعلق تھی۔ایک دوسری چیز انسان کے اندر اور ہے جس کا نام حال ہے جیسے شوق وجذب ووجد وغیرہ یہ اختیاری نہیں ہیں وہبی ہیں اور صاحب حال وغیر صاحب حال میں تفاوت یہ ہے کہ غیر صاحب حال کو مثلاً رشوت سے نفرت تو ہوتی ہے مگر ایسی نہیں جیسے گوہ سے اور صاحب حال کو گناہوں سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسی نجاست ظاہرہ سے اس لئے احوال کے محمود ہونے میں کلام نہیں مگر وہ مقصود نہیں ہیں کیونکہ غیر اختیاری ہیں اسی لئے مقصود ان پر موقوف نہیں مثلاً مقصود گناہوں سے بچنا ہے تو یہ بدوں حال کے بھی حاصل ہو سکتا ہے گو بدوں حال کے گناہوں سے ایسی نفرت نہ ہوگی جیسی گوہ سے مگر ایسی نفرت تو ہو سکتی ہے جیسی سنکھیا سے سو گناہوں سے بچنے کیلئے اتنی نفرت بھی کافی ہے اسی طرح مصیبت کے وقت صبر مطلوب ہے کہ اس کو خدا کا تصرف سمجھ کر راضی رہے اور دل میں خدا سے شکایت نہ لائے نہ ظاہر میں جزع فزع کرے یہ تو اعمال اختیار میں سے ہے جس کے مکلف ہم سب ہیں اب بعض لوگ کسی عزیز کی موت کے وقت صبر کر کے اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ہم کو اس کا خیال ہی نہ آئے تو یہ غیر اختیاری ہے۔غلبۂ حال میں ایسا بھی ہو جاتا ہے مگر حال اپنے اختیار میں نہیں۔

دینداروں کی غلطی

اب دینداروں کی غلطی یہ ہے کہ جس میں عوام بھی بعض دفعہ مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو اعمال سے زیادہ احوال کا اہتمام ہو جاتا ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا صبر آئے کہ عزیز کے مرنے کا خیال ہی دل سے نکل جائے۔اور نماز میں ایسا دل لگے کہ ڈھول بھی بجتے

ہوں تو خبر نہ ہو اسی لئے ذاکرین شیوخ سے کہتے ہیں کہ ذکر میں دل نہیں لگتا ذکر کر کے جی پھیکا پھیکا رہتا ہے۔ تہجد کا ہم کو ایسا اہتمام نہیں جیسا اسٹیشن پر جانے کا اہتمام ہوتا ہے یا تہجد و ذکر کے ناغہ ہونے کا اتنا قلق نہیں ہوتا جتنا مال چوری ہوجانیکا قلق ہوتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سالکین نے اعمال صالحہ کی بے قدری شروع کردی کہ جب نماز میں بیوی بچوں کا خیال آگیا تو وہ نماز ہی کیا ہوئی یہ شخص ناشکری میں مبتلا ہوگیا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ نماز کو اپنی نماز سمجھے اور اس کو اپنا کمال سمجھے کیونکہ نماز تو اپنی جب ہوتی کہ اپنے اسباب سے کام لیا ہوتا یہاں تو اعضاء وارادہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں اپنی حیثیت سے تو نماز وغیرہ کچھ بھی نہیں۔

عطائے حق ہونے کی وجہ سے اعمال صالحہ قابل قدر ہیں

مگر دوسری حیثیت سے یہ اعمال قابل قدر ہیں یعنی عطائے حق ہونے کی وجہ سے یہ نماز وروزہ جس درجہ میں بھی ہے قابل قدر ہے (مصرعہ) بلا بودے اگر ایں ہم نبودے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک چمار کو بادشاہ موتی دیدے تو وہ اپنے کو چمار ہی سمجھے گا مگر اس کے ساتھ ہی موتی کو موتی بھی سمجھے گا یہ نہیں کہ اپنے چمار ہونے کیوجہ سے موتی کو بھی ٹھیکرا سمجھنے لگے۔ یا موتی کو موتی سمجھنے سے اپنے کو چمار نہ سمجھے۔ بس یہ مطلب ہے شکر کا کہ اپنے کو تو چمار سمجھو مگر اعمال صالحہ عطائے حق ہونے کی وجہ سے قابل قدر سمجھو اور نعمت حق کی بے قدری نہ کرو مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی الہ اباد میں ایک بزرگ محمدی شاہ صاحب تھے جو ولایتی تھے اور مجرد بھی تھے الہ آباد والے بھی کہتے تھے کہ رات کو جب یہ ذکر کرتے ہیں تو سارا شہر گونج جاتا ہے۔ بہت لوگ ان کے معتقد تھے اور اکثر اہل مقدمات ان کے پاس بہت جاتے تھے اور بعضے بزرگوں کے پاس طالبان دین زیادہ جاتے ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کہ لوگ کسی کے پاس دین کی طلب کو جائیں بحمد اللہ ہمارے حضرات کے پاس اکثر اہل دین اور طالب آخرت ہی آتے ہیں میں بھی ایک دفعہ والد صاحب کے ساتھ ان بزرگ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ والد صاحب کیوں گئے تھے کسی مقدمہ کی وجہ سے دعاء کیلئے گئے تھے یا محض زیارۃ اہل اللہ کا قصد تھا ان بزرگ کا ایک واقعہ حافظ عبدالرحمن صاحب بگھروی بیان کرتے تھے کہ وہ ایک شخص کے ساتھ ان بزرگ کے

پاس حاضر ہوئے ۔ اس دوسرے شخص کو محمدی شاہ صاحب جانتے تھے ان سے حافظ عبدالرحمٰن صاحب کی تعریف پوچھی تو انہوں نے کہا یہ حافظ بھی ہیں حاجی بھی ہیں ذاکر شاغل بھی ہیں ۔اس پر حافظ عبدالرحمٰن صاحب نے تو اضعاً کہہ دیا کہ حضرت میں تو کچھ بھی نہیں یہ سنکر محمدی شاہ صاحب بگڑ گئے اور فرمایا اچھا تو تم حافظ نہیں ہو تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا حفظ قرآن سلب کرلیں اور تمہارا حج باطل ہو جائے ۔حافظ عبدالرحمٰن کہتے تھے کہ انہوں نے میری ایسی خبر لی کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا اور اس کے بعد جب کبھی حافظ جی ان کے پاس حاضر ہوتے تو کہتے آؤ ناشکرا آؤ ناشکرا۔انہوں نے ان کا لقب ہی ناشکرا رکھ لیا۔ غرض ہمارے اعمال میں دو حیثیتیں ہیں اور اس کو اہل علم اچھی طرح سمجھیں گے ۔اسی لئے کچھ درسی کتابوں کے پڑھنے کی بھی ضرورت ہے ۔پس ہماری حیثیت تو یہ اعمال کچھ نہیں ہیں مگر دوسری حیثیت سے قابل قدر ہے کہ عطاء حق ہیں گو وہ ٹوٹا ہی ہو ابریں دے دیں۔ پس سالکین پر تو احوال کے مقصود سمجھنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے اعمال کی بے قدری کرنے لگے اور عوام پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے عمل ہی کو چھوڑ دیا کہ جب نماز میں خیالات دنیویہ کا سلسلہ بند نہیں ہوتا تو ایسی نماز کو کیا کریں سالکین تو عمل کے بعد معطل ہوئے تھے۔

نماز کا شوق پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے

عوام کو قبل عمل ہی کے تعطل ہو گیا۔ چنانچہ یہ لوگ کسی بزرگ کے پاس جائیں گے تو یہ کہیں گے کہ کوئی ایسی تدبیر بتلا دیجئے کہ نماز کا شوق ہو جائے حالانکہ شوق ہوتا ہے نماز پڑھنے ہی سے نماز تو یہ چاہتی ہے کہ یہ اس کو پڑھیں تو شوق پیدا ہو اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے شوق ہو جائے تو نماز پڑھیں۔اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص چاہے کہ کھانا پختہ ہو جائے مگر جو اسباب ہیں پختہ ہونے کے ان کو جمع نہ کرے تو کیسے پختہ ہو گا البتہ ایسا پختہ ہو جائے گا جیسے ایک مسخرہ کی حکایت ہے کہ اس کو رس کی کھیر کا شوق ہوا لوگوں سے ترکیب پوچھی معلوم ہوا کہ چاول اور رس کو ملا کر آگ پر پکانا پڑتا ہے اور گھوٹنا بھی پڑتا ہے کہنے لگا یہ تو بکھیڑا ہے آپ نے کیا کیا چاول کچے پھانک کر اوپر سے رس پی لیا اور چولہے کی طرف سرین کر کے کھڑا ہو گیا کہ آنچ لگ کر کہ پیٹ میں سب پک جائے گا تو جیسے اس شخص کی

کھیر پک گئی تھی ایسا ہی ان لوگوں کا شوق حاصل ہوگا جو بدوں عمل کے شوق کے طالب ہیں اور اس غلطی کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ بدوں حال کے عمل کو کالعدم سمجھتے ہیں اور یہ ناس کیا ہے واعظوں نے جو اپنے وعظوں میں علی الاطلاق کہہ دیتے ہیں

برزباں تسبیح و دردل گاؤخر　　　　این چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر اللہ کا نام اور دل میں دنیا کا خیال۔ ایسی عبادت کیا اثر رکھتی ہے۔

اگر یہ لوگ محقق سے رجوع کرتے تو کبھی یہ حالت نہ ہوتی مگر غیر محقق واعظوں کی تعلیم نے مخلوق کا ناس کردیا ان کی یہ حالت ہے کہ۔

ایک واعظ کے دیہاتی کو روزہ سے محروم کرنے کی حکایت

ایک واعظ نے رمضان میں کسی دیہاتی سے کہا کہ آج روزہ رکھا ہے کہا ہاں رکھا ہے کہا نیت بھی کی تھی کہا ہاں کی تھی پوچھا کس طرح کی تھی اس نے بتلایا کہ سحری کھاتے ہوئے دل میں خیال کرلیا تھا کہ کل کو روزہ رکھیں گے واعظ صاحب بولے کہ یوں نہیں بلکہ زبان سے یوں کہنا چاہئے۔ نویت الصوم للہ تعالیٰ غدا۔ دیہاتی نے کہا بہت اچھا اب سے یوں کہا کروں گا۔ اگلے دن واعظ صاحب نے دیکھا کہ چودھری چوپال میں بیٹھے ہوئے حقہ بجا رہے ہیں کہا میاں یہ کیا؟ رمضان میں حقہ پیتے ہو کیا روزہ نہیں ہے کہا نہیں آج روزہ نہیں رکھا کیونکہ نیت یاد نہیں ہوئی جب نیت یاد ہو جائے گی تب روزہ رکھوں گا۔ دیکھئے اس واعظ نے بیچارے دیہاتی کا کیسا ناس کیا کہ اس کو روزہ سے محروم کردیا بس ان کی وہ حالت ہے جو اناڑی حکیم کی حالت ہوتی ہے چنانچہ ایسے ہی حکیم نے ایک بیمار کو مسہل دیا تھا نہ معلوم کیا خاک بلا دے دی کہ غریب کو بے انتہا دست آگئے حکیم صاحب کو مسہل دینا تو آتا تھا مگر دست بند کرنے کی ترکیب معلوم نہ تھی ۔ تیمار داروں نے آکر اطلاع کی کہ دست بہت آرہے ہیں بند نہیں ہوتے کہا کچھ ڈر نہیں مادہ فاسد ہے نکلنے دو۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع کی کہ بہت ضعف ہوگیا ہے کہا کہ کچھ ڈر نہیں مادہ فاسد نکلنے دو۔ پھر اطلاع کی کہ اس کو تو نزع کی سی کیفیت طاری ہے کہا مادہ فاسد ہے نکلنے دو۔ پھر اطلاع دی کہ وہ تو مر بھی گیا تو آپ فرماتے ہیں اللہ رے مادے جس کے نکلنے سے مر گیا اگر وہ اندر رہتا تو کیا ہوتا ۔ یہ

ویسا ہی جواب ہے جیسے بوجھ بجکو نے جواب دیا تھا جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک گاؤں میں ایک شخص تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا۔ چڑھ تو گیا مگر اترنا جانتا نہ تھا۔ لگا چلانے کہ مجھے اتارو گاؤں والے سارے بیوقوف تھے۔ کسی کی سمجھ میں تدبیر نہ آئی تو بوجھ بجکڑ کو (یعنی گاؤں کے عاقل کو) بلایا گیا۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے کہ بس تدبیر سمجھ میں آگئی۔ ایک لمبا سا رسہ لاؤ اور اس کے پاس پھینکو کہ اس کو اپنی کمر سے مضبوط باندھ لے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اس کے بعد حکم دیا کہ زور سے جھٹکا دو۔ چنانچہ یہ بھی کیا گیا وہ نیچے تو آ گیا مگر روح اوپر کو اڑ گئی۔ گاؤں والے بوجھ بجکڑ کے سر ہو گئے کہ یہ کیا ہوا تو آپ جواب دیتے ہیں کہ اس کی قسمت میں نے تو بہت آدمیوں کو اسی تدبیر سے کنویں سے نکالا ہے۔ بس یہی حالت آج کل کے واعظوں کی تعلیم کی ہے تحت کو فوق پر قیاس کرتے ہیں اور عوام کا ناس کرتے ہیں ان ہی لوگوں کی نسبت عارف فرماتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود　　گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

جب کمزوروں کو طلب کی خواہش ہو اور قوت نہ ہو۔ تو ان پر ظلم کرنا اچھا نہیں ہے۔

واقعی ایک کاروباری آدمی کو یہ مجاہدہ بتلانا کہ چالیس دن تک تجارت و زراعت و اہل و عیال سے الگ ہو کر ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے۔ بیداد و ظلم ہے بلکہ ہر شخص کو اس کے مناسب حال طریقہ بتلانا چاہئے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چار پا را قدر طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

چوپایوں پر طاقت اور اندازہ سے بوجھ رکھنا چاہئے۔ کمزوروں سے ہمت کے موافق کام لینا چاہئے۔

نان و حلوا کے شعر میں تبدیلی

اس طرح واعظوں نے یہ شعر پڑھ پڑھ کر ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

عوام کو نماز وغیرہ سے متوحش کر دیا ہے۔ یہ شعر مثنوی کا نہیں بلکہ نان و حلوا کا ہے جس کا مصنف شیعی ہے مگر نقال صوفی ہے کیونکہ ہر فن میں نقال بھی ہوتے ہیں اس لئے میں نے اس شعر کو یوں بدلا ہے ؎

برزباں تسبیح ودردل گاؤخر   ایں چنیں تسبیح ہم داردا ثر

یعنی گو نماز میں گاؤخر کے وسواس آتے ہوں مگر پھر بھی نماز تسبیح کا اثر ضرور ہوتا ہے بیکار نہیں ہے ہاں ایک ذرا سی شرط ہے اور کیمیا تو ایک ہی چٹکی سے بنتی ہے وہ یہ کہ نماز و تسبیح کے وقت یہ ارادہ رکھو کہ اس نماز سے ہمارے وسواس و خطرات بھی دور ہو جاویں نماز کا شوق بھی پیدا ہو جائے۔ پھر اسی نماز سے ایک دن یہ حال ہوگا۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور   کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

کنعان سے گم ہوا یوسف واپس آجائیگا فکر نہ کر۔ یہ اجڑا ہوا مکان ایک دن باغ ہو جائے گا فکر نہ کر۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و مے خراش   تادم آخر دمے فارغ مباش

اس راستہ میں خوب کوشش کر آخر دم تک بے کار مت رہ

تادم آخر دمے آخر بود   کہ عنایت باتو صاحب سر بود

جب تیرا وقت موت کا قریب آجائے۔ شاید اللہ تعالیٰ تجھ پر عنایت فرمائیں۔

سلوک جذب سے مقدس ہے:

صاحبو! اعمال احوال سے مقدم ہیں۔ حصول احوال کا طریق یہ ہے کہ اعمال میں لگ جاؤ بدوں اس کے احوال حاصل نہیں ہو سکتے۔ قاعدہ کی رو سے سلوک ہی جذب سے مقدم ہے اور وہب کا ذکر نہیں مگر لوگ جذب کو مقدم کرنا چاہتے ہیں اور یہ سخت غلطی ہے۔ نصوص سے قاعدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلوک جذب سے مقدم اور جذب سلوک پر مرتب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ رحمت جذب ہے اور احسان سلوک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ رحمت الٰہیہ نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے اور دوسری آیت میں یعنی اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ میں جو اجتہاد یعنی جذب کا مدار محض مشیت پر رکھا ہے وہ جذب موہوب ہے باقی کسب کے درجہ میں وہ ترتیب ہے جس کو اسی آیت کے دوسرے جملہ میں فرمایا ہے يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۔ بہر حال دلائل

سے ثابت ہے کہ سلوک جذب سے مقدم اور سلوک ہی کی بدولت جذب کے درجہ قویہ کا تحمل ہوسکتا ہے۔ اور اگر جذب قوی سلوک سے مقدم ہو جائے تو اس کا تحمل بھی نہ ہو سکے۔ چنانچہ وحی بھی اسی جذب کی ایک قسم ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں. لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ. یہ تو جبل کی نسبت فرمایا اور آپ کے قلب کی نسبت فرماتے ہیں فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے قلب نے اس چیز کا تحمل کیا جبل سے نہیں ہوسکتا تھا پس یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا دل تھا جس نے وحی الٰہی کے اس ثقل کا تحمل کیا ورنہ واقعات حدیثیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت اگر آپ اونٹنی پر سوار ہوتے تو اونٹنی آپ کو لے کر بیٹھ جاتی تھی اور نزول وحی کے وقت ایک صحابی کی ران پر آپ کا سر تھا تو انکی ران کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوا نیز سخت سردی کے موسم میں بھی نزول وحی کے وقت آپ کی پیشانی پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی میں ثقل باطنی کے ساتھ ثقل ظاہری بھی تھی اور جذب قوی کے دوسرے افراد ہیں گو اس درجہ کا ثقل نہ ہو لیکن اس ثقل کا تحمل بھی قبل سلوک نہیں ہوسکتا اس لئے مقتضائے حکمت یہی ہے کہ سلوک جذب سے مقدم ہو تا کہ جذب کا تحمل ہو جائے۔

نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ کی عجیب وغریب تفسیر:

اور نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ کے متعلق ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آئی گو مقام سے اجنبی ہے مگر استطراداً اسی آیت کی ذکر کے مناسبت سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض اہل باطل کے نزدیک یہ الفاظ قرآنیہ منزل من اللہ نہیں ہیں اوران کو نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ سے دھوکہ ہوا کہ اس میں محل نزول قرآن قلب کو فرمایا ہے اور قلب معانی کا مورد ہوتا ہے اور الفاظ کا مورد سمع ہوتا ہے نہ کہ قلب سو واقع میں یہی غلط ہے کیونکہ الفاظ دل میں بھی ہوتے ہیں چنانچہ ہر حافظ قرآن سوچ لے کہ الحمد للہ وغیرہ کے الفاظ دل میں ہیں یا نہیں یقیناً ہیں اسی کو ایک شاعر کہتا ہے۔

ان الکلام لفی الفواد وانما جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

تحقیق کلام منہ میں ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زبان کو منہ اس لئے نشان بنایا ہے۔

البتہ اس پر یہ سوال ضرور ہوگا کہ گو قلب پر بھی الفاظ کا ورود ہوتا ہے مگر بواسطہ سمع کے ہوتا

ہے تو یہاں سمع کا ذکر چھوڑ کر قلب کی قید کی کیا ضرورت تھی اس کا جواب ایک محقق نے خوب دیا ہے کہ مادری زبان اور غیر مادری زبان میں فرق ہوتا ہے غیر مادری زبان تو اول التفات الفاظ پر ہوتا ہے پھر معانی پر اور مادری زبان میں بالعکس ہے کہ التفات اول معانی پر ہوتا ہے پھر الفاظ کی خصوصیات پر گو خارج میں دونوں مقارن ہیں مگر التفات میں تقدم وتاخر ضرور ہے پس نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ میں اس امر کو بتلایا گیا ہے کہ چونکہ قرآن آپ کی مادری زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کا نزول اول آپ کے قلب پر ہوتا ہے یعنی الفاظ پر التفات ہونے سے پہلے قلب کو معانی کا ادراک ہو جاتا ہے واقعی یہ بات بہت عجیب ہے۔

قرآن پاک کو سب سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے:

اور یہ بات اسی شخص کو معلوم ہو سکتی ہے جس کی عادات وطبائع پر نظر ہو۔ اسی لئے قرآن کو سب سے زیادہ وہ شخص سمجھتا ہے جو عادات وجذبات انسانیہ پر نظر رکھتا ہو نہ کہ دقائق منطقیہ پر کیونکہ قرآن میں جذبات وعادات کی رعایت بہت زیادہ ہے مصنفین کی طرح دقائق فلسفہ کی رعایت نہیں کی گئی یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جذب کا تقدم مفید نہیں کیونکہ اس صورت میں اس کا تحمل اشد ہے اسی لئے ایسے لوگ جن پر سلوک سے پہلے جذب قوی طاری ہوتا ہے مجذوب ہو جاتے ہیں۔ جو نماز روزہ وغیرہ اعمال شرعیہ سے بھی محروم ہیں گو وہ مقبول ہیں مگر کامل نہیں بلکہ کاہل کہو تو ممکن ہے۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے چھوٹا بچہ کہ محبوب تو ہے مگر کامل نہیں بلکہ ہگتا موتا پھرتا ہے۔ ننگا بھی رہتا ہے۔ اور بڑا بچہ محبوب بھی ہے اور کامل بھی ہے کہ تہذیب وادب کیساتھ آراستہ ہے پس مجذوب گو مقبول ہیں مگر کامل نہیں کیونکہ وہ اعمال سے محروم اور ترقی اعمال ہی سے ہوتی ہے ورنہ ارواح کو عالم ارواح سے عالم اجسام میں نہ بھیجا جاتا کیونکہ عالم ارواح میں ارواح حامل احوال تھیں مگر حامل اعمال نہ تھیں چنانچہ ارواح میں محبت اس درجہ تھی کہ اس کی محبت ہی کی وجہ سے حمل امانت پر آمادہ ہو گئیں اس کا منشا محبت ہی تھا ورنہ تمام عالم اس امانت کے تحمل سے عاجز تھا اور محبت کی منشا حمل ہونے کی طرف شیرازی نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

امانت کا بوجھ آسمان نہ اٹھا سکا فال کا بھانسہ مجھ دیوانہ کے نام پر نکلا

باوجود یہ کہ حمل امانت کا اس کو امر بھی نہ ہوا تھا بلکہ محض استفسار ہی تھا جب محبوب کی طرف سے کلام ہوا تو عاشق کی کیا مجال تھی کہ امانت محبوب کے لئے تیار نہ ہوجاتا وہ تو ابتداء کلام ہی سے مست ہوگیا پھر یہ سوچ کر کہ امانت کے تحمل کے بعد مکالمت زیادہ ہوا کرے گی فوراً روح انسانی نے بار امانت کا تحمل کرلیا یہ تو محبت کی حالت تھی جو احوال میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اب معرفت کی حالت دیکھئے کہ وہ مسئلہ توحید جس میں بڑے بڑے مدعیان عقل کو اختلاف ہوگیا اور ارواح انسانیہ نے عالم ارواح میں اس کو بدون فکر کے فوراً حل کردیا کہ جب سوال ہوا الست بربکم تو معاً بلی کہہ دیا۔ یہ معرفت اضطراری تھی غرض محبت و معرفت دونوں ارواح کو حاصل تھیں۔ پھر کیا مصیبت تھی کہ ان کو عالم اجسام میں پھینک دیا گیا یہ وہ بات ہے کہ جس کو سوچ کر بعض مغلوبین تو بے چین ہوجاتے ہیں کہ ہائے ہم یہاں کیوں بھیجے گئے عالم ارواح ہی میں محبت و معرفت میں مستغرق رہتے تو اچھا تھا۔ چنانچہ مولانا نیاز اسی بے چینی کی حالت میں فرماتے ہیں ؎

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ پتہ
سوجگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا
مراد وہ خیال جو ناسوت میں آکر از خود رفتہ کر رہا ہے

ارواح کو عالم اجسام میں کیوں بھیجا گیا:

اہل ظاہر اس سوال کا جواب دیں کہ ارواح کو عالم اجسام میں بھیجا گیا۔ کیا چیز ان کو یہاں کھینچ کر لائی۔ حضرت وہ وہ چیز ہے جس کو اہل ظاہر نہیں سمجھ سکتے۔ سنئے یہاں ارواح کو بھیجنے سے مقصود قرب حاصل کرنا تھا۔ یعنی وہ قرب جو اعمال سے ہوتا ہے اور احوال سے نہیں ہوتا کیونکہ اعمال اختیاری ہیں اور احوال غیر اختیاری اور اس قرب کا مدار صرف اختیار پر ہے اور بہت سے اعمال وہاں یعنی عالم ارواح میں ممکن نہ تھے۔ کیونکہ بعض اعمال کا تعلق جسد سے ہے اور وہاں روح مجرد تھی مثلاً روزہ کیسے رکھا جاتا کیونکہ بھوک ہی نہ تھی۔ حج کیسے ہوتا وہاں خانہ کعبہ ہی نہ تھا۔ زکوٰۃ کیسے ادا ہوتی وہاں مال ہی نہ تھا۔ اور مصائب پر صبر کیسے ہوتا وہاں بیماری اور موت ہی نہ تھی۔ پس یہ قرب خاص اعمال پر موقوف تھا اس لئے حکمت حق مقتضی ہوئی کہ ارواح کو عالم

اجسام میں بھیجا جائے تا کہ قرب خاص حاصل ہو۔ یہ ہے سلوک پھر اس کے بعد جذب حاصل ہوتا ہے مگر چونکہ اثناء سلوک میں استعداد کامل ہو جاتی ہے اس لئے اب اس کے جذب کا ایسا غلبہ نہیں ہوتا کہ حواس معطل ہو جائیں اور اعمال سے محروم ہو جائیں۔

کاملین پر بھی بعض دفعہ غلبہ احوال ہوتا ہے:

اسی تفاوت استعداد کے سبب مبتدیوں پر احوال کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اور متوسطین پر ان سے کم اور منتہی پر سب سے کم۔ اور منتہی پر گاہ گاہ غلبۂ احوال کا ہونا یہ ایک غیر مشہور مسئلہ ہے جو شاید اس سے پہلے نہ سنا ہو۔ سالکین کا عام طور پر خیال یہ ہے کہ کاملین پر غلبۂ احوال بالکل نہیں ہوتا مگر یہ صحیح نہیں کاملین پر بھی بعض دفعہ غلبہ ہوتا ہے جس کی دلیل نصوص میں بھی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے قول کو رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّآ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۔

بعض مفسرین نے ادلال پر محمول کیا ہے اور ادلال غلبہ حال میں ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنی تفسیر میں اس کو ادلال سے نکال دیا ہے اور صحو کی حالت کے مناسب تفسیر کی ہے۔ کیونکہ انبیاء میں صحو اصل ہے اور سکر نادر تو جب تک صحو پر محمول ہو سکے ادلال پر محمول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خیر یہ آیت تو محتمل ہے مگر حدیث اس میں صریح ہے یعنی جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کی مختصر جماعت کفار کے بڑے لشکر کے مقابل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کی نصرت و فتح کے لئے دعا فرمائی۔ اور دعا میں اس قدر الحاح فرمایا کہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے صادر ہوئے اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لم تعبد بعد الیوم ۔ (الصحیح لمسلم: ۱۳۸۳) اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد کوئی آپ کی عبادت نہ کرے گا۔ آخر یہ کیا تھا یہ واقعی ادلال تھا یہاں اس کے سوا کوئی احتمال ہی نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاءؑ پر بھی کبھی کبھی غلبۂ حال ہوتا ہے۔ اور احادیث سے تو ملائکہ پر بھی غلبۂ حال ہونا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ میری وہ حالت دیکھنے کے قابل تھی کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اس کی زبان سے نکلا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا

اِسْرَآئِیْلَ . میں اس کے منہ میں کیچڑ ٹھونستا تھا کہ کہیں اس پر رحمت نہ ہو جائے۔ حضرت محبت حق چین سے نہیں بیٹھنے دیتی نہ کسی کامل کو نہ فرشتہ کو۔ حضرت جبریلؑ کے اس فعل کو غلبہ حال پر محمول نہ کیا جائے تو سخت اشکال واقع ہوتا ہے اگر ایمان مطلوب اعظم ہے اور حضرت جبریلؑ اسی کے واسطے وحی لاتے ہیں مگر حضرت جبریلؑ کو فرعون کے ایمان پر غصہ آ رہا ہے کہ یہ ایمان لا کر جہنم سے نہ بچ جائے۔ بس اس کی توجیہ یہی ہے کہ اس وقت حضرت جبریلؑ پر بغض فی اللہ کا اس قدر غلبہ تھا کہ مغلوب ہو گئے حالانکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس تدبیر سے کچھ نفع نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان کا تعلق اصلی قلب سے ہے اور تکلم بالایمان یعنی اقرار باللسان قدرت کے وقت فرائض اور کیچڑ ٹھونسنے کے بعد اس کی قدرت سلب ہو گئی تو اب تکلم کا فرض اس کے ذمہ سے ساقط ہو گیا۔ نیز حضرت جبریلؑ جانتے تھے کہ اس وقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ عالم آخرت کے بعد ایمان معتبر نہیں مگر پھر بھی حضرت جبریلؑ نے ایسا کام کیا جس کی کوئی غایت نہ تھی حالانکہ وہ بڑے درجہ کے فرشتہ ہیں جن کی تعریف میں عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ وارد ہے بس منشاء اس فعل کا وہی ہے کہ حضرت جبریلؑ پر بغض فی اللہ کا غلبہ تھا۔ بہرحال یہ مسئلہ نصوص سے ثابت ہے کہ کاملین پر بھی کبھی غلبہ ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ منتہی کو ایسے وقائع کم پیش آتے ہیں اور متوسط کو زیادہ جیسے مشاق سوار بھی گرتا ہے اور مگر کم اور سیکھتر زیادہ گرتا ہے تو جذب کاملین کو بھی نچاتا ہے جیسا کہا گیا ہے۔

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم ۔۔۔ جنید و شبلی و عطار شد مست

نہ میں ہی تنہا (اکیلا) اس میخانہ میں مست ہوں۔ بلکہ جنید اور شبلی اور شیخ فریدالدین صاحب مست ہو چکے ہیں۔ اب اگر یہ جذب سلوک سے پہلے کسی کو حاصل ہو جائے تو سمجھ لیجئے کیا حال ہوگا۔ یقیناً اعمال سے معطل ہو جائے گا۔ اور بعض دفعہ ممکن ہے کہ ہلاک بھی ہو جائے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ اور ایک بھٹیارہ کی حکایت:

چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی توجہ سے ایک شخص مر گیا تھا۔ حضرت خاتم مثنوی نے یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب متوکل تھے بعض دفعہ فاقہ بھی ہوتا۔ چنانچہ ایک دن حضرت کے یہاں فاقہ تھا اتفاق سے اسی دن مہمان آ گئے۔ حضرت کو مہمانوں کی وجہ سے فکر ہوا۔ ایک

بھٹیارہ حضرت کا معتقد تھا اس کو حضرت کی فکر کا احساس ہوا تو وہ فوراً کھانا سب مہمانوں کے لئے تیار کر کے لایا۔ حضرت کو اس سے بے حد خوشی ہوئی اور جوش مسرت میں فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ بھٹیارہ نے کہا کہ حضرت وعدہ کر لیجئے کہ جو میں مانگوں گا آپ دیں گے فرمایا ہاں میرے پاس جو کچھ ہے اس میں سے مانگو گے دوں گا۔ کہا میں ایسی چیز مانگوں گا جو آپ کے پاس ہے۔ فرمایا ہاں ہاں مانگو۔ کہا مجھے اپنا جیسا کر لیجئے۔ حضرت نے فرمایا

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ　　　برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

جو کچھ مانگو اندازہ سے مانگو　　　گھاس کا ایک پتہ پہاڑ نہیں اکھاڑ سکتا

بہت سمجھایا کہ یہ بات تمہارے تحمل سے زیادہ ہے۔ اس ہوس سے باز آؤ مگر اس نے نہ مانا۔ جب اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو اپنے حجرہ میں لے جا کر توجہ اتحادی ڈالی جس کا یہ اثر ہوا کہ توجہ کے بعد جو دونوں حجرہ کے باہر آئے تو صورت میں بھی اتحاد ہو گیا تھا۔ کسی کو یہ امتیاز نہ ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب کون سے ہیں اور بھٹیارہ کونسا ہے صرف یہ فرق تھا کہ بھٹیارہ پر اضطراب غالب تھا اور حضرت پر سکون مگر نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھٹیارہ مر گیا اس سے تحمل نہ ہو سکا کیونکہ سلوک سے جذب قوی وارد ہو گیا تھا۔ رہا یہ کہ پھر خواجہ صاحب نے اس کی درخواست کو کیوں منظور کیا اور ایسی توجہ کیوں دی جس سے ہلاکت واقع ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ مر ہی جائے گا۔ یہ خیال ہوگا کہ بہت مجذوب ہو جائے گا۔ لیکن اس درجہ ضعف کا علم نہ تھا کہ زندہ بھی نہ رہے گا کیونکہ دوسرے کا ضعف پوری طرح معلوم نہیں ہو سکتا۔

حضرات نقشبندیہ سلاطین اور حضرات چشتیہ مساکین ہیں:

نقشبندیہ کے یہاں توجہ اور تصرف بہت زیادہ ہے۔ یہ حضرات سلاطین ہیں یہ دوسروں پر بھی تصرف کرتے ہیں اور چشتیہ مساکین ہیں ان کا سارا تصرف اپنی ہی ذات پر ہوتا ہے ضرب بھی اپنی ہی ذات پر ہے اور سوزش و شورش بھی ان کا تو وہ حال ہے

افروختن و سوختن جامہ دریدن　　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

روشن ہونا اور جلنا اور کپڑے پھاڑنا　　　پروانہ اور شمع اور گل نے مجھ سے سیکھا ہے

پس جذب اگر سلوک سے مقدم ہوتا ہے تو یا ہلاک ہوتی ہے یا اعمال سے تعطل ہوتا

ہے اور دونوں حالتوں میں ترقی بند۔ کیونکہ ترقی اعمال سے ہوتی ہے اور اسی لئے مسلمان کے لئے طول حیات موت سے افضل ہے جبکہ وہ اپنی زندگی میں اعمال صالحہ کرے کیونکہ اعمال سے ترقی ہوتی ہے۔

اعمال صالحہ کے ساتھ مسلمان کیلئے طول حیات افضل ہے:

حدیث میں ہے کہ دو شخص ساتھ ساتھ مسلمان ہوئے تھے ان میں سے ایک تو شہید ہو گیا اور دوسرے رفیق کا ایک ہفتہ کے بعد بستر پر انتقال ہوا تو حضرات صحابہؓ نے دوسرے کو یہ دعا دی **اللھم الحقہ بصاحبہ** کہ اے اللہ اس کو اس کے ساتھی کے ساتھ ملا دیجئے یعنی اس کو بھی وہی درجہ عطا فرمایئے جو اس کے رفیق کو بوجہ شہادت ملا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ کیا کہا۔ سبحان اللہ حضرات صحابہؓ کی بھی کیا شان تھی کہ ان کو ہر وقت بارگاہ وحی سے فیضان علوم ہوتا تھا۔ اور الحمد للہ ہم بھی صاحب نصیب ہیں کہ ہم پر بھی ہر دم فیضان ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ وہاں فیضان بالمشافہ تھا۔ یہاں بواسطہ ہے اور یہ فرق ایسا ہے جیسے ایک شخص سے محبوب سامنے ہو کر باتیں کرے اور ایک سے پردہ میں ہو کر باتیں کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو بھی فیضان ہو رہا ہے مگر بواسطہ کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متجلی ہیں جیسا قرآن میں اللہ تعالیٰ شانہ جلوہ فرما ہیں اس پر مجھے مخفی کا شعر یاد آتا ہے ۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول کی پتی میں جو مجھ سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے میرا کلام دیکھے۔

جب ایک معمولی شاعر کا یہ دعویٰ ہے جو مجھے دیکھنا چاہے میرے کلام میں مجھے دیکھ لے حالانکہ وہ کلام کی کوئی عظمت نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تو بڑی شان ہے وہ تو واقعی جلوہ گاہ متکلم ہے۔ پس اب یوں کہیں گے ۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست خم و خمخانہ با مہر و نشاں ست

ابھی وہ رحمت کا ابر موتی برسا رہا ہے اور شراب خانہ محبت سے لبریز ہے

اگر یہ دولت بھی نہ ہوتی تو عشاق کی زندگی کس طرح ہوتی ہم تو اس حدیث سے زندہ

ہیں۔ لایزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لایضرهم من خذلهم (سنن ابن ماجة : ۱۰)۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بشارت دی ہے کہ ان شاء اللہ قرب قیامت تک قرآن وحدیث وعلوم حقہ محفوظ رہیں گے ورنہ آج کل تو جو حالت مسلمانوں کو پیش آرہی ہے کہ ہر طرف مسلمان نرغہ میں ہیں اور کفار دین حق کو مٹانا چاہتے اس کو دیکھ کر بعض دفعہ خطرہ ہوتا تھا کہ کہیں علوم اسلامیہ فنا نہ ہو جائیں مگر اس حدیث نے تسلی کر دی۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی اس دعا کو سن کر اللهم الحقه بصاحبه۔ فرمایا کہ تم نے یہ کیا کہا کہ اس کو پہلے شخص سے ملا دیا جائے جس سے اس شخص کا ادنیٰ ہونا معلوم ہوتا ہے آخر اس نے جو اس کے بعد عمل کئے ہیں وہ کہاں گئے بخدا ان اعمال کی وجہ سے جو اس نے اپنے ساتھی کے بعد کئے ہیں دونوں کے درجہ میں اتنا تفاوت ہے جتنا آسمان وزمین میں تفاوت ہے کیونکہ اس نے اس کے بعد نمازیں پڑھی ہیں۔ روزے رکھے ہیں ذکر اللہ کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لئے طویل حیات افضل ہے جبکہ اعمال صالحہ کے ساتھ زندگی ہو۔

شہادت کی فضیلت علی الاطلاق نہیں ہے:

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے میں اس کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ دوسرے شخص نے گو پہلے کے بعد اعمال صالحہ بہت کچھ کئے تھے مگر پہلے کو تو شہادت حاصل ہوئی تھی دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی اور شہادت کو دوسرے اعمال سے ایسی نسبت ہے کہ سونار کی ایک لوہار کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت کی فضیلت علی الاطلاق نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ شہید انبیاء سے بھی افضل ہو۔ دوسرے یہ کہ تمنائے شہادت بجائے شہادت ہے۔ حدیث میں ہے انما الاعمال بالنیات. نية المومن خیر من عمله (المعجم الکبیر للطبرانی ۶ : ۲۲۸) دوسری حدیث میں ہے من طلب الشهادة صادقاً من قلبه اعطیها ولو لم تصبه (الصحیح لمسلم الامارة : ۱۵۶) (رواہ مسلم)

اور اگر کسی کے قلب میں تمنائے شہادت بھی نہ ہو تو اس کا ایمان ناقص ہے حدیث میں ہے من لم یغز ولم تحدث به نفسه لقی الله وفی دینه ثلمه......اور بحمد اللہ ہر مسلمان ان کے لئے آمادہ ہے کہ اگر دین کے واسطے جان دینے کی نوبت آئے تو جان

دینے کو حاضر ہیں اور جب ہم جیسے مہمل بھی اس کے لئے آمادہ ہیں تو وہ صحابی اس کے طالب
اور اس کے لئے آمادہ کیوں نہ ہوں گے اور اسی بنا پر ہم کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو
ظاہری شہادت خفیہ حضرت حمزہؓ کی شہادت جلیہ سے افضل ہے گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو
ظاہری شہادت حاصل نہیں ہوئی مگر آپ کو اس کی تمنا تو بے حد تھی حدیث ہے ودت ان
اقتل فی سبیل اللہ ثم احی ثم اقتل ثم احی ثم اقتل (تاریخ بغداد للخطیب
۴:۷) (الحدیث) اور بعض دفعہ ذکر خفی ذکر جلی سے افضل ہوتا ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کی شہادۃ خفیہ دوسروں کی شہادت جامعہ سے افضل ہے اور اگر اس قاعدہ شرعیہ کو تسلیم نہ کیا
جائے تو سخت اشکال وارد ہو کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض کمالات حاصل نہیں
ہوئے اور یقیناً شہادت بھی کمالات میں سے ہے پس یہ اشکال اسی تقریر سے رفع ہو جائے گا
جو میں نے نصوص حدیث سے بیان کی ہے۔

شہادت کی فضیلت کا سبب:

تیسرے یہ بھی تو دیکھو کہ شہادت کی فضیلت کس وجہ سے ہے۔ سو ظاہر ہے کہ شہادت
کے دو جز ہیں ایک اقدام یعنی اعداء اللہ کی طرف پیش قدمی کرنا ان پر حملہ کرنا۔ دوسرے گردن
کٹ جانا۔ اور قواعد سے یہ بات معلوم ہے کہ مبنیٰ فضیلت کا امور اختیاریہ ہیں تو اب خود سمجھ
لو کہ ان دونوں میں امر اختیاری کونسا ظاہر ہے کہ اقدام ہی اختیاری ہے گردن کٹ جانا
اختیاری نہیں یہ تو دوسرے فعل پر موقوف ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقدام میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ حضرات صحابہؓ خود فرماتے ہیں کہ
ہم میں بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو معرکۂ جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتا
ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آگے دشمن کی صف میں گھسے رہتے تھے تو شہادت
کا جو مبنیٰ اختیاری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سب سے افضل تھے لہٰذا آپ کی شہادت
بھی سب سے افضل ہے چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بعض اعمال کا اجر بے حساب ہے
چنانچہ ذکر اللہ کے فضائل جو احادیث میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے ذکر اللہ شہادت
سے بھی افضل ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے کہ شہادت میں تو جو کچھ ہونا ہوتا ہے ایک

دفعہ ہو جاتا ہے۔ تلوار کے ایک ہاتھ میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور ذکر اللہ میں ہر دم دل پر آرہ چلتا ہے۔ ذاکرین کی حالت دیکھ لی جائے کہ ان پر کیسی کیسی حالتیں گزرتی ہیں۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

اللہ والے کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔ اگر چہ دل کے باغ میں گنجائش کم ہوتی ہے اور اس حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا زیبا ہے کہ

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

خنجر تسلیم سے مرنے والوں کیلئے ہر وقت اللہ کی طرف سے دوسری جان موجود ہے کہ ان کیلئے تو بار بار موت وحیات کا تکرار ہوتا رہتا ہے۔ (خصوصاً ذکر نفی اثبات میں تو ذاکر کامل کو بار بار موت وحیات کا تکرار ہونا بہت ظاہر ہے کما لا یخفی علی من له ذوق بالذاکر مع المعرفة رزقنا ہ اللّٰہ تعالیٰ دائماً ابدًا) پس یہ مسلم نہیں کہ شہادت کی فضیلت علی الاطلاق ہے بلکہ بعض اعمال شہادت سے بھی افضل ہیں اور اب وہ اشکال مرتفع ہو گیا جو اس حدیث پر وارد ہوا تھا۔

شہادت سے بغیر مشقت کے درجات مل جاتے ہیں:

ہاں یہ ضرور ہے کہ شہادت سے درجات بے مشقت مل جاتے ہیں۔ دوسرے طرق میں جو شہادت سے افضل ہیں مشقت ضرور ہے شہادت سے بے مشقت درجات ملنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی لکھنؤ میں ایک خان صاحب تھے جو نہ نماز پڑھتے نہ روزہ رکھتے تھے جب کوئی ان کو اصلاح اعمال کے لئے کہتا اور اس کا ثمرہ حصول جنت اور نجات دوزخ بتلاتا تو کہتے میاں جہاں تلوار کے دو ہاتھ ادھر دو ہاتھ ادھر مارے تو سب کائی سے پھٹتی چلی جائے گی۔ اور جنت میں جا پہنچیں گے۔ وہاں پہنچنا مشکل ہے لوگ ان کی باتوں پر ہنستے تھے پھر جس وقت مولانا امیر علی صاحب کے پاس آئے اور پوچھا کہ مولانا کیا مجھ جیسا فاسق بھی خدا کے یہاں مقبول ہو سکتا ہے اور کیا شہادت سے میری بھی مغفرت ہو جائے گی فرمایا مقبولیت سے کیا چیز مانع ہے یقیناً شہادت سے جنت ملے گی۔ یہ سنتے ہی خان صاحب نے تلوار ہاتھ میں لی اور دو ہاتھ ادھر مارے اور دو ہاتھ ادھر بہت سے کافروں کو مار کر خود بھی شہید ہو گئے سو

واقعی تلوار کے دو ہاتھ میں کائی سی پھٹ گئی اور خان صاحب نے ذرا سی دیر میں جنت لے لی بس یہ ضرور ہے کہ شہادت سے بے مشقت ذرا سی دیر میں درجات مل جاتے ہیں یہ بات دوسرے اعمال میں نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتی کہ دوسرا کوئی عمل شہادت کے برابر نہ ہو۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ مسلمان کے لئے طول حیات مع الاعمال افضل ہے اور احوال سے اعمال افضل ہیں اور جذب کے تقدیم میں یا جان کا خطرہ ہے یا اعمال سے تعطل کا اندیشہ پس تم اعمال کی اتنی بے وقعتی نہ کرو کہ اگر احوال نہ ہوں تو اعمال ہی سے ہاتھ دھولو۔

نماز حظ نفس کے لئے نہ پڑھو:

اگر کسی کا ذکر اللہ یا نماز میں دل لگے تو اس کو چاہئے کہ ذکر و نماز کو ترک نہ کرے بلکہ ہمت کر کے کام میں لگا رہے کیونکہ

گر مرادت را مذاق شکر ست — بے مرادی نے مراد ی دلبراست

اگر تیری مراد کا مذاق اچھا ہے۔ نامرادی سے امید مت رکھ مراد حاصل ہونے والی ہے اگر تم اعمال کے بعد اس پر بھی راضی نہ ہو اور تم کو اتنی بات بھی حاصل نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نماز وغیرہ اللہ کے واسطے نہیں پڑھی بلکہ حظ نفس کی نیت سے پڑھی ہے جیسے ایک گاؤں والے کی حکایت ہے کہ اس کو واعظ مولوی صاحب نے نماز کی نصیحت کی ان نے کہا کیا ملے گا مولوی صاحب نے کہا کہ اگر تو چالیس دن اس طرح نماز پڑھ لے کہ تکبیر تحریمہ فوت نہ ہو تو میں تجھے ایک بھینس دوں گا اور خیال تھا کہ اس طرح پڑھنے سے خود نماز ہی سے محبت ہو جاوے گی۔ پھر بھینس بھی نہ مانگے گا۔ اس نے کہا بہت اچھا۔ چالیس دن پورے کر کے وہ مولوی صاحب کے پاس آیا کہ وعدہ پورا کرو مولوی صاحب نے کہا کیسا وعدہ میں نے تو اس لئے بات کہہ دی تھی کہ چالیس دن نماز پڑھنے سے تجھے عادت ہو جائے گی اس نے کہا اچھا یہ بات تھی تو جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی ہے۔ اس ظالم کو جو چالیس دن بعد بھی نماز کا شوق نہ ہوا تو وجہ اس کی یہ تھی کہ اس نے اللہ کے واسطے نماز ہی نہ پڑھی تھی۔ اسی طرح جو لوگ طالب احوال ہیں ان کو بھی اعمال کا شوق نہیں ہوتا کیونکہ وہ رضائے حق کے طالب نہیں بلکہ اپنی مراد کے طالب ہیں اور یہ حالت صدق قلب کے

خلاف ہے۔ صدق طلب کی شان یہ ہے کہ اگر ساری عمر بھی شوق و کیفیت پیدا نہ ہو تو اسی پر راضی رہے اور یوں کہے

اريد وصاله ويريد هجري فاترك ما اريد لما يريد.

میں ارادہ کرتا ہوں اس کے وصال کا اور وہ ارادہ کرتا ہے مجھ سے فراق کا پس میں چھوڑتا ہوں اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ کے لئے۔

عارف شیرازی فرماتے ہیں

میل من سوئے وصال و میل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

عارف نے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عاشق کے نزدیک یہ عدم وصال بھی وصال ہی کے برابر ہے۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

فراق و وصل کے جھگڑے بے کار ہیں دوست کی رضامندی طلب کر۔ اس سے غافل رہ کر تمنا کرنا بیکار ہے۔

اور فراق و وصال کی تساوی کا جو حکم کیا ہے یہ وصال و فراق مزعوم ہے۔ یعنی فراق سے مراد قبض ہے جس میں احوال و کیفیات نہیں ہوتے اور وصال سے مراد بسط جس میں احوال و کیفیات کا ورود ہوتا ہے تو کہتے ہیں تم قبض و بسط کی فکر میں کیوں پڑے ہو بس رضائے دوست کو طلب کرو خواہ یہ رضا مضاف الی الفاعل ہو خواہ مضاف الی المفعول یعنی وہ رضا خواہ ادھر سے ہو خواہ ادھر سے۔

محققین رضا کے طالب ہیں:

اگر تم کو رضائے حق کا یقین نہیں ہو سکتا تو اپنی رضا کا تو علم ہو سکتا ہے۔ پس تم ہر حال میں ان سے راضی رہو یہ بھی کافی ہے کیونکہ

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اگر قسمت نے یاوری کی اس کا دامن پکڑ لوں گا۔ اگر میں نے اپنی طرف کھینچ لیا تو اچھا ہے اور اگر اس نے کھینچ لیا بہت اچھا ہے۔

رضا ہونی چاہئے خواہ کسی طرف سے ہو۔ حضرت صدیقؓ کے بارے میں آیت نازل

ہوئی ہے ولسوف یرضی .علماء نے اس کے مرجع ضمیر میں گفتگو کی ہے کہ حضرت صدیق ہیں یا حق تعالیٰ مگر محققین نے کہا ہے دونوں صورتیں برابر ہیں۔ خدا تعالیٰ راضی ہوں جب بھی مراد حاصل ہے اور صدیق راضی ہوں جب بھی کیونکہ دونوں رضاؤں میں تلازم ہے۔ غرض محققین تو رضا کے طالب ہیں خواہ قبض ہو خواہ بسط وہ قبض کی حالت میں یوں کہتے ہیں۔

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں	تازہ باش وچیں میفگن برجبیں
جن کی تنگی معلوم ہو کشادگی کا خیال کر	خوش رہ پیشانی پر بل مت لا
چونکہ قبضے آیدت اے راہرو	آں صلاح تست آلیس دل مشو
جب قبض تجھے پیش آوے اے سالک	تیرے لئے بہتر ہے رنجیدہ مت ہو

البتہ چونکہ قبض میں احتمال مسبب عن المعصیہ کا بھی ہوتا ہے اس لئے وہ احتیاطاً قبض میں استغفار بھی کرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

غم چو بینی زود استغفار کن	غم بحکم خالق آمد کارکن

جب تجھ پر کوئی تکلیف آئے جلد توبہ (استغفار) کر کیونکہ اللہ ہی کے حکم سے تکلیف آتی ہے۔ پس قبض کی حالت میں بھی مقصود سے مایوس نہ ہو بلکہ قبض اس اعتبار سے بڑی نعمت ہے کہ قبض کے بعد جو بسط ہوتا ہے وہ بڑا ہی قوی ہوتا ہے جیسے وہ پیاس بڑی نعمت ہے جس کے بعد صرف ٹھنڈا پانی ملنے کی امید ہو کیونکہ لطف برف پیاس ہی کے بعد ہے اسی طرح بسط کا لطف قبض کے بعد ہے۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم	گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

یار کی جدائی سے شکایت نہیں کرتا ہوں میں۔ جب جدائی نہ ہو حضوری میں مزا نہیں آتا یہ لفظ ہجر بفتح الہا ہے ایک دفعہ سعادت علی خان کی مجلس میں رزیڈنٹ کے جو فارسی دانی کا مدعی تھا اس لفظ کی تحقیق میں کہا کہ یہ لفظ ہجر بکسر الہا ہے ان شاء اللہ خان نے کہا بے شک بجا ہے چنانچہ شاعر اس کی شہادت بھی دیتا ہے

شب قدر ست طے شدہ نامہ ہجر	سلام فیہ حتی مطلع الفجر

شب قدر سے ختم ہو گیا جدائی کا خط۔ سلامتی ہے اس میں سورج نکلنے تک

آپ نے فجر کو بکسر الفاء پڑھا رزیڈنٹ شرمندہ ہو کر چپ ہو گیا۔اسی طرح ایک دفعہ اسی رزیڈنٹ نے کہا کہ سعدی کا یہ مصرع

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد (شاید درندہ سوتا ہووے)

غلط مشہور ہو گیا ہے۔صحیح خفیہ ہے۔ان شاء اللہ خان نے کہا بے شک حضور سچ ہے کیونکہ دوسرا مصرعہ بھی اس کا موید ہے۔

تامرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جب تک انسان بات نہ کرے اس کی بھلائی برائی معلوم نہیں ہو سکتی۔

یہاں بھی رزیڈنٹ بہت شرمندہ ہوا۔ان شاء اللہ خان بڑا مسخرہ تھا اور وقت پر اس کو بڑی دور کی سوجھتی تھی ایک دفعہ یہ سعادت علی خان کے ساتھ ننگے سر کھانا کھا رہا تھا سعادت علی خان نے چپکے سے ایک چپت اس کے رسید کیا تو آپ نیچے گردن کئے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ والد صاحب قبلہ کو غریق رحمت کرے یہ کہہ کر پھر کھانے میں مشغول ہو گیا۔سعادت علی خان نے پوچھا کہ والد صاحب کی کیا بات یاد آ گئی کہا کچھ نہیں اس نے اصرار شروع کیا تو کہا والد صاحب قبلہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان چپت مارا کرتا ہے آج مجھے ان کی بات یاد آ گئی کہ واقعی وہ صحیح فرماتے تھے۔اس جواب سے سعادت علی خان پر پانی پڑ گیا مگر پہلے زمانہ کے رؤسا علم اور اہل علم کے قدردان تھے۔اس لئے ان سب باتوں کو گوارا کرتے تھے آج کل کے رؤسا کی طرح بددماغ نہ تھے۔خیر یہ تو درمیان میں ایک لفظی تحقیق پر چند لطیفے یاد آ گئے۔

قبض باعتبار آثار کے بسط سے زیادہ نافع ہے:

اب ایک بات یہ بھی سمجھو کہ قبض باعتبار آثار کے بسط سے زیادہ نافع ہے کیونکہ بسط میں عجب کا خطرہ ہے اس میں اپنے کمالات پر نظر ہوتی ہے اور قبض میں اپنے اوپر نظر نہیں ہوتی بلکہ عجز و نیازمندی کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت انسان اپنے کو کتے اور فرعون سے بدتر سمجھتا ہے اور یہ بات اس شخص کے سمجھ میں نہیں آ سکتی جس پر یہ حال نہ گزرا ہو کیونکہ یہ ذوقی امر ہے جس پر گذرتی ہے وہی اس کو جانتا ہے اور یہ نہیں کہ اس وقت یہ شخص اپنے کو مومن نہیں

سمجھتا۔ بلکہ اپنے کو مومن اور فرعون کو کافر سمجھ کر پھر بھی اپنے کو اس سے بدتر سمجھتا ہے۔ میں الفاظ سے اس حالت کی حقیقت کو نہیں بتلاسکتا تم اتنا سمجھ لو کہ اس کو اپنے مآل پر نظر ہوتی ہے کہ نہ معلوم مآل کیسا ہو۔ اور اس طریق میں عجز و نیاز ہی سے کام چلتا ہے۔ عجب و پندار سے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

عقل و سمجھ تیز کرنے کا خیال نہیں ہو سکتی۔ جب تک اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو اور فرماتے ہیں۔ ؎

ہرکجا پستی ست آب آنجا رود　　　ہرکجا مشکل جواب آنجا رود

ہرکجا دردے دوا آنجا رود　　　ہرکجا رنجے شفا آنجا رود

جس جگہ درد ہوتا ہے دوا اسی جگہ کام آتی ہے جس جگہ بیماری ہوتی شفا اسی جگہ پر جاتی ہے۔

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　　آزموں رایک زمانے خاک باش

برسوں سے تو سخت پتھر کی طرح ہے　　　امتحاناً تھوڑی دیر کے واسطے خاک ہو جا

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　　خاک شوتا گل بروید رنگ رنگ

موسم بہار میں پتھر سبز کب ہوتا ہے　　　خاک ہوجا تا کہ رنگ برنگ کے پھول اگیں

ناز راروی بباید ہمچوں ورد　　　چوں ندا ری گرد بدخوئی مگرد

ناز کے لئے گلاب کا سامنہ چاہئے　　　جب تجھ میں عاجزی نہیں ہے تکبر مت کر

ہمچو یوسف نازش وخوبی مکن　　　جز نیاز وآہ یعقوبی مکن!

حضرت یوسف علیہؑ کی طرح ناز انداز مت کر۔ یعقوبؑ کی طرح عاجزی اور آہ کر۔

اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتیہ کا مذاق کیسا اچھا ہے گو تمام صوفیہ کا یہی مذاق ہے مگر چشتیہ پر سب سے زیادہ اس کا غلبہ ہے کہ ؎

افروختن وسوختن وجامہ دریدن　　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

روشن ہونا اور جلنا کپڑے پھاڑنا　　　پروانہ اور گل شمع نے مجھ سے سیکھا ہے

ساری عمر کے مجاہدات وریاضات کا حاصل:

میں نے مولانا گنگوہیؒ سے سنا ہے کہ جس شخص کو ساری عمر کے مجاہدات وریاضات

کے بعد میں یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا کیونکہ اس طریق کا حاصل یہی ہے بے حاصلی۔ اور جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ کمال حاصل ہو گیا وہ اس شعر کا مصداق ہے ؎

خواجہ پندارد کہ وارد حاصلے　　حاصل خواجہ بجز پندار نیست

اب قبض تو ایسا مفید مگر لوگ پھر بھی بسط ہی کے طالب ہیں اور تاویل یہ کرتے ہیں کہ بسط میں سہولت زیادہ ہے۔ میں کہتا ہوں مگر سہولت ہی چہ ضرور جیسے کسی نے شعر میں بے موقع ایک لفظ کو مشدد کیا تھا جب اعتراض ہوا تو کہا ضرورت شعری سے ایسا کیا گیا۔ استاد نے کہا شعر گفتن چہ ضرور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قبض میں قدرت عمل تو سلب نہیں ہوتی پس ہمت سے کام لو اور بدوں سہولت ہی کے عمل کرتے رہو سہولت کے طالب نہ ہو۔ ورنہ ایسی مثال ہوگئی جیسے ایک فقیر سلطنت کا طالب ہو اور یہ تاویل کرے کہ بادشاہ ہو جاؤں گا تو سہولت سے روٹی ملے گی تو کیا آپ اس طلب کو صحیح مانیں گے۔ ہرگز نہیں اور اگر یہ کہو کہ یہ طلب اس لئے صحیح نہیں کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ فقیر بادشاہ ہو جائے اور یہ تو سکتا ہے کہ عمل سہل ہو جائے۔ جواب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ایسا ہو نہیں سکتا غلط ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی پاگل بادشاہ مر جائے اور یہ وصیت کر جائے کہ شہر پناہ سے جو شخص سب سے پہلے داخل ہو اس کو بادشاہ بنا دیا جائے اور ایک فقیر کو اس طرح بادشاہت مل بھی چکی ہے پھر تخت پر بیٹھنے سے پہلے تو وہ فقیر تھا اور تخت پر بیٹھتے ہی شاہی دماغ عطا ہو گیا۔ چنانچہ دربار سے اٹھتے وقت اس نے وزیر کو اشارہ کیا کہ بغل میں ہاتھ دیکر اٹھائے کیونکہ سلاطین کل یہی قاعدہ تھا وزیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس بھک منگے کو ایک دن میں یہ قواعد کیوں کر معلوم ہو گئے آخر پوچھا اس نے جواب دیا کہ جس خدا نے بے مشقت مجھے بادشاہت دی ہے اسی نے دفعۃً دماغ شاہی بھی عطا کر دیا ہے سچ ہے جب خدا حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ اس لئے یہ طلب سلطنت محال کی طلب نہیں بلکہ احتمال کی طلب ہے گو اس احتمال کا پورا ہونا ایسا ہی ہے جیسے شیخ چلی کے احتمال کا پورا ہونا جیسے آج کل سوراج کی بہت شورش ہے۔ ہندوستانی بادشاہت کے طالب شاید تم کو ہی مل جائے احتمال تو ضرور ہے مگر بس احتمال

ہی سے خوش ہولو ورنہ یہ احتمال ایسا ہے جیسے ایک مولوی صاحب نے سیاہ کتے کو جھک کر سلام کیا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو کہا شاید جن ہو اور جنوں میں بھی بادشاہ ہو اور میرے سلام کی وجہ سے خوش ہو کر کچھ دیدے۔ بس ایسی ہی حالت آپ کی طلب کی ہے۔

سہولت کا منتظر رہنا غلطی ہے:

یہ مسلم ہے کہ بسط میں سہولت ہوتی ہے مگر سہولت کا منتظر رہنا ہی غلطی ہے اس کے متعلق میرا ایک واعظ التحصیل والتسہیل ہے اس میں ایک جزو کی بہت تفصیل ہے خدا کرے جلد طبع ہو جائے تو اس کا مطالعہ مل جائے تو شکر کرو جیسے کسی کو عالی شان مکان ٹھنڈا مل جائے تو نعمت ہے یا برف کا ٹھنڈا پانی مل جائے تو نعمت ہے اور اگر نہ ملے تو کنویں ہی کے پانی سے راضی رہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسٹیشن پر جا کر لاؤ چاہے گھل کر سیر بھر کا آدھ پاؤ ہی رہ جائے۔ اور جانے کی مشقت گرمی کی مصیبت جدا رہی۔ پس سلامتی اس میں ہے کہ تم عمل کرتے رہو اگر حال مرتب ہو جائے تو شکر کرو اور نہ مرتب ہو تو مناسب تو یہی ہے کہ اس حال میں بھی شکر کرو ورنہ صبر کرو۔

سالک کو نہ ملنے پر بھی شکر کرنا چاہیئے:

ایک عارف نے ایک سالک سے پوچھا تھا کہ کس حال میں ہو کہا مقام توکل میں ہوں اگر ملتا ہے شکر کرتا ہوں نہیں ملتا تو صبر کرتا ہوں عارف نے کہا کہ اتنا تو بغداد کے کتے بھی کرتے ہیں۔ سالک کو تو یہ چاہئے کہ نہ ملنے پر بھی شکر کرے کہ یہ بھی نعمت ہے اس میں بھی حکمت عظیمہ ہوگی اسی کو عارف فرماتے ہیں۔

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن	کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

فقیروں کی طرح عبادت مزدوری پر مت کر۔ مالک تو خود ہی بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے۔ کیونکہ کیا معلوم تم کو زیادہ روٹی ملتی تو کیا حال ہوتا اس لئے نہ ملنے پر بھی شکر چاہیئے۔ حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی شخص ذکر میں حال وغیرہ نہ حاصل ہونے کی شکایت کرتا اور یہ کہتا کہ کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا تو فرماتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم خدا کا نام لے رہے ہو پھر یہ شعر پڑھتے ؎

یابم اور ایا نیابم جستجوئے می کنم — حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

وہ ملے یا نہ ملے ہمیں تلاش کرنا چاہئے — نتیجہ نکلے یا نہ نکلے آرزو رکھنا چاہئے

واقعی ذکر اللہ کی توفیق ہو جانا ہی بڑی نعمت ہے اس کے بعد اور کیا چاہتے ہو۔

شیطان سالک کے ہمیشہ درپے رہتا ہے:

مولانا رومی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صوفی کو شیطان نے دھوکا دیا تم کو ذکر اللہ کرتے ہوئے بہت سال ہو گئے مگر اللہ کی طرف سے نہ کچھ پیام نہ جواب۔ جب وہاں شنوائی نہیں ہوتی تو خواہ مخواہ سر مارنے سے کیا فائدہ۔ سالک اس دھوکہ سے متاثر ہو گیا۔ آہ اس طریق میں بہت دھوکے ہیں کیونکہ شیطان سالک طریق کا درپے ہو جاتا ہے وہ اس کو طرح طرح سے بہکاتا ہے۔ اس لئے بہت احتیاط واہتمام کے ساتھ چلنا چاہئے۔

دررہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است — ہشیار و گوش را بہ پیام سروش دار

عشق کے راستہ میں اہرمن کا خیال ہی کافی ہے۔ ہوش رکھ اور کان کو اس کے احکام کی طرف لگا۔ پیام سروش سے مراد وحی ہے کہ شریعت کو پیش نظر رکھو اور شیطان کے ہر دھوکہ کا جواب شارع علیہ السلام کے ارشادات سے حاصل کرو۔ اور شریعت کیخلاف ہرگز کسی بات کو دل میں جمنے نہ دو۔ مگر بعض سالک محبوب مراد ہوتے ہیں۔ ان کی دستگیری ایسے وقت میں غیب سے ہوتی ہے ان کو احتیاط واہتمام کی بھی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ یہ سالک مرد تھا اس کو شیطان نے دھوکہ دیا اور دھوکہ میں آگیا کہ رات کو سب معمولات ترک کر کے سو رہا۔ مگر غیب سے اس کی دستگیری ہوئی رات کو خواب میں کوئی لطیفہ غیبی آیا اور اس نے حق تعالیٰ کی طرف سے دریافت کیا کہ کیوں میاں صاحب آج تم کو ہم بھول ہی گئے کیا بات ہے۔ کیوں خفا ہو گئے کہا میں نے برسوں سے حق تعالیٰ کو یاد کیا جب اس طرف سے کوئی پیام و جواب تک نہ آیا تو میں نے سوچا وہ تو پوچھتے بھی نہیں پھر میں ہی کیوں سر ماروں لطیفۂ غیبی نے اللہ کی طرف سے اس کو جواب دیا

گفت آں اللہ تو لبیک ماست — ویں نیاز وسوز و دردت پیک ماست

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیرا اللہ اللہ کرنا ہماری حاضری ہے۔ اور یہ عاجزی اور سوز اور درد تیرے واسطے ہمارا پیغام ہے۔

کہ تمہارا یہ اللہ اللہ کرنا ہی تو ہمارا جواب ہے۔ یہی علامت قبول ہے اگر تم مردود ہوتے تو ہم زبان کو اپنے ذکر سے روک دیتے۔ جیسا کہ بہت سی مخلوق کو اپنے ذکر سے محروم کر رکھا ہے۔

اعمال صالحہ کے قبولیت کی علامت:

ہمارے حاجی صاحبؒ اسی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ جب صبح کی نماز پڑھ کر ظہر کی توفیق ہو جائے تو یہ نماز صبح کی قبول کی علامت ہے اگر ان کو تمہارا دربار میں آنا ناگوار ہوتا تو دوسرے وقت گھسنے نہ دیتے۔ جیسے ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا وہ اس کو پکڑنے آیا مؤذن نے دھمکایا کہ لوگ مسجدوں میں جانور گھسا دیتے ہیں تو قصائی نے جواب دیا کہ کیوں بڑ بڑ کرتا ہے جانور تھا گھس گیا کبھی ہم کو بھی مسجد میں دیکھا ہے۔ حضرت یہی حال آپ کا ہوتا کہ مسجد میں گھسنے کی بھی توفیق نہ ہوتی۔ مولانا نے ایک آقا اور غلام کی حکایت لکھی ہے کہ دونوں بازار میں کسی کام کو گئے کہ راستہ میں اذان ہوگئی تو غلام نے آقا سے نماز کے لئے اجازت مانگی وہ نمازی تھا اور آقا بے نمازی تھا۔ اس نے اجازت دے دی غلام تو مسجد میں جا کر وضو نماز میں لگ گیا اور آقا مسجد کے باہر بیٹھ گیا غلام نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ میں لگ گیا جب بہت دیر ہوگئی اور سب نمازی چلے گئے تو آقا نے پکارا کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں۔ کہا آنے نہیں دیتا پوچھا کون نہیں دیتا کہا جو تم کو مسجد کے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔ واقعی جس کو وہ مردود کرتے ہیں وہ خود ہی مسجد سے بھاگتا ہے جیسے کہ وہ پانی سے بھاگتی ہے اور مچھلی پانی کی عاشق ہے وہ ہر دم پانی ہی میں رہنا چاہتی ہے اسی لئے علماء کا قول ہے۔

المؤمن فی المسجد کا السمک فی الماء والمنافق فی المسجد کا الطیر فی القفس (کشف الخفاء للعجلونی ۲: ۴۰۶) مومن مسجد میں پانی میں مچھلی کی طرح اور منافق مسجد میں پنجرہ میں پرندہ کی طرح۔ پس یہ بڑی دولت ہے کہ کسی کو ذکر اللہ کی توفیق ہو جائے ورنہ وہ نام تو ایسا ہے کہ اس کے لینے کی ہم جیسوں کو اجازت بھی نہ ہوتی جیسا کہا گیا ہے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب　　　ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اگر منہ کو ایک ہزار بار مشک وگلاب سے دھوئیں۔ تب بھی آپ کا نام لینا بے ادبی ہے۔ اور دیکھنے میں ہم آپس میں اپنے کسی بڑے کا نام بدوں القاب کے نہیں لے سکتے۔ کیونکہ

صرف نام لینے سے ناخوش ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ یا اللہ کہنے سے خوش ہوتے ہیں پس تم کو کیا ذوق وشوق لئے پھرتے ہو کام میں لگو۔ اور اس نعمت کی بے قدری نہ کرو کہیں یہ نعمت بھی سلب نہ ہو جائے۔ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے۔ تم اپنا کام کرو دوسروں کے کام کے پیچھے کیوں پڑے ہو کار خود کن، کار بیگانہ مکن، ذوق وشوق عطا کرنا ان کا کام ہے یہ تمہارے اختیار سے باہر ہے تم اس کے درپے نہ ہو جو کام تمہارے اختیار کا ہے اس میں لگو یہ ہے مذہب اہل تحقیق کا اور راحت اسی میں ہے کہ حال ذوق مل جائے تو عنایت نہ ملے تو عنایت تم ہر حال میں ہر حال میں راضی رہو بعض عشاق تو یہاں تک راضی ہیں کہ ہم کو جہنم بھی بھیج دیا جائے تو اس پر بھی راضی ہیں مگر اس بات کا ہمارا منہ نہیں اس کے قابل عشاق ہی کا منہ ہے اور لسان عشق معذور ہوتی ہے جیسے ایک پرندہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ایک مادہ سے کہہ رہا تھا کہ اگر تو میرے ساتھ مل جائے تو میں تجھ کو ملک سلیمان دیدوں گا۔ یہ بات حضرت سلیمانؑ نے سن لی اور منطق الطیر کے عالم تھے فوراً اس پرندہ کو بلایا اور فرمایا نالائق یہ کیا گستاخی تھی کہ میرا ملک دینے والے کون ہوتے ہیں اس نے کہا کہ نبی اللہ میں عاشق ہوں اور لسان عشق معذور ہوتی ہے اس پر حضرت سلیمانؑ نے اس کا قصور معاف کیا۔ اسی طرح یہ عشاق بھی وہاں معذور شمار ہوں گے۔ مگر ہر شخص کی زبان زبان عشق نہیں۔ تم ناز سے کام نہ لو اور عاشق کی نقل نہ کرو وہ تو اپنے کو مٹا کر فنا کر کے ناز کر رہا ہے۔ اس کو حق ہے تم کو حق نہیں ہے کیونکہ تم اپنے کو باقی رکھ کر ناز کرتے ہو۔

پیش یوسف نازش وخوبی مکن   جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

یوسفؑ کے سامنے ناز وانداز اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یعقوبؑ کی طرح عاجزی وانکساری کر۔

زشت باشد روئے نہ زیبا و ناز   عیب باشد چشم نابینا و باز

ترجمہ: اچھا نہیں معلوم ہوتا بری صورت اور ناز۔ برا ہے آنکھیں نہ ہوں اور کھلی کرے۔

منشی محمد حسن صاحب تھانوی نے بھوپال کے ولی عہد سلطنت کو ایک دفعہ سادگی سے کہہ دیا کہ آپ تو سمجھتے نہیں ہیں ولی عہد کو یہ بات ان کے منہ سے ذرا ناگوار نہیں ہوئی۔ وزیر صاحب کی کم بختی آئی کہ انہوں نے بھی ولی عہد کو یہی کلمہ کہہ دیا ولی عہد کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کہا بس اپنے درجہ پر رہو۔ تم منشی جی کی ریس کرتے ہو۔ ارے وہ تو تمہارے باپ کی جگہ ہیں نوکر

اور ملازم نہیں اور تم ملازم ہو۔ ملازم کو گستاخی اور بدتمیزی کا کیا حق ہے۔ اگر اب سے ایسی بدتمیزی کی تو کان پکڑ کر کے دربار سے نکلوا دیئے جاؤ گے۔ پس تم ناز نہ کرو۔ کیونکہ تم منشی محمد حسن نہیں ہو اور معیار فرق یہ ہے کہ تم اپنے آپ میں ہو اور عشاق آپے سے باہر ہیں۔

اسباب کے اختیاری ہونے کی بناپر امور اختیار یہ کہلاتے ہیں:

اب ایک بات اور سمجھو کہ یہ جو میں نے کہا ہے کہ امور غیر اختیار غیر مطلوب ہیں یہ عام نہیں بلکہ احوال کے ساتھ خاص ہے کیونکہ جزاء اعمال بھی غیر اختیاری ہے مگر وہ مطلوب ہے کیونکہ وہ احوال میں سے نہیں بلکہ جزاء ہے۔ ایک جواب تو یہ ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جزاء بھی اختیاری ہے کیونکہ اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اعمال صالحہ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے یوں کہا جائے کہ صحت اختیاری ہے کیونکہ اس کے اسباب اختیاری ہیں پس جنت وقرب ورضا اسی قبیل سے ہیں کہ فی نفسہ غیر اختیاری ہیں مگر بواسطہ اسباب کے اختیاری ہیں اور اگر نظر کو غائر کرو تو معلوم ہوگا کہ تمام اختیارات ایسے ہی ہیں کہ فی نفسہ غیر اختیاری ہیں مگر اسباب کے اختیاری ہونے کی وجہ سے ان کو اختیاری کہا جاتا ہے۔ مثلاً ابصار کو اختیاری کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں صرف فتح العین اختیاری ہے اور ادراک غیر اختیاری ہے مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ فتح العین پر اکثر ادراک کا ترتب ہو جاتا ہے اسی طرح شبع اور ری یعنی سیر ہونا اور سیراب ہونا یہ بھی محض اسباب کے واسطہ سے اختیاری ہیں ورنہ فی نفسہ غیر اختیاری بلکہ اور نظر کو غائر کرو جنت ابصار وغیرہ سے زیادہ اختیاری ہے کیونکہ فتح العین پر ترتب ادراک محض عادی ہے وعدی نہیں اور جنت کے ترتب کا اعمال صالحہ پر وعدی ہے اور عادت میں تخلف جائز ہے اور وعدہ میں جائز نہیں۔ پس اب اشکال مرتفع ہو گیا کیونکہ مبنی اشکال کا یہ تھا کہ جزا غیر اختیاری ہے اور اب معلوم ہو گیا کہ جزا اختیاری ہے۔ پس غیر مطلوب وہ ہے جو فی نفسہ بھی غیر اختیاری ہو اور اسباب کے لحاظ سے بھی غیر اختیاری ہو اور جو چیز اختیاری ہو خواہ بلاواسطہ یا بواسطہ وہ غیر مطلوب نہیں۔ اور احوال من کل وجہ اختیاری ہیں گو ان کے حصول میں بھی اعمال واسطہ ہیں مگر یہ واسطہ ایسا ہے جس پر احوال کا ترتب لازم نہیں نہ ان کا وعدہ ہے اس لئے ان کو بواسطہ بھی اختیاری نہیں کہہ سکتے پس ان کی طلب کے درپے نہ ہو بلکہ رضائے حق کے طالب بنو اور غیر حق سے نظر قطع کرو خوب کہا ہے۔

تو درو گم شو وصال ایں است پس گم شدن گم کن کمال این است و بس

تو اس میں فنا ہو جا یہی وصال ہے اپنا گم ہونا بھول جا انتہاء کی کمال یہ ہے

گم شو کا مطلب یہ کہ جس چیز کے فنا کا امر ہے اس کو گم کرو یعنی اپنے ارادہ و تجویز کو فنا کردو۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز روزہ کو بھی فنا کردو۔ اور گم شدن گم کن کمال ایں است و بس یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ آئے گی۔ مگر اس کا اشکال لغوی ہے۔

صاحب فنا کون ہے:

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سوتے ہوئے یہ جانتا ہو کہ میں سو رہا ہوں تو سونے والا نہیں سونے والا ہی ہے جس کو اپنے سونے کی بھی خبر نہ ہو اسی طرح صاحب فنا وہ ہے جس کو اپنے فنا ہونے کی بھی خبر نہ ہو یعنی اس پر التفات نہ ہو۔ یہ معنی نہیں کہ وہ محض بے وقوف ہوتا ہے کہ اس کو اپنے حال کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ خبر تو ہوتی ہے مگر التفات نہیں ہوتا تو گم شدن گم کن امر معقول ہوا اور اس فن کا کوئی مسئلہ بھی خلاف عقل نہیں کیونکہ تصوف محض ہے اور علم صحیح موافق عقل کے ہوتا ہے۔ پس علوم تصوف میں کوئی اشکال عقلی و شرعی واقع نہیں ہو سکتا۔ اور وہ عشاق کے کلمات ہیں جن کے ہیجے اور رواں مختلف ہوتے ہیں سو وہ مغلوب الحال ہیں کلمات عشاق کا نام تصوف نہیں بلکہ محققین۔ کے ارشادات کا نام ہے اور محققین کے کلام پر کسی کو انگلی رکھنے کی مجال نہیں وہ قرآن حدیث و عقل سب پر منطبق ہے۔

فناء الفنا کی حقیقت:

چنانچہ فناء الفنا کی حقیقت کو خود حکماء نے بھی تسلیم کیا ہے کیونکہ حکماء نے طے کر دیا ہے علم کے لئے علم العلم کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے آپ دھوپ میں کام کرتے ہیں چلتے پھرتے ہیں مگر دھوپ ہونے کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ اس کو اہل علم زیادہ سمجھیں گے اسی لئے اہل علم کو صوفی ہونے کا زیادہ حق ہے کیونکہ جاہل مقرَّب تو ہو سکتا ہے مقرِّب نہیں ہو سکتا مقرب عالم ہی ہو سکتا ہے۔ غرض فناء الفناء میں محبوب کی طرف اس قدر توجہ ہوتی ہے خواہ بواسطہ صفات محض ذات کی طرف کہ اس میں سالک کو اپنی ذات و صفات کی طرف التفات نہیں ہوتا یہ ہے گم شدن گم کن اور یہ حالت عشاق مجاز کو بھی پیش آتی ہے۔ عاشق کو اپنے محبوب کو

دیکھتے ہوئے اس طرف التفات بھی نہیں ہوتا کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں پس اب گم شدن گم کمال این ست وبس۔ پر کوئی اشکال نہیں۔ اور جو شخص اس قدر صاحب فنا ہوگا وہ شوق و ذوق کی طرف کیونکر التفات کریگا۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لا الہ میں سب کی نفی کردو کہ بجز ذات حق کے کسی طرف التفات نہ رہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما	اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے اچھے خیال والے عشق تو خوش رہ	اے ہماری تمام بیماریوں کے حکیم
اے دوائے نخوت وناموس ما	اے تو افلاطون وجالینوس ما
اے دوا ہماری تکبر اور بدنامی کی	اے کہ تو ہی ہے افلاطون وجالینوس ہمارا
عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت	ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
عشق وہ شعلہ ہے جب بھڑک جائے	معشوق کے سوا سب کو جلادے
تیغ لادر قتل غیر حق براند	درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند
لا الہ کی تلوار اپنی غرض کے قتل کرنے پر چلاؤ	اور پھر دیکھ کہ آخر (نتیجہ) لا کے بعد کیا رہا
ماند الا اللہ وباقی جملہ رفت	مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

اللہ ہی رہ جائے گا اور باقی کچھ نہیں رہے گا اے عشق سخت شرکت جلانے والے مجھ کو خوشخبری ہو جب یہ خود ہی نہیں رہا تو دوسری چیزوں کی طرف کیونکر التفات کرے گا۔ غرض احوال غیر اختیاری ہیں اس لئے وہ غیر مطلوب ہیں اور اعمال اختیاری ہیں اس لئے مطلوب ہیں اور یہ مسئلہ میں نے خود نہیں گڑھا بلکہ نص میں موجود ہے جس کی میں نے تلاوت کی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ثواب اور عذاب کا مدار کسب واکتساب پر ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے بلکہ ثواب وعذاب کا مدار کسب واکتساب پر ہے معلوم ہوا کہ انسان اختیارات کا مکلف ہے۔ اور احوال اختیاری نہیں اس لئے ان کا مکلف نہیں۔ اور یہ بات اس آیت کے شان نزول سے زیادہ واضح ہو جائیگی کیونکہ اس کا نزول احوال کی تحقیق میں ہے شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ

جب آیت اِنْ تُبْدُوْا مَافِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْتُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔ نازل ہوئی تو صحابہ اس سے ڈر گئے کیونکہ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ بظاہر عام ہے وسواس غیر اختیاریہ وعزائم اختیاریہ سب کو تو صحابہ یہ سمجھے کہ شاید ان سب پر مواخذہ ہوگا اور اس خیال کا منشا یہ صحابہ کی قلت علم نہ تھا بلکہ اس کا منشا غلبہ عشق تھا جس کی شان یہ ہے۔

عشق ست وہزار بدگمانی　　　باسایہ ترانمی پسندم

عاشق کو ضعیف الاحتمالات پر بھی بڑی فکر رہتی ہے ورنہ صحابہ قواعد کا سمعیہ وعقلیہ سے جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ فرمائیں گے۔ کیونکہ مقتضائے رحمت کے خلاف ہے مگر عشق ومحبت کی وجہ سے خشیت کا غلبہ تھا آیت میں عموم دیکھ کر ڈر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (ہم نے سنا اور ہم نے نے نافرمانی کی) کہنا چاہتے ہو۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور خوشی سے مانا) کہو ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے۔ صحابہ نے ادب سے کام لیا اور سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا گو زبان لڑکھڑاتی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ وسواس غیر اختیاریہ میں شاید اس حکم کی تعمیل نہ ہوسکے مگر ادب کی وجہ سے اطاعت کا وعدہ کر ہی لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کو یہ ادا پسند آ گئی اس پر اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر سورۃ تک آیتیں نازل ہوئیں اور ادب کی برکت سے آیت کی تفسیر کر دی گئی۔ ادب بڑی چیز ہے مولانا نے ادب کے متعلق قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے لغزش ہوئی اور ان پر عتاب ہوا۔ اور حضرت آدم نے رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۔ (ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا) کہا اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی تو بعد میں ان سے پوچھا کہ اے آدم خالق افعال تو میں ہوں تم نے ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا کیونکر کہا۔ آدمؑ نے جواب دیا۔

گفت من ہم پاس آنت داشتم　　　لیک من پاس ادب نگذاشتم

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہاں ادب سے کام لیا کہ خود اس آیت کی تفسیر نہ کی ورنہ آپ خود بھی تفسیر کر سکتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کا انتظار کیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئی جن میں اول رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کی تعریف ہے کہ سب نے ایمان پر استقامت ظاہر کی اور سمعنا واطعنا کہا اور جس کوتاہی کا اندیشہ تھا۔ اس سے استغفار کیا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۔ (اے ہمارے رب ہم تیری بخشش

کے امیدوار ہیں، اور ہم نے آپ کی طرف لوٹ کر جانا ہے) اس تعریف کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر کی گئی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ (اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اس کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو) میں جس کا حاصل یہ ہے کہ مدار تکلیف کا صرف اختیار ہے اور خطرات اختیاری نہیں تو عبد ان کا مکلف بھی نہیں۔ اب اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ غیر اختیاری کا مکلف تو نہ ہو مگر اس پر مؤاخذہ ہو جاوے اس کا جواب آئندہ جملہ میں ارشاد فرمایا گیا۔

امور غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ نہ ہوگا:

مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ (اسکا ثواب بھی اسے ہی ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کو ہوگا جو ارادہ سے کرے) کیونکہ کسب واکتساب کے معنی عمل بالاختیار کے ہیں اور لھا وعلیھا میں لام اور علی کا مدلول ثواب وعقاب ہے پھر دونوں میں مجرور کو مقدم کیا گیا جو مفید حصر ہے اس حصر سے معلوم ہوگیا کہ استحقاق ثواب وعقاب صرف امور اختیاریہ ہی پر ہے۔ پس آیت بالا کی تفسیر ہوگئی کہ مراد مَافِی اَنْفُسِکُمْ سے اعمال اختیاریہ ہیں اور مسئلہ کا منصوص ہونا ثابت ہوگیا جس کا میں نے دعویٰ کیا تھا اسی مسئلہ پر اپنے مقصود کی پھر تصریح کرتا ہوں کہ جب ثواب عقاب کا مدار اختیار پر ہے اور مقصود عبد کا صرف حصول ثواب اور نجات عن العقاب ہے پھر غیر اختیاری کے فکر میں کیوں پڑے یہاں ایک اور سوال کے جواب پر بھی متنبہ کرتا ہوں وہ سوال یہ ہے کہ بعض مصائب ایسے آتے ہیں جو تحمل سے زیادہ ہوتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں تکلیف مراد تکلیف شرعی ہے تکلیف تکوینی مراد نہیں سو اس کی یہاں نفی نہیں پس امور تکوینیہ میں فوق طاقت کا وقوع ہوسکتا ہے شاید اس پر یہ سوال کہ جب تشریعات میں رحمت کی وجہ سے یہ قاعدہ ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا تو تکوینیات میں بھی رحمت کا یہ مقتضا کیوں ظاہر نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ تکوینیات میں بوجہ زیادت اجر کے فوق طاقت کا وقوع خلاف رحمت نہیں رہا یہ سوال کہ پھر تشریعیات میں بھی زیادت اجر کے لئے ایسا کیا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تشریع سے عمل مقصود ہے اور فوق طاقت کا صدور کیونکر ہوتا اور تکوینیات میں صدور اس کا فعل نہیں ایک دوسری بات

مطلوب ہے جو وہ اختیاری ہے یعنی صبر کہ خدا تعالیٰ کی شکایت نہ کرے اور اس میں بھی اتنی توسیع ہے کہ حقیقی شکایت نہ کرے گو صورتاً شکایت ہو جائے تو وہ معاف ہے۔

بیماری میں آہ کا منہ سے نکلنا خلاف صبر نہیں:

جیسے یعقوبؑ کا قول ہے اِنَّمَآ اَشْکُوْبَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اسی طرح آنسو بہانا آہ آہ منہ سے نکلنا بھی خلاف صبر نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اسکے مستحق تھے بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی زیادہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے تو دل میں خدا سے شکایت پیدا نہیں ہوتی بعض لوگوں کو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے وہ بیماری میں آہ آہ کرنے کو خلاف صبر سمجھتے ہیں اس لئے اللہ اللہ کرتے ہیں تا کہ قوت قلب ظاہر ہو مگر یہ معرفت کے خلاف ہے اس پر مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کی حکایت مجھے یاد آئی کہ ایک بار وہ بیماری میں اللہ اللہ کر رہے تھے کہ اس کے بھائی آ گئے وہ بھی بڑے بزرگ تھے انہوں نے فرمایا بھائی جی آہ آہ کرو کیونکہ اللہ اللہ مظہر الوہیت ہے اور آہ آہ مظہر عبدیت ہے اور اس وقت وہ عبدیت کو دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے آہ آہ شروع کی اور بہت جلد صحت ہو گئی کیونکہ مقصود پورا ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو عجز و نیاز اور تضرع و زاری بہت پسند ہے۔ اور یہ بات بھی آہ ہی میں ہے اللہ اللہ کرنے میں نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تا نگرید کودک حلوا فروش ۔۔۔ بحر بخشایش نمی آید بجوش

جب تک حلوائی کا لڑکا نہ روئے ۔۔۔ اسکی بخشش کا دریا جوش میں نہیں آتا

اور فرماتے ہیں۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست ۔۔۔ اے خوشاں آں دل کہ آں بریان اوست

در پئے ہر گریہ آخر خندہ ایست ۔۔۔ مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

ہر غم کے بعد خوشی ہوتی ہے انجام پر نظر رکھنے والا مرد بہت اچھا ہے۔

اسی لئے ایک بار حضرت عمر سے بیماری میں جب کسی نے یہ پوچھا کہ کیسی طبیعت ہے فرمایا اچھی نہیں سائل نے کہا کیا آپ شکایت کرتے ہیں فرمایا کیا میں خدا کے سامنے اپنی بہادری ظاہر کروں کہ وہ تو بیمار کریں اور میں کہوں نہیں میں تو اچھا ہوں۔ اس سے معلوم ہو گیا

کہ شکایت منافی صبر وہ جو خود مقصود ہو اور جو کسی حکمت سے ہو وہ عبدیت ہے ان مقامات کو عارفین سمجھتے ہیں کہ اس وقت کیا مطلوب ہے اور دوسرے وقت کیا مطلوب۔ حضرت عمرؓ کی ایک اور حکایت ہے جس کو مناسبت مقام کی وجہ سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ۔

کسریٰ کے خزائن مفتوح ہونے پر حضرت عمرؓ کی دعا:

جب عمرؓ کے پاس کسریٰ کا خزانہ مفتوح ہو کر آیا تو سونے چاندی اور جواہرات کا بڑا انبار تھا آپ نے اس کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کی خداوندا آپ کا ارشاد ہے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ. کہ لوگوں کے دلوں میں خواہشوں کی محبت آراستہ کر دی گئی ہے۔ جن میں عورتیں بھی ہیں اور اولاد بھی اور سونے چاندی کے ڈھیر بھی اور گھوڑے نشان کردہ چوپائے اور کھیتی بھی۔ زین صیغۂ مجہول ہے جس کا فاعل یہاں مذکور نہیں علماء میں اس کے فاعل کے بارے میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اس کا فاعل شیطان کو مانا ہے کہ شیطان نے ان چیزوں کی محبت قلوب میں آراستہ کر دی ہے اور حضرت عمرؓ نے اللہ تعالیٰ کو فاعل مانا ہے۔ دونوں میں منافات کچھ نہیں دونوں صحیح ہیں کیونکہ تزیین کے دو درجے ہیں ایک وہ درجہ معصیت کی طرف مفضی ہو اس کا فاعل تو شیطان ہے اور ایک طبعی تزیین کا ہے جو کسی حکمت سے ودیعت رکھی گئی ہے۔ اس کے فاعل اللہ تعالیٰ ہیں کیونکہ طبعیات سب خدا کی پیدا کردہ ہیں آخر آپ کو کھانے پینے کی محبت نہیں ہے؟ یقیناً ہے پھر طبعاً مال و زر کی محبت بھی ہو تو کیا حرج ہے اور جس طرح طبیعت کے درجہ میں طعام و شراب کی محبت قبیح نہیں اسی طرح درجہ میں مال و اولاد کی محبت بھی قبیح نہیں اب اللہ تعالیٰ اس کے فاعل ہوں تو کچھ اشکال نہیں ہاں جو درجہ مفضی الی المعصیت ہے اس کا فاعل شیطان ہے ۔غرض حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مال کی محبت آپ نے ہمارے دلوں میں مزین کی ہے اس لئے ہم یہ تو نہیں چاہتے کہ ہم کو مال سے محبت نہ ہو اور نہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے ہم کو خوشی نہیں ہوئی ہاں یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی رضا کی طرف منعطف کر دیجئے اور اس کو اپنے دین کے کام میں صرف کر دیجئے سبحان اللہ! یہ حضرات ہیں عارف کامل! یہ

حکایت میں نے اسی واسطے ذکر کی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح لوگوں نے صبر کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ صورت شکایت کو بھی خلاف سمجھتے ہیں اسی طرح ترک دنیا اور زہد کی حقیقت کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے لوگ محبت مال کو مطلقاً زہد کے خلاف سمجھتے ہیں حالانکہ طبعی محبت زہد کے خلاف نہیں بلکہ خلاف زہد وہ درجہ ہے جو معاصی کی طرف مفضی ہو اور یہ جو صوفیہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مال کی محبت مطلقاً نہ تھی ان میں طبعی محبت دوسری محبت سے مغلوب ہو جاتی ہے جو بوجہ مغلوبیت کے کالمعدوم معلوم ہوتی ہے اور کبھی اس کے بعض آثار محسوس بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مقصود بالغیر ہوتی ہے تو صورت اس کے تعلق کی ہوتی ہے۔ حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔

حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ اور مولانا جامیؒ کی حکایت:

اس پر مجھے حضرت مولانا جامی کی حکایت یاد آئی کہ جب وہ حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں امیرانہ ٹھاٹ دیکھا تو بہت جھلائے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جن کے پاس اس قدر دنیا بھری ہوئی ہے آپ نے اسی وقت جھلا کر یہ مصرع پڑھا۔

نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد

اور یہ کہہ کر چل دیئے اور ایک مسجد میں آ کر سو رہے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور ایک شخص ان کے سر ہو گیا کہ میرے پیسے دلواؤ جو تمہارے ذمہ ہیں مولانا جامیؒ بڑے پریشان ہوئے کہ یہاں اس کو کہاں سے پیسے دوں اس نے کہا پھر نیکیاں دلواؤ۔ یہ اسی کشمکش میں تھے کہ ایک طرف سے حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ کی سواری بڑی شان سے آتی ہوئی نظر پڑی خواجہ صاحب نے مولانا جامیؒ کو پریشان دیکھ کر سواری روکی قرض خواہ کو دھمکایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو جاؤ جو کچھ تمہارا مطالبہ ہو ہمارے خزانہ سے وصول کر لو جو ہم نے یہاں پہلے سے جمع کر رکھا ہے یہ کہہ کر مولانا جامی کو اپنے ساتھ سوار کر لیا یہ دیکھ کر آنکھ کھل گئی۔ اب تو ان کو تنبہ ہوا کہ خواجہ صاحب بڑے درجہ کے درویش ہیں اور میں نے سخت غلطی کی جو ان پر اعتراض کیا ہے اسی سوچ میں تھے کہ اتنے میں خواجہ صاحب نماز کے لئے مسجد میں تشریف لائے یہ دوڑ کر قدموں میں گر پڑے اور خطا معاف کرائی خواجہ

صاحب نے فرمایا کہ ذرا وہ اپنا مصرع تو پھر سناؤ جو آتے ہی سنایا تھا مولانا جامی نے شرمندہ ہوکر عرض کیا کہ حضرت وہ تو میری حماقت تھی فرمایا کہ ایک بارتم نے اپنی خواہش سے حماقت کی تھی اب ہماری خوشی کے لئے وہ حماقت کرلو چنانچہ آپ نے پڑھا کہ ؎

نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد

تو حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا۔

اگر دارد برائے دوست دارد غرض مال کی محبت کا یہ درجہ خلاف زہد نہیں اور نہ مال کا جمع کرنا مطلقاً خلاف زہد ہے البتہ اس کو ذریعہ معاصی بنانا یہ خلاف زہد ہے اگر یہ نہ ہوتو پھر کچھ حرج نہیں بلکہ بعضوں کے لئے مالدار ہونا ہی مفید ہے اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کو مال سے قرب ہوگا اور کس کو افلاس سے۔ اس لئے کسی کو مال دیتے ہیں کسی کو مفلس رکھتے ہیں۔ میں نے حضرت عمرؓ کی عبدیت ظاہر کرنے کو ان کی حکایت بیان کی تھی۔ اس کے بعد بوجہ مناسبت کے دوسری حکایات ضمناً بیان ہوگئیں اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ بیماری وغیرہ میں صورت شکایت کا حرج نہیں بس شکایت حقیقت نہ ہونا چاہئے اور یہ امر اختیاری ہے اور تکوینیات میں انسان اسی کا مکلّف ہے اس کے سوا کسی عمل وغیرہ کا مکلّف نہیں پس تکوینیات میں فوق الطاقت کا وقوع جائز ہے اور تشریعیات میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہاں تکوینیات کے بارہ میں آگے دعا کی تعلیم ہے کہ فوق الطاقت مصائب سے بچنے کی بھی دعا مانگا کرو۔ چنانچہ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْراً کے بعد جو کہ تشریعیات کے باب میں ہے اس کا اضافہ بھی فرمایا گیا۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ ایک نکتہ اس مقام میں قابل غور یہ ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ میں دو عنوان کیوں اختیار کئے گئے۔ حالانکہ دوسری جگہ ارشاد ہے .وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اور ایک مقام پر ارشاد ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ.

شر کے لئے اکتساب اور خیر کے لئے کسب فرمانے کا سبب:

ان جگہوں میں اکتساب نہیں فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ اکتساب

میں کسب سے زیادت ہے کیونکہ افتعال کی خاصیت تکلف ہے۔ اب خیر کیلئے کسب اور شر کے لئے اکتساب اختیار کرنے میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاصی کے لئے انسان کو اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے گو وقوع اس کا سہولت سے ہو جائے مگر اہتمام شر کے لئے زیادہ ہوتا ہے اور خیر کے لئے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان کی اصلی فطرت خیر ہے جیسا کہ حدیث **کل مولود یولد علی الفطرۃ** (الصحیح للبخاری ۲:۱۲۵). (ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی نیز خیر سے مانع کوئی قوی قوت انسان کے اندر موجود نہیں رکھی گئی اور شر سے مانع ایک قوی قوت اس کے اندر موجود ہے یعنی عقل ۔ عقل خود معاصی سے روکتی ہے اسی لئے بعد معاصی کے انسان کو ندامت بے حد ہوتی ہے اس لئے شر کے واسطے اکتساب فرمایا اور خیر کیلئے کسب اور جو حدیث میں ہے **حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشہوات** (الصحیح لمسلم المقدمہ :۱) وہ اس تقریر کے منافی نہیں کیونکہ شر میں فی نفسہ سہولت نہیں ہاں عادت کے غلبہ سے وہ سہل اور مرغوب ہو جاتی ہے اور خیر میں فی نفسہ دشواری نہیں ہاں عادت نہ ہونے سے اس میں عارضی دشواری ہو جاتی ہے اور اسی درجہ کے لحاظ سے ان کو مکارہ کہا گیا ہے اب کچھ اشکال نہ رہا (میں کہتا ہوں کہ یہاں کسب و اکتساب میں تبدیل عنوان توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خیر میں مطلق کسب پر اجر ملے گا خواہ اتفاقاً خیر کا صدور ہو جائے اور شر میں مطلق کسب پر عذاب نہیں بلکہ تعمد کسب پر مؤاخذہ ہوتا ہے چنانچہ خطا و نسیان عفو ہے واللہ اعلم ۱۲

ط) ایک سوال و جواب یہاں حصر کے متعلق ہے جو لہا اور علیہا کی تقدیم سے حاصل ہوا ہے وہ یہ کہ اس حصر سے لازم آتا ہے کہ جیسے عقاب بلا کسب نہیں ہونا چاہیے کہ ثواب بھی بلا کسب نہ ہو حالانکہ ثواب کبھی بلا عمل محض فضل سے بھی مل جاتا ہے جیسا کہ نصوص میں وارد ہے۔ جواب یہ ہے کہ حصر باعتبار حصول کے نہیں بلکہ باعتبار استحقاق کے ہے یعنی استحقاق تو ثواب کا بھی بدوں کسب نہیں گو عطا ہو جاوے اور اوپر میرے کلام میں بھی اس طرف اشارہ ہے ایک نکتہ اس مقام پر قابل حل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا

اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا۔ (اے ہمارے رب ہم پر دارو گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں) کی ہم کو تعلیم فرمائی ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ دعا قبول ہو چکی ہے۔

نسیان وخطا امر غیر اختیاری ہے:

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رفع عن امتی الخطاء والنسیان (کنز العمال: ۱۰۳۰۷)۔ (میری امت سے خطا اور نسیان معاف کر دیئے گئے) اب سوال یہ ہوتا ہے کہ نسیان وخطا امر اختیاری ہے یا غیر اختیاری ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ غیر اختیاری ہے اور لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا الخ (اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اس کی طاقت اور اختیار کے مطابق) سے معلوم ہو چکا ہے کہ غیر اختیاری پر مؤاخذہ نہیں پھر بعد رفع مؤاخذہ آئندہ کیلئے دعائے عدم مؤاخذہ کی تعلیم کے کیا معنی جبکہ مؤاخذہ کا احتمال ہی نہیں دوسرا اشکال یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے رفع خطا ونسیان اس امت کے ساتھ مخصوص ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ دوسری امتوں پر مؤاخذہ تھا اور یہ عقل کے خلاف ہے کہ دوسری امتوں کو تکلیف مالا یطاق دی گئی ہو۔ نیز نص لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا (اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اس کے طاقت اور اختیار کے مطابق) میں نفسا عام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشریعیات میں تکلیف مالا یطاق کسی کو نہیں دی گئی اور عقل بھی عموم کو چاہتی ہے اس کے جوابات علماء نے مختلف دیئے ہیں مگر میرے ذہن میں جواب آیا ہے میں اس کو عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ خطرات ووساوس میں دو درجے ہیں ایک درجہ حدوث کا ہے۔ وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک درجہ بقا کا ہے۔ یہ بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے مثلاً کسی اجنبیہ کا دل میں بلا قصد خیال آ گیا یہ تو غیر اختیاری ہوا۔

وسوسہ کا کچھ دیر تک باقی رہنا بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے:

مگر اس وسوسہ کا کچھ دیر تک باقی رہنا بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے اور یہ بقاء کبھی قصیر ہوتا ہے کبھی طویل اور یہ بقاء اکثر ہوتا ہی ہے کیونکہ وسوسہ کا ایسا وقوع نادر ہی ہے کہ حدوث کے ساتھ ہی فنا ہو جائے زیادہ بھی ہے کہ وسوسہ کچھ دیر کو ضرور باقی رہتا ہے مگر

انسان کو اکثر بقاء قصیر کا احساس کم ہوتا ہے۔ بقاء طویل ہی کا احساس ہوتا ہے کہ کیونکہ ابتدا میں اس کو اس پر التفات نہیں ہوتا کہ وسوسہ درجہ حدوث سے تجاوز کر کے درجہ بقاء حاصل کر چکا ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھو کہ درجہ حدوث پر تو کسی سے مؤاخذہ نہیں وہ تو من کل وجہ غیر اختیاری ہے اور تیسرے درجہ پر سب سے مواخذہ ہے یعنی بقاء طویل پر کیونکہ وہ من کل وجہ اختیاری ہے اب ایک درجہ بیچ کا ہے یعنی جبکہ وسوسہ کو بقاء قصیر ہو یہ امت محمدیہ سے عفو ہے اور پہلی امتوں سے اس پر مؤاخذہ تھا کیونکہ یہ درجہ فی نفسہ اختیاری ہے اس لئے محل مؤاخذہ ہونے کے قابل ہے مگر مشابہ غیر اختیاری کے ہے اس لئے امت محمدیہ سے اس کے متعلق مؤاخذہ مرتفع ہو گیا رہا یہ سوال کہ جب یہ درجہ مشابہ غیر اختیاری کے ہے تو پہلی امتیں اس سے کس طرح بچتی ہوں گی اس کا جواب یہ ہے کہ جب فی نفسہٖ اختیاری ہے تو وہ اہتمام مزید کر کے بچتے ہوں گے اور نہ بچتے ہوں تو ان پر اس سے استغفار واجب ہوگا اور امت محمدیہ پر اس سے استغفار کا وجوب نہ ہوگا گو استحباب ضرور ہے۔ اور یہی دو درجے خطا ونسیان میں ہیں کہ خود خطا ونسیان تو غیر اختیاری ہے مگر اس کا منشاء یعنی عدم استحضار یا تذکر اختیاری ہے اگر تذکر کا استحضار کامل ہو تو پھر خطا ونسیان کا صدور نہیں ہوسکتا ان کا صدور جب بھی ہوگا عدم استحضار وغفلت ہی سے ہوگا چنانچہ اگر دن میں ہر وقت روزہ کا دھیان رہے تو نسیان طاری نہ ہوگا۔

افعال صلوٰۃ پر توجہ سے نماز میں سہو نہیں ہوتا:

نماز میں اگر افعال صلوٰۃ پر پوری توجہ ہو تو سہو نہ ہوگا اور یہ امر اختیاری ہے کہ توجہ رکھو تو اس کے ترک پر مؤاخذہ ہوسکتا ہے اب آیت وحدیث رفع عن امتی الخ پر تو اشکال نہ رہا۔ لیکن ایک مستقل اور اشکال وارد ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نماز میں سہو ہوا ہے کیا اس کا منشاء بھی عدم استحضار افعال صلوٰۃ تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں سہو نبوی کی علت بھی یہی ہے۔ لیکن علت عدم استحضار افعال صلوٰۃ ہم میں اور ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور۔ یعنی ہماری عدم توجہ الی الصلوٰۃ کا منشاء تو یہ ہے کہ

ہم کوایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی ہے جو نماز سے ادنیٰ ہے یعنی دنیا۔اور حضورؐ کی توجہ الی الصلوٰۃ کا منشاء یہ ہے کہ آپ کو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی تھی جو نماز سے اعلیٰ ہے یعنی ذات حق خوب سمجھ لو۔ بحمد اللہ اب یہ مسئلہ ہر طرح منقح ہو گیا کہ امور غیر اختیار یہ قابل اہتمام نہیں ان کا اہتمام چھوڑ دینا چاہئے اور غیر اختیاری سے مراد صرف احوال و کیفیات ہیں جز امرادنہیں بلکہ وہ تو مطلوب ومقصود ہےاوراحوال مقصود نہیں گومحمود ہوں مگر ابِ تو ستم یہ ہے کہ لوگ نماز ہی اس لئے پڑھتے ہیں تا کہ حضور قلب ہو اس لئے اگر حضور نہ ہو تو نماز بے کار سمجھتے ہیں حالانکہ حضور کی سعی اس لئے ہونا چاہی تھی ۔ کہ نماز کامل ہو ۔ہاں احوال کیلئے دعا کرنا جائز ہے پس دعا کرو۔لیکن شیخ سے ان کے عدم حصول کی شکایت نہ کرو۔ اور اگر وہ اجازت دے اور اس کا طریقہ بتلا دے تو اس کا تبرع ہے اس پر یہ بات لازم نہیں ۔پس عدم حصول احوال کی ایسی مثال ہے جیسے اولاد نہ ہونا کہ اس لئے دعا جائز ہے اور توقع کی درجہ میں تدبیر بھی جائز ہے لیکن یہ لازم ہے کہ اگر ترتب ہو جائے تو وہ خوش ہو جاؤ اور ترتب نہ ہو تو جب بھی خوش رہو پریشان نہ ہو بلکہ سمجھو کہ میرے لئے عدم حصول ہی مصلحت مگر خود دعا میں یہ قید نہ لگا دیں کہ یا اللہ اگر حال محمود مجھے نافع ہو تو عطا ہو ورنہ نہیں عقیدہ اور عزم تو یہی رکھے کہ اگر عطا نہ ہو گا تو میں یہی سمجھوں گا کہ میرے واسطے حصول میں حکمت نہ تھی مگر دعا میں اس قید کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ خود لے لیا ہے کہ اگر حصول مضر ہو گا تو ہم خود ہی نہ دیں گے۔ چنانچہ اولاد و رزق کے واسطے بھی دعا مشروع ہے مگر اس میں کہیں اس قید کی تصریح نہیں ۔اور دعائے استخارہ سے شبہ نہ کیا جائے کہ وہاں یہ تعلیم ہے کہ اگر یہ میرے واسطے خیر ہو تو میرے لئے آسان ہو جائے ورنہ میرے دل کو اس سے پھیر دیا جائے کیونکہ استخارہ کا محل ایسا امر ہے جس میں ظاہرا بھی نفع وضرر دونوں کا احتمال ہے اور یہاں ایسی دعا کا ذکر ہے جو بظاہر نافع ہی ہے فافترقا ۔بعض لوگوں کو خود دعا میں ایک اشکال واقع ہو گیا ہے کہ دعا کرنا بظاہر خلاف تفویض ہے تفویض اسی میں ہے کہ خود کچھ نہ مانگے جو وہ چاہیں گے خود ہی عطا فرما دیں گے۔

چہ حاجت بہ پیش تو حال دل گفتن کہ حال خستہ دلاں راتو خوب می دانی

اے اللہ تیرے سامنے دل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔اس لئے کہ زخمی دلوں کا حال تو خوب جانتا ہے۔

دعا تفویض کے منافی نہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ دعا تفویض کے خلاف جب ہو کہ داعی عدم اجابت پر راضی نہ ہو اور جب عدم اجابت پر بھی راضی ہے تو عین دعا کے وقت تفویض حال ہے۔ بہر حال غیر اختیار یہ میں دعا کی ممانعت نہیں ہاں تصدی و اہتمام کی ممانعت ہے کہ اگر حاصل نہ ہوں تو شکایت پیدا ہو۔

خلاصہ وعظ:

خلاصہ یہ ہوا کہ ایک تو اعمال اختیاریہ ہیں ان کا اہتمام واجب ہے اور ثمرات آجلہ یعنی جزا کے لئے دعا بھی جائز ہے اور اہتمام بھی واجب ہے اور ایک احوال غیر اختیاریہ ہیں یعنی ثمرات عاجلہ ان کے لئے صرف دعا جائز ہے اس کے علاوہ کسی قسم کا اہتمام جائز نہیں اور دعا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ عدم عطا پر بھی راضی رہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ہم کو فہم و عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد

وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین O

شفاءُ العی

یہ وعظ ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ شب جمعۃ المبارک بمقام چوک متصل کمبوہ ہال شہر انبالہ جو حضرت والا نے بیٹھ کر ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً آٹھ سو تھی۔ مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اما بعد فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انما شفاء العی السوّال. (سنن ابی داؤد کتاب الطہارۃ باب:۱۲۶)

تمہید

جہالت کا علاج:

یہ جملہ جس کو میں نے پڑھا ہے حدیث ہے یعنی ارشاد ہے حضور نبی کریم افضل الصلوٰۃ والتسلیم کا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے جس کی ضرورت عام اہل اسلام کو ہے جو غور کرنے سے معلوم ہوگی اور تعین اس کی ترجمہ سے ہو جاوے گی ترجمہ اس کا یہ ہے کہ بات یہی ہے کہ جہل کی شفاء سوال ہے جہل کے معنی ہیں ناواقف ہونا یعنی ناواقف ہو اس کی شفا سوال کرنا ہے یعنی پوچھ لینا۔ تحقیق کر لینا اس کا ترجمہ سے مقصود کی اجمالی تعین تو ہوگئی کہ مقصود ازالہ جہالت کا طریقہ بتلانا اور اس کی ترغیب دینا ہے یعنی جہل جو ایک مرض ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زائل کرنے کی ترغیب دے

رہے ہیں اور اس کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں اور ضرورت اس کی غور کرنے سے معلوم ہوگی
اور غور کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ بعض امور واقع میں ضروری ہوتے ہیں لیکن ہماری
نظروں میں ضروری معلوم نہیں ہوتے اس لئے ہم ان کی تحقیق نہیں کرتے اس لئے غور کی
ضرورت ہوگی تا کہ غور کرنے سے اس کا ضروری ہونا معلوم ہوجاوے۔ سو غور کی تقریر یہ ہے
کہ خیال کرنا چاہئے کہ ہر مسلمان مسلمان ہونیکی حیثیت سے اطاعت الٰہیہ کو ضروری سمجھتا
ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ اطاعت بدون علم کے کیسے ہوسکتی ہے۔ کیونکہ
جب تک حکم معلوم نہ ہو اس کی بجا آوری ممکن نہیں۔ تیسرا مقدمہ جس کو سب جانتے ہیں یہ
ہے موقوف علیہ کا موقوف علیہ موقوف علیہ ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ پس
ثابت ہو گیا کہ مسلمان کے لئے احکام شریعت کا علم لازم ہے اور چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ علم
حاصل ہونے کے طرق میں جو طریقہ عام اور سہل ہوسکتا ہے وہ اہل علم سے پوچھ لینا ہے بلکہ
بعض اوقات خود اہل علم کو بھی باوجود مراجعت کتب کے اس کی حاجت ہوتی ہے کہ وہ اپنے
سے زیادہ علم رکھنے والوں سے تحقیق کریں۔ اور اتنی موٹی بات ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ فہم والا
بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے لیکن افسوس آج یہ مسئلہ ایسا نظری اور غامض و خفی ہو گیا جس کو اہتمام
سے بیان کرنے کی حاجت ہوئی آج کل طرز عمل یہی ہو گیا ہے کہ احکام دین کو کوئی نہیں
پوچھتا ہے ہر آدمی ٹٹول کر دیکھ لے کہ ہر روز وہ کتنے احکام پوچھتا ہے ہر روز تو کیا بعض آدمی
مہینوں میں بھی کوئی بات دین کی دریافت نہیں کرتے بعض کو سالوں میں کسی بات کی تحقیق
کرنے کی نوبت نہیں آتی یا تو اس لئے کہ وہ دین کا کوئی کام ہی نہیں کرتا جو ضرورت ہو
پوچھنے کی کیونکہ دریافت وہی کرتا ہے جس کو کوئی کام کرنا ہو مثلاً جو شخص حج کا ارادہ رکھے وہ
حج کا طریقہ ضرور دریافت کرے گا۔ روزہ رکھنے والا روزہ کے مسائل کی تحقیق ضرور کرے گا
نمازی کو نماز کے مسئلے ضرور دریافت کرنے پڑیں گے یا زکوٰۃ کے مسئلے وہی دریافت کرے گا
جس کو ادائے زکوٰۃ کا خیال ہوتا ہے۔ اسی طرح میراث کے احکام وہ پوچھے گا جو دوسروں کا
حق پہنچانا چاہتا ہو اور جس کو حق العباد کی پرواہ نہ ہو وہ کیوں پوچھے گا اور یا دین کا کام کرتا ہے

مگر اپنی رائے سے کر لیتا ہے اور دونوں عذر نامقبول و نامعقول ہیں۔ اور اس تحقیق نہ کرنے سے صدہا معاصی کا ارتکاب ہوتا ہے۔

زمانہ جاہلیت کی ایک ظالمانہ رسم:

مثلاً میراث ہی کے باب میں یہ بے پرواہی ہے بنا بر رواج کے یوں جانتا ہو کہ اس ترکہ میں کسی کا حق ہی نہیں اور یا یہ خیال کر لیتا ہے کہ اسکی مقدار قلیل ہوگی مگر فی الحقیقت کثیر ہوتی ہے اور اگر قلیل بھی ہو تب بھی تو اس کا ادا کرنا واجب اور اخلال موجب وعید ہے چنانچہ پنجاب میں عموماً رواج عام کے مطابق میراث تقسیم ہوتی ہے جو کہ زمانہ جاہلیت کی ایک ظالمانہ رسم ہے اور اکثر مسلمانوں کو حتی کہ ناخواندہ حضرات کو کبھی بھی گمان نہیں ہوتا کہ ہم کسی کا حق دبائے بیٹھے رہیں بے فکری سے حرام کو حلال سمجھ کر کھاتے ہیں۔ علماء پر واجب ہے کہ اس ظلم کو مٹانے میں امکانی کوشش صرف کریں افسوس علماء کی جماعت خود مرض میں مبتلا ہے۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی ۲ (جامع) یا پورے حق سے واقف ہیں مگر اس درجہ تک اس کی ضرورت ذہن میں نہیں آتی جتنا کہ مہتم بالشان ہے (اس کو ایک معمولی مسئلہ تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حق العباد کا اہتمام حق اللہ سے بھی زیادہ بعض اعتبار سے ہونا چاہئے۔

حقوق العباد کا اہتمام حقوق اللہ سے زیادہ ہے:

کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ **و دیوان لا یترکہ اللہ ظلم العباد فیما بینھم حتی یقتص بعضھم من بعض و دیوان لا یعبأ اللہ بظلم العباد فیما بینھم و بین اللہ فذاک الی اللہ ان شاء عذب بہ و ان شاء تجاوز عنہ** ۔ یعنی حق اللہ معاف ہو سکتا ہے لیکن حق العباد بدوں ادا کئے چارہ نہیں اور اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ حق اللہ کا اہتمام نہ کرنا چاہئے کیونکہ منشاء ارشاد ہے یعنی اگر اللہ چاہے تو معاف کر دے گا معافی کا حتمی وعدہ نہیں ہے جس کی بنا پر حقوق خداوندی سے بے پرواہی کا فتویٰ دیا جا سکے اور حقوق مالیہ زیادہ قابل اہتمام ہیں کیونکہ حرام مال سے خیرات قبول نہیں اور کھانے پینے یا کپڑے میں حرام صرف کر کے نماز قبول نہیں ہوتی نہ حج قبول ہوتا

ہے جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں امید ہے کہ اس مختصر معروض کو قبول کر کے اس ظلم عام کی رفع کی طرف توجہ منعطف فرمائیں گے تفصیل کا یہ محل نہیں ۱۲ (جامع)

خلاف شریعت چندہ اکٹھا کرنے میں غضب الٰہی کا اندیشہ

اسی طرح احکام کی تحقیق نہ ہونے سے چندہ جمع کرنے میں اس کی رعایت بالکل نہیں ہوتی کہ خوشی سے دے رہا ہے یا بغیر خوشی کے بلکہ تحصیل چندہ کے لئے ایسے اشخاص کو منتخب کیا جاتا ہے جن کے دباؤ سے ہر شخص کو خواہی نخواہی دینا ہی پڑے گا۔ اگر کوئی متنبہ کرتا ہے کہ جائز نہیں تو اسکا جواب یہ دیا جاتا ہے ہم کوئی اپنے واسطے تھوڑا ہی کر رہے ہیں ہم تو خدا کے کام میں کوشش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ مسئلہ نہیں آیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے بھی طیب خاطر شرط ہے احکام نہ جاننا ہی سبب ہوا اس جواب کا اگر واقفیت ہوتی تو ایسی بات نہ کہتے بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے لئے چندہ جمع کرنے میں طیب قلب کی رعایت نہ کرنا اہون ہے۔ خدا کے واسطے چندہ جمع کرنے میں اس کی رعایت نہ کرنے سے کیونکہ یہ قاعدہ مسلم ہے کہ فعل کا مقصود حاصل نہ ہو وہ بے کار اب مقصود چندہ پر غور کرنا چاہئے تو اپنے لئے چندہ جمع کرنے والے کی غرض تو خود مال حاصل کرنا ہے پس وہ تو اس مقصود میں بہر حال کامیاب ہو جاتا ہے چاہے معطی کو طیب قلب ہو یا نہ ہو اور دین کے لئے چندہ کی غرض رضائے خداوندی ہے اور وہ جب نصیب ہوتی ہے کہ قواعد شرعیہ کے موافق کام کیا جاوے ورنہ بجائے رضائے باری تعالیٰ کے غضب الٰہی کا اندیشہ ہے پس اس کی کوشش بالکل ہی اکارت گئی۔ اور مقصود سے بالکل ہی محرومی ہوئی اور بڑا فرق ہے۔ اس میں جو کامیاب ہوا اور اس میں جو نا کامیاب رہا۔ البتہ گنہگار دونوں ہوئے اور فرق یہ ہوا کہ ایک کو دنیا کا تو فائدہ حاصل ہو گیا اور دوسرے کو دنیا کا بھی فائدہ نہ ہوا جس کی وجہ سے بالکل محروم ہوا پس ثابت ہوا کہ دینی چندہ میں احکام کی زیادہ رعایت کرنا چاہئے۔

مردہ کی چارپائی اور لباس وغیرہ کو منحوس سمجھ کر صدقہ کرنا:

اسی طرح احکام کی تحقیق نہ ہونے سے یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو دو طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک معمولی چیزیں جیسے چارپائی چادر وغیرہ تو عادت یہ ہے کہ ان کو للہ دیا

جاتا ہے اور قیمتی چیزوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اور دونوں چیزوں میں کوتاہی برتی جاتی ہے اس صدقہ میں تو دوخرابیاں ہوتی ہیں اول یہ کہ عموماً ان مستعمل چیزوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے مثلاً جس چارپائی پر انتقال ہوا اس کو استعمال کرنا معیوب خیال کرتے ہیں جن کپڑوں میں انتقال ہوا ہو ان کو گھر میں رکھتے ہوئے عار آتی ہے غضب ہے کہ منحوس سمجھتے ہوئے خدا کے نام پر دیتے ہیں کیونکہ نعوذ باللہ وہی اس کے لائق ہیں افسوس لوگوں کو شرم نہیں آتی جب کھانا سڑ گیا تو اللہ کے واسطے ہو گیا ورنہ اپنے کھانے کا تھا نیا کپڑا اپنے لئے تھا جب پھٹ گیا تو اللہ کے نام پر تھوپ دیا۔ غرض کہ جو شئے نکمی ہو جاتی ہے وہ اللہ کے نام دی جاتی ہے حالانکہ ادھر یہ ارشاد ہے ۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ خیر کامل کو تم کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔ حضرات صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے سب سے زیادہ محبوب باغ ہے اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ فرما دیجئے ان کی یہ حالت تھی کہ سب سے عمدہ شے اللہ کیلئے خرچ کرتے تھے تا کہ رضائے مولا حاصل ہو اور درحقیقت یہ اللہ کی رحمت ہے کہ صدقات کو اپنی طرح منسوب کیا ورنہ وہ کسی کا محتاج نہیں اس نے مخلوق کو اپنا کوئی نفع حاصل کرنے کے واسطے پیدا نہیں کیا اور نہ اس کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے اس نے مخلوق کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ ان کو انعام بخشے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

میں نے مخلوق اس لئے نہیں پیدا کی کہ میں کوئی نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا تا کہ اپنے بندوں پر عنایت کروں۔

وہ سب کو نفع پہنچاتا ہے سب چیزیں اور خود ہم بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں ایسی حالت میں کتنی ستم کی بات ہے کہ اس کے پسندیدہ مواقع میں خراب چیزیں خرچ کی جاویں۔ البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان پرانی چیزوں کو پھینک دیں۔ جواب یہ ہے کہ پھینکو نہیں بلکہ مساکین ہی کو دے دو مگر اس نیت سے دو کہ ان کی حاجت رفع ہو اور خاص خوشنودی حق کے لئے دو تو وہ اچھی سے اچھی چیز ہونی چاہئے۔

ہدیہ کا مقصد:

اور فرق ان دونوں میں اس سے معلوم ہوگا کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور صدقہ قبول نہیں فرماتے تھے پھر دریافت کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ تو اللہ تعالیٰ کے خوش کرنے کے لئے جس کا مصرف فقراء ہیں اور ہدیہ میرے خوش کرنے کے لئے ہے۔ ہدیہ میں محض مہدی الیہ کا دل خوش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ثواب کی نیت اس میں نہیں ہوتی گویا بالواسطہ ثواب مل جاتا ہے کیونکہ تطییب قلب مسلم بھی عبادت ہے۔ لیکن براہ راست ثواب مقصود نہیں ہوتا اور صدقہ میں براہ راست ثواب ہی مقصود ہوتا ہے اور اسی واسطے اگر کسی کے پاس صدقہ بھیجیں اور وہ نہ لے تو دوسرے کو دیدیا جاتا ہے اور ہدیہ جس کے پاس بھیجا جاوے اگر وہ نہ لے تو خود کھاپی لیتے ہیں۔ یا مستقل قصد سے اور کسی کو ہدیہ دیتے ہیں جب ہدیہ اور صدقہ میں فرق سمجھ لیا تو ایسا ہی فرق گھٹیا اور بڑھیا چیز کے دینے میں بھی ہے کہ اعلیٰ شے اللہ کے نام پر ثواب کے لئے دو۔

ادنیٰ شئ مسکین کو کس نیت سے دینا جائز ہے:

اور ادنیٰ شئے کسی مسکین کو رفع حاجت کے لئے دے دو۔ گو اجر اس سے بھی مل جاوے گا مگر اللہ کے نام پر خراب شئے دینے میں جو بے ادبی تھی اس سے احتراز ہو گیا کیونکہ تم نے وہ اللہ کے نام پر نہیں دی بلکہ مسکین کو رفع حاجت کے لئے دی ہے۔ اب سب اشکالات رفع ہو گئے۔ اور سب نصوص جمع ہو گئے۔ دیکھئے احکام نہ جاننے سے اتنی کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اسی لئے علم کی بہت ضرورت ہے یہ تو صدقہ کی دو خرابیوں میں سے ایک خرابی کا بیان تھا کہ مردہ کے ایصال ثواب کے لئے وہ چیز دی جاتی ہے جس کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اب اسی صدقہ کے متعلق دوسری کوتاہی بتلاتا ہوں جو عام طور پر ہوتی ہے مگر نہ دینے والوں کو اس کی خبر ہے نہ لینے والوں کو۔ افسوس بڑی غفلت ہے احکام شرعیہ سے سنئے حکم شرعی یہ ہے کہ کل ترکہ میت کا مشترک ہے درمیان ورثہ کے اور مشترک مال کو بلا اجازت دیگر شرکاء کے صرف کرنا جائز نہیں۔ پس ترکہ میں کا ایک کرتہ یا پاجامہ حتی کی ٹوپی کمر بند رومال بلکہ ایک سوئی تک بھی قبل از تقسیم بلا رضا مندی سب ورثہ کے کسی کو دینا جائز نہیں ہوگا مگر آج کل اس کی مطلق

پرواہ نہیں۔ دیتے ہیں ثواب کیلئے اور ہوتے ہیں گناہ گار خدا بچاوے جہالت سے اور توفیق فرماوے علم وعمل کی۔ (آمین ثم آمین)

مشترکہ مال خرچ کرنے کے چند شرائط:

مشترکہ مال خرچ کرنے کی چند شرائط ہیں ایک اجازت دوسرے اجازت دینے والے کا عاقل بالغ ہونا۔ تیسرے طیب خاطر سے اجازت دینا۔ یہ شرطیں یہاں بھی ملحوظ رہیں تینوں باتوں کو خوب دیکھنے کے بعد خرچ کیا جاوے تو جائز ہوگا ورنہ حرام یعنی سب ورثہ سے اجازت لی جاوے اور ان میں کوئی نابالغ نہ ہوں مجنون نہ ہو اور اجازت خوشی سے دے دیں اگر کسی دباؤ سے یا بنا بر رواج کے اجازت دی گئی تو وہ معتبر نہیں کیونکہ اس میں طیب خاطر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی وارث کا دل نہیں چاہتا مگر انکار میں سبکی ہوتی ہے اس لئے اجازت دی جاتی ہے۔ یادرکھو حدیث شریف میں صاف وارد ہے الا لایحل ما ل امرئ مسلم الا بطیب نفس منه (کنز العمال : ۲۹۷) یعنی کسی مسلمان کا مال بدون اس کے دلی خوشی کے لینا حلال نہیں۔ پس اصل صورت تو اس کی یہی ہے کہ ترکہ تقسیم کرکے ہر شخص کا حصہ اس کو پہنچا دیا جاوے۔ سب منقول وغیر منقول کو باہم تقسیم کرلو اس طرح کہ جو چیزیں ذوات الامثال ہیں مثلاً غلہ ان کو بجنسہ بانٹ لو اور جو متماثل نہ ہوں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اس کی قیمت لگالو اور اگر اختلاف ہو تو قرعہ ڈال لو۔ یا نیلام کرکے دام تقسیم کرلو غرض سب کی رضامندی سے جب پورا ترکہ تقسیم ہو چکا تو پھر جس کا دل چاہے اپنے اپنے حصہ میں سے خیرات کردے۔ یہ بیان تھا صدقہ کی کوتاہیوں کا۔

ترکہ کی تقسیم میں چند عظیم کوتاہیاں:

اب تقسیم ترکہ کی کوتاہی سنئے اول تو جس جس وارث کو شریعت نے مستحق ٹھہرایا ہے۔ اس کے مطابق آج کل ورثہ کے حقوق ہی نہیں سمجھتے بلکہ رواج عام جس کو وارث کہے وہی حقدار قرار دیا جاتا ہے یہ پورا اور صریح مقابلہ شریعت کا جس سے کفر کا اندیشہ ہے اس سے توبہ کرو اور شریعت کے مطابق میراث تقسیم کیا کرو۔ چنانچہ آج کل بہنوں کا ترکہ میں کچھ نہیں شمار کیا جاتا اور اگر کسی نے بہن کو حقدار سمجھا بھی تو اس سے معافی کرانے کی فکر کی جاتی ہے۔ معافی کی

صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ مجھے کچھ ملتا تو ہے نہیں (کیونکہ ظالموں نے قانون میں بہن کو محروم الارث کرر کھا ہے) تو بھائی صاحب سے بری کیوں بنوں وہ تو مجبور ہو کر اپنا حق معاف کر دیتی ہے اور جہاں قانوناً اسے حق مل سکتا ہے (جیسا کہ اضلاع سہارنپور و مظفر نگر وغیرہ میں) وہاں بھائی صاحب سے حصہ لینے میں بدنامی سمجھی جاتی ہے اور دعوی کرتے ہیں تمبع شریعت ہونے کا کہ ہم نے تو بہن سے کہا تھا اس نے خود ہی اپنا حق چھوڑ دیا۔

شرعاً معافی معتبر ہونے کا طریق:

پس جاننا چاہئے کہ یہ معافی معتبر نہیں البتہ اگر ہمشیرہ کو اسکا حق سپرد کر دیا جاوے پھر وہ قبضہ کے بعد بلکہ چند روز اس سے منتفع ہونے کے بعد جس سے اس کو اس کی حقیقت منکشف ہو جاوے طیب خاطر سے ہبہ کر دے تو جائز ہو سکتا ہے ورنہ بلا طیب خاطر کے یہ رسمی اجازت ہرگز معتبر نہیں (و نیز بلا تقسیم کئے ہوئے نہ ہبہ صحیح ہے اور نہ معافی معتبر کیونکہ **هبته المشاع** اور **ابراء عن الاعيان** باطل ہے **کما هو مصرح في کتب الفقه ۱۲ جامع**) اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اکثر لوگ ان مسائل سے یا تو ناواقف ہیں یا واقف ہیں مگر ضروری العمل نہیں سمجھتے۔ نیز یہ احکام جس درجہ اہتمام کے قابل ہیں وہ درجہ ان کے ذہن نشین نہیں۔

معاملات میں کوتاہیاں:

اس کے علاوہ اور بہت سے معاملات ہیں جنہیں احکام شرعیہ کی تحقیق نہ ہونے سے ایسا ہی برتاؤ ہو رہا ہے چنانچہ نوکری اور تجارت میں حلال و حرام کا کچھ امتیاز نہیں حتیٰ کہ بہت لوگ ناجائز کے جواز کی تمنا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بیرسٹر صاحب الہ آباد میں کہتے تھے کہ آج کل مسلمانوں کا افلاس حرمت سود کی وجہ سے ہو رہا ہے علماء کو چاہئے کہ سود کے جواز کا فتویٰ دے دیں۔ ایک مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب قرآن شریف میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے تو اہل علم کو کیا اختیار ہے جائز کہہ دینے کا وہ تعجب کے ساتھ بولے کہ کیا قرآن شریف میں اس کی حرمت آئی ہے مولوی صاحب نے کہا جی ہاں۔ اس نے کہا مجھے خبر نہیں میں سمجھتا تھا کہ علماء نے خود ہی حرام کر رکھا ہے۔ ان مجموعی حالات سے پتہ لگتا ہے تعلیم احکام شرعیہ کی ضرورت کا میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی عمل بھی نہ کرے تب بھی مسائل کا جاننا اور پوچھنا لازم ہے

احکام کا علم نہ ہونا قابل قبول عذر نہیں:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ احکام پوچھنا نہ چاہیے کیونکہ معلوم ہونے پر پھر خلاف کیا تو سخت گناہ ہوگا۔ اور بلا معلوم ہوئے جو کوتاہی ہوجاوے وہ قابل گرفت نہیں مگر یہ محض من گھڑت لغویات ہے کیا نعوذ باللہ خداتعالیٰ ایسے بھولے ہیں کہ آپ کے بہلانے میں آجاویں گے۔ کیونکہ صاحب اگر اللہ تعالیٰ یہ دریافت فرمائیں کہ تم نے خبر کیوں نہیں حاصل کی۔ جواب کیا دو گے۔ یہ عذر بے علمی کا جب مقبول ہوسکتا ہے جبکہ باوجود کوشش کے معلوم نہ ہوسکے اور جب دل میں ایک بات کے متعلق شک ہے اور بتلانے والے موجود ہیں تو پھر یہ عذر کیسے معتبر ہوسکتا ہے۔ اور ایسے باطل خیالات اور مقالات لوگوں کے ذہن اور ذہن میں دین ہی کے باب میں آتے ہیں۔ دنیا کے معاملات میں کبھی نہیں آتے چنانچہ دنیا کے احکام کو دیکھتے ہیں کہ اگر مجرم عدم علم قانون کا عذر کرے تو یہ ان کے نزدیک معتبر نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی بھی چون و چرا نہیں کرسکتا وہاں تو خود ہی فتویٰ لگا دیتے ہیں کہ وکیل اور بیرسٹر موجود ہیں ملزم کو ان سے دریافت کرنا چاہیے تھا اور یہ سمجھنا کہ جان کر گناہ کرنا زیادہ عذاب کا باعث ہے من وجہ صحیح ہے مگر علی الاطلاق من کل الوجوہ غلط ہے۔

بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے:

کیونکہ مسلمان کے دو فرض ہیں علم اور عمل پس فرض علم کو ادا کرکے وہ ایک فرض سے تو سبکدوش ہوگیا اور بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے۔ پس بتلایئے دو گناہ زیادہ ہیں یا ایک یقیناً دو گناہ زیادہ ہیں البتہ جاننے والے کا عملی گناہ نہ جاننے والے کے عمل گناہ سے اشد ہوگا مگر جاننے والا بے علمی کے گناہ سے محفوظ ہوگا اور جاہل بلا عذر کو بے علمی کا گناہ بھی ہوگا۔ پس لازم ہے کہ عزم عمل کا انتظار نہ کرے بلکہ احکام دریافت کرتا رہے جب عمل کی توفیق ہوگی اس وقت یہ علم کام آوے گا۔ جیسا کہ کسی خارشی نے علاج تو نہیں کیا مگر مجرب نسخہ یاد کرلیا ہے۔ سو یہ بھی مفید ہے کیونکہ جب کبھی اس کو علاج کی طرف توجہ ہوگی تو نسخہ پاس موجود ہے علاج کرلے گا اور اگر نسخہ بھی یاد نہیں تو مشقتیں اٹھانا پڑیں گی۔ ایک نسخہ تلاش کرنے کی اور دوسرے دوا استعمال کرنے کی۔ پس اسلم یہی ہے کہ ہر حال میں احکام شرعیہ معلوم ہوجاویں۔

مسائل دریافت کرتے رہنے کی ضرورت:

صاحبو! عمل میں تو دشواری بھی ہے مگر دریافت کرنے میں کیا مشقت ہے جس کو حرمت رشوت کا اجمالاً علم ہے اس کو ترک رشوت تو بے شک کسی قدر دشوار ہے لیکن اس کے تفصیلی مسائل پوچھنے میں کیا تکلیف ہوگی۔ جان کر گناہ کرنا بے شک زیادہ برا گناہ ہے مگر جو پوچھ پاچھ کر کے قادر ہو جانے پر وہ بھی جاننے والے کے برابر ہے اس کے گناہ کے کمی پر کوئی دلیل نہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص قصداً رمضان کا چاند نہ دیکھے تو کیا جب تک یہ اپنی نظر سے چاند نہ دیکھے گا اس پر روزہ فرض نہ ہوگا۔ البتہ اگر انتیس کو بوجہ ابر وغیرہ کے باوجود تلاش کے نظر نہ آیا تب معذور ہے پس جو شخص دریافت کر سکتا ہے اس پر دریافت کرنا واجب ہے اور اگر نہ کرے گا تو اس کو ایسا ہی گناہ ہوگا جیسا مسئلہ جان کر عمل نہ کرنے میں گناہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حیثیت میں مختلف ہوں ایک حیثیت سے بے علمی کا گناہ زیادہ ہو اور دوسری حیثیت سے جان بوجھ کر معصیت کرنے کا زیادہ گناہ ہو۔ بعض لوگ وعظ میں اس لئے نہیں جاتے کہ مسئلہ سن کر عمل کرنا پڑے گا۔ سبحان اللہ اور کیا باوجود قدرت علی تحصیل العلم کے تم کو عدم علم کا گناہ ہوگا غرض کہ لوگ تحقیق کو یعنی مسائل پوچھنے کو ضروری نہیں سمجھتے اس بلا میں سب مبتلا ہیں اسی واسطے اس بیان کی ضرورت ہوئی۔ الحمد للہ کہ اب مضمون کی تعیین بھی ہوگئی اور اس کی ضرورت بھی ثابت ہوگئی۔ اب حدیث کی شرح عرض کرتا ہوں سو حدیث کے تین اجزاء ہیں اور ہر ایک میں جداگانہ فائدہ ہے اور ہر فائدہ ایک علم مستقل ہے۔

جہالت ایک مرض ہے:

چنانچہ اول فائدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاء کی اضافت جہل کی طرف فرمائی ہے جس سے جہل کا مرض ہونا معلوم ہوگیا۔

امراض باطنی کو مرض نہ سمجھنا جہالت ہے:

یہ بات اس لئے بتلانا ضرور ہے کہ لوگ عموماً اس مرض سے غافل ہیں۔ امراض جسمانی کو تو لوگ مرض سمجھتے ہیں مگر روحانی مرض کو مرض ہی نہیں جانتے۔ اگر کسی کو دق یا سل

ہو جائے تو مزاج پرسی کے جواب میں مریض ہونا ظاہر کیا جاوے گا اور اگر ان امراض مذکورہ سے محفوظ ہوں تو ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ الحمد للہ اچھا ہوں چاہے باطن میں کتنے ہی امراض ہوں۔ امراض باطنہ کی تو پرواہ ہی نہیں کی جاتی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں   حکمت ایمانیاں راہم بخواں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب   صحت آں حس بجوئید از حبیب

یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے۔ کچھ حکمت ایمانی یعنی معرفت پڑھو۔ اس حس جسمانی کی درستی چاہتے ہو تو طبیب جسمانی سے رجوع کرو۔ اور اگر حس روحانی کی درستی منظور ہے تو مرشد کامل سے رجوع کرو۔

امراض روحانی زیادہ مہلک ہیں:

یعنی ایک حواس ظاہری ہیں ایک باطنی پس باطنی یعنی قلب کی اصلاح اہل اللہ سے ڈھونڈو حق تعالیٰ فرماتے ہیں شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ. کہ قرآن پاک شفاء ہے۔ امراض قلب کے واسطے اس سے بھی امراض باطنہ کا اثبات ہوتا ہے۔ غرض یہ جہل بھی ایک مرض ہے اور مرض بھی شدید بلکہ اشد کیونکہ امراض جسمانی کا انجام تو صرف ہلاک دنیوی ہی ہے۔ اور ہلاک دنیوی کی حقیقت کیا ہے کچھ بھی نہیں بلکہ وہ تو دراصل جملہ امراض سے فارغ ہو جانا ہے اسی کے بعد وہ حیات ہے جو بنا پر اخبار صادقہ منقطع ہی نہیں ہو سکتی بخلاف مرض روحانی کی کہ اس کا انجام اخروی ہے جو یا ابدی ہے یا غیر ابدی ممتد ارشاد ہے۔ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. وہاں تو ایک دن کی سزائے قید ہزار برس کے برابر ہے اور پھر امتداد کے ساتھ وہاں کی قید میں اشتداد بھی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ وہاں کی آگ یہاں کی آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے جب اسی آگ کی برداشت نہیں ہو سکتی تو اس کی کیسے ہوگی تمام بدن تو درکنار ایک دیا سلائی کی آگ انگلی تک پہنچ جائے تو تحمل نہیں ہوتا اور وہ آگ تو محیط ہوگی کہ انسان اس میں غرق ہوگا اور رگ و پے تک آگ پہنچے گی اس کی برداشت کیسے ہو سکتی ہے اور کون برداشت کر سکتا ہے۔ اور کافر کیلئے تو عذاب ابدی ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ہرگز ہرگز کسی طرح رہائی نہ ہو سکے گی۔

دین کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے:

اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کافر وہ ہے جو کفر کا کام کرے یا کفر کی بات کہے اگر چہ عقائد کفریہ نہ ہوں پس اگر کوئی مسلمان کفر کا کام کرے گا جیسے بلا عذر زنار پہن لینا وہ بھی کافر ہو جاوے گا۔ یا جب زبان سے کلمہ کفر کہا فوراً کفر عائد ہو جاوے گا۔ اس سے بھی آج کل نہایت بے پرواہی ہو رہی ہے مثلاً بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے گا جس کے پاس کھانے کو نہ ہو اور کچھ خیال نہیں ہوتا کہ ہم نے کس درجہ کا گناہ کیا حالانکہ وہ کافر ہو گیا۔ اب یا تو اس کو اپنے کفر کی خبر نہیں یا خبر ہے مگر کفر کو خفیف خیال کرتا ہے اور در حقیقت یہ کلمہ بہت شدید اور سخت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم نے تو مذاق میں کہا تھا تو سن لو کہ دین سے مذاق کرنا بھی کفر ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (کہہ دیجئے کہ تم اللہ تعالیٰ اس کی نشانیوں اور اس کے رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے) اس سے صاف معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کے ساتھ تمسخر کرنیوالا بھی کافر ہے۔

کافر بنانا اور کافر بتانا میں فرق:

پھر اس پر ایک اور ستم ہے وہ یہ کہ آج کل کوئی عالم یہ فتویٰ دیتا ہے کہ تم کافر ہو گئے تو اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں یہ کیسے مولوی صاحب ہیں جو مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں اے صاحب خبر بھی ہے کہ بنانے کے کیا معنی ہیں بنانے کے معنی ہیں تعلیم دینا چنانچہ مسلمان بنانے کے معنی سب کے نزدیک یہی ہیں کہ کافر کو اسلام کی تعلیم دینا تم جو مولویوں پر اعتراض کرتے ہو کہ یہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں تو کیا وہ کسی کو کفر کی تعلیم کرتے ہیں ہرگز نہیں ہاں وہ دلیل کی بناء پر کسی کو کافر ضرور کہتے ہیں کہ کافر کہنا کافر بنانا نہیں دیکھو کافروں کو مسلمان کہہ دینے پر کسی کے نزدیک بھی مسلمان بنانا صادق نہیں آتا بلکہ کافروں کو اسلام کی تعلیم دینے سے البتہ کہا جاوے گا کہ اس نے فلاں کافر کو مسلمان بنایا ہے اسی طرح کافر بنانے کے یہی معنی ہوں گے کہ کسی شخص کو کفر کی بات سکھا دیں تو ایسا کسی عالم کو دیکھا ہے اور اگر فتویٰ دیا تو اس کو کافر بنانا (نون سے) نہیں کہہ سکتے البتہ یہ تو کافر بتانا (تا سے) ایک نقطہ کا فرق ہے (اس نکتہ کو یاد رکھنا) پس یہ الزام علماء پر خواہ مخواہ کا ہے بلکہ وہ تو خیر خواہی کرتے ہیں کہ

تمہارے قول و فعل کا انجام بتلا کر اس سے محفوظ رہنے کا طریقہ سکھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم مسلمان رہو تو درحقیقت وہ مسلمان بناتے ہیں اور یہی ان کا کام ہے تاکہ مسلمان اس کفر سے محروم رہیں خصوصاً وہ لوگ جو علوم معاش میں ترقی کر رہے ہیں ان کا تو رات دین یہی شیوہ ہے کہ شریعت کا استہزاء استخفاف کرتے رہتے ہیں۔

شریعت کی بے تمیزی پر علماء کا غصہ بجا ہے:

چنانچہ ایک بڑی لیاقت کے نوتعلیم یافتہ نے میرے سامنے ایک حدیث شریف کا مضمون سنکر کہا کہ مسلمانوں کو جولا ہوں جیسے عقیدے سکھائے جاتے ہیں اس کا کفر ہونا تو بالکل ہی ظاہر ہے اور بعض نوتعلیم یافتہ استہزاء و استحقار کے عنوان سے تو نہیں بلکہ رفع شبہ کے طور پر علماء کے سامنے مسائل شرعیہ پر اعتراض کرتے ہیں۔

رفع شبہ کی دو صورتیں:

مگر سن لو کہ رفع شبہ کی دو صورتیں ہیں ایک ادب کے عنوان سے اور ایک عناد کے ساتھ آج کل اکثر عناد اور استخفاف کے شبہات پیش کرتے ہیں۔

شریعت کی بے تمیزی پر علماء کا غصہ بجا ہے:

اور جب علماء کو ان کی بے تمیزی کی باتوں پر غصہ آتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ غصہ کرنے لگے ہم کو جواب نہیں دیا۔ سبحان اللہ جب شریعت کے ساتھ گستاخی سن کر علماء کو غیرت آتی ہے تو اس کو بدمزاج کہا جاتا ہے۔ صاحبو! جب تم اپنے ماں باپ کی شان میں کسی کو گالی دیتے ہوئے سن کر جامہ سے باہر ہو جاتے ہو تو کیا خدا کی اتنی وقعت بھی علماء کے قلوب میں نہ ہو کہ ان کی بے ادبی سن کر انہیں غصہ آجاوے۔ غرض ان سب واقعات کی وجہ وہی مرض جہالت ہے مگر اس پر بھی لوگوں کو تندرست ہونے کا دعویٰ ہے پھر مگر غور سے سن لو کہ عذاب نار کی ابدیت اسی کے ساتھ خاص نہیں جس کو سب لوگ کافر سمجھتے ہوں بلکہ جو شخص بھی کفر کرے اس کی یہ سزا ہے کہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ جب امراض روحانی کا یہ انجام ہے تو بتلاؤ مرض جسمانی اشد ہوا یا روحانی۔

امراض جسمانی سے گناہ معاف ہوتے ہیں:

بلکہ مرض جسمانی پر تو ثواب دیا جاتا ہے بخار سے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے خزاں میں درختوں سے پتے گرتے ہیں۔حتیٰ کہ اگر کسی کے کانٹا لگ جاوے اس پر بھی حق تعالیٰ اجر عطا فرماتے ہیں بخلاف اس مرض روحانی کے کہ اس میں ثواب تو درکنار الٹا خدا کے غضب اور عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے مگر افسوس کہ اسکو بیماری ہی نہیں سمجھتے حتیٰ کہ اس کی سزا کو دیکھ کر ذہن میں یہ بات نہیں آتی چنانچہ جب کوئی جسمانی بیماری ہم کو لاحق ہوتی ہے تو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے افعال کا نتیجہ ہے بلکہ آب وہوا خراب ہونے کی طرف گمان کیا جاتا ہے اور اسی کی صفائی کا اہتمام ہوتا ہے اور امراض باطنہ کی طرف اور اصلاح اعمال کی جانب اصلاً توجہ نہیں کرتے حالانکہ بعض امراض جسمانیہ مسبب ہوجاتے ہیں امراض روحانیہ یعنی معاصی اور سبب نہیں ہوتے امراض روحانیہ کے کیونکہ وہ اپنی ذات میں رحمت ہیں۔البتہ اگر سوء فہم سے مرض میں شکایت کی تو اس عارض کے سبب گناہ نہ ہوگا۔باقی فی نفسہ مرض جسمانی سبب رحمت ہی ہے۔عدم تحمل سے کوئی سخت کلمہ کہہ دیا۔سو یہ قبح بالواسطہ ہے کہ جو اس کے تصرف سے پیدا ہوگیا غرض امراض جسمانی اور امراض روحانی میں ایک طرف سے سببیت ومسببیت کا خاص علاقہ ہوجاتا ہے جیسا کہ خود امراض جسمانی میں بھی ایک دوسرے مرض میں علاقہ قائم کیا جاتا ہے مثلاً زکام کو بخار کا سبب قرار دیکر زکام کا علاج کرتے ہیں مگر روحانی اور جسمانی مرض میں علاقہ کا اعتقاد نہیں کرتے حالانکہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ. یعنی تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی بدولت ہے پس معلوم ہوگیا کہ امراض روحانی یعنی معصیت کبھی سبب ہوجاتا ہے امراض تکالیف جسمانی کا بعض روایات کا ترجمہ کرتے ہوئے مولانا رومی کا ارشاد ہے ؎

ابرناید از پئے منع زکوٰت   وز زنا افتد وبا اندر جہات

زکوٰۃ ادا نہ کرنے سے بادل نہیں آتے اور زنا سے پورے اطراف میں مصیبت آجاتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس میں جوڑ نہیں۔

امراض جسمانی وروحانی میں تعلق:

صاحبو! جوڑ اچھا خاصہ ہے مگر جو علم شریعت اور حقیقت سے بے بہرہ ہو اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی توضیح ایک مثال سے ہو جاوے گی وہ یہ کہ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ پھانسی کسی جرم کی وجہ سے ہوا کرتی ہے اس نے کسی کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھا اور کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس نے ایک خون کر دیا تھا وہ سبب ہوا اس کی موت کا وہ کہتا ہے یہ بالکل غلط ہے بلکہ میں بتلاتا ہوں میں نے خود دیکھا ہے کہ اسکے گلے میں ایک رسی ڈال کر پاؤں کے نیچے سے تختہ کھینچ دیا تھا اسکا گلا گھٹا اور مر گیا یہ سبب ہے اسکی موت کا اور کسی کو مار دینے اور اس کی جان جانے میں کچھ علاقہ اور جوڑ نہیں ہے اس وقت عقلمند اور قانون اس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ دراصل اس کے جرم ہی پر حاکم نے حکم دیا کہ گلے میں رسی ڈال کر تختہ کھینچ لو اصل سبب یہی جرم ہے کہ اس نے خون کیا تھا پس جس طرح اس ناواقف کو سب بیوقوف بنائیں گے اور خون کرنے اور پھانسی دیئے جانے میں جوڑ کا پختہ یقین کرتے ہیں اسی طرح طاعون وغیرہ میں اور گناہوں میں پورا جوڑ ہے وہاں حکم حاکم سے یہ سب کچھ ہوا تو یہاں بھی معاصی کی سزا میں حاکم حقیقی کے حکم سے جراثیم پیدا ہوئے اور اس سے طاعون پھیلا اس میں کونسی باریکی ہے جو آپکو سمجھ نہیں آتی۔ دیکھا آپ نے کہ مرض روحانی اور مرض جسمانی میں کیسا علاقہ ہے تعجب ہے کہ اس کی طرف اصلاً التفات نہیں اور ناخواندہ حضرات کی تو کیا شکایت افسوس یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے غافل ہے (خصوصاً طالبان علم دین کی غفلت زیادہ قابل تاسف ہے) بہر حال ایک تو یہ حالت ہے کہ مطلقاً باطنی امراض کو مرض ہی نہیں سمجھا جاتا اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو سب امراض کو امراض نہیں سمجھتے چنانچہ اختلال فی العمل یعنی بدعملی کو تو گناہ سمجھتے ہیں مثلاً نماز نہ پڑھے تو اس کو گناہ گار جانتے ہیں لیکن اختلال فی العلم یعنی ترک علم کو گناہ ہی نہیں خیال کیا جاتا مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور اس کے مسائل نہیں سیکھتا تو اس کو کوئی گناہ نہیں جانتا حتی کہ (خطا معاف) جو علم دین حاصل کر رہے ہیں ان کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں کہ ہم کو مرض جہل سے شفا حاصل کرنے کی قصد علم حاصل کرنا چاہئے مگر تاہم ان کو مرض جہالت

سے شفا تو ہو جاوے گی کیونکہ دوا پینے والا تندرست ہو جاتا ہے گو نیت کچھ ہی ہو۔ البتہ اس نیت سے پڑھتا کہ مرض جہل دور کرنے کیلئے خدا تعالیٰ نے تحصیل علم فرض کر دی ہے اور میں اس فرض کو ادا کر رہا ہوں تو اور زیادہ اہتمام کرتا ہے بخلاف اس شخص کے جو مقتداء وغیرہ بننے کیلئے پڑھتا ہے اس کو علم کا اتنا اہتمام نہ ہوگا دوسرے یہ کہ اس کو ضروری اور غیر ضروری علوم میں امتیاز ہوگا اور اس کو نہ ہوگا پس اس کا انجام یہ ہوگا کہ ؎

مولوی گشتی و آگاہ نیستی خود کجاؤ از کجاؤ کیستی

مولوی بن گئے اور واقفیت حاصل نہیں خود کہاں سے کہاں کون ہے؟

اور فرماتے ہیں ؎

ایہا القوم الذی فی المدرسہ	کل ما حصلتموہ وسوسہ
علم نبود غیر علم عاشقی	مابقی تلبیس ابلیس شقی
علم رسمی سر بسر قیل ست وقال	نے ازو کیفیتی حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت	زنگ گمراہی زدل بربایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند	خوف وخشیت در دلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز	خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

اے وہ لوگو جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ بھی تم نے حاصل کیا ہے وہ وسوسہ ہے۔ سوائے علم عاشقی کے اور کوئی علم کار آمد نہیں باقی تمام علوم ابلیس کی تلبیس ہے۔ رسمی علم سراسر قیل وقال ہے اس سے نہ تو کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا حال پیدا ہوتا ہے۔ علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھلائے۔ اور تیرے دل میں سے گمراہی کے زنگ کو دور کردے۔ یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف وعاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کرتا ہے تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی عورت۔

علماء کے غیر مقصود میں مشغول ہونے پر اظہار افسوس:

اگر زوائد ثلثہ میں سے (جو کہ دراصل زوائد ہیں) ایک بھی کم ہو جاوے تو اس کو قلق ہوتا ہے اور اگر دینیات میں سے جلالین آدھی ہوئی اس وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ

ہم پورے مولوی نہیں ہوئے بلکہ مطالعہ ہی کو کافی سمجھتے ہیں (اور اکثر تو مطالعہ کو بھی لازم نہیں جانتے) حالانکہ تفسیر بالرائے کی سخت ممانعت آئی ہے ہاں اگر منقولات میں تبحر کے باوجود قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذوق سے کچھ بیان کرے تو وہ مقبول ہے لیکن جس کو قرآن کی خبر ہی نہیں حالت یہ ہے کہ ترجمہ بھی درست نہ ہو سکے مگر تفسیر کرنے کو تیار ہیں وہ تفسیر بالرائے اور محل وعید ہے۔ علم دین میں یہ کیفیت اور زوائد ثلثہ سب کو یاد کرنا لازمی ہے افسوس یہ ہماری حالت ہے کہ جو عالم دین کہلاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ غایت کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ غیر مقصود میں مشغول ہو گئے۔ اسی واسطے فرماتے ہیں

جملہ اوراق و کتب در نار کن　　سینہ را از نور حق گلزار کن

اس میں علوم زائدہ اور مضرہ مراد ہیں اور استغراق عرفی ہے حقیقی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم جہل کو مرض اور معصیت نہیں جانتے اس لئے علوم کی طرف توجہ نہیں اور توجہ کے بعد ہی ضروری اور غیر ضروری میں امتیاز نہ کرنے کا مرض تو عوام و خواص سب ہی میں ہے۔ چنانچہ عوام کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی عالم آیا تو اختلافی مسئلوں میں اس کا امتحان شروع کر دیتے ہیں۔

گیارہویں کے سائل کو حضرت حکیم الامتؒ کا جواب:

میں ایک جگہ گیا تو ایک شخص نے گیارہویں کے متعلق سوال کیا میں نے جواب دیا کہ استفادہ مقصود ہے یا امتحان اگر استفادہ کی ضرورت ہے تو اس کے لئے اعتماد شرط ہے کیونکہ جس پر اعتماد نہیں ممکن ہے کہ وہ مسئلہ بتلا دے۔ اور اعتماد کے لئے واقفیت شرط ہے اور آپ میری اصلی حالت سے ناواقف ہیں۔ پس جن حضرات سے آپ کی واقفیت ہے ان سے دریافت کیجئے اور اگر امتحان مقصود ہے تو میرا امتحان میرے اساتذہ لے چکے ہیں آپ کو اس کا کوئی حق نہیں (یہ جواب حضرت والا نے اس واسطے دیا کہ قرائن سے اس سائل کی نیت معلوم کر لی تھی کہ محض امتحان مقصود ہے ورنہ یہ مطلب نہیں کہ ناواقف کو بالکل مسئلہ نہ بتلایا جائے) ایسے ہی واقعات کی بنا پر میں سخت مزاجی میں بدنام ہوں مگر میں کیا کروں جبکہ ایسے لوگوں کو تحقیق ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ محض یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اس کا مسلک کیا ہے اور جب جواب ملنے سے مسلک کا علم ہو گیا تو پھر مجیب سے کہتے ہیں

کہ فلاں عالم تو اس کے خلاف کہتے ہیں پھر اس مجیب نے اتفاقاً اس کو برا بھلا کہہ دیا۔ اس کو وہاں پہنچاتے ہیں اب دونوں میں لڑائی پیدا ہو گئی یہ نتیجہ ہے ان کی تحقیق کا حالانکہ جس سے تحقیق کی جاوے اس کے اعتماد کی یہ حالت ہونا چاہئے۔

دلارامے کہ داری دل درو بند　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر تم محبوب رکھتے ہو تو دل کا تعلق اسی سے رکھو اور اپنی نگاہ کو سارے عالم سے بند ہی کر لو

ہمہ شہر پر ز خوباں منم وخیال ماہے　　چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کیا کروں کہ چشم بدخو کی نظر کسی پر بھی نہ پڑی۔

ایسا تعلق ہو تب دریافت کرنا مفید ہوگا مگر بات یہ ہے کہ ضروری وغیر ضروری میں امتیاز جب کریں جب کہ جہل کو معصیت سمجھتے ہوں جو شخص بیمار ہوگا اس کو فضول باتوں کی کب فرصت ہوگی بلکہ وہ تو اپنے مرض کی دوائیں حکیم سے پوچھے گا نہ یہ کہ شلجم کا اچار کیسے بنتا ہے اور اگر کسی کو اچار ہی کی ترکیب معلوم کرنا ہو تو باورچی سے دریافت کرو طبیب سے کیوں پوچھتے ہو۔ اب علماء کے ساتھ یہ برتاؤ ہو رہا ہے جیسا کہ سنارے کے پاس کھرپا بنوانے جاویں اور علماء سے تو یہی برتاؤ ہے کہ ان سے کوئی فضول مسئلہ ہی پوچھے گا لیکن ہوگا تو وہ ظاہر میں مسئلہ ہی۔

صوفیاء سے بالکل لایعنی سوال:

مگر صوفیہ سے تو ایسی باتیں پوچھتے ہیں جو ظاہر میں بھی دین نہیں مثلاً یہ کہ ہمارے باپ کی نوکری کب لگے گی چنانچہ مجھے ایک شخص نے خط لکھا کہ میں دوا کی دکان کروں یا بانوں کی۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میرا باپ نہ عطار تھا نہ کھٹ بنا جو میں اس میں مشورہ دوں

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہم نے سکندر اور دارا کا قصہ نہیں پڑھا ہے ہم سے سوائے مہربانی اور وفا کے کچھ نہ پوچھ۔ ہم سے تو محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا طریقہ دریافت کرو۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بزرگ صاحب تجربہ نہیں رکھتے مگر الہام سے بتلا دیں گے اور وہ بالکل صحیح ہوگا۔ سو یاد رکھنا چاہئے کہ اول تو الہام اختیاری نہیں اور پھر ہمیشہ نہیں ہوتا۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

کبھی تو بلند ترین مقام پر بیٹھتا ہوں کبھی اپنے پشت سے اپنے کو نہیں دیکھتا پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جو ان کے منہ سے نکلے گا اس کا پورا کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب ہی ہو گیا نعوذ باللہ منہ خدا بچاوے شرک سے اس لئے لوگ مجذوبوں کو بہت دق کرتے ہیں ان کو تو اللہ تعالیٰ کا سر رشتہ دار اور ممبر کمیٹی اعتقاد کرتے ہیں۔ غرض الہام ہر وقت نہیں ہوتا اور جب ہو بھی تو الہام کو یقینی نہیں ظنی ہے غلط بھی ہوتا ہے صحیح بھی۔ ہم برکت کے قائل ہیں مگر اس کے حاصل کرنیکا طریقہ یہ ہے کہ دنیا داروں سے مشورہ لے لو بزرگوں سے دعا کرا لو۔

بزرگوں سے امور دنیا میں مشورہ لینے کی مثال

اور بزرگوں سے ان کاموں میں مشورہ لینے کی وہی مثال ہے جیسا کہ سنار سے کھرپا بنوانا۔ اللہ والوں کا کام دین سکھانے کا ہے یہ کام ان سے نہ لینا چاہئے۔ یہ تو دنیا داروں کا برتاؤ ہے اور جو دیندار ہو وہ بزرگوں سے تعبیر کا کام لیتا ہے حالانکہ اس کو بزرگی سے کیا علاقہ اگر تعبیر دینا کوئی بزرگی کی بات ہوتی تو ابو جہل بھی بزرگ ہوتا کیونکہ وہ بڑا معبر مشہور تھا۔ بات یہ ہے کہ جس کو کشف یا علم تناسب سے مناسبت ہوتی ہے وہ تعبیر اچھی دے سکتا ہے مگر یہ امر بزرگی سے الگ ہے بزرگی یہ ہے کہ اللہ کا ہو جاوے چاہے ساری عمر میں ایک مرتبہ بھی کشف و فراست نہ ہو۔ غرض بزرگوں کو تعبیر کی تکلیف دینا بھی زیبا نہیں پھر ان میں جو منتظم ہیں وہ حقیقت پر مطلع و متنبہ کر دیتے ہیں اور جو زیادہ خلیق ہیں ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

کشند از برائے دلے بارھا خورند از برائے گلے خارہا

ایک دل کی دلداری کے لئے بار بار بوجھ اٹھاتے ہیں اور ایک پھول کے لئے بہت کانٹے کھاتے ہیں۔

وہ سوچ سوچ کر تعبیر دیتے ہیں جو اول تو ما انا من المتکلفین۔ کے خلاف ہے۔ (میں ان امور کا مکلف نہیں ہوں) دوسرے یہ کہ مشغول بحق ہونے میں اتنی دیر کا حرج ہوا۔ تیسرے اس کا یہ نقصان کہ خواب کو اس رتبے سے زیادہ سمجھنے لگا۔

خواب کی حقیقت:

حالانکہ حقیقت محض یہ ہے کہ وہ مبشرات سے ہے یعنی ایک دل خوش کرنے والی بات ہے۔ باقی قرب تو اعمال سے بڑھتا ہے کہ وہ مبشرات سے نہیں اکثر لوگ گو خواب کو عقیدۃً ظنی سے جانتے ہیں لیکن حالاً اس کے یقینی کا سا برتاؤ کرتے ہیں اور خوابوں پر صاحب کمال ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں میرا معمول ہے کہ جب کوئی اس خیال کا آدمی تعبیر دریافت کرتا ہے تو جواب میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں ۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

نہ میں رات ہوں نہ شب پرست ہوں کہ خواب کی بات کروں جبکہ میں اپنے محبوب حقیقی کا غلام ہوں اس لئے محبوب حقیقی کے بارے میں بات کرتا ہوں یہ تو اس خواب کا حکم ہے جو واقع میں خواب ہو اور ایسا خواب خود بہت کم ہوتا ہے اگر فقط خیال ہی ہے جب تو اس کی طرف متوجہ ہونا محض ہی بے کار ہے بعض دفعہ عوام کو خواب کے متعلق یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ پہلے سے ایسی شئے نہ دیکھی اس لئے یہ خیال کا کام نہیں خواب ہی ہے حالانکہ قوت متخیلہ جو کام بیداری میں کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ خواب میں کر سکتی ہے۔ اس کی تو یہ حالت ہے کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ مثلاً کبھی دوسر کا آدمی خواب جوڑ کر کھڑا کر دیا اس لئے اصل بات یہ ہے کہ خواب تو ہوتا ہے اولیاء و اتقیاء و صلحا کا اور ہمارا خواب تو محض خیالی گھوڑ دوڑ ہوتی ہے۔ پس معمول یہ چاہیے کہ اگر اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور شکر کرے اور اگر برا دیکھے تو آنکھ کھلنے پر تین بار بائیں طرف تھتکار دے اور اعوذ باللہ پڑھے حدیث شریف میں آیا ہے۔ لن تضرہ ابداً کہ اس کے بعد وہ خواب ہرگز اس کو نقصان نہ پہنچاوے گا اور ایسے خواب کی نسبت یہ بھی ارشاد ہے کہ لا یحدث بہ احد یعنی کسی سے اس کا ذکر نہ کرو اور دعا کرو کہ خدا اس کے شر سے محفوظ رکھے اور اگر کوئی انوکھا خواب دیکھو تو ذکر کر دینے میں مضائقہ نہیں اگر ساتھی بے تکلف ہے تو پہلے یہ عرض کر دیا جاوے کہ اگر خیال مبارک میں کوئی تعبیر آوے تو بتلا دیجئے ورنہ خیر۔

شیخ کا فرض منصبی خواب کی تعبیر دینا نہیں:

کیونکہ ان کا فرض منصبی یہ نہیں ہے کہ تعبیریں دیا کریں بلکہ ان کا اصلی کام تو قرب

خداوندی کا طریق تعلیم کرنا ہے اس کے سوا اور کسی قسم کا عقیدہ خواب کے متعلق نہ رکھنا چاہئے۔ اسی طرح آجکل بزرگوں سے سفارش کراتے ہیں اور اس باب میں بھی عام غلط فہمی ہو رہی ہے۔

سفارش کی حقیقت:

سفارش کی حقیقت تو یہ ہے کسی کے واسطے کلمۃ الخیر کہہ دیا وہ مانے یا مانے اور اگر انکار کرے تو سفارش کرنے والا برا نہ مانے چنانچہ حدیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت بریرہؓ ایک لونڈی تھیں جن کو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آزاد کر دیا تھا اور یہ مسئلہ ہے کہ جب باندی آزاد ہو جاوے تو اس کو اختیار ہے کہ نکاح سابق کو باقی رکھے یا فسخ کر دے پس اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہؓ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا۔ ان کے خاوند کو نہایت محبت کے سبب بہت رنج ہوا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے ان کے خاوند کے متعلق فرمایا کہ اے بریرہ تم اپنے خاوند سے رجوع کرو تو اچھا ہے بریرہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کا حکم ہے یا سفارش حضورؐ نے فرمایا کہ میں سفارش کرتا ہوں عرض کیا کہ اگر محض سفارش ہے تو منظور نہیں کرتی وہ جانتی تھیں کہ سفارش کا قبول کرنا ضروری نہیں اور اگر حکم ہوتا تو ضرور عمل کرتیں اسی لئے تو جواب دینے سے بیشتر دریافت کیا یہ ہے حقیقت سفارش کی اور آپ نے ذرا برا نہیں مانا مگر آج کل اگر کوئی سفارش کو نہ مانے تو پیر صاحب پیٹ بھر ناراض ہو جاتے ہیں اس لئے مریدوں کو ان کی سفارش ضرور پوری کرنی پڑتی ہے چاہے کتنی ہی مشقت اٹھانا پڑے تو اس حالت میں سفارش اپنی حقیقت پر کہاں رہی جب کہ اس کی یہ حالت ہوگئی کہ اگر سفارش پر عمل ہو تو عمل کرنیوالے کو کلفت اور اگر عمل نہ ہو تو شفارش کرنے والے کو کلفت ایسی سفارش کے تو جواز میں بھی کلام ہے۔ بعض لوگ ان شبہات کو سن کر بھی کہتے ہیں کہ کسی کا کام ہو جاوے تو اچھا ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کا کام کرنا جو کہ مستحب تھا اور دوسرے کو تکلیف دینا جو کہ حرام ہے کونسی اچھی بات ہے کہ حرام کا ارتکاب کیا جاوے یہ خرابی اسی کی ہے کہ ضروری اور فضول یا مضر میں لوگوں کو امتیاز نہیں۔ بزرگوں سے بجائے تحقیق دین کے کہ ان کا اصل منصب ہے فضول یا ناجائز کام لیتے ہیں چنانچہ ایک عالم سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کے ایمان کی نسبت سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نماز کے فرض تم کو یاد ہیں جواب دیا کہ نہیں فرمایا

فرائض نماز یاد کرو جن میں سے اگر کوئی متروک ہو جائے تو نماز ہی نہ ہو اور نماز وہ چیز ہے کہ قیامت میں سب سے اول اسی کی باز پرس ہوگی اور حضورؐ کے والدین کے متعلق تو کچھ سوال بھی نہ ہوگا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ ۔ یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول کو ترک کر دے اور کوئی وجہ تو ہے کہ حضورؐ نے مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرنے کی ممانعت فرمائی کیا حضرات صحابہؓ اس کو سمجھ نہ سکتے تھے ۔حالانکہ ہم جیسے بھی کچھ تفصیل سمجھ لیتے ہیں وجہ یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مسئلہ تقدیر کی تحقیق پر کوئی کام انکا ہوا نہیں جو اعمال کرنے کے ہیں ان کی تحقیق چاہئے تقدیر پر مجملاً ایمان بالکل کافی ہے اور دیکھو قرآن شریف میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ یعنی صحابہ دریافت کرتے ہیں کہ چاند چھوٹا بڑا کیوں ہوتا ہے۔ جواب ملا قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۔یعنی چاند کے یہ حالات مختلفہ حج وغیرہ کے اوقات معلوم کرنے کے واسطے ہیں تو سوال علت سے تھا مگر جواب میں حکمت بیان کی اس میں یہی اشارہ ہے کہ کام کی بات پوچھو اور غیر ضروری سے پرہیز کرو۔ یہ جواب علیٰ اسلوب الحکیم کہلاتا ہے اور دیکھئے ایک جگہ میں تصریح ہے وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ .(اور جو لوگ اعراض کرتے ہیں لغو امور سے) لغو کے معنی ہیں مالا نفع فیہ اور یہ عام ہے خواہ مضر ہو یا نہ ہو۔ پس کتاب و سنت تو لایعنی کے ترک کرنے کا حکم دے رہی ہے مگر آج کل عموماً اسی میں ابتلاء ہو رہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جہل کو مرض نہیں سمجھتے اور ضروری وغیر ضروری میں امتیاز نہیں کرتے اور اس عدم امتیاز کا منشاء بھی جہل ہے۔ اگر لوگ جہل کو مرض سمجھتے تو اس کے رفع کرنے کی فکر میں لگتے فضول قصوں میں وقت ضائع نہ کرتے اور دین کی ضروری بات کو ضرور دریافت کرتے اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے متنبہ فرما دیا کہ جہل مرض ہے۔ پس ایک فائدہ تو یہ ہے جو کہ حدیث شریف میں ہے لفظ شفاء سے مستنبط ہوا۔ دوسرا فائدہ لفظ سوال سے معلوم ہوا وہ یہ کہ جب مرض ہوا تو ظاہر اس کی شفاء علم کو فرمانا چاہئے تھا۔

سوال کرنا شفا ہے:

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے علم کے لفظ سوال فرمایا (اس تعبیر کیلئے کسی مصح

اور مرجح کی ضرورت ہے پس مصحح تو یہ ہے کہ سوال سبب ہے علم کا پس حقیقت میں مقصود علم ہی ہے اور مرجح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ اور يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ اور الدين يسر. تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں ۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی منظور ہے ۔ دین آسان ہے) کے موافق بوجہ شفقت کے لفظ سوال فرما کر یہ بتلا دیا کہ تم سوال کر کے سبکدوش ہو جاؤ گے خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو ۔ پس شفاء العی (جہالت کا علاج سوال ہے) السوال اور شفاء العی العلم (جہالت کا علاج علم ہے) میں فرق یہ ہے کہ اگر کسی سائل نے مسئلہ پوچھا لیکن مسئول عنہ نے جواب نہ دیا یا غلط جواب دیا پس اگر علم فرماتے تو شفاء ہونے کا حکم ان صورتوں کو شامل ہوتا بلکہ شفا کی صرف ایک ہی صورت ہوتی یعنی جب مسئول عنہ جواب دے اور صحیح جواب دے اور اب یعنی لفظ سوال ارشاد فرمانے میں تینوں صورتوں کو یہ حکم شفاء شامل ہو گیا پس خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ سائل ہر حال میں شفا یابوں میں داخل ہو گیا اور اس میں ایک قاعدہ فقہیہ القادر بقدرة الغير غير قادر. (جو کسی دوسرے کا محتاج ہو کسی کام کے کرنے میں تو اس کو اس کام میں قادر نہیں سمجھو گے) کی طرف اشارہ ہو گیا جس کو فقہاء نے سمجھ لیا ۔ اور واقعی فقہاء سمجھتے ہیں ان نکات کو بس فقیہ وہ ہے جو اجتہادی شان رکھتا ہو ۔ خواہ مطلق خواہ مقید ہم اس سے محروم ہیں غایت یہ کہ ہم اصول سے بعض فروع کو مستنبط کر سکتے ہیں مگر قرآن حدیث سے خود اصول فقہ کا مستنبط کرنا یہ انہیں حضرات کا کام ہے ہر شخص چار کتابیں پڑھکر اجتہاد کا دعویٰ کرنے لگے تو مقبول نہ ہو گا ۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند	نہ ہر کہ آئینہ دار دسکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر زمو ایں جاست	نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یعنی جو شخص چہرہ آراستہ کرے یہ لازم نہیں کہ دلبری جانتا ہو اور جو شخص آئینہ بناتا ہو یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو ۔ اس جگہ ہزاروں باریکیاں بال سے زیادہ باریک ہیں جو شخص بھی سر منڈا لے ضروری نہیں کہ قلندری بھی جانتا ہو ۔

اجتہاد کے لئے ذوق صحیح شرط ہے فقط پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا ۔

شاید آں نیست کہ موئے و میانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں جو پتلی کمر اور عمدہ بال رکھتا ہو بلکہ محبوبیت ایک آن اور ادا میں ہوتی ہے۔
علم تو موئے و میان ہے اور ذوق آن ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا گیا
هل خصّکم رسول الله بشيء یعنی آپ کو حضورؐ نے کوئی ایسی شے دی ہے جو اوروں
کو نہیں دی جواب دیا لاالافهماً اوتيه الرجل في القران ۔ یعنی حضورؐ نے ہم کو کوئی
خاص بات نہیں بتلائی ہاں ہم کو دین کی ایک خاص سمجھ عطا کی گئی ہے۔ غرض اس حدیث
سے یہ ایک اصل فقہی مستنبط ہوگئی کہ القادر بقدرة الغير غير قادر چنانچہ ظاہر ہے
کہ سوال کے بعد کیا جواب صحیح معلوم کر لینا اس کی قدرت میں ہے ہرگز نہیں اسکا تو اتنا ہی
اختیار ہے کہ کامل سے (یعنی عالم کامل سے) سوال کرے اگر وہ انکار کر دے یا غلط جواب
دے تو یہ کیا کر سکتا ہے۔ البتہ حضورؐ نے عالم کو تاکید فرمائی ہے کہ سائل کو ضرور جواب دو
بشرطیکہ وہ عمل کے لئے سوال کرے یا جن علوم کا حاصل کرنا شرعاً فرض ہے ان میں محض علم
کے لئے نہ کہ بحث کے لئے چنانچہ ارشاد ہے۔ من سئل عن علم علم ثم كتمه
الجم بلجا م من النار. (سنن الترمذی : ۲۶۴۹) جس شخص سے کوئی ایسی علمی بات
پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہو لیکن اس کو چھپائے تو اس کو دوزخ کی لگام ڈالی جائے گی۔
اسی طرح حضورؐ نے صحیح جواب دینے کی بھی تاکید اور اس کے خلاف پر وعید فرمائی ہے
چنانچہ ارشاد ہے ۔ من افتى بغير علم فانما اثمه على من افتاه (مشکوٰة
المصابیح : ۲۴۲) (جس نے بغیر علم کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ اس شخص کے سر ہے جس
نے یہ فتویٰ دیا) پس آپ نے مجیب کے لئے افادۂ علم کا بھی پورا انتظام کیا ہے مگر کوئی اس
کے بعد بھی انکار کر دے یا غلط بتلا دے تو اگر شفاء العی العلم فرمایا جاتا تو اس صورت میں
سائل کو حسرت ہوتی کہ مرض جہل میں مبتلا اور شفاء نہ ہوتی اس حسرت کو دور کرنے کے
لئے فرماتے ہیں کہ سوال کرنا ہی شفاء ہے چاہے جواب ملے یا نہ ملے چاہے غلط ملے کیونکہ
جو کام تیرے قبضہ کا تھا وہ تو کر چکا (ہاں اگر پھر دریافت کرنے کی قدرت ہو تو دریافت
کرے۔ ایک مرتبہ سوال کرنے سے جواب نہ ملے تو خاموش ہو کر نہ بیٹھ رہے بلکہ اسی عالم
سے یا اور کسی عالم سے پھر دریافت کرے البتہ اگر یہ کوشش کرتا رہا اور جواب نہ ملا یا غلط ملا تو

اس کو گناہ نہ ہوگا بلکہ دونوں صورتوں میں مفتی کے ذمہ گناہ رہا جیسا کہ دونوں حدیثیں ابھی گزریں ۱۲ جامع) اسی کی طرف اشارہ کرنے کے واسطے لفظ سوال فرمایا لفظ علم نہیں فرمایا پس معلوم ہوا کہ تینوں صورتوں میں شفاء کی نعمت حاصل ہوگی اگر چہ بظاہر صرف جواب صحیح ملنے کے وقت شفاء کا حصول معلوم ہوتا ہے اسی کو مولاناؒ فرماتے ہیں۔

گر مرادت راندا ق شکر ست　　　بے مرادی نے مراد دلبرست

اگر تیری مراد کا مذاق اچھا ہے نامرادی سے امید مت رکھ مراد حاصل ہونے والی ہے۔
گو اس میں بظاہر خطاب اہل سلوک کو ہے مگر سائل احکام بھی سالک ہی ہے۔

ذکر اللہ سے بہر صورت نفع:

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے جو کوئی یہ کہتا کہ مجھ کو ذکر سے کچھ نفع نہیں ہوا تو دو جواب ارشاد فرمایا کرتے کبھی تو یہ فرماتے کہ کیا یہ نفع نہیں کہ تم نے اس کا نام لے لیا۔

بلا بودے اگرایں ہم نبودے

اور کبھی ارشاد فرماتے

یابم اور ایا نیا بم جستجوئے میکنم　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

میں اس کو پاسکوں یا نہ پاسکوں اس کی جستجو کرتا رہوں گا۔ حاصل ہو یا نہ ہو اس کی تمنا کرتا رہوں گا۔

حضرت مولانا جامی فرماتے ہیں۔

ہمینم بس کہ داند ماہر ویم　　　کہ من نیزاز خریداران اویم
ہمینم بس اگرکا سد قما شم　　　کہ من نیز از خریدارا نش باشم

ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ میرا معشوق یہ جان لے کہ میں ان کے خریداروں میں سے ہوں۔ ہمارے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اگر کھوٹا مال واسباب ہو پھر بھی میں اس کے خریداروں سے ہوں۔

کوشش اور طلب بھی کامیابی کے حکم میں ہے:

مولانا رومیؒ نے اس مسئلہ پر قرآن شریف سے استدلال کیا ہے کہ کوشش اور طلب بھی

کامیابی ہی کے حکم میں ہے اور ان کے استدلال کے بھروسہ پر ہم کو بھی اس مسئلہ کے بیان کی ہمت ہوئی ہے ورنہ وہ گھڑت ہوتی ہے۔ وہ استدلال یہ ہے کہ سورۃ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔ (بے شک ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کھلم کھلا فتح دی) واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کو تشریف لے گئے تھے مگر عمرہ نہ ہو سکا بلکہ حدیبیہ ہی سے واپس آ گئے تھے تو اکثر مفسرین نے اس فتح سے فتح مکہ مراد لی ہے اور فتحنا (عنقریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو فتح عطا کریں گے) کو سنفتح کے معنی میں لیا ہے اور یہ مضمون بھی صحیح ہے مگر مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اس فتح سے خود صلح حدیبیہ ہی مراد ہے کیونکہ گو ظاہر میں ناکامی ہوئی مگر باطنی دولتیں اس ناکامی میں اتنی عطاء ہوئیں کہ ان کے اعتبار سے یہ واقعہ فتح مبین ہو گیا پس ہم نے اس عدم فتح میں ہی آپ کو فتح عطا کر دی۔ چنانچہ ایک بڑی دولت تو یہی ہے کہ اس مشقت پر ثواب عظیم ملا اسی کو محققین نے مختلف عبارات میں ادا کیا ہے ایک بزرگ کا قول ہے۔

ارید وصاله ویرید هجری فاترک ماارید لما یرید

میں اس کے وصال کا خواہش مند ہوں اور وہ فراق چاہتا ہے تو اسکی خاطر میں اپنی خواہش چھوڑ دیتا ہوں۔

عارف شیرازی کہتے ہیں

میل من سوئے وصال و میل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف، میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے۔

سب کا خلاصہ یہ ہے کہ طلب کے بعد ناکامی بھی کامیابی ہی ہے اسی پر راضی رہنا چاہئے یہاں ظاہر بینوں کو عارف شیرازی کے اس شعر پر شبہ ہوتا ہے کہ فراق پر راضی ہونا تو کفر ہے کیونکہ فراق تو کافروں کے واسطے اور رضا بالکفر کفر ہے۔ مگر در حقیقت یہ ایک اصطلاح ہے صوفیہ کی۔

ہر یکے را سیرتے بنہادہ ایم ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ترجمہ: ہر ایک کو ہم نے ایک اصطلاح عطاء کی ہے اور ہر ایک شخص میں ایک خصلت رکھی ہے۔

اور وہ اصطلاح اس شعر سے معلوم ہوتی ہے۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب که حیف باشد از وغیر او تمنائے
کیسا وصل اور کیسا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہئے اس سے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا۔

قبض کی بے شمار حکمتیں:

اب دیکھو فراق کے وہ معنی ہیں جو رضائے دوست کے ساتھ جمع ہوسکیں اور وہ معنی حالت قبض کی ہے اس کو زعم سالک کے اعتبار سے فراق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کو بعد سمجھتا ہے تو حاصل یہ ہوا کہ جس قبض کو تم بعد فراق سمجھتے ہو اور جس بسط کو تم قرب ووصال سمجھتے ہو ان کی طرف التفات مت کرو رضا کو مطلوب سمجھو اسی قبض سے ناگواری نہ ہونے کو دوسرے مقام پر عارف رومی اس طرح فرماتے ہیں۔

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں شاد باش و چیں میفکن بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے رہ رو آں صلاح تست آئیں دل مشو
جب تجھے تنگی معلوم ہو کشادگی کا خیال کر خوش رہ پیشانی پر بل مت لا
جب تجھ کو قبض معلوم ہوا ے صوفیاء کی راہ چلنے والے وہ تیرے لئے بہتر ہے رنجیدہ مت ہو۔

اور اس کے صلاح ہونے کو ایک بزرگ اس عنوان سے فرماتے ہیں۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن که خواجہ خود روش بندہ پروری داند

اور مولانا اس عنوان سے فرماتے ہیں

طفل مے لرزد زنیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شاد کام
بچہ نشتر لگانے سے لرزتا ہے مگر مشفق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے۔

یہ اجمالاً حکمتوں کا بیان تھا باقی قبض میں جو حق تعالیٰ شانہٗ کی حکمتیں ہیں وہ بے شمار ہیں ان کو تفصیلاً کون بیان کرسکتا ہے وہ بھی اسی آیت کے عموم میں داخل ہیں۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا اور مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ ۔ کے موافق مثال کے طور پر کچھ بیان کرتا ہوں کہ قبض میں ایک حکمت مثلاً یہی ہے کہ سالک کو اگر ہمیشہ بسط رہے تو اکثر اس سے دعویٰ اور پندار پیدا ہو جاتا ہے جس سے دفعۃً اندھیر ہو جاتا ہے اس لئے قبض وارد کر دیتے ہیں تاکہ عجب سے محفوظ رہے اور بھی حقیقت میں بڑی کامیابی ہے اس بنا پر فرماتے ہیں ۔

میل من سوئے وصال و میل اوسوئے فراق　　ترک کام خود گرفتن تا برآید کام دوست

میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا فراق کی طرف۔ میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے۔

غرض یہاں تو ناکامی بھی کامیابی ہی ہے

گر مرادت　را مذاق　شکر است　　بے مرادی　نے　مراد　دلبر است

اگر تیری مراد کا مذاق اچھا ہے نامرادی سے امید مت رکھ کہ مراد حاصل ہونے والی ہے۔

نامرادی کا مفہوم:

حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مسئلوں کی دکان تو مولویوں کے پاس رکھا دی ہے۔ اور تعویذوں کی حاجی محمد عابد صاحبؒ کے پاس غرض مرادیں اس طرح تقسیم ہو گئیں اب میرے پاس تو صرف نامرادی ہے جس کو مرادیں لینا ہوں ان بزرگوں کے پاس جائے جس کو نامرادی لینا ہو میرے پاس آئے۔ پہلے پہلے میری سمجھ میں یہ جملہ نہیں آیا مگر خود حضرت کے بتلانے سے اب کہہ رہا ہوں فرمایا کہ نامرادی سے مراد عشق ہے کیونکہ عاشق ہمیشہ نامراد ہوتا ہے اس کو کسی مراد پر بھی قرار نہیں ہوتا ترقی ہی کا طالب ہوتا ہے اسلئے ہر دم ناکام اور نامراد ہی رہتا ہے بس اس کا یہ ہوتا ہے

دلا　رام　دربر　دلارام　جوئے　　لب از تشنگی خشک و بر طرف جوئے

نگویم　کہ　بر　آب　قادر نیند　　کہ　بر　ساحل　نیل　مستسقی　اند

محبوب بغل میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہیں نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں مگر نیل کے کنارے جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں۔

اور واقعی جب طریق کا حال یہ ہے کہ

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

راہ عشق بھاگنے سے طے نہیں ہوتی بلکہ یہ خود بخود بغیر دوڑے طے ہو جاتی ہے تو پھر عشاق نامراد کیوں نہ رہیں اسی کو فرماتے ہیں۔

اے برادر بے نہایت در گہیست　　　ہر چہ بروے میرسی بروئے مالیست

اے برادر یہ بے نہایت درگاہ جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھرو۔ بلکہ آگے کو ترقی کرو۔ پس عاشق ہر منزل پر نامراد اور ناکام ہی ہوا یہ مطلب تھا حاجی صاحبؒ کا جو ان کے بتلانے سے معلوم ہوا اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عارفوں کے قول پر جلدی سے اعتراض نہ کرنا چاہئے۔

درنیا ید حال پختہ ہیچ خام　　　پس سخن کو تاہ باید والسلام

ناپختہ کبھی پختہ تجربہ کار کے حال کو نہیں پاسکتا اسلئے زبان کو اعتراض سے بند کرنا چاہئے۔ شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ وہ حضرات پہلے ہی سے کیوں نہیں بتلا دیتے کہ ہمارا یہ مطلب ہے تا کہ اعتراض کا موقع ہی نہ ہو۔ سو جواب یہ ہے کہ ان کا دستور العمل ہی یہ ہے۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق ہستی　　　بگذار تا بمیر د در رنج خود پرستی

مدعی کو اسرار عشق و مستی سے آگاہ نہ کرو اسے اپنی حالت پر چھوڑ دو تا کہ وہ خود پرستی کے رنج میں مر جائے۔ یعنی وہ اہل کو بتلاتے ہیں نااہل کو نہیں بتلاتے گو نااہل ان پر اعتراض کرتے ہیں مگر اس کی ان کو پرواہ نہیں ہوتی۔

صوفیاء اور اہل ظاہر کے مذاق میں فرق:

اہل ظاہر کا یہ مذاق ہے کہ اگر ان پر اعتراض ہو تو خفا ہوتے ہیں اور آستینیں چڑھا کر جواب دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ اعتراض پر خوش ہوتے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے کسی مرید کو بدگمان کر دے تو میں انعام دوں اور اگر عالم مرید کو بدگمان کر دے تو زیادہ انعام دوں۔ بات یہ ہے کہ معتقدین سے ان کو تو وحشت ہوتی ہے اہل ظاہر خوش ہوتے ہیں بلکہ وہ معتقدین سے ذاتی تعلق رکھتے ہیں اور اہل اللہ محض محبوب کا حکم سمجھ کر خدمت کرتے ہیں لوگ ان کو بدنام کرتے ہیں کہ وحشی ہیں بدخلق ہیں تم کو کیا خبر ہے کہ ان کی کیا حالت ہے تمہیں مزہ آتا ہے ان خرافات میں اور ان کو گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ان کو ایک وحدہ لاشریک لہ سے علاقہ ہے ان کو گوارا نہیں کہ وہ کسی کی طرف توجہ کریں یوں وہ خدمت تو کرتے ہیں خلق کی مگر اس میں ان کو نفسانی لطف نہیں آتا یہ درمیان میں جواب تھا ان حضرات کے اپنے کلام کی شرح نہ کرنے کا اصلی مضمون یہ تھا کہ اس طریق میں

ناکامی بھی کامیابی ہے۔ پس حدیث میں گویا ارشاد ہے کہ اگر تم کو سوال کے بعد جواب نہ ملے تو حسرت نہ کرنا کیونکہ تم کو تو شفاء حاصل ہوگئی ہمارے نسخہ میں ہر حال میں شفا ہی ہے اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے علم کے سوال کا لفظ اختیار فرمایا ہے۔

انسان صرف امور اختیاری کا مکلّف ہے:

اور تیسرا فائدہ حدیث میں وہ ہے جو ضمناً مذکور ہو چکا یعنی یہ کہ قادر بقدرۃ غیر قادر نہیں اور یہ کہ انسان امور اختیاریہ کا مکلف ہے کہ غیر اختیاری کا۔ سبحان اللہ ذرا سے جملہ میں کتنے علوم بھرے ہوئے ہیں۔ میں حدیث کی شرح کر چکا۔ اب اس سے سبق لینا چاہئے یعنی اس پر عمل کرنا چاہئے کہ مسائل ضرور یہ دریافت کیا کرو۔ دیکھئے حضورؐ نے کتابیں پڑھنے کو واجب نہیں فرمایا بلکہ بے حد سہولت کردی کہ پوچھتے ہی رہا کرو سوال کرتے رہنے سے بہت جلد مسائل یاد ہو جاویں گے اور دقت بھی نہ ہوگی۔ پس میرا مقصود یہی تھا۔

بے علمی بدعملی کی جڑ ہے:

کہ اصل مرض بدعملی اور بے علمی ہے اور بے علمی بدعملی کی جڑ ہے اگر کوئی شبہ کرے کہ جڑ کس طرح ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض عالم بھی بے عمل ہوتے ہیں تو وہاں بدعملی بدوں بے علمی پائی گئی حالانکہ بدوں جڑ کے شاخ کا وجود نہیں ہوتا۔ جواب یہ ہے کہ آپ نے علم کے معنی فقط دانستن کے لئے ہیں حالانکہ قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے کہ رفع جہالت کیلئے محض دانستن کافی نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کبھی گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کرتے ہیں۔ سوا ایسوں پر خدا تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں) سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ علم کے ساتھ گناہ کرنے سے توبہ قبول نہیں ہوتی اور دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً بھی گناہ کرے تب بھی توبہ قبول نہیں ہوتی تو محققین نے رفع تعارض کیلئے فرمایا ہے کہ بِجَهَالَةٍ قید واقعی ہے احترازی نہیں جب قید واقعی ہے تو آیت اس پر دال ہوگی کہ گناہ ہمیشہ جہل سے ہوتا ہے اور علم کے ہوتے ہوئے معصیت ہو ہی نہیں سکتی۔

علم کی حقیقت:

تو معلوم ہوا کہ علم کی حقیقت کوئی ایسی چیز ہے جس کے ساتھ معصیت جمع نہیں ہوئی اور وہ حقیقت یہ ہے کہ اعتقاد یہ ہے کہ اعتقاد جازم مطابق واقع مع غلبۃ الحال والاستحضار اور ظاہر ہے کہ اس غلبہ واستحضار کے ہوتے ہوئے گناہ ہونا ممکن نہیں۔ پس گناہ کرنیوالے کو گو علم بمعنی دانستن ہوتا ہے مگر اعتقاد جازم مع الاستحضار وغلبۃ الحال نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہو گیا علم کے ساتھ بدعملی نہیں ہو سکتی۔ پس میرا دعویٰ صحیح رہا کہ بدعملی کی جڑ بے علمی ہے۔

حدیث لا یزنی الزانی وہو مؤمن کا مفہوم:

اور یہی تفسیر لا یزنی الزانی وھو مؤمن (الصحیح للبخاری ۳: ۱۷۸) میں بھی جاری ہوگی اس طرح سے کہ ایمان کے معنی ہیں تصدیق علم پس مؤمن کے معنی عالم بعذاب المعصیۃ کے ہوں گے تو معلوم ہوا کہ علم اور زنا جمع نہیں ہوتے جس کی تفسیر مذکور کی تائید نکل آئی۔ اور علماء ظاہر کو بھی لفظ بدل کر یہی تفسیر کرنا پڑی یعنی انہوں نے مومن کامل مراد لیا ہے اور کمال ایمان کا وہی حاصل ہے جو اعتقاد جازم مع غلبۃ الحال کا ہے۔ پس ان دلائل سے اصل مرض بے علمی ٹھہرا اور بدعملی اس کی فرع (اور بدیں معنی تحصیل علم کے لئے ایسے ہی حضرات کی صحبت کی ضرورت ہے جنہوں نے علم کی حقیقت سمجھی ہے ایسے ہی صحبت کی ترغیب مولاناؒ فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مرد حال شو ۔۔۔ پیش مرد کاملے پامال شد

بات کو چھوڑ کر صاحب حال بنو اور کسی بزرگ کے سامنے پامال ہو جاؤ۔

رزقنا اللّٰہ وایاکم۔ (۱۲ جامع)

ناواقف کو احکام دریافت کرنا ضروری ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے علمی و بدعملی کا علاج بہت ہی سہل اور مختصر فرما دیا ہے چونکہ اسکی تفصیل واہتمام کی ضرورت تھی اس لئے کسی قدر بیان طویل ہو گیا تا کہ اس کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہو ورنہ بات صرف اتنی ہے کہ ناواقف کو احکام کا دریافت کرنا ضروری ہے۔ اب دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق عطا فرما دیں۔

العمل للعلماء

یہ وعظ ۱۵ رجب ۱۳۳۰ھ وقت شب بمقام مدرسہ عربیہ دیوبند جو کہ حضرت والا نے کھڑے ہو کر ۲ گھنٹہ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۳۰۰ تھی جس کو مولنا سعید احمد تھانوی صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡکَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ. قال اللّٰه تبارک وتعالىٰ. اِنَّهُمۡ کَانُوۡا يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرَاتِ وَيَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَکَانُوۡا لَنَا خٰشِعِيۡنَ.

(وہ لوگ نیک کاموں میں مستعدی کرتے تھے اور ہم کو نہایت ہی شوق اور خوف سے پکارتے تھے اور ہم سے ڈرتے تھے)۔ یہ آیت کا ایک جزو ہے۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں:

اس سے قبل حق سبحانہٗ تعالیٰ نے حضرات انبیاءؑ کا ذکر اور حسب ضرورت مقام کے خاص خاص اغراض کے لئے ان کے کچھ حالات بیان فرمائے ہیں ان حالات کے بعد ان حضرات کے مشترک اوصاف کو اس آیت میں ذکر فرمایا ہے جس کا ترجمہ آپ کو معلوم ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا اور مقصود اس آیت سے اس وقت ایک خاص امر کو ظاہر کرنا ہے اور وہ امر کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آپ لوگوں کی جانی ہوئی بات ہے لیکن بعضی بات ایسی ہوتی ہے کہ باوجود اس کے معلوم ہونے کے وہ ملتفت الیہ (جس کی طرف توجہ کی جائے) نہیں ہوتی اور اس لئے اس امر کو جدید بھی کہہ دیا جاتا ہے تو یہ بھی چونکہ ملتفت الیہ نہیں ہے اس

واسطے اس کو بھی اس خاص اعتبار سے امر جدید کہنا درست ہوگا اور التفات نہ ہونے کے اسباب مختلف ہوتے ہیں کبھی تو کسی امر کے غایت درجہ بین (صاف واضح) ہونے کی وجہ سے اس کو معمولی سمجھا جاتا ہے اور اس کی طرف التفات نہیں ہوتا اور کبھی کسی امر کا غیر بین ہونا اس کے غیر ملتفت الیہ ہونے کا سبب ہوتا ہے اور جب ہے یہ تو یہ امر مقصود بالبیان بھی ممکن ہے کہ بعض افراد کے اعتبار سے تو غایت درجہ بین ہونے کی وجہ سے معمولی بات ہوکر غیر ملتفت الیہ ہوگیا اور بعض افراد کے اعتبار سے غیر بین ہوکر غیر ملتفت الیہ ہوگیا غرض چونکہ بعض امور غیر ملتفت الیہ (جس کی طرف توجہ نہ کی جائے) ہو جاتے ہیں اور واقع میں ان کی طرف التفات کرنا ضروری ہوتا ہے اس لئے ان کو بیان کیا جایا کرتا ہے۔ اور ان کا بیان کرنا باوجود ان کے معلوم للمخاطب ہونے کے عبث نہیں ہوتا بیان اور شرح اس امر کی یہ ہے کہ اس مقام پر انبیاؑ کا ذکر ہے اور آپ حضرات بوجہ دولت علم کے ان حضرات کے وارث ہیں چنانچہ ارشاد ہے العلماء ورثة الانبیاء (سنن ابن ماجة : ۲۲۳) (علماء انبیاء کے وارث ہیں) اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو ہر ذی علم نے بڑی خوشی سے تسلیم کرلیا ہے اور سب کا اتفاق اس وراثت پر ہوگیا ہے جس اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے کے ماننے میں اہل علم کا نفع ہی نفع ہے وہ یہ کہ اس سے ایک عظیم الشان فخر حاصل ہوتا ہے اور کسی قسم کی مؤنت اور مشقت اس میں ہے نہیں اس لئے اپنا لقب وارث قرار دیکر بیٹھ رہے

صرف کمال علمی وراثت انبیاء نہیں:

حالانکہ اس میں اس بات پر غور کرنے کی ضرورت تھی کہ حضرات انبیاءؑ میں کمال علمی کے ساتھ کوئی دوسرا کمال یعنی کمال عملی بھی تھا یا نہیں ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں دیا جائیگا کیونکہ اگر انبیاءؑ میں بھی کمال عملی نہ مانا جائے تو پھر کس کے اندر مانا جائے گا کیونکہ وہ حضرات تو افضل المخلوقات ہیں پس یہ کہنا ضروری ہوگا کہ انبیاءؑ میں اس درجہ کمال عملی تھا کہ کسی دوسرے میں ہونا ممکن نہیں جب یہ بات ثابت ہوچکی تو اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وجہ وراثت آیا صرف کمال علمی ہے یا کمال عملی بھی اس میں داخل ہے ہم جو غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف کمال علمی وجہ وراثت نہیں ہوسکتا اس لئے کہ جو عالم بے عمل ہیں ہم

ان میں کوئی شان مقبولیت کی نہیں پاتے حالانکہ وراثت نبی کے لئے مقبول ہونا ضروری ہے مثلاً ابلیس کہ وہ بہت بڑا عالم ہے اور دلیل اس کے عالم ہونے کی یہ ہے کہ وہ علماء کے اغوا کی تدبیر کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ کسی شخص کے خیالات کو وہی بدل سکتا ہے جو کہ خود بھی ان خیالات میں کم از کم اس کے برابر اور ماہر ہو جس کے خیالات بدلنے کی کوشش ہے۔ قانون کے سمجھنے میں قانون دان کو وہی شخص دھوکہ دے سکتا ہے جو کہ خود بھی قانون کو جانتا ہو۔ تو شیطان کا علماء کے اغواء میں کامیاب ہونا صاف بتلا رہا ہے کہ وہ بھی بہت بڑا عالم ہے لیکن اس کا جو انجام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ علی ہذا علماء بنی اسرائیل جن کی نسبت اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (تم لوگ کتاب کی تلاوت کرتے ہو) ارشاد ہے گمان کی رخامت عاقبت کا ذکر خود قرآن شریف میں مذکور ہے اور جگہ جگہ ان لوگوں کی مذمت فرمائی گئی ہے حتیٰ کہ کسی فرقے کی اتنی مذمت قرآن میں نہیں جتنی بنی اسرائیل کی ہے پس معلوم ہوا کہ صرف کمال علمی وجہ وراثت نہیں ہے بلکہ عملی کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بدون عمل کے قبولیت نہیں ہوتی اور غیر مقبول وارث انبیاء نہیں ہو سکتا۔

علم بلا عمل وبال جان ہے:

اس کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں نہایت واضح فرما دیا ہے فرماتے ہیں العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثو ادينا رًا ولادرهما ولكن ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر (سنن ابن ماجة : ۲۲۳) (علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں اور انبیاءؑ اپنے ورثہ میں نہ تو کوئی دینار چھوڑتے ہیں اور نہ درہم بلکہ وہ علم چھوڑتے ہیں لہٰذا جس شخص نے علم کو اپنا لیا اسے بہت بڑا حصہ دستیاب ہوا)۔ اس حدیث میں علم کو حظ وافر فرمایا ہے اور علم حظ وافر اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب مقرون بالعمل ہو نری صفت علم کو حظ وافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا وبال جان ہونا خود حدیث میں مذکور ہے ارشاد ہوتا ہے۔ ان من العلم لجهلا (سنن ابی داؤد : ۵۰۱۲) (بے شک علم کے اندر جہالت بھی ہے۔) اسی طرح کلام مجید میں ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَاشَرَوْابِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْكَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (وہ

جان چکے ہیں کہ جو کوئی اس کا خریدار ہو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بہت بری چیز ہے وہ جس کے بدلہ میں اپنی جانوں کو دے رہے ہیں کاش ان کو (اتنی) (عقل ہوتی) تو حدیث میں ایسے علم کو جہل فرمانا اور آیت میں عَلِمُوْا کے بعد لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ صاف بتلاتا ہے کہ یہ علم کسی درجہ میں بھی قابل اعتبار نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ واضح لیجئے حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کو دیکھا جائے گا کہ اس کی آنتیں باہر نکلی پڑی ہیں اور وہ ان کے گرد گھوم رہا ہے لوگ اس سے اس کا سبب پوچھیں گے کہے گا کہ میں اپنے علم پر عمل نہ کرتا تھا پس ان آیتوں اور حدیثوں سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ علم بلا عمل حظ وافر نہیں ہو سکتا کیونکہ جو علم عقاب (عذاب) سے نہ بچا سکے وہ حظ وافر کیا ہوگا۔

حظّ وافر علم:

پس حظ وافر وہی علم ہوگا جو کہ مقرون بالعمل ہو پس وجہ وراثت بھی وہی علم ہوگا جو کہ مقرون بالعمل ہو مطلق علم وجہ وراثت نہ ہوگا مگر باوجود اس کے ہم لوگ جو اپنے کو اہل علم کہتے ہیں ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے قلوب میں محض صفت علم ہی پر ایک ناز پایا جاتا ہے اور ہم اپنے کو اس صفت کی وجہ سے بہت بڑا سمجھتے ہیں اور عمل کی کمی سے ہم کو اپنے کمال میں نقص کا شبہ ہی نہیں ہوتا اور یہ ایسا بدیہی امر ہے کہ اس پر کسی قرینے کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہر شخص ذرا غور سے خود معلوم کر سکتا ہے اور اگر قرینہ اس کا یہ ہے کہ باوجود عمل نہ کرنے کے عوام الناس سے اپنے کو برتر سمجھتے ہیں اور اپنی حالت کو ان سے ارفع خیال کرتے ہیں چنانچہ اگر عوام الناس ہماری تعظیم میں کمی کریں تو ہم کو سخت تعجب ہوتا ہے اور بہت ہی غصہ آتا ہے یہ صاف دلیل اس کی ہے کہ ہم لوگ محض علم کی وجہ سے اپنے کو ارفع سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کہیں چلے جا رہے ہوں اور کوئی عام آدمی ہم کو راستے میں ملے تو خود سلام کرنا تو در کنار اس کے سلام کا جواب دیدینا بھی اپنا احسان سمجھتے ہیں کیوں کہ صاحب کیا قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کی بابت فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (وہ اپنے علم کی وجہ سے جو کہ ان کے پاس ہے شاد و مسرور ہو گئے) ارشاد نہیں ہوا اور جب یہ ہے تو کیا نرا علم قابل ناز یا فخر کرنے کے ہو سکتا ہے کبھی نہیں جیسا کہ حدیث

شریف میں صاف مذکور ہے ایک علم بندے کے لئے حجت ہے اور ایک علم خدا کی حجت ہے بندے پر ایسا علم کیا مایہ ناز ہوسکتا ہے اور ہم جو اپنے کو انبیاء کا وارث سمجھتے ہیں تو کیا ہمارا نرا علم حاصل کر لینا اس وراثت کے لئے کافی ہوگیا۔ ہرگز نہیں چونکہ ہم لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں خواہ وہ ابتلاء اعتقاداً ہو یا عملاً یا حالاً اور یہ آیت اس خیال کا باطل ہونا بتلا رہی ہے اس لئے اس آیت کو اس وقت اختیار کیا گیا جس میں انبیاءؑ کے وصف علم کے اثبات کے بعد شان عملی کو بیان کیا گیا ہے تاکہ ہم متوجہ ہوں اور غور کریں کہ جن کے ہم وارث بنتے ہیں ان میں کیا کیا اوصاف تھے۔ اور یہی غور کرنا غرض ہے قرآن شریف میں متعدد جگہ حضرات انبیاءؑ کے قصص مذکور ہونے سے تاکہ ہم غور کیا کریں پس ہم کو متوجہ ہونا چاہئے آیا کہ ہم میں وہی شان عمل میں پائی جاتی ہے یا نہیں اگر نہیں پائی جاتی تو وراثت کا دعویٰ ہم کو چھوڑ دینا چاہئے تو گویا یہ آیت ہمارے اس مرض کا علاج ہے پس بیان آیت کا یہ ہے کہ اس میں اول حضرات انبیاءؑ کے علم کو بیان کیا گیا ہے جس کی برابر کسی کا علم بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے علم کامل کے لئے نبوت لازم ہے یا یوں کہیں کہ ایسا علم کامل کیلئے نبوت لازم ہے یا یوں کہیں کہ علم کامل نبوت کیلئے لازم ہے یا دونوں طرف تلازم مانا جائے بہرحال جو کچھ کہا جائے اتنا قدر مشترک ماننا پڑتا ہے کہ نبوت کمال علم میں انفکاک نہیں ہوتا تو باوجود علم کے اس کامل مرتبہ پر ہوں گے پھر بھی ان کی مدح کا مدار صرف اس علم کو قرار نہیں دیا۔

صرف کمال علمی مدح نہیں:

بلکہ اس کے ساتھ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (یہ سب نیک کاموں میں دوڑتے ہیں) مجموعہ جزئین پر مدح کو ختم فرمایا جس کا حاصل یہ ہوا کہ کمال علمی بھی اگرچہ کمال ہے لیکن وہ کمال نہیں تمام اس وقت ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ عمل بھی مقرون ہو کیونکہ اگر عمل کو مدح میں داخل نہ مانا جائے اور صرف صفت علم پر مدح کو مقصود مانا جائے تو صفت علم کو معرض مدح میں ذکر کرنا ایک امر زائد ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ باعث مدح صرف کمال علمی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کمال بھی ہے اور وہ کمال کمال عملی ہے جس کو اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس وقت آپ حضرات کو وہی سنایا جا رہا ہے اگرچہ آپ کو سنانے کی ضرورت

نہیں تھی کیونکہ آپ خود متکلم سے زیادہ جانتے ہیں لیکن اسی قاعدہ مذکورہ کی بنا پر کہ کبھی باوجود معلوم ہونے کے بعض امور ملتفت الیہ نہیں ہوتے سنانا مفید معلوم ہوا اور گو اس وجہ سے کہ مقصود بالذات علم سے عمل ہے اور مقصود بالذات کا ملتفت الیہ ہونا ضروری ہے اس اعتبار سے اس مقصود بالذات پر متنبہ کرنیکی حالت نہ ہونا چاہئے لیکن کبھی مقصود بالغیر میں اس قدر انہماک ہو جاتا ہے کہ اصل مقصود بالذات نظر سے غائب ہو جاتا ہے اگرچہ یہ ہے بڑی غلطی کیونکہ اس سے اکثر خود طریق میں بھی غلطی واقع ہو جاتی ہے توضیح اس کی یہ ہے کہ اگر مقصود پیش نظر نہ ہو تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس طریق کو مقصود سے تعلق ہے کہ وہ قابل اہتمام ہو اور کس طریق کو اس سے تعلق نہیں کہ وہ قابل ترک ہو تو سعی کا مفید یا طائل ہونا معلوم نہیں ہوتا مثلاً اگر کوئی شخص دہلی جانا چاہے تو ریل میں بیٹھنا وہاں پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن اگر دہلی پیش نظر ہے تو اس کو اہتمام ہوگا کہ وہ گاڑی تلاش کرے جس کے ذریعہ سے دہلی پہنچ جائے اور اگر دہلی پیش نظر نہیں بلکہ محض چلنا ہی پیش نظر ہے تو عجب نہیں کہ اس میں غلطی ہو اور بجائے دہلی کے کلکتہ پہنچ جائے یہی حالت ہر طریق اور مقصود میں ہے کہ اگر خود طریق ہی کو مثل مقصود بالذات کے سمجھ لیا اور بالذات کو پیش نظر نہیں کیا تو اس میں گا ہے انہماک ہو کر ضرور غلطی ہوگی لہذا طریق کے اہتمام میں مقصود کو بھلانا بڑی کمی ہے مگر پھر بھی تحصیل علم میں یہ کوتاہی بکثرت واقع ہو رہی ہے کہ محصلین کو یہ یاد ہی نہیں کہ اس علم کی غایت عمل ہے اسی وجہ سے باوجود آپ کے جاننے کے پھر بھی آپ کو متنبہ کرنے کا خیال پیدا ہوا سو اس باب میں انبیاءؑ کی حکایت ہمارے لئے کافی نمونہ ہے کیونکہ ہم انبیاءؑ کے جانشین ہیں جو ان کی حالت تھی وہی ہم کو اختیار کرنا چاہئے اور وہ حالت اس آیت میں مذکور ہے اور اس میں کئی قسم کے حکم بیان کئے گئے ہیں اور سب کا حاصل مشترک یہ ہے کہ اس میں شان عملی کو ذکر کیا گیا ہے۔

ہر جملہ ہر نوع عمل کے لئے:

جس میں سے مختلف انواع کو ایک ایک جملہ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کا حاصل کرنا ضروری ہے فرماتے ہیں اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ کہ وہ لوگ مستعدی کرتے تھے نیک کاموں میں یہ ایک جملہ ہے جس میں ایک نوع عمل کو ذکر کیا ہے آگے

ارشاد ہے وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا یعنی ہم کو پکارتے تھے شوق سے اور خوف سے یہ دوسرا جملہ ہے جس میں دوسری نوع کا ذکر کیا گیا تیسرا جملہ ہے وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ جس میں ایک خاص نوع عمل کا بیان کیا ہے۔ اگر چہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر ہر جملہ میں تینوں قسم عمل کے مجموعے کو مراد لیا جائے لیکن پھر بھی اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہر جملہ کو کسی ایک نوع سے زیادہ تعلق ہے یعنی عمل تین قسم کے ہوتے ہیں اعمال جوارح اعمال لسان اعمال قلب مثلا نماز ہاتھ پاؤں کے متعلق ہے ذکر اللہ زبان کے متعلق ہے خشوع قلب کے متعلق ہے تو ان انواع اعمال میں اگر چہ ہر ہر جملہ کو سب ہی اقسام کے ساتھ ایک طرح کا تعلق ہے لیکن زیادہ تعلق ایک ایک جملہ کو ایک ایک ہی عمل کے ساتھ ہے چنانچہ پہلا جملہ اعمال جوارح کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا جملہ عمل لسان کے ساتھ اور دوسرے جملے یعنی يَدْعُوْنَنَا میں جو رَغَبًا وَّرَهَبًا کی قید ہے وہ تابع ہے لہذا اصل مقصود بِالذِّكْرِ يَدْعُوْنَنَا ہی ہوا اگر چہ اس جملہ میں دوسرا احتمال بھی ہے کہ قید زیادہ مقصود ہو اور اسی بنا پر میں نے کہا تھا کہ ہر جملہ کو ہر ہر نوع عمل کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے تیسرا جملہ اعمال قلب کے ساتھ متعلق ہے اور اسی پر ختم کر دیا گیا ہے پس اس جمع کرنے سے لازم آیا کہ عمل کی تینوں قسموں کے جمع کرنے سے عمل کا کمال ہوتا ہے اور اگر ایک جز کی بھی کمی رہی تو عمل ناقص رہے گا اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص گھر بنائے تو اس گھر کو کامل گھر اس وقت کہا جائے گا کہ اس میں تمام ضروری حصے ہوں کمرہ سہ دری باورچی خانہ وغیرہ وغیرہ اور اگر ایک جز بھی کم ہو تو اس گھر کو کامل گھر نہ کہیں گے بس یہی حالت عمل کی بھی ہے اگر ایک نوع بھی چھوٹ گئی تو عمل کامل نہ ہوا بلکہ ناقص رہا اب ہم اپنی حالت کو غور کر کے دیکھیں کہ اول تو مسلمانوں میں نفس عمل ہی کی کمی ہے اور اگر کچھ عمل کیا بھی جاتا ہے تو وصف میں بالکل ناقص اور زیادہ افسوس علماء کی جماعت پر ہے اس لئے کہ جانتے ہیں اور پھر کوتاہی کرتے ہیں

فان كنت لاتدری فتلک مصيبة وان كنت تدری فالمصيبة اعظم

(اگر تم نہیں جانتے تھے تو تب بھی یہ ایک مصیبت ہے اور اگر تمہیں اس کے متعلق علم تھا تو پھر تو ڈبل مصیبت ہے)

علماء کو ایک مثالی نمونہ بننے کی ضرورت:

اور علماء کی جماعت میں اگرچہ سب ایسے نہیں ہیں لیکن ان کے لئے کسی ایک کا ایسا ہونا بھی موجب شکایت ہے کیونکہ اپنے کو عمداً تباہ کرتے ہیں دوسرے وہ تباہی ان ہی تک مقصود نہیں رہتی بلکہ اس ایک کو دیکھ کر دوسرے بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ علماء کی جماعت میں اگر ایک شخص بھی لاابالی ہوتا ہے تو اس کا اثر سب پر پہنچتا ہے اور یہ اثر دو طرح سے ہوتا ہے ایک یہ کہ اس کو دیکھ کر دوسرے عوام بدعملی پر جرأت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سب علماء سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے عام علماء پر جو اعتراض کی نوبت آتی ہے اور پھر اعتراض سے بدزبانی تک نوبت آجاتی ہے اور اس میں اگرچہ اکثر عوام گنہگار ہیں کیونکہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (نہیں اٹھائیگا کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) لیکن زیادہ تر اس کا سبب ہم ہیں اور وہ اعتراضات اکثر مخالفین کے نہیں ہوتے کہ ان کو حسد یا بغض پر محمول کر لیا جائے یا یہ کہا جائے کہ اعتراضات تو انبیاءؑ پر بھی ہوئے ہیں پھر ہم کو اعتراضات کی کیا پرواہ کیونکہ حضرات انبیاءؑ پر جو اعتراضات ہوتے تھے وہ کفار کی طرف سے ہوتے تھے اور جماعت علماء پر اکثر انکے موافقین بھی جو کہ ہر وقت ان کا دم بھرتے ہیں اعتراض کرتے ہیں اور ہمارے لئے یہ امر بڑا عیب ہے کہ ہم کسی موافق یا مخالف کو اتنا موقع دیں تو جب اپنے لوگ بھی اعتراض کرنے پر مجبور ہوں تو ہماری حالت بے حد محل تاسف ہے اور وہ اعتراض اگرچہ اول ایک ہی شخص پر ہو لیکن ہے

چو از قومے یکے بیدانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

(جب کسی قوم کا کوئی آدمی کوئی نادانی کرتا ہے تو نہ تو اس قوم کے چھوٹوں کی کوئی قدر باقی رہ جاتی ہے نہ بڑوں کی) بالخصوص اس زمانے میں علی العموم علم دین سے لوگوں کو نفرت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس کے بھاگنے کے لئے لوگ بہانے تلاش کرتے ہیں ایسے وقت میں ہماری ایسی حالت ہونا لوگوں کے فاسد خیالات کی گویا اعانت کرنا ہے مگر باوجود اس کے افسوس ہے کہ ہم میں ایسے بھی افراد ہیں کہ وہ صرف علم ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور عمل کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے بعض کی حالت تو یہاں تک ناگفتہ بہ ہے کہ وہ نماز بھی نہیں پڑھتے بعض ایسے ہیں کہ وہ اس قدر کھلم کھلا تو بے عمل نہیں لیکن اپنی زبان وغیرہ کی حفاظت وہ بھی نہیں

کرتے جس جگہ بیٹھیں گے لوگوں کی غیبت شکایت کے انبار لگائیں گے بعض ایسے ہیں کہ وہ زبان کی تو حفاظت کرتے ہیں لیکن وہ نظر کی حفاظت بالکل نہیں کرتے اکثر نامحرموں کو دیکھنا راستہ چلتے ہوئے ادھر ادھر تاکنا جھانکنا عادت ہوجاتی ہے۔

اصل مقصود بالذّات عمل ہے:

صاحبو! اول تو علم مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات عمل ہے دوسرے اگر علم کو مقصود ہی مان لیا جائے تو تب بھی یہ سمجھ لو کہ یہ حالت بدعملی کی تو خود کمال علمی میں بھی حارج ہے کیونکہ یہ تجربہ ہے کہ تقوے میں جتنی کمی ہوگی اسی مرتبے کی کمی علم میں ہوگی اس کا آسان امتحان یہ ہے کہ دو مہینے کیلئے آپ بالکل متقی بن جائیں اور پھر اپنی پہلی علمی حالت اور اس زمانہ تقویٰ کی علمی حالت میں موازنہ کریں ان دونوں حالتوں میں تفاوت ہوگا بتلا دے گا کہ تقوی کو اس میں بڑا دخل ہے۔ ممکن ہے کہ کسی صاحب فہم کو یہ خیال ہو کہ ہم تو متقی بھی نہیں لیکن پھر بھی ہم کو تو اچھا خاصہ علم حاصل ہے سو سمجھ لیں کہ علم صرف ترجمہ کرلینے کا یا چند تصدیقات حاصل ہوجانے کا نام نہیں بلکہ ان تصدیقات کے حاصل کے بعد جو ایک ملکہ ہوجاتا ہے اس کا نام علم ہے سو وہ بالذات اختیاری نہیں یعنی اگرچہ اس کے اسباب کے اختیاری ہونے کے اعتبار سے وہ اختیاری ہو لیکن بدون اسباب کے حاصل کیے ہوئے خود اس کا حاصل ہونا اختیاری نہیں۔

تقوی اور علم:

اور اس کے اسباب میں سے ایک سبب اعظم تقویٰ ہے کہ بدون اس کو حاصل کیے ہوئے وہ ملکہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ امام شافعیؒ کا قول ہے

شکوت الی وکیع سوء حفظی   فاوصانی الی ترک المعاصی
فان العلم فضل من الہ   وفضل اللہ لایعطی لعاصی

(میں نے حضرت وکیع سے اپنی قوت حافظہ کے کمزور ہونیکی شکایت کی انہوں نے مجھے گناہوں کے ترک کرنے کی نصیحت فرمائی اس وجہ سے کہ علم باری تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے اور اس کا عطیہ گناہگاروں کو نہیں ملا کرتا) غرض یہ مطلب نہیں کہ جو متقی نہ ہوگا وہ جلالین یا بیضاوی کے پڑھانے پر قادر نہ ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ بدون تقوی کے وہ خاص ملکہ میسر نہ

ہوگا چنانچہ یہ شخص اگر اپنی پہلی حالت اور تقویٰ کے بعد کی حالت میں غور کریگا تو اس کو معلوم ہوگا کہ پہلے میرا مبلغ علم کیا تھا اور مہینہ دو مہینہ کے اندر علم میں کیسی ترقی ہوگئی تو علم اگر مقصود بالذات بھی مان لیا جائے تب اس کے حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کی ضرورت ہے مگر ہم لوگ اکثر بے باک ہیں تمام تر انہماک اس میں ہے کہ کسی طرح کتابیں ختم ہو جائیں بہت لوگوں کی تو ایسی حرکتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے تمام قوم بدنام ہوتی ہے اور چونکہ ان لوگوں کی عادت ہوگئی ہے لہذا اس کے ساتھ توبہ بھی ان کو نصیب نہیں ہوتی یعنی بشر سے غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن اگر چار دن تقویٰ رہے اور ایک دن ٹوٹ جائے اور گناہ ہونے پر پھر توبہ کر لی جائے تب بھی اس قدر خراب حالت نہ ہو اور تھوڑے دنوں میں گناہ چھوٹ جائیں۔

ترک عمل کی مضرتیں:

لیکن بعض لوگوں کو تو مبالات ہی نہیں رہتی اور اس سے عوام الناس پر بہت برا اثر پڑتا ہے یعنی ان کو یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے کہ علماء ایسے ہوتے ہیں پس اگر خلوص سے تقویٰ کو اختیار نہ کیا جائے تو اسی مصلحت سے اختیار کر لیا جائے کہ اس سے عوام بگڑیں گے ورنہ ایسے لوگ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (وہ لوگ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں) کے مصداق کہے جا سکتے ہیں کیونکہ روکنا جس طرح مباشرۃ ہوتا ہے کہ زبان سے روکے یا ہاتھ سے روکے اسی طرح تسبب بھی ایک قسم کا روکنا ہے تو اس کو بھی صد عن سبیل اللّٰہ کہا جائیگا کیونکہ سبب معصیت بھی معصیت ہوتا ہے اور اسی معصیت کے ساتھ اس کا بھی شمار ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض ایسے امور جو فی نفسہ طاعت ہیں جب کسی معصیت کا سبب بن گئے تو ان کی بھی ممانعت ہوگئی چنانچہ ارشاد ہے۔ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں ان کو گالی مت دو اس وجہ سے کہ پھر دشمنی میں بغیر جانے بوجھے اللہ کو گالی دینگے تو دیکھئے بتوں سے نفرت کا ظاہر کرنا اور ان کو برا کہنا ایک حد تک طاعت تھا لیکن چونکہ وہ مفضی تھا ایک معصیت کی طرف اس لئے اس سے بھی ممانعت ہوئی پس معلوم ہوا معصیت کی معاشرت معصیت ہے اس طرح تسبب بھی معصیت ہے تو اگر ایک شخص نے عمل نہ کیا تو دیکھنے والوں کیلئے درجہ تسبب میں یصدون کا مصداق بن گیا غرض ترک عمل میں یہ مضرتیں ہیں اس لئے اگر خلوص سے بھی

عمل نہ ہوتو کم سے کم دین کی احتیاط اور حفاظت کے لئے ہو اسی کو ہمارے حضرت نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ ریاء الشیخ خیر من اخلاص المرید (شیخ اور پیر کی ریاکاری مریدوں کے اخلاص سے بہتر ہے) یعنی چونکہ شیخ کا عمل دوسروں کیلئے باعث ہو جاتا ہے اس لئے اگر اس کے عمل میں ایک درجہ کی ریاء بھی ہوتو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اور یہ مقولہ حضرت کا میں نے قیاس کے لئے کہا ہے ورنہ مدلول اس کا یہ نہیں ہے کیونکہ اس مقولہ میں ریاء سے مراد ریا لغوی ہے نہ کہ شرعی اور میں درخواست کرر ہا ہوں ان بدعملوں سے علی سبیل التنزل ریاء شرعی کی۔ اور حکم مشترک یہ ہے کہ اگر دوسرے کی حفاظت دین کے لئے کوئی عمل کرے تو اس میں بھی خیریت کم سے کم یہی کہ سبب عمل بدکا نہ بنا تو دین کی حفاظت چونکہ ضروری ہے اس لئے یہی سمجھ کر اپنے کو بدعملی سے روکنا چاہیے۔

عامل بالشریعت کہلانے کا مستحق:

الحاصل ارشاد ہوتا ہے کہ انبیاءؑ تمام انواع عمل کے جامع تھے اور چونکہ اخبار سے مقصود کوئی انشاء ہوتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا کہ ہم کو بھی ایسا ہونا چاہیے کہ انواع عمل کے جامع ہو مگر ہم لوگوں میں اس کے متعلق چند کوتاہیاں ہیں چنانچہ ایک کوتاہی تو یہ ہے کہ عمل ہی کی طرف التفات نہیں کرتے اور اگر کچھ عمل کرتے بھی ہیں تو غضب یہ کیا ہے کہ ہم نے اس میں انتخاب کرلیا ہے اور اپنے اس انتخاب کو کافی سمجھ کر اپنے کو عامل باشریعت اور دیندار سمجھتے ہیں۔ صاحبو! ظاہر ہے کہ حسین وہ شخص کہلائے گا کہ اس کی آنکھ ناک چہرہ سب خوبصورت ہوں گے ورنہ اگر کسی کی آنکھیں تو نہایت اچھی ہوں اور ناک بالکل خراب چپٹی ہو یا برعکس ہو یا دانت باہر کو نکلے ہوئے ہوں تو وہ حسین نہ کہلائے گا بس اسی طرح دین بھی ایک حسن معنوی ہے تو حسین معنوی یعنی دیندار بھی اسی کو کہیں گے جو تمام وجوہ دین وانواع عمل کا جامع ہو اور جس نے ایک کو لیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا مثلاً اعمال جوارح کو لے لیا اور اعمال لسان کو چھوڑ دیا یا اعمال قلب کو لیا اور دوسرے دونوں کو چھوڑ دیا یا اعمال لسان کو لے لیا اور بقیہ دو کو چھوڑ دیا وہ شخص ہرگز اس حسن معنوی کے ساتھ متصف نہ سمجھا جائے گا آجکل ہم لوگوں میں اکثر افراد جو کچھ عمل کرتے بھی ہیں تو وہ اعمال جوارح مثلاً روزہ نماز حج وغیرہ کر لیتے ہیں ورنہ اکثر تو عمل ہی نہیں کرتے کہ نماز ہو رہی ہے اور وہ پڑے سو رہے ہیں۔

لاتفریط فی النوم کا صحیح مصداق:

ممکن ہے کہ ایسے لوگ اپنے عذر میں وہ حدیث پیش کریں کہ لا تفریط فی النوم (مسند احمد ۵: ۲۹۸) (نیند میں کمی نہیں) لیکن یہ حدیث ان کے لئے کچھ مفید نہیں کیونکہ یہ عدم تفریط اس وقت ہے کہ اپنی طرف سے تو پورا انتظام کر کے سوئے لیکن باوجود اہتمام اور انتظام کے پھر بھی آنکھ نہ کھلے اور اگر ایسے وقت سویا کہ غالب گمان یہ ہو کہ نماز کے وقت آنکھ نہ کھلے گی اور کچھ انتظام بھی نہیں کیا تو یہ ضرور تفریط میں داخل ہے قرینہ اس تقیید کا یہ ہے کہ ارشاد ایک خاص قصے کے متعلق ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ ایسے وقت سونے کی نوبت آئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال ؓ کو بٹھلا دیا تھا کہ جب صبح ہو ہم کو جگا دو مگر اتفاق سے ان کی بھی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی اور پھر اٹھے تو صحابہ ؓ بے حد گھبرائے تو اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ لا تفریط فی النوم. (مسند احمد ۵: ۲۹۸) یعنی چونکہ ہم لوگوں نے جاگنے کا پورا انتظام کیا لیکن باوجود کوشش کے پھر بھی آنکھ لگ گئی اس لئے اس سونے میں تفریط نہیں ہوئی یہ تو ان کا ذکر تھا جو بیدار ہی نہیں ہوئے اور بعض لوگ باوجود بیدار ہونے کے محض سستی کی وجہ سے پڑے رہتے ہیں سو اول تو نماز وغیرہ میں بھی ٹوٹا ہے لیکن خیر اگر بڑی دوڑ دوڑی تو نماز کے پابند ہو گئے لیکن دوسرے اعمال یا تقویٰ کے شعبے اکثر ندارد۔

بدنظری اور اس کا علاج:

چنانچہ بعض لوگ نظر میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی غیر محرموں کی طرف بیبا کانہ دیکھتے ہیں اور اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتے بلکہ یہ ایسا مرض ہے کہ اس سے بہت کم لوگ پاک ہیں کیونکہ اکثر ان گناہوں سے لوگ بچتے ہیں جن کے ارتکاب میں فوت جاہ یا رسوائی کا خیال ہو اور اس گناہ میں جاہ فوت نہیں ہوتی اس لئے کہ اول تو دوسرے کو نظر کی خبر ہی کیونکر ہو سکتی ہے دوسرے اگر نظر کی اطلاع بھی ہو جائے تو نیت کی کیا خبر اس کا امتیاز کسی کو بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ نظر بشہوت ہے یا بہ شفقت و محبت کیونکہ یہ ایک امر مبطن ہے خاص کر جبکہ شریعت نے دوسروں کو بدگمانی کی ممانعت بھی فرما دی تو اور بھی بدنظری کا گمان نہ کیا جائے گا اور جاہ فوت نہ

ہوں۔ اس گناہ سے چونکہ جاہ فوت نہیں ہوتی اس واسطے اس میں اکثر وہ لوگ مبتلا ہیں جو بظاہر ثقہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اس گناہ کی نسبت خاص طور سے خدا تعالیٰ نے اپنے علم کی اطلاع دی فرماتے ہیں۔ یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ اگر کسی دوسرے کو اس خیانت کی اطلاع نہیں ہوتی تو ہم کو اطلاع ہے اور ہماری اطلاع قابل نظر ہے اس کے بعد فرماتے ہیں وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (جو کہ امر سینوں میں پوشیدہ ہے وہ بھی ہم جانتے ہیں یہ اس لئے بڑھا دیا کہ بعض لوگ محض وقوع نظر کی اطلاع کو مفوت جاہ سمجھ کر اس سے بھی بچتے ہیں کیونکہ سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے اس کے وقوع ہی سے کسی کو بدگمانی پیدا ہو جائے اس لئے اس سے بھی بچتے ہیں لیکن ان کے قلب میں یہ مرض شہوت ہوتا ہے اور لطف یہ کہ باوجود اس مرض قلبی کے یہ شخص اپنے کو متقی سمجھتا ہے حالانکہ خیالات اس کے نہایت گندے ہوتے ہیں کہ وہ اکثر حدیث نفس میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات عزم بھی ہو جاتا ہے یعنی اگر اس کو موقع مل جائے تو یہ ہرگز نہ بچے تو ان لوگوں کے علاج کے لئے یہ بڑھا دیا کہ ہم دلوں کی پوشیدہ بات کو بھی جانتے ہیں۔

بدنظری سے متعلق شیطان کا دھوکہ:

غرض نظر کی معصیت اتنی مہتم بالشان معصیت ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو مستقل طور پر ذکر فرمایا اور جب اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کا چھوٹنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس میں یہ ہوتا ہے کہ شیطان بہکاتا ہے کہ ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لو تو جی بھر جائیگا اور یہ شیطان کا ایسا دھوکہ ہے کہ صغائر کبائر سب میں اس کے ذریعے سے کام لیتا ہے یہ دھوکا بظاہر نظر خفیف سا معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا دھوکہ ہے اور کس قدر قبح میں اشد ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ایک معصیت کو بصورت طاعت اس کے سامنے پیش کیا اور طرح اس میں مبتلا کر دیا اور صورت طاعت اس لئے ہوئی کہ شیطان نے دل میں یہ ڈالا کہ ارتکاب ایک گناہ کے چھوٹنے کا ذریعہ ہے اور ترک گناہ کا ذریعہ سبب اول تو طاعت واجبہ یا کم از کم ایک امر مستحب تو ضرور ہوگا اگر مستحب بھی نہ ہوگا جائز تو ضرور ہوگا تو گو شیطان نے ایک معصیت کو طاعت یا جائز اس کے ذہن میں ڈالا تو کس درجہ کا قبیح اعتقاد ہوا اور باوجود اس خرابی کے پھر وہ مقصود بھی جس کا شیطان نے وعدہ کیا ہے حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ خاصیت اس کی یہ ہے کہ القلیل یفضی الی الکبیر (قلیل کثیر تک پہنچا دیتا

ہے) یعنی جب تک انسان بچا رہے اس وقت تک محفوظ رہتا ہے اور جب ایک مرتبہ مبتلا ہو جائے اور پھر ترک بھی کر دے اگر چہ دو چار دن کے لئے ترک میں کامیاب ہو جائے اور اس مدت تک پھر طبیعت ادھر متوجہ نہ ہو لیکن دو چار دن گزرنے کے بعد پھر تقاضا شروع ہوتا ہے اور چونکہ ایک مرتبہ ارتکاب ہو جانے سے وہ رکاوٹ رہی نہیں اس لئے بہت جلد اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ساری عمر اسی میں گزر جاتی ہے اور پھر وعدہ ترک کی وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم بازچوں فردا شود امروز را فردا کنم

(ہر رات کو یہ وعدہ کرتا ہوں کہ کل یہ دھندا ترک کر دوں گا اور جب کل آتی ہے اسے پھر کل پر ڈال دیتا ہوں)۔

اور یہ دو چار دن کے لئے معاصی کی کامیابی بھی علی سبیل الفرض مان لی ہے۔ ورنہ اصل تو یہ ہے کہ گناہ پر کبھی یہ اثر ترک معصیت کا مرتب ہی نہیں ہوتا شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔ ؎

شکم صوفی را زبوں کرد وفرج دو دینار بر ہر دو آں کرد خرچ

صوفی سے ظاہری صوفی مراد ہے یعنی ایک دینار سے اس نے شہوت کو پورا کر لیا اور دوسرے دینار سے پیٹ کو بھر لیا اور سمجھا کہ اب اطمینان ہو گیا آگے فرماتے ہیں کہ پیٹ جس کو بھرا تھا وہ تو پھر خالی ہو گیا اور فرج جس کو خالی کیا تھا وہ پھر بھر گیا خواہش نہ پیٹ کی کم ہوئی نہ فرج کی اور دینار دونوں برباد کئے۔ تو واقعی یہی حالت ہے تو اول تو گمان ہی غلط ہے کہ ایسا کر لینے سے یکسوئی ہو جائے گی اور اگر کسی کو شاذ و نادر ہو بھی جائے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ اس گناہ میں یہ منفعت (نفع) ہے لیکن کسی گناہ میں منفعت ثابت ہو جانے سے بھی وہ گناہ گناہ ہی رہتا ہے دیکھئے شراب میں بھی منافع ہیں۔

گناہ میں منفعت ہونے سے حلال نہیں ہوتا:

چنانچہ اہل تجربہ نے لکھا ہے کہ اس کے پینے سے سخاوت بڑھتی ہے اور بہادری پیدا ہوتی ہے نیز اور بھی بعضے اخلاق کہ ان کا حصول شرعاً مطلوب ہے اس سے حاصل ہوتے ہیں بلکہ خود قرآن میں اس کے اندر منافع مان لئے گئے ہیں فرماتے ہیں۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. (وہ آپ

سے شراب اور جوئے کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں اور آپ ان سے کہہ دیں کہ ان دونوں میں لوگوں کے لئے بہت بڑا گناہ بھی ہے اور بہت بڑا نفع بھی ہے لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہے) لیکن ان منافع کے ہونے سے شراب کو حلال نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی حرمت ویسی ہی باقی رہی پس اسی طرح اگر کسی دوسری معصیت میں بھی کچھ منافع ثابت ہو جائیں تو ان کے منافع کی وجہ سے وہ حلال اور جائز ہو جائے گی بلکہ ان منافع کو کالعدم قرار دیں گے اور اس فعل کو معصیت ہی کہیں گے پھر ان سب باتوں کے ماسوا اگر عین ارتکاب کے وقت دم نکل جائے کیونکہ موت حیات کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ تو بتلایئے کہ کس ردی حالت میں انتقال ہوگا اور اگر نہ بھی مرے تو ممکن ہے کہ ارتکاب کے بعد توبہ نصیب نہ ہو۔

کثرت معاصی سے بے باکی بڑھ جاتی ہے:

بلکہ ایسے لوگوں کو اکثر توبہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ جب بے باکی بڑھ جاتی ہے تو ان افعال پر ندامت نہیں ہوتی اور جب ندامت نہیں ہوتی تو یہ بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ہرچند توبہ مقولہ فعل میں سے لیکن اس کا جزو اخیر انفعال ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ارشاد ہے التوبة ندم (توبہ پشیمانی اور ندامت ہے) اور یہ جزو پورے طور سے اختیار میں نہیں اور جب کثرت معاصی سے بے باکی ہو جاتی ہے تو ندم پھر مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور جب یہ حالت ہے تو ذرا غور کر لیجئے کہ ہم لوگ کس برتے پر گناہ کی جرات کرتے ہیں یہ لکھے پڑھے لوگوں کے گناہ ہیں کہ تاویلیں کر کر کے ان کے مرتکب ہوتے ہیں۔

عجب کا علاج معصیت سے کرنے کی مثال:

علیٰ ہذا اہل دل کو بھی بسا اوقات اسی قسم کا دھوکہ ہوتا ہے چنانچہ اگر عجب پیدا ہوتا ہے تو اس کا علاج کسی معصیت سے کیا جاتا ہے اور مصلحت یہ سمجھی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے ہم اپنی نظروں میں ذلیل رہیں گے اور اس سے عجب کی جڑ کٹ جائے گی۔ صاحبو! یہ ایسا علاج ہے جیسا کہ کوئی شخص بدن سے پاخانے کو بذریعہ پیشاب دھونے لگے نیز در پردہ یہ لوگ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہیں اور شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنوز کامل نہیں سمجھتے کیونکہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ سے بچنے کی ترکیب یہ کہیں نہیں بتلائی کہ ایسا گناہ میں مبتلا

ہو جاؤ اور یہ لوگ اس ترکیب کو علاج سمجھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امراض باطن کے علاج میں ناقص سمجھتے ہیں اور یہ مقابلہ ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا) اور کہتے کہ بعض بزرگوں نے بھی اس کو علاج بتلایا ہے تو ہم کہیں گے اگر حکایت صحیح ہے تو انہوں نے غلطی کی اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس شخص کا نام کتاب میں لکھا ہو وہ ضرور شیخ قابل تربیت ہو یا اس قابل ہو جائے کہ اس کی تقلید کریں۔

زبان کا گناہ:

اسی طرح زبان کا گناہ ہے کہ شاید طالب علم سے زیادہ اس میں کوئی شخص مبتلا نہیں ہوتا اور یہ گناہ نہایت ہی شدید ہے۔ حدیث میں ہے الغيبة اشد من الزنا (مشکوۃ المصابیح ۵: ۴۸۷۴) (غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے) اور پھر غیبت بھی دو قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے ایک تو برے کو برا کہنا اور ایک اچھے کو برا کہنا عوام الناس اگر غیبت میں مبتلا ہیں تو وہ اکثر ایسے لوگوں کو برا کہتے ہیں جو کہ واقع میں برے ہیں اور ہم لوگ ایسے لوگوں کو برا کہتے ہیں جو کہ نہایت صالح متقی عالم فاضل ہیں اکثر طالب علموں کی زبان سے سنا ہوگا کہ فلاں شخص کو آتا ہی کیا ہے فلاں میں یہ عیب ہے اگرچہ ان فضلاء میں بعض ایسے لوگ بھی جو کہ فضول سے مشتق ہیں اور ان کی غیبت جائز بھی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کہ خلق اللہ کو گمراہ کررہے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ ان کی غیبت سے بھی بچا جائے کیونکہ جب غیبت کی عادت ہو جاتی ہے تو پھر اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہتی اور حفظ حدود نہیں ہو سکتا۔ یہ حالت ہوتی ہے کہ جس کی طرف سے ذرا بھی کدورت ہوئی فوراً اس کا تذکرہ برائی کے ساتھ شروع کردیا۔ اسی طرح قلب کی یہ حالت ہے کہ اس میں کینہ، حسد، بغض عداوت غرض تمام امراض بھرے ہوئے ہیں اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اگر عمل کا تھوڑا بہت اہتمام ہے بھی تو صرف اعمال جوارح کا باقی زبان اور قلب اکثر تباہ ہے اور اکثر تو ہم میں سے تینوں ہی قسم کے گناہوں میں خوب اچھی طرح سے مبتلا ہیں غرض بیماریوں کو تو سب میں ابتلا ہے اور محتاط قدرے جوارح کی حفاظت کرتے ہیں مگر زبان کی حفاظت نہیں کرتے اور جو بہت ہی متقی ہیں وہ زبان کی بھی حفاظت کر لیتے ہیں قلب کی حفاظت وہ بھی بہت کم کرتے ہیں اور معاصی

قلوب سے ان کو بہت کم نجات ہوتی ہے تو مرض قلب وہ مرض ہوا کہ قریب قریب سب کے سب ہی اس میں مبتلا ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں تینوں نوعوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ انبیاء جوارح کو بھی بچاتے تھے کہ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ان کی حالت تھی اور زبان کو بھی معاصی سے روک کر اس کو طاعت میں لگاتے تھے یَدْعُوْنَنَا ان کی شان تھی اور پھر ان کی دعاء بھی رغبت اور رہبت کے ساتھ تھی یعنی ظاہر یہ ہے کہ رغبت اور رہبت کو بہ طور شرط فرمایا ہے اور مقصود یَدْعُوْنَنَا معلوم ہوتا ہے اگر چہ دوسری تفسیر بھی اس کی ممکن ہے جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ بھی کیا ہے لیکن مجھے اختیار ہے کہ میں اس تفسیر کو اختیار کرلوں۔ اور قلب کو معاصی سے پاک رکھتے تھے کہ ان میں خشوع پایا جاتا تھا۔

خشوع عمل قلب ہے:

مجھے زیادہ تر اس وقت یہی بیان کرنا بھی ہے کہ یہ تیسرا جزو یعنی خشوع کہ عمل قلب ہے ہم میں بہت کم پایا جاتا ہے حالانکہ یہ ساری طاعت کا راس ہے مگر ہم لوگ اس کی ذرا فکر اور اہتمام نہیں کرتے اور ہماری اس حالت فقدان خشوع کی شکایت نہایت صاف لفظوں میں قرآن شریف میں بھی ہے فرماتے ہیں۔ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ یعنی کیا مسلمانوں کیلئے ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب خشوع کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ شکایت اس امر کے ترک پر ہوتی ہے جس کا کرنا نہایت ضروری اور واجب ہو۔ تو معلوم ہوا کہ خشوع نہایت ضروری عمل ہے اور اس کا مقابل قساوت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کیلئے سو وہ اجالے پر ہے اپنے رب کی طرف سے سو خرابی ہے ان لوگوں کیلئے جن کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے قاسی ہیں۔) اور آگے فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی بہتر بات (یعنی کتاب جو کہ آپس میں ملتی جلتی ہے دہرائی ہوئی ہے اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں پھر نرم ہوتی ہے ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ

تعالیٰ کے ذکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں) تو اس آیت میں قساوت کا مقابل لین ہو فرمایا ہے اور لین وہی خشوع ہے تو معلوم ہوا کہ خشوع کا مقابل قساوت ہے۔

قساوت کی مذمّت:

اور قساوت کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے ان ابعد شیء من اللّٰہ القلب القاسی (سنن الترمذی : ۲۴۱۱) تو خشوع کی تاکید کرنا جیسا کہ سابق آیت میں ہے اور قساوت کی مذمت کرنا جس کا حاصل خشوع کے ترک پر مذمت کرنا ہے جیسا مابعد کی آیت میں ہے اس سے زیادہ اور اس کے ضروری اور واجب ہونے کیلئے کیا چاہیئے پس ہر عالم اور طالب کیلئے لازم ہے کہ وہ قلب میں خشوع پیدا کرے اور اس کے ظاہری آثار یہ ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے بات چیت میں معاملات میں سختی نہ کرے غیظ اور غضب میں مغلوب نہ ہو۔ انتقام کی فکر میں نہ رہے علی ہذا اور ان کو آثار اس لئے کہا کہ جب قلب میں خشوع کی صفت ہوگی تو جوارح پر اس کا اثر ضرور پڑے گا حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو یہ ایسا ہرگز نہ کرتا اب اس کی ضرورت اور آثار معلوم ہو جانے کے بعد دیکھ لیجئے کہ آیا ہمارے قلب میں خشوع ہے یا نہیں اور ہمارے قلوب میں اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ کے مضمون میں داخل ہے یا نہیں اور ہمارے قلوب میں ترفع اور شیخی تو نہیں پائی جاتی پس اگر ہمارے قلوب میں خشوع ہے تو کیا وجہ کہ اس کے آثار نہیں پائے جاتے اس کی کیا وجہ کہ ہم کو اپنا کام خود کرنے سے یا کسی مسلمان کا کام سے عار آتی ہے۔ صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو مخدوم نہیں ہے پھر دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حالت تھی فرماتے ہیں۔ انی اکل کما یاکل العبد (کنز العمال : ۴۰۷۰۷) (کہ میں کھانا اس طرح کھاتا ہوں کہ جیسے کوئی غلام کھاتا ہے جس میں تجبر اور اکڑ اور اپنے کو بڑا سمجھنا اور تکبر کا نام نہیں ہوتا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے اقوال وافعال دونوں متبوع ہیں:

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے چلنے پھرنے کی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی آگے نہ چلتے تھے بلکہ کچھ صحابہؓ

آگے ہوتے تھے اور کچھ برابر میں ہوتے تھے اور کچھ پیچھے ہوتے تھے اور یہ کسی کا آگے اور کسی کا پیچھے چلنا بھی کسی خاص نظم اور ترتیب سے نہیں تھا جیسا آج کل بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کی عادت ہے کہ جب چلتے ہیں تو باقاعدہ کچھ لوگ ان کی عزت وشان بڑھانے کو ان کے آگے پرا جمائے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ان کے پیچھے ہوتے ہیں سو یہ نہ تھا بلکہ جس طرح بے تکلف احباب ملے جلے چلتے ہیں کہ کبھی کوئی آگے ہو گیا اور کبھی کوئی آگے ہو گیا اس طرح چلتے تھے لباس کی یہ شان تھی کہ ایک ایک کپڑے میں کئی کئی پیوند لگا کر پہنتے تھے آرام کرنے کی یہ حالت تھی کہ ٹاٹ کے اوپر آرام کرتے تھے۔ معاشرت کی یہ حالت تھی کہ اپنا کاروبار خود کرتے تھے بازار سے ضرورت کی چیزیں جا کر خرید لاتے تھے۔ غرض یہ سب افعال جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منقول ہیں تو کس لئے کیا اس لئے ہم سنیں اور پرواہ بھی نہ کریں۔ صاحبو! جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول متبوع ہے اسی طرح آپ کا فعل بھی متبوع (جنکی پیروی کی جائے) ہے جب تک تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو۔ ارشاد ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اچھی اور عمدہ عادتیں ہیں) تو یہ افعال بھی سب اتباع ہی کیلئے ہیں کہ ہماری بھی وہی وضع ہو وہی چال ڈھال ہو وہی معاشرت ہو۔ ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانا کھاتے دیکھا تو کانپ اٹھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تواضع کی کس حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی باہر کا ایلچی ڈر گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے مت ڈرو میں ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو کہ سوکھا گوشت کھاتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات کو دیکھئے اور پھر اپنے کو تو معلوم ہوگا۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

(راستے کا فرق دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے)

اہل علم کو سادگی اختیار کرنے کی ضرورت:

حدیث میں وارد ہے کہ البذاذہ من الایمان (کنز العمال: ۲۶۱۹) (کہ سادگی ایمان کا ایک شعبہ ہے) سو دیکھ لیجئے کہ ہم میں بذاذۃ اور سادگی پائی جاتی ہے یا نہیں میرے خیال میں جہاں تک غور کیا جائے گا ہم میں سادگی کا پتہ بھی نہیں ملے گا اور نہایت

افسوس اس امر کا ہے کہ اس وقت خود اکثر اہل علم میں عورتوں کی سی زینت آ گئی ہے۔ صاحبو! یہ ہمارے لئے دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا میں بھی سخت نقص ہے۔ اس سے بجائے عزت بڑھنے کے اور ذلت بڑھتی ہے ہمارا کمال تو یہ ہے کہ ؎

اے دل آں بہ خراب از مے گلگوں باشی	بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل بہتر یہ ہے کہ تو مئے گلگوں کو پی کر مست ہو جائے اور بغیر کسی مال اور بغیر کسی خزانے کے قارون کی حشمت اور اس کا رعب پیدا کرے)

دررہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں	شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(منزل لیلیٰ کے راستہ میں جس میں جان کے خطرے میں پہلی شرط یہ ہے کہ تو مجنون بنے۔ ہمارے لئے کمال یہی ہے کہ نہ لباس میں کوئی شان و شوکت ہو نہ دوسرے سامان میں مگر اس وقت یہ حالت ہے کہ اکثر طالب علموں کو دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طالب ہیں یا کسی نواب کے لڑکے اور یہ کوئی دیندار ہیں یا دنیادار کسی نے خوب کہا ہے ؎

یا مکن با پیلباناں دوستی	یا بنا کن خانہ برانداز پیل

یا مکش برچہرہ نیل عاشقی	یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

(یا تو ہاتھی ہانکنے والوں کے ساتھ دوستی مت کرو یا اگر کرتے ہو تو ہاتھی کے برابر اپنا مکان بھی بناؤ۔ یا تو چہرے پر عاشقی کا رنگ مت لگاؤ اور اگر لگاتے ہو تو پھر تقویٰ کے لباس کو بھی اسی رنگ میں رنگو)

یعنی یا تو آدمی کسی جماعت میں داخل نہ ہو اور اگر داخل ہو تو پھر وضع قطع سب اسی کی سی ہونا چاہیے۔

زینت علم:

علم کی یہی زینت ہے کہ اہل علم کی وضع پر رہے میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا بھی خیال نہیں تو کم از کم اس کا خیال تو ضرور کیجئے کہ آپ کس کے وارث ہونے کے مدعی ہیں اور ان مورث کی کیا حالت تھی۔ واللہ ہماری حالت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دین کا ہم پر کامل اثر نہیں ہوا دین ہمارے قلب میں پوری جگہ نہیں کی ہمارے سلف صالحین کی تو یہ حالت تھی کہ

انہوں نے بعضے مباح امور کو بھی جبکہ وہ مفضی بہ تکلف یا فساق کا شیوہ ہو گئے تھے ترک کر دیا تھا چنانچہ بناء اول پر باریک کپڑا پہننا چھوڑ دیا تھا۔ اور اسی بناء پر حدیث شریف میں ہے کہ من رق ثوبہ رق دینہ (جس نے اپنے لباس کو باریک بنایا اس کا دین بھی رقیق اور کمزور ہوگا) دوسری بناء کے متعلق ایک واقع ہے کہ کسی صحابی یا تابعی نے (میں اس وقت بھولتا ہوں) ایک مرتبہ کسی خلیفہ کو مہین لباس پہنے دیکھ کر یہ کہا تھا کہ انظروا الیٰ امیرنا ھذا یلبس ثیاب الفساق (ہمارے سردار کو دیکھو یہ فاسقوں کا لباس پہنتے ہیں) اور بناء ثانی بھی درحقیقت ناشی بناء اول سے تھی یعنی چونکہ سلف میں سادگی بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی اس لئے اس وقت صلحاء باریک کپڑے نہ پہنتے تھے بلکہ فساق ہی پہنتے تھے اس لئے امیر کو فساق کا لباس پہنے دیکھ کر یہ اعتراض کیا پس اس وقت بھی جو امور وضع اہل باطل یا اہل کبر کی ہیں گو فی نفسہ مباح ہی ہوں ان کو ترک کرنا چاہیے جیسے انگریزی بوٹ جوتے پھندے دار ٹوپی وغیرہ۔ کیونکہ اس قسم کے امور اول تو من تشبہ میں داخل ہیں دوسرے اگر ان کو تشبہ سے قطع نظر کر کے مباح مطلق بھی مان لیا جائے تب بھی چونکہ ثقہ لوگوں کی وضع نہیں اس لئے بھی وہ قابل ترک ہوں گے۔ ہماری وضع ایسی ہونا چاہیے کہ لوگوں دیکھتے ہی معلوم ہو جائے یہ ان لوگوں میں ہیں جن کو وحشی و ناکارہ سمجھا جاتا ہے جو کہ ہمارے لئے مایہ فخر ہے کیوں کہ ؎

تابدانی ہر کرا یزداں بخواند ازہمہ کار جہاں بیکار ماند

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد مرعس را دیدو درخانہ نہ شد

ماا گر قلاش و گر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جسے یزداں بلا لیتا ہے وہ دنیا کے سارے دھندوں سے بیکار ہوتا ہے۔ وہ پاگل ہے جو کہ دیوانہ نہیں ہوا محافظ کو دیکھا اور گھر میں نہ رہا اگر ہم محتاج اور دیوانے ہیں تو اس ساقی اور اس پیمانے کے مست بھی ہیں۔)

اور اہل تکلف کی وضع کی نسبت فرماتے ہیں ؎

عاقبت سازدترا ازدیں بری ایں تن آرائی وایں تن پروری

(تو اپنی عاقبت سنوار) تجھ کو یہ تکلف اور تصنع انجام کار تجھے دین سے دور کر دیگا۔

زینت اور نظافت میں حد اعتدال:

حقیقت میں اس کا انجام بہت ہی برا ہے کیونکہ اس میں قطع نظر اس کے کہ یہ بذات کے بالکل خلاف ہے ایک بڑی مضرت یہ ہے جب ہر وقت یہی شغل رہے گا تو باقاعدہ النفس لاتتوجه الیٰ شیئین فی اٰن واحد (نفس ایک ہی وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) یہ ضروری ہے کہ علم کی توجہ نہ رہے گی اور علم سے بالکل بے بہرہ رہے گا چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ ہر وقت اپنے بناؤ سنگار میں رہتے ہیں نہ ان میں کوئی استعداد ہوتی ہے نہ مناسبت اور یہ یقینی ہے کہ جو شخص امور عظام (بڑے کاموں) میں مشغول ہوتا ہے اس کی نظر امور صغار (چھوٹے کاموں) پر نہیں رہا کرتی حتی کہ یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ غسل کب کیا تھا اور کپڑے کب بدلے تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ شریعت مطہرہ نے یہ قانون مقرر کر دیا کہ ایک ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور غسل کر لیا کرو ورنہ یہ تو خود امر طبعی تھا مگر کام کرنے والے لوگوں کو اس طرف التفات نہیں رہتا اس لئے قانون کی ضرورت پڑی ۔ سبحان اللہ کس قدر رعائتیں شریعت مطہرہ نے مرعی رکھی ہیں کہ ایک طرف تو بذاذت کا حکم ہو رہا ہے تا کہ زینت اور تکلف نہ آجائے اور چونکہ بعض لوگوں سے اس پر ایسا عمل کرنے کا احتمال تھا کہ وہ اپنے تن بدن کی خبر نہ رکھنے کیوجہ سے حد نظافت سے بھی خارج ہو جاتے اس لئے دوسرے موقع پر یہ بھی ارشاد فر دیا ہے کہ ہفتے بھر میں ایک مرتبہ غسل کر لیا کرو۔ تا کہ نظافت بھی بھی فوت نہ ہو جائے کیونکہ نظافت مطلوب ہے چنانچہ اس کی اس قدر ترغیب دی ہے کہ یوں ارشاد فرمایا۔ نظفوا افنیتکم ولا تتشبھوا بالیھود (سنن الترمذی : ۲۷۸۹) (یعنی اپنے فنا دار کو صاف رکھا کرو اور اس کو میلا کچیلا رکھ کر یہود جیسے نہ بنو فنا دار اس حصہ زمین کو کہتے ہیں جو کہ گھر سے باہر دروازے کے سامنے ہو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب فناء دار تک کی نظافت مطلوب ہے تو خود دار کی اور اس سے بڑھ کر لباس اور بدن کی نظافت کسی درجہ مطلوب ہوگی۔ سو شریعت کی تو یہ تعلیم ہے کہ دونوں امر میں اعتدال ہی بتلایا مگر اس کے بعد اپنے اوپر نظر کر کے وہ شعر یاد آتا ہے کہ

چوں گرسنہ میشوی تو سگ شوی   چونکہ خوردی تندو بدرگ میشوی

(جب تم بھوکے ہوتے ہو تو کتا ہو جاتے ہو اور جب کھاتے ہو تو سرکش اور کمینے ہو جاتے ہو)

یعنی ہماری بھوک بھی ایک آفت اور سیری بھی ایک مصیبت یعنی اگر نظافت اختیار کریں گے تو اس درجہ کہ نواب معلوم ہوں اور بذاذۃ پر اتریں گے تو اس حد تک کپڑے بھی سڑے ہوئے بدن بھی سڑا ہوا وہ تعدیل کی شان جو شریعت نے سکھلائی ہے اس کا کہیں کوسوں بھی پتہ نہیں حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ نظافت اور بذاذۃ دونوں کو ہاتھ سے نہ جانے دے یہ تو شرعی پہلو سے بذاذت پر گفتگو تھی۔

تکلّفات ترک کرنے کی ضرورت:

اب حسی اعتبار سے لیجئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حسًا بھی یہی حالت ہے کہ جو آدمی کسی بڑے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کو چھوٹے کاموں کی طرف توجہ نہیں ہوتی مثلاً شادی کے موقع پر جن لوگوں کے سپرد شادی کا انتظام ہوتا ہے ان کو اپنے کپڑوں کی خبر ہوتی ہے نہ بدن کی اور وہ اس کو کچھ عار نہیں سمجھتے بلکہ اپنی کارگزاری پر ناز کرتے ہیں بلکہ جو زیادہ مشغول ہوتے ہیں ان کو اس طرف بھی التفات نہیں ہوتا کہ اس سے کارگزاری کا اظہار ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ انہماک فی الامور العظام کے لئے بذآذت او عدم الالتفات الی صغار الامور لازم ہے۔ پس جو طالب علم اپنے علم کے شغل میں لگا ہوگا اس کو کبھی اس کی فکر نہ ہوگی کہ میرے پاس بوٹ بھی ہے یا نہیں اور رومال بھی ہے یا نہیں۔ اس کی بنا پر محققین نے کہا ہے کہ رفارمر ہونے کیلئے عادۃً لازم ہے کہ وہ بالکل سادہ زندگی بسر کرے گا اور بڑے لوگوں کی سوانح عمری دیکھنے سے بھی اگرچہ وہ دنیا ہی کے بڑے ہوں صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے زندگی نہایت بے تکلف بسر کی پس جو شخص ہر وقت مانگ پٹی میں مشغول رہے اس کی نسبت سمجھ لینا چاہیے کہ لیس من الکمال فی شیء (اسے کوئی کمال حاصل نہیں ہے) ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی ان کو گھر پر جا کر آواز دیتا تو کم از کم نصف گھنٹہ میں باہر آتے اس کی وجہ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس وقت پکارنیکی آواز گھر میں پہنچتی ہے تو وہ آئینہ اور کنگھا طلب کرتے ہیں اور نہایت تکلف سے بالوں کو درست کر کے مانگ نکال کر داڑھی میں کنگھا کر کے ایک ایک بال کو موزوں بنا کر غرض دولھا بنکر باہر تشریف لاتے تھے۔

(ع) جنوں و خبط نہ کہئے اسے تو کیا کہئے۔ (جامع)

اسی طرح اکثر متکلفین (تکلف کرنے والے) کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک دو جوڑے محض اس کام کیلئے رہتا ہے کہ جب باہر نکلیں تو اس کو زیب تن کر کے نکلیں اور جب واپس آجائیں تو پھر وہی لنگوٹی یا سڑے ہوئے کپڑے ان لباس گویا ہاتھی کے دانت ہیں کھانے کے اور دکھانے کے اور ان لوگوں کو شیطان نے یہ دھوکا دیا ہے کہ ان اللہ جمیل ویحب الجمال (الصحیح لمسلم کتاب الایمان :۱۴۷) (اللہ تعالیٰ خوبصورت ہیں اور خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں) اور جب خدا تعالیٰ کو جمال پسند ہے تو ہم کو بھی جمیل بن کر رہنا چاہیے۔ لیکن میں ان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر یہ تزین محض جمال کی وجہ سے ہے تو اس کی کیا وجہ کہ محض جلوت میں یہ تکلف کا لباس پہنا جاتا کیا خلوت میں خدا تعالیٰ کو جمال پسند نہیں۔ صاحبو! یہ سب نفس کی توجیہات اور نکات بعد الوقوع ہیں اور خود آثار سے پتہ چل جاتا ہے کہ اصل مقصود کیا چنانچہ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ نہایت کم قیمت کپڑا معمولی کپڑا نہ پہنیں گے لیکن وضع ایسی اختیار کریں گے کہ دوسرے کو نہایت قیمتی معلوم ہو نیز تراش ایسی ہو گی کہ یہ بڑے لوگوں میں شمار ہوں اور وضع و تراش کا ذکر تکلف کی مثال میں اس لئے کیا کہ کپڑے میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک صورت اور ہیئت۔ سو تکلف میں اکثر زیادہ دخل ہیئت کو ہوتا ہے یعنی اگر کسی قیمتی کپڑے کی سادہ ہیئت بنالی جائے تو وہی معمولی اور سادہ معلوم ہونے لگتا ہے ہم نے بعض امراء کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت قیمتی کپڑا پہنتے ہیں لیکن اس کی وضع سادہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل معمولی معلوم ہوتا ہے اسی طرح بعض غرباء کو دیکھا ہے کہ وہ کپڑا کم قیمت پہنتے ہیں مگر بہت خوبصورت بنا کر۔ تو اگر خدا تعالیٰ نے وسعت دی ہو کپڑا پہنو لیکن اس کی وضع بالکل سادہ رکھو اس میں بناوٹ اور تزین ہرگز نہ ہونے دو مگر یہ اسی سے ہو سکے گا جو کسی بڑے کام میں مشغول ہوگا۔ پہلے طالب علموں کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ وہ بالکل اول جلول رہتے تھے کہ نہ کرتے کی خبر ہے نہ پاجامے کی پھر دیکھ لیجئے کہ ان میں جواب موجود ہیں وہ اپنے وقت کے مقتدا ہیں اور جو شخص کرتے پاجامے کی زیب و زینت میں مشغول رہے گا اس کو کبھی یہ بات کہاں میسر ہوگی نیز لوگوں کو یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم جو تکلف اور فیشن کے پیچھے پڑے ہیں آخر اس کی غرض کیا ہے ظاہر ہے کہ اپنی قدر بڑھانا اور لوگوں کی نظروں میں

عزیز بنا یہی اس کی غرض ہوتی ہے سو علماء کی جماعت میں تو اس سے کچھ قدر نہیں ہوتی اس جماعت کی نظروں میں قدر بڑھانے کی تو صورت یہ ہے کہ علم میں کمال حاصل ہو۔ اگرچہ پیجامہ نصف ساق تک ہو اور اگرچہ کرتہ بالکل بھی نہ ہو کانپور میں جس زمانہ میں میرا قیام تھا ایک مرتبہ مدرسہ میں پڑھاتا تھا کہ ایک شخص آکر بیٹھے ان کے بدن پر صرف ایک لنگی اور ایک چادر تھا۔ اس ہیئت کو دیکھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی لیکن جب انہوں نے گفتگو شروع کی تو معلوم ہوا کہ بہت بڑے فاضل ہیں۔ پھر تو ان کی اس قدر وقعت ہوئی کہ ہر ہر طالب ان پر جھکا جارہا تھا اور تتبع حالات وخیالات عوام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظروں میں بھی اہل علم کی وقعت وضع لباس سے نہیں غرض آپ لوگوں کی وقعت علم اور تقوی وطہارت سے ہے نہ کہ لباس سے یہ ظاہری زیب وزینت صرف ان لوگوں کے لئے ذریعہ حصول وقعت ہے۔ جو کمال سے عاری ہیں ورنہ خوب سمجھ لو کہ

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست　　بآب ورنگ خال وخط چہ حاجت روی زیبا را

(ہمارے ناقص عشق کی جمال یار کو کوئی ضرورت نہیں آب ورنگ تل وخط کی حسین چہرے کو کیا حاجت ہو سکتی ہے)

اور یہ بھی اس وقت ہے کہ وقعت کو کسی درجے میں قابل شمار کہا جائے۔

خشوع کے آثار:

ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود یہ وقعت ہی کوئی چیز قابل اہتمام نہیں غرض یہ آثار ہیں کپڑے میں خشوع تجبّر کے۔ اسی طرح چلنے اور بولنے میں بھی اس کے کچھ آثار ہیں جن کی نسبت ارشاد خداوندی ہے۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ (اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا کرو اور آواز کو پست کرو) پس معلوم ہوا کہ جب قلب میں خشوع ہوتا ہے تو رفتار میں بھی خشوع کا اثر ہوتا ہے اور آواز میں بھی اس کا اثر ہوتا ہے اور جیسے خشوع کے لئے یہ آثار لازم ہیں اسی تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان آثار کے لئے بھی خشوع لازم ہے۔ بلکہ ہر ظاہری ہیئت کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ دیکھئے اگر کوئی شخص غمگین صورت بنا کر بیٹھ جائے تو قلب میں بھی اضمحلال کا اثر محسوس ہوگا۔ یا اگر کوئی شخص متکبرانہ وضع

بنالے تو دل میں بھی ایک تجبّر اور تکبر کی شان پائی جائے گی تو جیسے باطن ظاہر میں مؤثر ہے کہ باطن موافق آثار ظاہر میں پائے جاتے ہیں اس طرح ظاہر بھی باطن میں مؤثر ہے۔ جب ایسا ہے تو جن لوگوں کو اس وقت تک صفت خشوع حاصل نہیں ہوسکی ان کو چاہیے کہ متواضعین کے افعال اختیار کریں ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے قلب میں بھی تواضع صفت پیدا ہوگی اور صاجبو کوئی تو وجہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے متکبرین کے افعال سے ممانعت فرمائی اور قرآن شریف میں. وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ارشاد ہوا۔ ذرا آپ اپنے اسلاف کے حالات دیکھیے کہ ان کی کیا شان تھی بلکہ میں کہتا ہوں کہ حضرات اکابر دین اس وقت موجود ہیں ان ہی کے حالات کو دیکھ لیجیے کیا ان کے افعال قابل اتباع نہیں ضرور ہیں پس ہم کو لازم ہے کہ ہم وہی وضع اختیار کریں جو کہ ان کو مرغوب ہو اور جس کو وہ اختیار کر چکے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہم اس تشبہ ظاہری کی بدولت اپنے باطن کو درست کر سکیں اہل اللہ کے ساتھ یہ ظاہر کا تشابہ بھی وہ چیز ہے کہ اس کی بدولت کفار پر فضل ہوگیا۔

ساحران موسیٰ علیہ السلام کے ایمان لانے کا سبب:

سیر کی روایت ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے ساحرین کو جمع کیا تو وہ لوگ ایسے لباس میں آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام کا لباس تھا آخر مقابلہ ہوتے ہی تمام ساحرین مسلمان ہوگئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خداوندی سے عرض کیا کہ الٰہی یہ سامان فرعون کے اسلام کے لئے ہوا تھا کیا سبب اس پر فضل ہوا اور ساحرین کو توفیق ایمان ہوگئی ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ یہ لوگ تمہاری سی صورت بن کر آئے تھے ہماری رحمت نے پسند نہ کیا کہ ہمارے محبوب کے ہم وضع لوگ دوزخ میں جائیں اس لئے ان کو توفیق ہوگئی اور فرعون تو چونکہ اتنا مناسبت نہیں تھی اس لئے اس کو یہ دولت نصیب نہ ہوسکی۔ اس حکایت سے احتجاج مقصود نہیں کہ اس کے ثبوت میں کلام کرنے لگو بلکہ صرف تائید منظور ہے اگر یہ حکایت صحیح نہ ہو اور اس لئے تقریر سے حذف بھی کر دی جائے تو بھی اصل مضمون دلائل سے ثابت ہے کہ کسی حکایت عدم ثبوت مضر نہیں غرض ہے خشوع اور اس کے آثار کی اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم میں صفت خشوع موجود ہے تب تو ہم کو اس کے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے اور اگر یہ صفت

موجود نہیں ہے تو خود اس کی تحصیل کے لئے ایسا کرنا یعنی اسکے آثار کا اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ تحصیل خشوع کی علت کے اجزا میں سے ایک جزو یہ بھی ہے اور دوسرا جزو یہ ہے کہ اہل خشوع کی صحبت اختیار کی جائے تیسرا جزو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی خشیت کو دل میں جگہ دی جائے۔

خشیت اللہ پیدا کرنے کی تدبیر:

اور اس خشیت کو پیدا کرنے کیلئے تدبیر کی جائے کہ کوئی وقت مناسب تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر اپنی حالت عصیاں اور پھر خدا تعالیٰ کے نعم اور نیز اس کے عذاب آخرت اور قیامت کے اہوال پل صراط میزان دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا جائے اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کو معمول کر لیا جائے تو ان شاء اللہ بہت کچھ فائدہ ہو کیونکہ اس کو خشیت کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خشیت سے خشوع ہوگا نیز ... سرے طور پر بھی اس کو حصول آثار خشوع میں دخل ہے وہ یہ کہ سب سے پہلا اثر جو اس سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے دل بالکل اٹھ جاتا ہے اور جب دنیا سے دل اٹھ جائے تو تکلف اور زینت اور اسی طرح دل بستگی کے سب آثار آجاتے ہیں اور اس قسم کی تمام باتوں سے نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس شخص کے پیش نظر ہر وقت سفر آخرت رہیگا اور دنیا میں اپنے تئیں مسافر سمجھے گا اور ظاہر ہے کہ مسافر کو سفر میں دل بستگی نہیں ہوا کرتی۔ اس کو منزل کا خیال ہر وقت سوہان روح رہتا ہے۔

بعد فراغ درسیہ علماء کیلئے دستور العمل:

چوتھا جزو علت خشوع کا یہ ہے (اور یہ بعد فراغ کتب درسیہ آپ کے ذمہ واجب العمل ہے) کہ اگر ظاہری علوم کی تحصیل میں دس سال ختم کئے ہیں تو باطن کی درستی میں کافی سال تو کیا چند ماہ ہی خرچ کر دیجئے یعنی کم سے کم دس مہینے ہی کسی کامل کی خدمت میں صرف کیجئے اور اس کے ارشاد کے مطابق چلئے۔ خداوند تعالیٰ کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے دولت خشوع عطا فرماتے ہیں اور علم کا اثر قلب کے اندر پیوست ہو جاتا ہے۔ خوب کہا ہے ۔

علم چوں برتن زنی مارے بود ۔۔۔ علم چوں بردل زنی یارے بود

(علم کو اگر بدن سے لگاؤ گے تو وہ تمہارے لئے سانپ ہو جائیگا اور اگر دل سے لگاؤ گے تو وہ تمہارا دوست ہوگا)

ایک جگہ اس کی تدبیر بتلاتے ہیں ۔

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کا ملے پامال شو

(بات کو چھوڑ کر مرد حال ہو اور کسی بزرگ کے سامنے پامال ہو جاؤ)

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

(اگر ایک ساعت کیلئے بھی نیک لوگوں کی صحبت میسر آجائے تو وہ سو سال کی عبادت اور پرہیزگاری سے بہتر ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اولیاء کی تھوڑی صحبت سو سال کی پر خلوص عبادت سے بڑھ کر ہے

نفس نتواں کشت الا ظل پیر دامن آں نفس کش را سخت گیر

علاوہ کسی پیر کے سائے کے نفس کو اور کوئی نہیں مار سکتا تم نفس مارنے والے پیر کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو)

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر وپس برآ

(اے دل اگر تجھے اس سفر کی خواہش ہے تو رہبر کا دامن تھام کے چلا آ)

در ارادت باش ثابت اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

(ارادت میں اے فرید ثابت اور اٹل رہو تاکہ معرفت کے خزانے کی کنجی تمہیں دستیاب ہو جائے)

شاید کسی کو ناز ہو کہ ہمارے پاس تو کتابیں ہیں ان کو دیکھ کر ہم سب کچھ حاصل کر لیں گے اس لئے آگے فرماتے ہیں ۔

بے رفیقی ہر کہ شد در راہ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(جس نے کہ بغیر کسی رفیق سفر کے عشق کے راستے میں قدم رکھا عمر گذرنے کے باوجود بھی اسے عشق سے آگاہی نہیں ہو سکتی)

اس شعر کو سن کر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے متعدد حضرات کی نسبت سنا ہے کہ وہ بغیر مرید ہوئے اس راہ میں کامیاب ہو گئے اس لئے اس کا جواب دیا جاتا ہے ۔

یار باید راہ را تنہا مرو بے قلاوز اندریں صحرا مرو

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ رابرید　　　ہم بعون ہمت مرداں رسید

(راستے کے لئے ساتھی کی ضرورت ہے تنہامت جا جس نے تنہا اور اکیلے اس راستے کو اختیار کیا وہ بھی بزرگوں کی توجہ سے ہی پہنچا ہے)

یعنی اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو وہ بھی محض ظاہراً ہوا ہے ورنہ واقع میں وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور مدد ہی سے مقصود تک پہنچا ہے اگر چہ اس کو اس مدد کی خبر بھی نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچے کی پرورش کہ بدون ماں باپ کی مدد اور اعانت کے وہ پرورش نہیں پاسکتا لیکن اس کو خبر نہیں ہوتی تو اگر چہ وہ بچہ بڑا ہو کر کہنے لگے کہ بغیر کسی مدد کے اتنا بڑا قوی الجثہ ہو گیا ہوں تو جس طرح اس کا یہ قول غلط اور قابل مضحکہ ہے اسی طرح اس راہ کے قطع کرنے والے کا قول بھی غلط ہو گا بات یہ ہے بعض مرتبہ ظاہراً ایک شخص کو کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا لیکن واقع میں بہت سے حضرات بامر خداوندی اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور وہ اس کو غلطیوں میں پھنسنے سے بچاتے ہیں۔ قطع راہ میں مدد فرماتے ہیں بہر حال اس جزو کی بھی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اس پر اسی وقت عمل کرنا مناسب ہے کہ جب کتب درسیہ سے فراغ ہو چکے اور اساتذہ ادھر متوجہ ہونے کی اجازت دے دیں اور اگر اساتذہ ختم درسیات کے بعد بھی چندے درسیات ہی میں مشغول رہنے کا حکم فرمائیں تو ان کے ارشاد پر عمل کرے اور جب تک کافی مناسبت نہ ہو جائے اس وقت تک درسیات ہی میں مشغول رہے اور جب کافی مناسبت ہو جائے تو چندروز کسی کے پاس رہ کر اصلاح باطن کر لے اور پھر درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری کر دے یہ ہے تدبیر خشوع کے پیدا ہونے کی چونکہ اس کا اہتمام بہت ضروری تھا اس لئے اس وقت اس کو عرض کیا گیا۔

سادگی کا مفہوم:

اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے بذاذۃ جس کو اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق کچھ تھوڑی توضیح عرض کر دوں کیونکہ ممکن ہے کوئی صاحب بذاذۃ کے وہ معنے سمجھ لیں جیسے غالب نے سمجھے تھے مشہور ہے کہ غالب نے ایک دوست کو اپنے گھر بلانا چاہا اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم تکلف زیادہ کرتے ہو اور اس سے مجھے اور تمہیں دونوں کو تکلیف ہوتی ہے اس واسطے آنے کی ہمت نہیں ہوئی آپ نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس

مرتبہ کچھ تکلف نہ ہوگا اور اس کے بعد محلّہ بھر کے گھر کا راکھ جمع کر کے اپنے گھر میں ایک ٹیلہ لگا دیا جب دوست کے آنے کا وقت آیا تو آپ اس پر چڑھ بیٹھے اور نہایت ہی مفلسانہ وضع بنائی مہمان نے آ کر یہ وضع دیکھی تو اس کو سخت رنج ہوا سمجھا کہ آج کل غالب کسی سخت مصیبت میں ہے قریب پہنچ کر حال دریافت کیا تو آپ فرماتے ہیں کہ میں بہت اچھا ہوں لیکن تم نے تکلف روک دیا تھا اس لئے میں نے یہ بے تکلفی کی وضع اختیار کی ہے تو جیسے غالب نے بے تکلفی کے معنی سمجھے تھے اسی طرح بعض لوگ شاید بذاذۃ کے یہ معنی سمجھ جائیں کہ نہ صفائی ہو اور نہ نظافت ہو بالکل میلی کچیلی حالت میں رہے حالانکہ میلے پن سے بذاذۃ کو کوئی علاقہ نہیں اور یہ بات بھی ضروری بیان کرنے کے قابل بھی کیونکہ ہماری جماعت جو کہ علماء طلبہ کی جماعت کہلاتی ہے اس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ یہ نظافت کی طرف متوجہ ہوں جہاں تک دیکھا جاتا ہے ان لوگوں کو اسکا ذرا خیال نہیں ہے بعض لوگ تکلف کے خوگر ہوتے ہیں لیکن صفائی ان میں بالکل نہیں ہوتی حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ تکلف نہ ہو اور صفائی ہو۔

نظافت کی ضرورت:

مثلاً آج کل گرمی کا موسم ہے اسی موسم میں علی العموم کپڑوں میں جلدی بدبو ہو جاتی ہے اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہفتے میں دو مرتبہ ضرور غسل کر کے کپڑے بدلے جائیں ۔اور اگر کسی کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو وہ یہ کرے کہ اپنے انہی کپڑوں کو جن کو پہنے ہوئے ہے دھو کر صاف کر لے۔ صاحبو! کپڑے میں کلف اور استری کی ضرورت نہیں ۔ضرورت صرف اس کی ہے کہ میلا نہ ہو پسینے کی بدبو نہ آتی ہو کیونکہ بدبو سے دوسروں کو بے حد تکلیف ہوتی ہے خصوصاً اساتذہ کو ایسے لوگوں سے سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اس کا خود خیال ہونا چاہئے اور اگر کسی کے ذہن میں اب تک خود یہ بات نہیں آئی تھی تو اب سننے کے بعد ضرور خیال رکھنا چاہئے آپ لوگوں نے حدیث میں پڑھا ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (الصحیح للبخاری ۹:۱) (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں) اور پسینے کی بدبو سے اذیت ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث قصہ سنیت غسل جمعہ میں آیا ہے کان یؤذی بعضھم بعضا (ان میں کا ایک

دوسرے کو تکلیف پہنچاتا تھا) یعنی ایک دوسرے سے بوجہ پسینہ کے تکلیف ہوتی تھی اس لئے غسل کا حکم ہوا۔ اور لیجئے فقہا نے کہا ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ کچی پیاز کھا کر مسجد میں نہ جائے علیٰ ہذا یہی حدیث نظفو ا افنیتکم (سنن الترمذی : ۲۷۸۹) (اپنے گھر کے سامنے کا حصہ صاف رکھو) سن چکے ہو جس میں یہ بیان کیا تھا کہ جب دار کے صاف کرنے کا حکم ہے تو خود حجرہ اور لباس و بدن صاف کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ اور علاوہ دوسرے کی تکلیف کے صفائی نہ رکھنے سے طرح طرح کی بیماریوں کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اور صفائی کو صحت میں بہت زیادہ دخل ہے کیونکہ صفائی سے نشاط پیدا ہوتا ہے اور نشاط معین صحت ہے۔ اب طالب علموں کی یہ حالت ہے کہ چاہے دو بالشت کوڑا ان کے حجرے میں ہو جائے لیکن یہ کبھی صاف نہ کریں گے مجھے تھانہ بھون کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک طالب علم کے حجرے میں چوہے نے زمین کھود کر بہت سی مٹی نکال دی تھی اور وہ کئی روز تک اسی طرح رہی لیکن اس کو بھٹ بند کرنے یا مٹی پھینکنے کی توفیق نہ ہوئی اتفاق سے ایک صاحب جو حاجی بھی ہیں اس طرف کو جو گزرے تو انہوں نے اس کو درست کر دیا چند روز کے بعد چوہے نے پھر مٹی کھود ڈالی اور پھر مٹی اسی طرح جمع ہوگئی کسی شخص نے دیکھ کر اس طالب علم سے کہا کہ اس کو ٹھیک کر دو تو آپ فرماتے ہیں کہ حاجی جی ٹھیک کر دیں گے۔ گویا حاجی صاحب ان کے نوکر ہیں کہ وہ آ کر ان کے حجرے کو صاف کیا کریں۔ اسی طرح آج کل آموں کی فصل ہے مدرسے میں جس جگہ دیکھئے چھلکا گٹھلی پھیلا پڑا ہے میں نے تھانہ بھون میں یہ انتظام کیا ہے کہ ایک جگہ ایک بڑا ٹوکرہ رکھ دیا ہے اور سب سے کہہ دیا ہے کہ اس میں چھلکے وغیرہ ڈالو لیکن باوجود اس کے بھی کسی کو اس کی توفیق نہیں ہوتی وجہ یہی ہے کہ مزاج میں صفائی اور نظافت نہیں۔ علیٰ ہذا گرمی کی وجہ سے سب لوگ صحن میں سوتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں کہ صبح اٹھ کر چارپائی کو کسی ٹھکانے کی جگہ رکھ دیں بلکہ جس جگہ پڑی ہیں وہیں دن چڑھے تک پڑی رہے گی۔ اکثر طالب علم اپنی ضرورت سے مسجد کے لوٹے حجرے میں لے جاتے ہیں لیکن پھر مسجد میں لا کر کون رکھے۔ اول تو مسجد کا لوٹا اپنے حجروں میں لے جانا ہی جائز نہیں اور کسی جگہ مسجد و مدرسے کا خرچ مشترک ہونے کی وجہ سے جائز بھی ہو تو حجرے میں رکھ لینا تو پھر بھی جائز نہیں۔ غرض ہم لوگ تکلف کریں گے تو نوابوں کی طرح اور بذاذۃ اختیار کریں گے

تو بالکل ہی بدنظم بن جائیں گے اس لئے میں نے عرض کر دیا ہے کہ تطافت بذاوت کے خلاف نہیں ہے بلکہ جس طرح طہارت ضروری ہے نظافت بھی ضروری ہے۔

ہماری بدمذاقی:

اب تو ہماری بدمذاقی کی یہ حالت ہوگئی کہ مدارس میں ایک انگریز مسلمان ہوا مسجد میں آ کر دیکھا کہ نالی میں بہت سارینٹھ وغیرہ پڑا ہے۔اس نے منتظمین سے کہا کہ مسجد کو صاف رکھنا ضروری ہے۔اس کی حالت ایسی خراب نہ رکھنی چاہیئے اس کو سن کر وہ لوگ کہنے لگے کہ تجھ میں ابھی عیسائیت باقی ہے۔ابھی صفائی کی بو دماغ سے نہیں نکلی گویا مسلمانوں کے لئے میلا کچیلا خراب خستہ رہنا لازم ہے اور اس قدر برہم ہوئے کہ اس کو مار کر مسجد سے نکال دیا بعض داناؤں کو اس حرکت کی اطلاع ہوئی تو وہ اس انگریز کے پاس آئے اور تسلی تشفی کرنے لگے۔اس نے کہا کیا آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ میں ان لوگوں کی اس حرکت سے اسلام چھوڑ دوں گا۔میں ان لوگوں پر ایمان نہیں لایا بلکہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نہ تھے۔تو بعض آدمی ستھرائی کو ہی اسلام کے خلاف کیوں سمجھتے ہیں۔استغفر اللہ حالانکہ دوسری قوموں نے صفائی اور ستھرائی اسلام ہی سے سیکھی ہے۔اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ وعظ:

خلاصہ وعظ سارے بیان کا یہ ہے کہ ہم کو صرف علم حاصل کر لینے پر بس نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے اور بالخصوص صفت خشوع اور اسکے آثار و تدابیر کا اختیار کرنا اور اہل علم کے لئے زیادہ خصوصیت کے ساتھ ضروری ہے کہ انکے لئے زینت اور زیور ہے۔اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائیں۔اللھم وفقنا لما تحب وترضیٰ۔اے اللہ ہمیں ان کاموں کی توفیق عطا فرما جنہیں آپ پسند فرماتے ہیں اور جس سے آپ خوش ہوتے ہیں۔آمین یا ارحم الراحمین۔

التیسیر للتسیر

وعظ ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۷ھ بمقام جامع مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے منبر پر بیٹھ کر ۳ گھنٹہ ارشاد فرمایا، سامعین کی تعداد تقریباً پچاس تھی جس کو مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. وتحمل اثقالکم الیٰ بلدلم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ط ان ربکم لرؤف رحیم ○والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ط ویخلق مالا تعلمون○

تمہید

یہ وہ آیت ہے جس کے متعلق دس روز پہلے کچھ بیان کیا گیا تھا اور آیت کی تفسیر بیان کرنے کے بعد چند فوائد زائدہ کا بھی بیان ہوا تھا مگر بعد ختم بیان کے ایک خاص فائدہ کی تفسیر اس آیت کے متعلق ذہن میں آتی تھی جس کے بارے میں اول یہ ارادہ ہوا کہ اسی دن دوسرے وقت بیان کر دی جائے۔ مگر وعظ ضبط کرنے والے وقت پر نہ آ سکے اس لئے پھر یہ قصد ہوا کہ نظر ثانی میں اس کو بڑھا دیا جائے گا۔ چنانچہ یادداشت میں لکھ لیا گیا تھا مگر ابھی پہلے بیان پر نظر ثانی کی بھی نوبت نہ آئی تھی کیونکہ وعظ کی تسوید اجمالی کے بعد تسوید تفصیلی میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے اور تسوید تفصیلی کے بعد میری نظر ثانی بھی فوراً نہیں ہوتی بلکہ نظر ثانی میں اہم اور اقدام کو مقدم کیا جاتا ہے اس لئے اس وعظ پر نظر ثانی ہنوز نہ ہوئی تھی کہ دوسرے وعظ

کی تحریک ہوئی جس کے جواب میں اول تو میں نے عذر کیا اور عذر کی وجہ یہ تھی کہ..... کوئی خاص مضمون ذہن میں نہ تھا اور یوں تو تمام مضامین شریعت نافع ہیں مگر مجھے نفع قریب کا اہتمام رہتا ہے جو وقتی ضرورت کا ہو دور دراز کے نفع کے لئے وقت صرف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور مضمون درخواست کے وقت ذہن میں حاضر نہ ہوا تھا جو اس آیت کے متعلق پہلے بیان میں رہ گیا تھا اس لئے میں نے دوسرے وعظ سے عذر کیا پھر اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ اگر کوئی مضمون ذہن میں آگیا تو بیان کردوں گا پھر شام کو خیال آیا کہ وہ فائدہ جو رہ گیا ہے اس کو بیان کردیا جائے نہ محض اس واسطے کہ اس وعظ کی تتمیم ہو جائے کیونکہ اس کی صورت یہ بھی ممکن تھی کہ نظر ثانی میں اس کو اضافہ کردیا جاتا بلکہ اس واسطے کہ وہ مضمون فی نفسہ بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے مستحضر نہ ہونے سے ہمارے بھائیوں کی پریشانی بڑھ رہی ہے اور شاید بعض لوگ سمجھتے ہوں گے کہ پریشانی کا زیادہ ہونا تو مجاہدہ ہے تو پریشانی کا بڑھنا اچھا ہے۔ استغفراللہ استغفراللہ ہر پریشانی مطلوب نہیں۔

پریشانی کی دو اقسام:

بلکہ پریشانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو با اختیار ہو کہ انسان کے کسب کو اس میں دخل ہو دوسرے وہ جو بلا اختیار ہو کہ انسان کے کسب کو اس میں دخل نہیں۔ پھر جس میں کسب کو دخل ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا جلب وسلب دونوں اختیاری ہیں یعنی اس کے پیدا ہونے میں بھی کسب کو دخل ہے اور دفع کرنے میں بھی اور ایک وہ جس کا جلب تو اختیاری نہیں مگر دفع اختیاری ہے یہ بھی کسبیہ میں داخل ہے، پس جس جلب وسلب اختیاری ہوں اس کے اسباب کو خود پیدا کرنا سخت مضر ہے اور جس کے اسباب جلب اختیاری نہیں مگر دفع اختیاری ہے اس کے اسباب مدافعت کو اختیار نہ کرنا اور پریشانی میں مبتلا رہنا بھی مضر ہے۔ اور ایک پریشانی وہ ہے جس کا نہ جلب اختیار میں ہے نہ سلب یہ واقعی خیر ہے اور اس کی نسبت یوں کہا جائے گا۔

دردازیارست و درمان نیز ہم   دل فدائے اوشد جان نیز ہم

درد دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی جانب سے ہے میرا دل اور جان بھی اسی پر قربان ہے۔

یعنی اس کیلئے درمان کی بھی طلب نہیں کی جائے گی اور یہی وہ پریشانی ہے جس کے بارے میں عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست　　بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(طریقت میں سالک پر جو پیش آتا ہے اسی میں خیر ہے اے دل جو صراط مستقیم پر ہے وہ گمراہ نہیں ہے)

یعنی طریقت میں جو امر طریقت کے متعلق پیش آئیں وہ تو خیر ہیں ہی جو امور طریقت کے علاوہ بھی بدون اس کے کسب واختیار کے پیش آئیں وہ بھی اس کیلئے خیر ہیں رہا یہ سوال کہ ہم صاحب طریقت کہاں ہیں۔

ہر مسلمان صاحب طریقت ہے:

اس کا جواب یہ ہے کہ سب مسلمان صاحب طریقت ہیں کیونکہ طریقت کہتے ہیں طریق ولایت کو اور ولایت کا ایک درجہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اللہ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ. تو جو شخص ایک ظلمت سے بھی نکل گیا اور یہی وہ طریق ہے اس پر یہ آیت صادق ہے۔ اور یقیناً ہر مسلمان ظلمت کفر سے نکلا ہوا ضرور ہے تو اس کو ولایت حاصل ہے گو بڑے درجہ کی ولایت حاصل نہ ہو جیسے شیخ سعدیؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ زمین پر بے ہوش پڑا ہے لوگ اس کے گرد کھڑے ہوئے ہیں پوچھا کیا حال ہے لوگوں نے کہا یہ عاشق ہے عشق میں دو منزلہ مکان سے کود پڑا ہے وہاں قریب ہی ایک زینہ تھا شیخ سعدی اس کی ایک سیڑھی پر چڑھ کر کود پڑے اور کہا ہم بھی عاشق ہیں مگر عشق سعدی تا بزانو۔ یعنی عشق کے مراتب مختلف ہیں۔ ایک درجہ ہم کو بھی حاصل ہے گو بڑا درجہ حاصل نہ ہو۔ یہ تو شیخ سعدیؒ کی ظرافت تھی۔

ادنیٰ درجہ کی قدر:

مگر حق تعالیٰ کے یہاں یہ حقیقت ہے وہاں ادنیٰ درجہ کی بھی قدر ہے حتیٰ کہ صلحا کی صورت بنانے کی بھی قدر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ من تشبہ بقوم فھو منھم. (سنن أبی داؤد : ۴۰۳۱) کہ جو شخص جس قوم کی مشابہت

اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا چنانچہ صوفیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ریا سے بھی صوفیوں کی وضع بناتا ہو اسکی بھی قدر کرو۔ کیونکہ اس کے اس فعل سے تو معلوم ہوا کہ اس کے دل میں صوفیہ کی قدر ہے جب ہی تو وہ ان کی وضع وصورت سے باقدر ہونا چاہتا ہے پس تم اس کے عیب (ریا) پر نظر نہ کرو بلکہ اس خوبی پر نظر کر کے اس کی قدر کرو اور یہ سمجھو کہ یہ چندروز کے بعد ریاء نہ رہے گی تو جب اللہ تعالیٰ کے یہاں صورت کی بھی قدر ہے تو حقیقت کی گو وہ ادنیٰ ہی درجہ کی ہو قدر کیوں نہ ہوگی پس۔ ثابت ہو گیا کہ سب مسلمان صاحب طریقت کو جو حالت بھی پیش آتی ہے وہ سب خیر ہی خیر ہے۔

کونسی پریشانیاں خیر ہیں:

خلاصہ یہ کہ جن پریشانیوں کا نہ سلب اختیار میں ہے نہ جلب وہ واقعی مجاہدہ ہیں اور وہ سب خیر ہی خیر ہیں جن کا جلب وسلب دونوں یا محض سلب اختیاری ہو وہ پریشانی مجاہدہ نہیں۔

کونسی پریشانی کا سر لینا مجاہدہ نہیں:

جیسے کسی نے خواہ مخواہ بلا ضرورت ایسے شخص کا مقابلہ شروع کر دیا جس کے مقابلہ کا تحمل نہیں اب نتیجہ یہ ہوا کہ پریشان پھرتا ہے اپنے بچاؤ کے لئے لوگوں سے مدد مانگتا پھرتا ہے تیری میری خوشامد کرتا ہے ایسی پریشانی کا سر لینا مجاہدہ نہیں بلکہ شریعت نے ایسی پریشانیوں کے مول لینے سے منع کیا ہے۔ حدیث میں ہے **لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ قالو ایارسول اللہ وکیف یذل نفسہ قال یتحمل من البلاء مالا یطیق.** (سنن الترمذی: ۲۲۵۴)

(کسی کو مناسب نہیں کہ اپنے کو ذلیل کرے صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ کیسے اپنے کو ذلیل کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے اوپر ایسی بلا کو لادے جس کی اس کو طاقت نہیں)

اور ایک پریشانی وہ ہے جس کے اسباب تو غیر اختیاری ہیں مگر وہ اس کی مدافعت پر قادر ہے مثلاً کسی نے خواہ مخواہ اسکے اوپر دعویٰ کر دیا اگر مدافعت کی قدرت ہی نہیں تو مجبوری ہے اور یہ پریشانی قسم اول میں داخل ہے جو خیر ہی خیر ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ اس کے پاس مال ہے دعویٰ کو رفع کر سکتا ہے تو اب اس سے تقاعد عجز وحمق ہے حدیث میں ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ایک مقدمہ دائر ہوا فریقین میں سے ایک ہارا تو اس نے کہا **حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل** جس کا حاصل ترجمہ محاورے میں یہ ہے کہ مرضی خدا کی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **ان اللّٰہ یلوم علی العجز وعلیک بالکیس فاذا علیک امر فقل حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل.** (سنن أبی داؤد : ۳۶۲۷) یعنی اللہ تعالیٰ کم ہمتی کو پسند نہیں فرماتا عقل و تدبر سے کام لینا چاہیے ۔ پھر جب بالکل ہی مغلوب و عاجز ہو جاؤ اس وقت **حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل** کہو ۔ مطلب یہ ہے تم نے **حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل** بے موقع کہا یہ اس کا موقع نہ تھا ۔ اور یہ مطلب میں نے اس واسطے بتلا دیا کہ بعض اس سے شاید یہ سمجھے ہوں گے کہ مطلب یہ ہے کہ جب تک تدبیر سے کام چلے اس وقت تک تقدیر پر نظر نہ کرنا چاہیے ۔ یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ قواعد شرعیہ سے مطلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا ۔ اگر قواعد شرعیہ کا لحاظ نہ کیا جائے اور محض ترجمہ حدیث کا دیکھ کر عمل کیا جائے تو ایسی غلطیاں بہت ہوں گی بلکہ لفظی غلطیاں بھی ہوں گی ۔

حکایت عامل بالحدیث:

جیسے ایک عامل بالحدیث کی حکایت ہے کہ وہ امامت کے وقت نماز میں بہت ہلا کرتے تھے اور تنہا نماز پڑھتے ہوئے نہ ہلتے تھے کسی نے پوچھا کہ امامت کے وقت تم کو کیا ہو جاتا ہے جو اس قدر ہلتے ہو کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ امام کو ہلنا چاہیے لوگوں نے کہا ذرا ہم بھی وہ حدیث دیکھیں تو آپ مترجم کتاب اٹھا لائے اس میں حدیث **من ام منکم فلیخفف** کا ترجمہ یہ لکھا تھا کہ جو شخص امام بنے ہلکی نماز پڑھائے یعنی طویل نہ کرے آپ نے ہلکی کو ہل کر پڑھا ۔ کیسا ناس کیا ۔ اسی طرح ایک شخص کا دوست پٹ رہا تھا اور خود بھی کچھ کچھ ہاتھ چلا رہا تھا آپ نے دوڑ کر دوست کے ہاتھ پکڑ لئے دشمن نے اور زیادہ مرمت کی جب اس سے فراغت ہوئی تو دوست نے جھلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی میری امداد کرنے سے تو رہے الٹے میرے ہاتھ بھی پکڑ لئے کہ میں خود بھی مدافعت نہ کر سکوں کہا میں نے شیخ سعدیؒ کے ارشاد کے موافق حق دوستی ادا کیا تھا وہ فرما گئے ہیں ۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست   در پریشان حالی و درماندگی

(دوست وہ ہے جو اپنے دوست کے پریشانی اور مصیبت میں ہاتھ پکڑ لے)

صرف ترجمہ دیکھنا کافی نہیں:

اگر قواعد شریعت سے کام نہ لیا جائے تو محض ترجمہ دیکھنے سے ایسا عمل ہوگا جیسا اس شخص نے شیخ سعدی کے قول پر عمل کیا تھا آج کل جو لوگوں کو قرآن و حدیث کے ترجمہ کا شوق ہے یہ شوق بہت اچھا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں کیونکہ

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب　　　بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ　　　چارہ نبود در مقامش از چراغ

چونکہ موسم گل ختم ہوگیا اور چمن اجڑ گیا گلاب تو رہا ہی نہیں جس سے خوشبو حاصل ہو اب عرق گلاب سے ہی خوشبو حاصل کرو۔ چونکہ آفتاب چھپ گیا اور ہم کو داغ دے گیا اس لئے اس کی جگہ اب چراغ ہی سے کام لو۔

عورتوں کا مضامین اور غزلیں اخبار میں شائع کرانا بے حیائی ہے:

چنانچہ ایک صاحب نے ایک رسالہ اپنی بیٹی کے نام سے شائع کیا ہے اور آج کل یہ بھی مرض ہوگیا ہے کہ عورتوں کے نام سے رسائل چھاپتے ہیں اور بعضے تو نام کیساتھ پورا پتہ بھی لکھ دیتے ہیں نہ معلوم اس میں کیا مصلحت ہے؟ کیا لوگوں کو اس کی ملاقات کا رستہ بتلانا مقصود ہے جو ملنا چاہے۔ وہ اس پتہ سے تلاش کر کے مل لے یا اس پتہ پر بیگم صاحبہ سے خط و کتابت کر سکے۔ استغفر اللہ . واللہ غیرت مند آدمی تو بلا ضرورت اپنی گھر کی مستورات کا نام بھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا چہ جائیکہ پورا پتہ لکھنا اور اس کے نام سے کتابیں اور غزلیں شائع کرنا یا اخباروں میں مضامین دینا یہ سخت بے حیائی ہے اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے بیوی کو سر بازار بٹھلا دیا تو اس رسالہ میں اول تو اسی کا رونا رویا تھا کہ مسلمان تنزل میں ہیں افلاس میں ہیں ان کو ترقی کرنا چاہئے جو آج کل عام رسالوں میں ہوتا ہے اس کے بعد لکھا تھا کہ آج کل بڑا ستم یہ ہے کہ مسلمان تقدیر کے بھروسہ پر رہتے ہیں تدبیر کچھ نہیں کرتے بس جہاں ان پر کوئی مصیبت آئی لگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعا کرنے مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بھائی مجھے کوئی اور بھی کام ہے یا میں تمہاری دعائیں سنا کروں میں نے تمہیں ہاتھ پیر عقل دیدی ہے اس سے کیوں نہیں کام لیتے (نعوذ

باللہ ،نعوذ باللہ .) یہ اپنے خدا پر افترا باندھا گویا معاذ اللہ ان کو دوسرے مشاغل اتنے رہتے ہیں کہ وہ بندوں کی دعاؤں سے گھبرا گئے تو ایسے جاہل لوگ اس حدیث سے سمجھیں گے جب تک تدبیر سے کام چل سکے اس وقت تک تقدیر پر نظر نہ کرو۔

حدیث توکل کا مفہوم:

اس لئے میں نے عرض کر دیا کہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جس قصد سے اس وقت تم نے حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل کہا ہے یہ بے موقع ہے بلکہ مغلوبیت کاملہ کے بعد حَسْبِیَ اللّٰہُ کہنا چاہئے (مقدمہ میں ناکامی اس وجہ سے ہوئی کہ مدعی نے بینہ قائم کر کے ثبوت نہیں دیا۔سو یہ مغلوبیت کاملہ نہیں بلکہ اس میں مدعی کی کوتاہی کو دخل ہے اس کو چاہئے کہ گواہ تلاش کرے اور اپنے دعویٰ کا ثبوت دے اور اس تدبیر کے بعد بھی اگر مغلوب ہو جاوے تو اب حَسْبِیَ اللّٰہُ کہنے کا موقع ہے یہی مطلب ہے اذا علیک امر فقل حَسْبِیَ اللّٰہُ کہ جب تم پر کوئی ایسی افتاد پڑے جس میں تمہاری کوتاہی کو اصلاً دخل نہ ہو اس وقت حَسْبِیَ اللّٰہُ کہو اور جہاں تمہاری کوتاہی کی وجہ سے تمہارے خلاف فیصلہ ہوا ہو عقل وتدبیر سے کام لینا چاہئے خلاصہ یہ کہ حدیث میں قدرت ہوتے ہوئے قدرت سے کام نہ لینے کی ممانعت ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جب تک تدبیر سے کام چل سکے اس وقت تک تقدیر پر نظر نہ کرو بعض نادانوں کا خیال ہے کہ تقدیر کے اعتقاد نے مسلمانوں کو کاہل بنا دیا۔

تقدیر کے اعتقاد کی برکت:

میں کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ تقدیر نے مسلمانوں کو بہادر و شیر دل بنا دیا ہے جو شخص تقدیر کا معتقد ہے وہ ادنیٰ درجہ کی تدبیر سے بھی کام شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً کَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰہِ۔(بعض مرتبہ چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آ جاتی ہے) چنانچہ حضرات صحابہؓ کے واقعات میں سے اس کی کافی دلیل موجود ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی جماعت کے مقابلہ میں اس کے منتظر نہ رہتے تھے کہ ان کی برابر ساز وسامان اور جمعیت ہو تو جب ہی مقابلہ کیا جائے بلکہ ادنیٰ سے سامان و جمعیت کے ساتھ ان کا مقابلہ شروع کر دیتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے (بتلایئے

کہ وہ کونسی چیز تھی جس نے ادنیٰ سے سامان کے ساتھ بڑی بڑی مسلح و مکمل و بیشمار جماعتوں کے مقابلہ پر آمادہ کردیا وہ تقدیر ہی کا اعتقاد تو تھا) بخلاف صاحب تدبیر کے کہ وہ جب تک مکمل تدبیر نہ کرے گا اس وقت تک ہرگز کام شروع نہ کرے گا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس پریشانی کی مدافعت اختیاری ہو وہاں مدافعت کرنا چاہئے اور ترک مدافعت سے اپنے سر پریشانی نہ لینا چاہئے ہاں جب مصیبت کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اسکی مدافعت پر بھی قادر نہ ہو سو یہ واقعی مجاہدہ ہے اور اب اس پریشانی سے کچھ ضرر نہ ہوگا بلکہ اس میں نورانیت ہوتی ہے۔ وہ سراسر محمود ہے اور اس وقت اہل اللہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں آپ کی رضا ہو۔ اور یوں کہتے ہیں

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ بنے دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ اس پر آپ کا خنجر رہے۔

ہر پریشانی محمود نہیں:

ایسے پریشانی میں اہل اللہ کا تو توکل و اطمینان بڑھ جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں ایک درخت کے نیچے تنہا سو رہے تھے اور آپ کی تلوار درخت میں لٹکی ہوئی تھی حضرات صحابہؓ دوسرے درختوں کے سایہ میں ذرا فاصلہ سے سو رہے تھے کہ اس حالت میں ایک کافر نے درخت سے تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور سوت کر کھڑا ہوا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی تو اس نے للکار کر پوچھا من یمنعک منی (سنن أبی داؤد : ۳٦۷۲) کہ بتلایئے کہ آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا اللہ آپ کے چہرہ پر بل بھی تو نہ پڑا نہ کچھ خوف و ہراس ظاہر کیا بس آپ کا کہنا تھا کہ کافر کے ہاتھ میں رعشہ پڑ گیا کانپنے لگا اور تلوار ہاتھ سے گر پڑی اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار ہاتھ میں لے کر اس سے پوچھا من یمنعک منی کہ تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا کہا انت آپ ہی بچائیں گے آپ

نے اس پر رحم کیا اور قتل نہیں کیا اور جو پریشانی اختیار سے لائی جاتی ہے اس میں نور نہیں ہوتا بلکہ ظلمت ہوتی ہے اور جیسے کسی کا بچہ بیمار ہے اور وہ اس کا علاج نہیں کرتا اس لئے پریشان ہے تو اس میں نور نہ ہوگا اور ایک صورت یہ ہے کہ بچہ بیمار تھا اس کا علاج کیا گیا اور علاج کے بعد وہ مرگیا تو اس سے پریشانی نہ ہوگی۔ عارف ایسی مصیبت میں دل میں شاد ہوتا ہے اور ظاہر میں مغموم نواب شیفتہ اسی کو فرماتے ہیں۔

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رندان شو   کہ بینی خندہ برلبہا وآتشپارہ دردلہا

تو اے افسردہ دل زاہد ذرا بزم رنداں میں جا کر تو دیکھو کہ ان لبوں پر ہنسی ہے مگر ان کے دل رو رہے ہیں۔

ہر حال میں تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ پریشانی مطلقاً مطلوب نہیں اور نہ ہر پریشانی محمود ہے حق جل شانہ اپنے بندوں کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے بلکہ ہر امر میں ان کو راحت دینا چاہتے ہیں تشریعاً بھی تکوینا بھی۔ اگر اللہ تعالیٰ کو بندوں کی پریشانی پسند ہوتی تو یہ دعا تعلیم نہ کی جاتی۔ رَبَّنَا وَلاَ تُحَمِّلْنَا مَالاَ طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ (اے پروردگا ہمارے اوپر ایسا بوجھ نہ لا دیجے جس کے تحمل کی ہم کو طاقت نہیں کیونکہ جس عرضی کا مسودہ خود حاکم تجویز کردے وہ ضرور پوری ہوگی پس یقیناً جو دعائیں حق تعالیٰ کی فرمودہ ہیں اور اسی طرح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمودہ ہیں وہ ضرور مقبول ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے۔

گفتۂ او گفتہ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان گویا اللہ کا فرمان ہے اگرچہ ایک اللہ کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ادا ہوا ہے۔

اور یہ شان ہے

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت بگوی گویم

پس پردہ مجھے طوطے کی طرح بیٹھا دیا ہے مجھے تو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی کہہ رہا ہوں۔

آپ وہی فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد:

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہیں کرتے تھے بلکہ مطلب یہ

ہے کہ آپ کا اجتہاد بھی امر حق سے ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا امر تھا کہ جب کوئی واقعہ ایسا پیش آئے جس کے متعلق نص موجود نہیں تو ایک وقت محدود تک وحی کا انتظار کر کے اجتہاد کیجئے تو آپ اجتہاد میں بھی امر حق پر عامل تھے جیسے مقلد احکام میں مقلد ہے مگر نفس تقلید میں محقق ہے کیونکہ عامی کیلئے تقلید حکم نص میں منصوص ہے تو نفس تقلید میں وہ نص پر عمل کر رہا ہے اس لئے محقق ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد میں بھی وحی پر عامل تھے گو اجتہاد سے جو حکم بیان فرمائیں گے وہ اجتہادی ہوگا حقیقی وحی نہ ہوگا گو حکماً وہ بھی وحی ہے۔ جب اس کے خلاف وحی نازل نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ آپ سے اگر اجتہاد میں خطا ہوگی تو فوراً اس پر متنبہ کیا جائے گا تو جب آپ نے اجتہاد کیا اور اس کے خلاف وحی نازل نہ ہوئی تو تقریر الٰہی کی وجہ سے وہ بھی حکماً وحی ہے۔ اور بعض لوگ جو وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. سے نفی اجتہاد پر استدلال کرتے ہیں یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہاں اول تو قرآن کے متعلق کلام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو قرآن نکل رہا ہے یہ آپ کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ محض وحی ہے دوسرے اس کو عام بھی رکھا جائے تو یہاں اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. سے نفی ہوا کی مطلوب ہے نفی اجتہاد کی مطلوب نہیں مطلب یہ ہے کہ آپ ہوائے نفس سے تکلم نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں وحی کا اتباع فرماتے ہیں خواہ حقیقتاً یا حکماً جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ دعائیں ضرور قبول ہیں اور حق تعالیٰ نے ہم کو خود یہ دعا تعلیم فرمائی ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ. تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہم کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے ورنہ یہ دعا کیوں تعلیم کی جاتی۔

احکام تشریعیہ اور احکام تکوینیہ انسانی قوت سے زائد نہیں:

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں پر ایسی مصائب نازل ہوتی ہیں جن کا تحمل ان سے نہیں ہو سکتا اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ آیت احکام تکوینیہ کے بارہ میں نہیں ہے بلکہ احکام تشریعیہ کے بارہ میں ہے۔ اور احکام تشریعیہ میں کوئی حکم مافوق الطاقۃ نہیں۔ میں اس کو ابھی ثابت کروں گا۔ اور اگر اس کو عام رکھا جائے تو دوسرا جواب یہ ہے کہ

احکام تکوینیہ میں بھی کوئی شے طاقت سے خارج نہیں بشرطیکہ طاقت سے کام لیا جائے۔اس کی ایسی مثال ہے جیسے پندرہ بیس سیر اناج ہو اور کسی مزدور سے اس واسطے نہ اٹھتا ہو کہ اس نے کپڑے کے اندر اس کو نہیں باندھا بلکہ یوں ہی ہاتھوں میں اٹھانا چاہتا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ بوجھ اٹھانے کا طریقہ اختیار کرو یہ بوجھ زیادہ نہیں اسی طرح یہاں کہا جاتا ہے کہ مصائب تکوینیہ کے تحمل کا طریقہ اختیار کرو پھر کوئی شے طاقت سے زیادہ نہیں وہ طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ تعلق مع اللہ پیدا کر کے دیکھو پھر سب مصائب طاقت کے اندر ہیں کوئی بھی مافوق الطاقت نہیں کیونکہ کام تو وہ خود کرتے ہیں تم صرف طریق اور سڑک اور مظہر ہو کہ فعل تم سے ظاہر ہو جاتا ہے ورنہ کرنے والے وہ خود ہیں تو اب تحمل اس لئے ہو جائے گا کہ وہ تمہارے قلب میں قوت تحمل پیدا کر دینگے اور اگر خدا سے تعلق نہیں تو پھر قلب میں قوت کہاں سے آئے اس صورت میں واقعی دل ضعیف ہوگا اور اس کے بعض واقعات طاقت سے زائد معلوم ہوں گے۔صاحبو! اللہ تعالیٰ کے معاملات واقوال میں غور کر کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتے۔چنانچہ ارشاد ہے۔یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ ۔ اللہ تعالیٰ تم پر تخفیف کرنا چاہتے ہیں آگے اس کی وجہ ارشاد ہے۔وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے جب تکوینی ضعف کا تشریع میں لحاظ کیا گیا ہے تو کیا تکوینیات میں لحاظ نہ ہوگا ضرور ہوگا۔پس یہ آیت بھی تکوین وتشریع دونوں میں رعایت تخفیف کو ظاہر کر رہی ہے۔ایک مقام پر ارشاد ہے۔یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ .(اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں۔دشواری نہیں چاہتے) اگر کوئی اس کو بھی شرائع کے ساتھ خاص کرنا چاہے تو اول عموم لفظ اس سے آبی ہے اور تسلیم بھی کر لیا جائے تو اور نصوص تو دونوں کو عام ہیں مگر میں اول اس اشکال سے فارغ ہونا چاہتا ہوں جو بعض لوگوں کو تشریع کے یسر پر پیش آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو تشریعات میں بہت تنگی معلوم ہوتی ہے۔

دین میں ذرا تنگی نہیں:

مثلاً کوئی شخص معاملات فاسدہ سے بچے اور بالکل شریعت کے موافق معاملات کرنا چاہے تو اس کی عافیت تنگ ہو جائے گی۔اور وہ نہ ملازمت کر سکے گا نہ تجارت نہ زراعت کیونکہ سب میں ایسوں ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔جن کو اس کا اہتمام نہیں تو

لامحالہ اس کو اہتمام میں تنگی ہونا لازم ہے اس کا جواب ایک مستقل وعظ میں دیا گیا ہے جس کا نام نفی الحرج ہے جس میں مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ . کا بیان ہے یہ ایک آیت اور یاد آ گئی ہے جو پہلے ذہن میں نہ آئی تھی اس کو بھی پہلی آیات کے ساتھ اضافہ کر لیا جائے اس میں من حرج نکرہ تحت النفی ہے جو استغراق کو مفید ہے مطلب یہ ہوا کہ دین میں ذرا بھی تنگی نہیں یہ قرآن کا دعویٰ ہے اور ایسے وقت میں کیا گیا ہے جبکہ تمام عالم کو قرآن کے مقابلہ کی دعوت دی گئی تھی اور تمام کفار اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ قرآن کی کسی بات کو غلط ثابت کر دیں ۔ اگر دین اسلام کے احکام میں ذرا بھی تنگی ہوتی تو ایسا زوردار دعویٰ ہرگز نہ کیا جاتا اور اگر کیا گیا تھا تو کفار ضرور اس میں کچھ کلام کرتے مگر تاریخ شاہد ہے کہ کفار کو اصلاً قرآن پر حرف گیری کا موقع نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ کفار کو بھی یہ بات تسلیم تھی کہ واقعی اسلام میں کچھ تنگی نہیں ۔

شریعت کو تنگی کا الزام دینے کی مثال:

رہا یہ کہ آپ کو آج کل کی تنگی نظر آتی ہے تو اس کی ایک مثال اسی وعظ سے نقل کرتا ہوں وہ مثال یہ ہے جیسے ایک گاؤں والا کسی حکیم کے پاس گیا اور نبض دکھلا کر اپنے مرض کا علاج حکیم صاحب سے پوچھا حکیم نے نسخہ لکھا جس میں ایسی دوائیں لکھیں جو اس گاؤں میں نہیں ملتیں پھر غذا کا پوچھا تو حکیم نے شوربا یا پالک کے ساگ اور مونگ کی دال کی اجازت دی مگر وہ دیہاتی ایسے گاؤں کا رہنے والا ہے جہاں نہ مونگ کی دال نہ پالک ملتا ہے حکیم نے کہا اچھا کدو کھا لیا کرو اس نے کہا وہاں تو یہ بھی نہیں ملتا۔ حکیم نے پوچھا پھر کچھ وہاں ملتا بھی ہے ۔کہا وہاں تو مسور کی دال چنے کی دال اور کریلے اور بینگن ملتے ہیں حکیم نے کہا یہ ہرگز مت کھانا۔ اب اگر یہ دیہاتی یوں کہے کہ اس طبیب کا مطب بہت تنگ ہے تو بتلایئے عقلاء کیا کہیں گے یقیناً سب یہ کہیں گے کہ مطب تو تنگ نہیں بلکہ تیرا گاؤں تنگ ہے جہاں معمولی دوائیں معمولی غذائیں بھی نہیں ملتیں اسی طرح صاحبو! شریعت میں تنگی نہیں بلکہ آپ کی معاشرت تنگ ہے کہ آپ ایسی باغی جماعت کے اندر پھنسے ہوئے ہیں جو اعمال قبیحہ و افعال ظلم کی عادی اور جرائم کی خوگر ہے ۔شریعت میں بجز معاملات ربویہ کے تمام صورتیں بیع وشراء کی جائز ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ آج کل جس قوم کے ہاتھ میں تجارت ہے اس نے

جائز صورتیں چھوڑ کرنا جائز ہی ناجائز اختیار کر رکھی ہیں۔ پس یہ تو آپ کی معاشرت میں تنگی ہوئی اور اس وقت شریعت کو الزام دینا حقیقت میں اپنے کو الزام دینا ہے

حملہ برخود مے کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اے سادہ لوح انسان تم اپنے پر خود حملہ کرتے ہو جس طرح اس شیر نے خود اپنے پر حملہ کیا تھا۔ اور آپ کے اس الزام کی ایسی مثال ہے جیسے ہمارے قصبہ میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک عورت اپنے بچہ کو ہگا رہی تھی اتنے میں لوگ چاند دیکھنے لگے اس نے کپڑے سے پاخانہ پونچ کر چاند دیکھنا شروع کیا مگر اس کی انگلی میں پاخانہ لگا رہ گیا اور وہ ناک کے اوپر انگلی رکھ کر چاند دیکھنے لگی اس کی جو بدبو آئی تو آپ کہتی ہیں اوئی اب چاند کیسا سڑا ہوا نکلا۔

احکام شرعیہ پر غصہ آنے کی مثال:

اسی طرح آپ کو جو علماء کے اس جواب سے کہ سود حرام ہے رشوت حرام ہے اجارہ مجہولہ حرام ہے۔ غصہ آتا ہے اس غصہ کی ایسی مثال ہے جیسے مولانا نے حکایت لکھی ہے کہ ایک بوڑھا آدمی حکیم صاحب کے پاس جا کر کہے میری آنکھوں میں کمزوری ہے کہا بڑھاپے سے کہا میرا دماغ خالی سا ہو گیا ہے۔ کہا بڑھاپے سے۔ کہا میرے ہاتھ پاؤں میں درد رہتا ہے۔ کہا یہ بھی بڑھاپے سے۔ بڈھے نے جھلا کر حکیم کے ایک دھول رسید کی کہ نامعقول تو نے بڑھاپے کے سوا حکمت میں کچھ اور بھی پڑھا ہے۔ حکیم نے ہنس کر کہا کہ میں آپ کے غصہ کا برا نہیں مانتا یہ غصہ بھی بڑھاپے ہی سے ہے۔ اسی طرح آپ کو جو مولویوں کے فتوؤں پر غصہ آتا ہے اس کا سبب وہی جہل اور معاشرت کی تنگی ہے ورنہ شریعت میں کوئی بھی اشکال نہیں جیسے قرآن بے دھڑک کہتا ہے۔ ذالک الکتاب لا ریب فیہ حالانکہ آگے چل کر اسی صورت کے تیسرے رکوع میں ہے وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو قرآن میں شک بھی تھا۔ مگر قرآن اس کے باوجود بے دھڑک لاریب فیہ کہہ رہا ہے کیونکہ ان لوگوں کے شک کی ایسی مثال تھی جیسے یرقان والا کہتا ہے ھذا الثوب اصفر. یہ کپڑا زرد ہے اور تندرست آدمی اس کے جواب میں کہتا ہے ھذا لا صفرۃ فیہ کہ اس میں زردی نہیں تو وہ صحیح کہتا ہے کیونکہ وہ زردی تو اس کی آنکھوں میں

ہے۔اسی طرح اس آیت کا مطلب ہے کہ قرآن میں تو ریب نہیں تم خود ریب میں جا گھسے ہو اور وہ ریب بھی تم کو خود نہیں لپٹا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ریب سے پاک پیدا کیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ. (الصحیح للبخاری : ۲:۱۲۵) (ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے) مگر یہ خدائی باغ ہے اس میں پھول بھی ہیں اور جھاڑ بھی ہیں۔ایمان بھی ہے اور کفر بھی ہے تم کو تو اللہ تعالیٰ نے جھاڑوں سے الگ رکھا تھا تم خود ان میں جا پھنسے رہا یہ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے باغ میں جھاڑ کیوں رکھے ہیں تو اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور اجمالی جواب یہ ہے کہ اس میں بھی حکمتیں ہیں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست　　　　در بما نسبت کنی کفر آفت ست

کفر کی نسبت خالق کی طرف حکمت ہے اور نسبت دوسرے کیساتھ ہو تو کفر کی آفت ہے۔

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در کار خانۂ عشق از کفر ناگزیر ست　　　　آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

دنیا میں کفر کا وجود ضروری ہے اگر ابولہب نہ ہو تو دوزخ کی آگ کس کو جلائے۔یہ تو اشکال کا رفع تھا۔

مصیبت اور غم کے وقت تعلیم شریعت:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ نصوص سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پریشانی سے ہم کو بچانا چاہتے ہیں۔چنانچہ اوپر نصوص کا ذکر آچکا ہے اب میں اللہ تعالیٰ کے معاملات دکھلانا چاہتا ہوں ان معاملات سے بھی یہی معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو پریشانی سے نجات دینا چاہتے ہیں دیکھئے ایک مقام پر ارشاد ہے .اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ. قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (جب ان پر مصیبت آئی تو کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اس کی طرف کو جانے والے ہیں) یہاں اللہ تعالیٰ نے مصیبت کے متعلق ہم کو ایک تعلیم فرمائی ہے مگر اس تعلیم کی حقیقت معلوم کرنا چاہئے اور کوئی تصوف راز نہیں بلکہ عربیت میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور بات یہ ہے کہ شریعت کی تعلیم کا پورا لطف بدوں علم عربیت کے حاصل نہیں ہوتا۔ہم لوگوں میں بہت سے امراض اس وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں کہ ہم

تعلیم شریعت میں غور نہیں کرتے۔ پس ہم کو تفکر و تدبر کی عادت ڈالنا چاہئے۔ اب سنئے کہ انا للہ کے معنی بنا بر دلالت لام کے یہ ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملاؤ کہ مالک کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہے یہ مقدمہ ظاہر تھا۔ اس لئے اسے بیان نہیں کیا گیا دونوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے اندر ہر طرح تصرف کرنے کا اختیار ہے پھر پریشانی کیوں ہے یہ کیا ظلم ہے کہ تم کو برائے نام مالکیت کی وجہ سے اپنے مملوکات میں تصرف کا اختیار ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کو باوجود ملکیۃ حقیقۃ کے اپنے مملوکات میں تصرف کا اختیار نہ ہو پس ہم کو یہ تعلیم ہے مصیبت و غم کے وقت کہ اس مضمون کو پیش نظر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت اور غم اس لئے دیا ہے تاکہ بندہ کا عاجز ہونا اور حق تعالیٰ کا مالک و مختار ہونا مشاہد ہو اگر انسان پر مصیبت و غم نہ آئے تو یہ فرعون ہو جائے خلاصہ یہ کہ غم کا سبب یہ ہے کہ تم خدا کی مملوکات میں اپنی تجویز لگاتے ہو حالانکہ دوسرے کی ملک میں تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں بالخصوص احکم الحاکمین کی مملوکات میں اپنی تجویز لگانا سخت بے ادبی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہم کو غم اس واسطے ہوتا ہے کہ ہم غم کی حقیقت سے بے خبر ہیں اگر ہم غم کی حقیقت سے خبردار ہو جائیں تو اس سے خبردار ہونا ہی زوال غم ہے چنانچہ حقیقت غم کی تجویز ہے اگر ہم اس کو سمجھ جائیں تو یقیناً اس کو قطع کر دیں اور جب اس کو قطع کر دیں تو پھر غم پاس کو نہ آئے یعنی غلبہ نہ ہو۔

مگر آج کل تو یہ حالت ہے کہ ایک شخص لڑکے کو انگریزی پڑھاتا ہے اور بہت سے امتحان پاس کراتا ہے اور حقیقت میں اس کو خدا سے دور کراتا ہے دفعۃً حرکت قلب بند ہونے سے لڑکا سو تارہ گیا تو اب یہ خاک اڑاتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے میری امیدوں کا خاتمہ ہو گیا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

افسوس آنکھ جھپکتے ہی محبوب کی صحبت ختم ہو گئی۔ ابھی دل بھر کر پھول کو دیکھا بھی نہ تھا کہ موسم بہار ختم ہو گیا۔

اگر اس کو معرفت ہوتی تو اس غم سے پار ہو کر اس بہار میں لگ جاتا جو اس کے اندر موجود ہے وہ کیا؟ وہ وہ دولت ہے جس کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ — تو زغنچہ کم ندمیدۂ درِ دل کشا بچمن درآ

تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو۔

اور مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر عقل یکدم با خود آر   دم بدم در تو خزان ست و بہار

اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل کو درست کرلے دیکھو خود تمہارے اندر خزاں و بہار موجود ہے۔

طبعی غم کی حکمتیں:

ارے تم کو اس تجویز کا کیا حق ہے کہ یہ لڑکا سو سال زندہ رہے گا اور اس طرح روپیہ جمع کرے گا۔ یوں گھر کو چلا جائے گا۔ عارف سب سے اول تجویز ہی کو قطع کرتا ہے اسی لئے وہ کسی مصیبت سے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے ہر تصرف کے لئے آمادہ ہوتا ہے وہ بچہ کی دوا دارو اس کا حق سمجھ کر کرتا ہے مگر دل سے اس پر بھی راضی رہتا ہے یہ اللہ کی امانت ہے وہ جب چاہیں لے لیں ان کو اختیار ہے۔ اس کو بچہ کے مرنے سے رنج بھی ہوتا ہے مگر محض طبعی رنج ہوتا ہے عقلی رنج نہیں ہوتا۔ آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفائی دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم (**علیہ وعلیٰ ابیہ فداہ روحی افضل الصلوٰۃ والتسلیم ۱۲**) (**المصنف لابن أبی شیبۃ: ۳:۳۹۳**) کی وفات کے وقت صاف فرمادیا (**انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون** (اے ابراہیم بے شک ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غم بھی ہوا پھر اس کو ظاہر بھی فرمادیا تاکہ کوئی معتقد اس غم کو کسی باطنی حال پر محمول نہ کرے آپ نے صاف فرمادیا کہ بچہ کی مفارقت کا غم ہے اب جو چاہے معتقد رہے اور جس کا جی چاہے معتقد نہ رہے۔ حضرت با ہوا آدمی اس موقع پر ہرگز غم کو ظاہر نہ کرتا کہ معتقدین یوں کہیں گے کہ یہ کیسے نبی ہیں کہ بچہ کے غم میں رو رہے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پرواہ نہیں کی عملاً بھی آپ نے رنج ظاہر کیا اور قولاً بھی تاکہ امت کو معلوم ہوجائے کہ طبعی غم کا مضائقہ نہیں بلکہ یہ تو ہونا چاہئے ورنہ غموم و ہموم میں جو حکمتیں ہیں (مثلاً رفع درجات و اظہار عجز عبد و اظہار اختیار حق ۱۲) وہ باطل ہو جائیں گی اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ جو لوگ اولاد کے مرنے کے وقت ہنستے ہیں وہ ناقص

تھے اور جو روئے ہیں وہ کامل تھے۔ کیونکہ اس نے اولاد کا بھی حق ادا کیا اور خالق کا بھی۔ اولاد کا یہ بھی حق ہے کہ ان کی مفارقت کا رنج کیا جائے اور خالق کا یہ حق ہے کہ عقلاً اس کے تصرف سے راضی رہے۔ اور اس نقصان وکمال کی نظیر صاف یہ ہے کہ ایک شخص کے تو آپریشن کیا گیا کلوروفارم سنگھا کر اس نے نشتر لگانے کے وقت اف تک نہیں کیا اور دوسرے بدون کلوروفارم سنگھائے نشتر لگایا گیا اس نے آہ کی مگر اسی طرح پڑا رہا ناواقف پہلے شخص کو بہادر سمجھے گا مگر حقیقت شناس دوسرے کو بہادر کہے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پہلے شخص کے حواس معطل تھے اس لئے اس کو نشتر کا احساس ہی نہیں ہوا اور دوسرے کے حواس معطل نہ تھے اس کو تکلیف کا پورا احساس ہوا اس لئے ایک آہ نکل جانا کچھ بہادری کے خلاف نہیں بلکہ بڑی بہادری یہ ہے کہ باوجود احساس کے از جارفتہ نہیں ہوا۔

پریشانی کی جڑ رنج عقلی ہے:

اسی طرح جو لوگ اولاد کے مرنے پر ہنس دیئے ہیں ان کو کلوروفارم سنگھایا گیا تھا۔ یعنی وہ مغلوب الحال تھے اور جو روئے وہ مغلوب الحال نہ تھے۔ گفتگو بہت طویل ہوگئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ عارف کو طبعی رنج تو ہوتا ہے مگر اس کی عمر زیادہ نہیں۔ نہ اس سے پریشانی ہوتی ہے۔ عقلی رنج اس کو نہیں ہوتا اور پریشانی کی جڑ یہی ہے۔ عارف کو عقلی رنج اس واسطے نہیں ہوتا کہ وہ انا للہ کے مضمون کو پیش نظر رکھتا ہے۔ غرض عدم تفکر کی وجہ سے ہم لوگوں کو انا للہ (بے شک ہم اللہ ہی کیلئے ہیں) کے معنی ہی معلوم نہیں اس لئے ہم پریشان ہیں ورنہ یہ تعلیم غم کی زائل کرنے والی ہے وانا الیہ راجعون (بے شک ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) یہ بعض ضعفاء کی تسلی کے لئے بڑھایا گیا ہے جس کو مفارقت کے غم سے نجات ہی نہیں ہوتی۔ تو ان کو بتلاتے ہیں کہ تم بھی وہیں جاؤ گے جہاں وہ گیا ہے۔ یہ سوچ کر ان کو تسلی ہو جائے گی کی مفارقت دائمی نہیں ہے بلکہ چند روزہ ہے۔ شاید کوئی کہے کہ اچھا مراقبہ بتلایا کہ تم بھی مرو گے۔ موت سے تو ویسے ہی وحشت ہے اس سے تسلی کیونکر ہوگی۔ سو بات یہ ہے کہ جس کا محبوب مر چکا ہے اس کو موت سے وحشت نہیں رہتی وہ تو دل سے چاہتا ہے کہ کاش میں مر جاؤں اور وہ زندہ رہے تو ایسے شخص کو موت کا مراقبہ دشوار نہیں بلکہ اس کو یہ مراقبہ

آسان ہوگا۔ اور مفید بھی ہوگا دوسرے ہم لوگوں کو نصوص کے معلوم نہ ہونے سے آخرت سے وحشت ہے ورنہ وہ تو حقیقت میں قابل تمنا ہے۔ مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

دلا تاکے دریں کاخ مجازی کنی مانند طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرورمرغ گستاخ کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا ازآں آشیاں بیگانہ گشتی چودوناں چغد ایں ویرانہ گشتی

اے دل اس مجازی مکان (دنیا) میں کب تک لڑکوں کی طرح خاک سے کھیلتا رہے گا۔ تو ہی وہ ہاتھ کا پلا ہوا مرغ گستاخ ہے کہ تیرا آشیاں اس مکان سے باہر تھا تو اس آشیانہ سے کیوں بیگانہ ہوگیا کمینوں کی طرح اس ویرانہ کا الّو بنا ہوا ہے۔

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا درمیکدہ شاداں و غزلخواں بروم

وہ دن بہت اچھا ہے کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے پاس پہنچ جاوے۔ میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں۔

یہ تو موت کی نذریں مانتے ہیں کیونکہ وہاں کی راحت کا مشاہدہ کئے ہوئے ہیں۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مردہ قبر میں جا کر اکیلا تنہا پڑ جاتا ہے یہ غلط ہے احادیث میں واقعات موت دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اگر انشاء اللہ ایمان پر خاتمہ ہوگیا اور انشاء اللہ ایمان ہی پر خاتمہ ہوگا تو دوسری ارواح استقبال کو آئیں گی پھر وہ اس شخص سے دنیا والوں کے حالات دریافت کرتے ہیں کہ فلاں کیسا ہے فلاں کیسا ہے افسوس ہم کو ان کی یاد نہیں آتی اور وہ ہم کو یاد کرتے ہیں۔ افسوس وہ ہم سے ملنا چاہتے ہیں اور ہم ان سے ملنا نہیں چاہتے۔ صاحبو! یہ کس قدر بے انصافی ہے اور جب اجنبی ارواح سے بھی ملاقات ہوگی تو کیا اپنا بیٹا اور بھائی بیوی وغیرہ نہ ملیں گے ضرور ملیں گے۔ حدیث میں ہے کہ ادھورا بچہ بھی اپنی آنول نال سے والدین کو جنت میں لے جائے گا۔ نیز حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بچوں کے ناز نخرے ماں باپ سے زیادہ اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ بچہ کو جب کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو تو وہ جنت کے دروازہ پر

اڑ کر کھڑا ہو جائے گا کہ ہم تو اندر نہیں جائیں گے پوچھا جائے گا کیوں؟ کہے گا کہ پہلے ہمارے ماں باپ کو لاؤ ہم ان کو اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں گے تو ارشاد ہوگا۔ ایھا الطفل الراغم ربہ ادخل ابویک الجنہ (اتحاف السادۃ المتقین :۵:۲۹۸) کہ اے لڑکے اپنے رب کے ساتھ ضد کرنے والے جا اپنے والدین کو جنت میں لے جا۔ تو حضرات مرنے کے بعد اس طرح کے واقعات ہوں گے ان معاملات کو یاد کر کے تو جی چاہتا ہے کہ ہم عالم ارواح ہی میں ہوتے یہ تماشا عجیب ہے جو مرنے کے بعد ہوگا اور جس کو زیادہ تفصیل کا شوق ہو تو وہ میرا رسالہ شوق وطن مطالعہ کریں۔ پس اب وہ شبہ جاتا رہا جو وانا الیہ راجعون پروارد ہوا تھا۔ اور ایک بات یہ بھی سمجھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں قالوا فرمایا ہے اعتقدوا و تیقنوا نہیں فرمایا اس میں نکتہ یہ ہے کہ قول میں ایک خاص خاصیت ہے جو صرف اعتقاد سے حاصل نہیں ہوتی مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ جس امر کا دل میں اعتقاد ہو اس کو زبان سے بھی کہا جائے تو اثر دوبالا ہو جاتا ہے اسی کو ایک شاعر بیان کرتا ہے۔

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر ولا تسقنی سرا متی امکن الجھر

خبردار مجھے شراب محبت پلاؤ اور کہہ دو کہ یہ شراب ہے اور مجھے چھپ کر نہ پلانا جب تک کہ اس کا ظاہر کرنا ممکن ہو۔

زبان سے کہنے کا زیادہ اثر:

عشاق کو جذبات صحیحہ کا ادراک زیادہ ہوتا ہے اس لئے معاملہ میں ان کا قول حجت ہے۔ اسی لئے چشتیہ ذکر لسانی اور ذکر جہر کی تعلیم کرتے ہیں۔ پس تقلیداً اس کو مان لیجئے کہ زبان سے کہنے میں زیادہ اثر ہوتا ہے یہ بات اہل سائنس کو مبارک ہو کہ وہ ہر بات میں کہتے ہیں کیوں؟ میں کہتا ہوں بہت اچھا تم میرے ایک کیوں کا جواب دیدو پھر میں تمہارے ہر کیوں کا جواب دوں گا۔ بتائیے مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے۔ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ بالخاصہ جاذب ہے تو ایسے ہی یہاں بھی مان لیجئے کہ ذکر لسانی بالخاصہ زیادہ موثر ہے۔ حضرت عاشق کو زبان سے محبوب کا نام لینے میں زیادہ حظ آتا ہے چنانچہ تجربہ کر لیا جائے اسی کو ایک حکایت کے ضمن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرانورد　　در بیاباں غمش نشستہ فرد
ریگ کا غذ بود وانگشتان قلم　　مے نمود ے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ می کنم　　خاطر خود را تسلی می دہم

مجنوں کو کسی نے جنگل بیاباں میں دیکھا کہ بیٹھا ہے اور انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے ریت کا غذ اور انگلیاں قلم ہیں کسی نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو یہ کس کو خط لکھ رہے ہو۔ اس نے کہا لیلیٰ لیلیٰ لکھ رہا ہوں اور دل کو ٹھنڈا کر رہا ہوں یہی راز چشتیہ کا ذکر لسانی اور ذکر بالجہر میں ہے اور اسی لئے چشتیہ ریا کے ساتھ بدنام ہیں لوگ ان کو ریا کار سمجھتے ہیں مگر۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم کو ان لوگوں کی کیا خبر ہے جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں۔

خدا کی قسم وہ جس مقام پر ہیں وہاں سب چیزیں فنا ہوگئی ہیں ریا کا وہاں کہاں پتہ ہے۔

عشق ایں شعلہ است کہ چوں برفروخت　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند　　درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہوتا ہے تو محبوب کے علاوہ سب کو فنا کر دیتا ہے لا الٰہ کی تلوار اپنی غرض فاسدہ پر چلاؤ اس کے بعد دیکھ کہ ا لا کے بعد کیا رہا الا اللہ باقی رہ گیا۔ باقی سب فنا ہوگیا۔

وسوسہ ریا ریا نہیں:

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ذکر جہر میں ریا بھی ہو تو ہمارے امام الصوفیہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ ریا اول ریا ہوتا ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص ریا کی نیت سے بھی عمل کرے تو اس کے ساتھ ایک نیت یہ بھی کرے کہ میں اس لئے عمل کرتا ہوں کہ یہ ریا ایک دن اخلاص ہو جائے گی۔ بہر حال زبان سے ذکر کرنے میں یہ منافع ہیں۔ گو اس میں ریا کا وسوسہ بھی آتا ہے اس کی پروانہ کرنا چاہئے۔

اور یہاں ایک راز آپ کو میں اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ ریا اور ہے وسوسہ اور ہے۔ اس سے اکثر اپنے اوپر بھی ریا کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ریا وہ ہے جو بقصد اختیار ہو اور وسوسہ وہ ہے جو بلا قصد و اختیار کے آئے۔ سو وسوسہ ہرگز مضر نہیں۔ میں اکثر علماء سالکین سے جو کہ ریا کی شکایت کرتے ہیں اول یہ سوال کرتا ہوں کہ بتلاؤ ریا اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ اگر وہ کہیں اختیاری ہے تو میں کہتا ہوں کہ بس تم اپنے اختیار سے ریا کا قصد نہ کرو۔ اور اگر یہ کہیں کہ غیر اختیاری ہے تو میں کہتا ہوں کہ کیا شریعت نے امر غیر اختیاری سے نہی کو متعلق کیا ہے؟ اب وہ سمجھ جاتے ہیں کہ بلا اختیار جو چیز آتی ہے وہ ریا نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اس سے بے فکر رہو اس کے بعد ان کو حقیقت سے مطلع کرتا ہوں کہ یہ ریا نہیں بلکہ وسوسۂ ریا ہے۔ اگر یہ حقیقت پہلے بتلا دی جائے تو اس قدر نہ ہو تسلی بھی نہ ہو۔

وسوسہ ریا کی عجیب مثال:

جب سوالات وارد کرنے سے وہ خود حقیقت میں غور کرنے لگتے ہیں۔ تب بتلاتا ہوں کہ یہ وسوسہ ریا ہے جو دل کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے گو اندر ہی محسوس ہوتا ہو خدا نے مجھے اس کی بھی ایک نظیر بتلائی ہے وہ یہ کہ جیسے آئینہ کے اوپر مکھی بیٹھی ہو تو وہ دور سے ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اندر ہے ایسے ہی یہاں سمجھو اور اس سے اندیشہ نہ کرو یہ تو ذرا **لاحول** پڑھنے سے بھاگ جائے گا مگر لاحول یہ نہیں ہے کہ **لاحول لاحول** پڑھو بلکہ اس کی **لاحول** یہ ہے کہ اس کی طرف التفات نہ کرو اور **لاحول و لاقوۃ** کی حقیقت بھی یہی عدم التفات ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی میں کچھ طاقت و زور نہیں یعنی خدا کے سوا کسی چیز کا اندیشہ نہ کرنا چاہئے اور سب سے بے التفاتی برتنا چاہئے۔ تم یہ مت سمجھو کہ وسوسہ کے ساتھ تم خود تکلم کر رہے ہو بلکہ دراصل ابلیس تکلم کر رہا ہے تم تو صرف اس کی بات سن رہے ہو اور سماع کفر مضر نہیں ہاں تکلم جرم ہے۔ پس تم پر کوئی جرم عائد نہیں یہ عقلی وجہ ہے عدم التفات کی بلکہ التفات کرنا مضر ہے کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تو اگر ہم اس سے خفا ہو گئے تو حاسد کا مدعی پورا ہو جائے گا وہ اس جھگڑے میں ملاقات کا وقت نکال دے گا بس اس سے بچاؤ کا طریقہ یہ ہے کہ خاموش چلے جاؤ اور اپنے کو باب عالی پر ڈال دو وہاں حاسد کا گزر نہیں۔

شیطان کی مثال:

شیطان کی تار بجلی جیسی ہے کہ اس کو ہاتھ ہی نہ لگاؤ نہ جلب کیلئے نہ دفع کے لئے ورنہ تم کو لپٹ جائے گا بلکہ اس کو منہ بھی نہ لگاؤ اس کی طرف التفات بھی نہ کرو۔ تم نے اس شیطان سے ڈر کر اس کا دماغ بگاڑ دیا ہے اس سے بالکل نہ ڈرو اور اس کو منہ ہی نہ لگاؤ۔ انه ليس له سلطان على الذين آمنو وعلى ربهم يتوكلون انما سلطانه على الذين يتولونه والذين هم به مشركون. جن پر خدا کا بھروسہ ہے جو خدا پر نظر رکھتے ہیں ان پر شیطان کا ذرا بھی قابو نہیں اس کا قابو انہی پر چلتا ہے جو اس سے کچھ واسطہ رکھتے ہیں اس کو منہ لگاتے ہیں ليس له سلطان میں نکرہ تحت النفی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر نظر رکھنے والوں پر اس کا ذرا بھی قابو نہیں تم اس کو منہ لگا کر قبضہ اپنے اوپر بڑھاتے ہو پس ذکر لسانی و ذکر جہر میں وسوسۂ ریا کا اندیشہ نہ کرو اس پر التفات ہی نہ کرو اور اگر شیطان یہ کہے کہ ذکر ریائی بے فائدہ ہے تو کہہ دو کہ تو غلط کہتا ہے یہ بھی ایک واسطہ سے مفید ہے۔ غالباً حضرت حاجی صاحبؒ کی حکایت ہے کہ ان سے ایک شخص نے کہا کہ فلاں شخص ریا سے ذکر کرتا ہے فرمایا تجھ سے اچھا ہے اسی کا یہی ذکر ریائی ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بن کر اسے پل صراط سے پار کردے گا۔ اور تیرے پاس تو ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی نہیں اور وہ واسطہ یہ ہے کہ ریا سے آگے چل کر اخلاص بھی پیدا ہو جاتا ہے اور یہ جواب پوری کامیابی نہ ہونے میں مگر پوری ناکامی بھی نہ ہونے میں ایسا ہے جیسا مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ نے ایک معترض کو جواب دیا تھا۔ اس نے بعض اکابر دین پر جو ایک بڑے کام میں شریک ہوئے تھے مگر ناکام رہے اعتراض کیا تھا کہ ان لوگوں نے خواہ مخواہ اپنے کو تباہ کیا ان کو کیا حاصل ہوا مولانا نے فرمایا۔

سود اقمار عشق شیریں سے کوہ کن | بازی اگرچہ پانہ کا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز۔ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

مگر اتنا کہے دیتا ہوں کہ ان حضرات کو اپنی سعی میں کامیابی کی توقع غالب تھی اس لئے ان کا وہ فعل موجب اجر تھا گو ناکام رہے اور اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہو جیسا کہ اس وقت حالت ہے تو ایسے افعال جائز نہیں نہ ان میں اجر ہے۔ یہ گفتگو اس بات پر طویل ہوگئی کہ حق تعالیٰ نے

اس آیت میں قالوا انا للہ فرمایا ہے اعملوا واعتقدو انہیں فرمایا تو میں نے بتلا دیا کہ قول میں خاص اثر ہے جو مجرد علم میں نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مصائب کے وقت ہم کو اس مضمون کے استحضار و تکرار کی تعلیم دی ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ بتلا رہا ہے کہ وہ ہم کو راحت دینا چاہتے ہیں پریشانی میں رکھنا نہیں چاہتے پس احکام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لئے آسانی چاہتے ہیں اور معاملات سے بھی اور ان کی صفات سے بھی رحمت و شفقت و رافت کا غلبہ ہوتا ہے چنانچہ جابجا ان اللہ غفور رحیم. ان اللہ بکم لرؤف رحیم موجود ہے۔

ہر چہ می گویند آن بہتر ز حسن   یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آن حسن سے بہتر ہے۔ ہمارا محبوب یہ آن بھی رکھتا ہے اور حسن بھی۔

اب تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں ایک مقام پر فرماتے ہیں لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حدیث میں ہے سددوا وقاربوا ا ستقیمو اولن تحصوا ولن یشا دالدین احد الا علیہ او کماقال (الصحیح للبخاری : ۱۶:۱) جو شخص مشقت میں پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ہی بڑھا دیتے ہیں اس کا ترجمہ فارسی میں کسی نے خوب کہا ہے۔

گفت آساں گیر خود کار کز روی طبع   سخت می گیرو جہاں بر مرداں سخت کوش

نفس کے حقوق:

پھر آپ خواہ مخواہ کیوں مشقت میں پڑتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی راتوں کو سوتے نہ تھے اور دن میں کھاتے نہ تھے رات بھر نماز پڑھتے اور دن کو روزہ رکھتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا ان لنفسک علیک حقاً ولعینیک علیک حقا ولا ھلک علیک حقاقم ونم وصم وافطر ھذا من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی (مسند احمد: ۶:۲۶۸) (تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔) رات کو کچھ وقت نماز میں کھڑے رہو کچھ سو رہو دن میں کبھی روزہ رکھو کبھی بے روزہ رہو یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقے سے اعراض کرے وہ مجھ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا اگر مشقت میں ہر حالت میں فضیلت و ثواب ہے تو حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے ان صحابی کو مشقت سے کیوں منع فرمایا ظاہر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو تکثیر عمل سے منع فرمایا یہ غلط ہے بلکہ آپ نے تقلیل عمل سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس تکثیر کا انجام تقلیل ہی ہے۔

تکثیر عمل کا طریقہ:

تکثیر عمل کا طریقہ یہ ہے کہ عمل مواظبت ومداومت کے ساتھ کیا جائے حدیث میں ہے خیر العمل مادیم علیه وان قل (اتحاف السادة المتقین: ۸: ۵۷۰) (بہتر عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جاوے اگرچہ تھوڑا ہو۔ اور اعتدال ہی میں نباہ ہوسکتا ہے اپنے کو مشقت میں ڈال کر ہم نباہ نہیں کر سکتے۔ صاحبو! اگر تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتدال کو نہ سمجھ سکو تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین ہوں ان کے اعتدال کا اتباع کرو۔ ان شاء اللہ سوائے اصل ونقل کے زیادہ فرق نہ ہوگا۔ پس خواہ مخواہ اپنے کو مشقت میں نہ ڈالو کہ ہر مشقت مجاہدہ اور ثواب نہیں۔ میرے ایک دوست کا دعویٰ تھا کہ جس عمل میں مشقت زیادہ ہو اس میں ثواب زیادہ ہے میں نے کہا یہ دعویٰ مطلقاً صحیح نہیں مشقت میں ثواب اس وقت ہے جبکہ مقاصد میں مشقت ہو نہ کہ طریق میں ورنہ تم کو چاہئے کہ وضو کے واسطے تھانہ بھون خانقاہ کے کنویں سے پانی نہ لو بلکہ دو میل جا کر جلال آباد سے پانی لایا کرو اس مثال سے ان کو اپنے دعوے کی غلطی واضح ہوگئی۔ اور مقاصد میں بھی مشقت برداشت کرنا اس وقت موجب اجر ہے جب کہ اس مقصد کا کوئی طریق مشقت کے سوا نہ ہو اور اگر وہ مقصد دوسرے طریق سے بسہولت حاصل ہو سکے تو مشقت برداشت کرنے میں اجر نہیں۔

عبدیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کمال ہے:

دلیل اس کی حدیث عائشہ ہے ماخیر رسول الله صلی الله علیه وسلم بین امرین الا اختار اهونها (سنن ابی داؤد: ۴۷۸۵) (متفق علیه) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں کا اختیار دیا جاتا تو آپ آسان کو اختیار فرماتے تھے اس میں ایک حکمت تو یہ تھی تاکہ ضعفاء امت کا عمل بھی موافق سنت ہو جائے اور وہ آسان صورت کو اختیار کر کے بھی اتباع سنت کا ثواب حاصل کر سکیں اور ایک لطیف حکمت یہ ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جہاں تمام کمالات ہیں وہاں سب سے زیادہ عبدیت کی شان ہے اور یہ آپ کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اور قوی شق کے اختیار کرنے میں گویا قوت کا دعویٰ ہے اور شق اہون کے اختیار کرنے میں عبدیت کا اظہار ہے کہ میں عاجز ہوں۔

حکایت حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندیؒ:

حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندی قدس سرہ کی مجلس میں ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضرات صحابہ کے زمانہ میں چھلنی نہ تھی بس آٹے کو پیس کر یوں یہ پھونک مار دیا کرتے تھے۔ جو بھوسی اڑ گئی اڑ گئی باقی گوندھ لیا اور پکا لیا۔ شیخ نے حدیث سن کر فرمایا کہ آج سے ہماری خانقاہ میں اسی کے موافق عمل ہونا چاہیے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر رات کو سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اب عارفین کی عقل دیکھیے واللہ ان کی عقل بوجہ تعلق مع اللہ کے مطہر بھی ہو جاتی ہے اور معطر بھی اور منور بھی اور کیا کہوں سب قافیے ختم ہو گئے ہاں مدور بھی ہو جاتی کیونکہ مدور کی کوئی نہایت نہیں ہوتی (لتساوی اجزاء ۱۲۵) اگر اس وقت ہم وہاں ہوتے تو معاذ اللہ یوں کہتے اچھا اتباع سنت کیا مگر شیخ نے یوں فرمایا کہ ہم نے بڑی گستاخی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ مساوات کا قصد اور دعویٰ کیا بھائی ہم لوگ ضعیف ہیں ہم ان حضرات کے ساتھ مساوات نہیں کر سکتے بس آج سے چھلنی کا چھنا ہوا آٹا دستور سابق کے موافق پکایا کرو۔ سبحان اللہ کس قدر ادب کی رعایت کی اور کتنی جلدی عبدیت کی طرف مائل ہوئے۔ واللہ عشق نے ان کی عقول کو منور کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عشق سے عقل زائل ہو جاتی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ محبت و عشق ہی سے عقل کامل ہوتی ہے

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
وہ دیوانہ ہے جو دیوانہ نہیں

حضرت خواجہ نقشبند کا یہ واقعہ میں نے ایک مجلس میں بیان کیا تو اس وقت ایک غیر مقلد صاحب بھی تشریف رکھتے تھے وہ خواجہ صاحب کا یہ ارشاد سن کر بولے کہ اتباع سنت سے مساوات لازم آتی ہے تو کیا اتباع سنت ہی چھوڑ دیا جائے۔ میں نے کہا بس خاموش بیٹھے رہو تم بے چھنا ہی آٹا کھایا کرو۔ تم نقشبند کے نکتہ کو کیا سمجھو گے ہاں کوئی نقشبند ہی ہو یعنی کسی کے دل پر نقش لگا ہوا ہو تو وہ ان نکات کو سمجھے گا۔ اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں

نقشبندیہ کو چشتیہ پر فضیلت دے رہا ہوں۔ یہ طریقہ ان لوگوں کا ہے جن کو مقصود کی ہوا نہیں لگی اور جو مقصود کو جانتا ہے اس کے نزدیک سب چشتیہ نقشبندی ہیں اور سب نقشبندیہ چشتی ہیں کیونکہ مقصود سب کا ایک ہے صرف لون اور مذاق کا فرق ہے وہ اس طرح کہ جو مذاق نقشبندیہ کا ہے اس سے چشتیہ بھی خالی نہیں اور جو مذاق چشتیہ کا ہے اس سے نقشبندیہ بھی خالی نہیں ہاں غلبہ وعدم غلبہ کا فرق ہے دیکھئے نواب شیفتہ حالانکہ نقشبندی ہیں مگر ان میں کس قدر سوزش وشورش ہے۔ فرماتے ہیں

تو افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو کہ بینی خندہ برلبہا وآتشپارہ دردلہا

اے افسردہ دل زاہد ذرا بزم رنداں میں جا کر دیکھو کہ ان کے لبوں پر ہنسی ہے مگر ان کے دل بکھرے ٹکڑے ہیں۔

اس میں چشتیہ کا رنگ ظاہر ہو رہا ہے اور ایک شعر انہی کا یہ ہے

چہ خوش ست باتو بزمے نہفتہ ساز کرن درخانہ بند کرن سر شیشہ باز کرن

کیا ہی اچھا ہو کہ محفل میں تنہا ہو، اور گھر کا دروازہ بند شراب کی بوتل کھلی ہوئی ہو یا پاس رکھی ہو۔ اس میں نقشبندیت جھلک رہی ہے اور بعضے چشتی ایسے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل نقشبندی معلوم ہوتے ہیں چھکے پھاکے نہ سوزش نہ شورش ہے نہ حال ہے نہ قال ہے چنانچہ ابھی کچھ دن ہوئے ہمارے ایک دوست آئے تھے ان کی بیٹی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے بیعت ہے اور بڑی صاحب کشف ہے میں نام نہیں بتلاتا مبادا کسی کے دل میں پیغام نکاح دینے کی خواہش پیدا ہو کیونکہ وہ لڑکی ابھی تک ناکتخدا ہے اس کے باپ نے بہت سے واقعات اس کے کشف کے ظاہر کئے منجملہ ان کے ایک یہ واقعہ ظاہر کیا کہ حضرت خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ کے ایک خلیفہ (جن کا نام بتلانا مناسب نہیں) ان کے گھر آئے اور پردہ کی آڑ میں اس لڑکی کو بٹھلا کر اس سے کچھ باتیں کیں آخر تو بچی ہی ہے اس کو کیا سوجھی کہ مراقب ہو کر ان حضرت خلیفہ صاحب کے قلب کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے بعد ہنس کر اپنے والد سے کہا کہ ان کا حضور کامل تو ہے مگر بالکل سادہ ہے کیفیت کا نام نہیں انہوں نے اپنی لڑکی کا مقولہ ان خلیفہ صاحب سے ذکر کیا تو وہ ہنسنے لگے اور کہا واقعی بالکل صحیح کشف ہے مجھ پر کیفیات کا ورود مطلق نہیں ہوتا اور میں نے حضرت شیخ سے بھی یہ بات عرض کی تھی فرمایا کہ تم کو کیفیات سے

مناسبت نہیں اس کے درپے نہ ہو اور صرف حضور کے کامل کرنے میں لگے رہو یہی کافی ہے اور دوست یہاں پر اپنی بیٹی ہی کا حال کہنے آئے تھے کیونکہ اس کو طریق میں کچھ مشکل پیش آگئی تھی بحمد اللہ میں نے اسے حل کر دیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ میں لڑکی کو یہاں لاؤں گا میں نے کہا نہ بھائی یہاں نہ لانا کیونکہ ان صاحب میں حضور تو تھا۔ یہاں تو یہ بھی نہیں بس خواہ مخواہ مجھے اس کے سامنے کیوں فضیحت کرتے ہو واللہ میری یہ حالت ہے۔

طاؤس راہ بنقش و نگاریکہ ہست خلق تحسین کنندہ او تجل از زشت پائے خویش

مور کے بدن پر جو پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں مخلوق اس کی تعریف کرتی ہے اور وہ اپنے بدصورت پیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہے۔

میں اپنی زشتی قدم سے شرمندہ ہوں کیونکہ میرے پاس عمل نہیں اور اس طریق میں قدم یعنی عمل ہی کی ضرورت ہے دم مارنے اور باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دم بے قدم

طریقت میں قدم رکھنا چاہئے یعنی عمل کرنا چاہئے اس لئے کہ بغیر قدم رکھے (عمل کئے) دعوی کی کچھ اصل نہیں۔

تو اس حکایت سے معلوم ہوا ہوگا کہ بعضے چشتی بھی مثل نقشبندیوں کے افسردہ اور پھیکے پھاکے ہوتے ہیں پس نقشبندی اور چشتی کے جھگڑے کو چھوڑ کر یہ سب ایک ہی ہیں ایک مقصود کے طالب ہیں۔ غرض یہ کہہ رہا تھا کہ حضور نے شق اہون کو اظہار عبدیت کے لئے اختیار کیا ہے پس تم اس نیت سے اظہار عبدیت کے لئے شق اہون کو اختیار کیا کرو۔ اب میں چند اور معاملات حق تعالیٰ کے دکھلانا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ راحت چاہتے ہیں پریشانی نہیں چاہتے۔

قلب کو نماز میں پابند کرنے کی کوشش کی ضرورت:

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ہم کو نماز کا حکم دیا ہے اور بظاہر نماز میں بڑی مشقت ہے کیونکہ اس میں پوری پابندی ہے اور قلب کو پابندی ہی گراں ہے کیونکہ اس کی تو شان یہ ہے انھم فی کل واد یھیمون یہ تو یوں چاہتا ہے کہ بھاگا بھاگا پھرے قلب کا نماز میں پابند ہو جا:

بہت دشوار ہے مگر اس کا مطلب نہیں کہ اگر قلب پابند نہ ہوتا تو نماز ہی نہ پڑھو یا وہ نماز بے کار ہے ہرگز نہیں بلکہ پڑھتے رہو اور قلب کو پابند کرنے کی کوشش کرو۔

حکایت حضرت احمد غزالیؒ:

بعض اہل حال نے اس وجہ سے کہ جماعت میں یکسوئی نہیں ہوتی جماعت کی نماز ہی چھوڑ دی تھی یا اس لئے کہ امام کے قلب میں یکسوئی نہیں ہوتی ایسے امام کیساتھ نماز پڑھنا ترک کر دیا تھا مگر یہ غلطی ہے اس کے متعلق ایک حکایت ہے کہ امام غزالی کے بھائی احمد غزالی جو صاحب حال زیادہ تھے اور امام صاحب صاحب علوم زیادہ ہیں جماعت کی نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ تنہا پڑھتے تھے امام صاحب نے والدہ سے شکایت کی کہ احمد میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتا جماعت ترک کرتا ہے والدہ نے ان کو جماعت کی تاکید کی تو وہ نماز میں آئے اس زمانہ میں امام غزالیؒ فقہ کی کوئی کتاب لکھ رہے تھے اور کتاب الحیض تک پہنچے نماز میں ان کو کتاب الحیض کے کسی مسئلہ پر خیال آ گیا اور اس کو سوچتے رہے ان کے بھائی صاحب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور تنہا پڑھکر چلے آئے۔ امام غزالی نے والدہ سے شکایت کی کہ آج تو انہوں نے بہت سخت حرکت کی کہ شرکت کر کے پھر جماعت سے الگ ہو گئے والدہ نے اس کا سبب پوچھا کہا کہ ان سے پوچھئے اگر کسی کا کپڑا خون آلود ہو تو نماز ہو گی یا نہیں۔ کہا نہیں کہا اور دل کا درجہ کپڑے سے زیادہ ہے جب کپڑوں کا خون سے پاک ہونا شرط ہے تو دل کا پاک ہونا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور تم نماز کے اندر حیض کے مسائل سوچ رہے تھے تمہارا دل خون آلودہ تھا اس لئے میں نے علیحدہ نماز پڑھی والدہ نے کہا احمد تمہارا دل بھی اس دھبہ سے محفوظ نہیں رہا تو تم نے ان کے دل پر توجہ ہی کیوں کی تم کو چاہئے تھا کہ اپنے شغل میں لگے رہتے والدہ ان دونوں سے زیادہ عارفہ تھیں کیسا عجیب فیصلہ کیا۔ غرض بعض اہل حال اس مشقت حضور کو دیکھ کر نماز ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ بدون حضور نماز نہیں اور حضور ممکن نہیں مگر سخت یہ غلطی ہے چنانچہ ایسے ہی شخص کا قول ہے۔

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر　　این چنیں تسبیح کے دارد اثر

زباں پر تسبیح، دل میں گاؤ خر ایسی تسبیح کب اثر رکھتی ہے۔

میں نے اس کا رد کیا ہے اور کہا ہے ای چنیں تسبیح ہم دارد اثر ایسی تسبیح اثر رکھتی ہے۔

نماز میں گرانی دور کرنے کا طریق:

بہر حال اس میں شک نہیں کہ نماز کے اندر جو پابندی ہے وہ نفس کو بہت گراں اور قرآن میں اس کی گرانی کو تسلیم کیا گیا ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَة بے شک نماز بہت گراں ہے۔ مگر اب حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ آگے اس گرانی کے زائل کرنے کی بھی تدبیر بتلاتے ہیں اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ یعنی مگر خشوع کرنے والوں پر نماز گراں نہیں ظاہر ہے مقصود استثناء ہے مگر در حقیقت اس میں بتلانا مقصود ہے کہ نماز کی گرانی کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خشوع حاصل کرو۔ خشوع کے معنی عربی میں سکون ہیں اور سکون حرکت کا ضد ہے اور قاعدہ ہے کہ علاج بالضد ہوتا ہے۔ پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ نماز گراں اس لئے تھی کہ قلب متحرک رہنا چاہتا ہے تم اس کو سکون کا عادی کرو تو یہ گرانی باقی نہ رہے گی۔ اس جگہ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آیت کی اس عنوان سے تقریر کرنا ہمارے ذمہ ضروری نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خشوع سے گرانی نہیں رہتی مگر ایسی تقریر کر دینا محض سامعین کی خاطر ہے مگر شاید کوئی اس علاج پر یہ شبہ کرے کہ یہ تدبیر تو صحیح مگر یہ تو ایسی تدبیر ہوئی جیسے کسی نے کہا تھا کہ ایک منٹ میں سات دفعہ سورہ بقرہ پڑھ لو تو سلطنت ہفت اقلیم مل جائے گی۔ یا جیسے گاندھی نے کہا تھا کہ سب ہندوستانی اتفاق کر کے گورنمنٹ سے ترک موالات کر دیں تو سوراج مل جائے گا یہ تو مسلم مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں اتفاق ہو بھی ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں یہاں کی آب و ہوا میں خاصیت یہ ہے کہ یہاں اتفاق ہو نہیں سکتا اور ہو بھی جائے تو رہ نہیں سکتا تو یہ علاج بھی ایسا ہی ہوا کہ قلب کو سکون کا عادی کر لو نماز گراں نہ رہے گی یہ تو مسلم مگر سکون کیونکر حاصل ہو۔

خشوع قلب حاصل کرنے کا طریق:

تو صاحبو! اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر نہیں بتلائی جو حاصل نہ ہو سکے چنانچہ آگے خشوع حاصل کرنے کا بھی طریقہ بتلاتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ کہ خشوع قلب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لقاء رب کا مراقبہ کرو کیونکہ لقاء رب کا مراقبہ قاطع جملہ افکار ہے جس دل میں یہ مراقبہ ہوگا وہاں اور کوئی فکر جم نہیں سکتا پس سکون قلب اور خشوع حاصل ہو جائے اسی کو دوسری آیت میں فرماتے ہیں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کہ

اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے خشوع اور اطمینان اور سکون سب متحد ہیں اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اطمینان ایمان کے علاوہ کوئی شے اور ہے کیونکہ اطمینان خشوع کا مرادف ہے اور بغیر خشوع کے ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت لوگ ایماندار ہیں جن کو خشوع حاصل نہیں تو ایمان بھی بدون اطمینان محقق ہو سکتا ہے۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کا مشاہدہ احیاء موتی کی درخواست کا سبب:

پس حضرت ابراھیمؑ کے قصہ میں جبکہ انہوں نے مشاہدہ احیاء موتی کی درخواست کی تھی اور بَلٰی وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ فرمایا تھا کوئی وہم اشکال نہیں رہا۔ اب یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابراھیمؑ نے اطمینان کی نفی کی ہے تو معاذ اللہ ایمان کی بھی نفی ہو گئی۔ ہرگز نہیں۔ اسی وہم کو رفع کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے حال پر رحم فرمایا کہ حضرت ابراھیمؑ سے خود ہی سوال فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تم کو احیاء موتی پر ایمان نہیں تا کہ وہ یہ جواب دیں وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کہ ایمان کیوں نہ ہوتا لیکن میں اطمینان قلب چاہتا ہوں یہاں بھی اطمینان سے سکون ہی مراد ہے یعنی چونکہ بدوں مشاہدہ کے کیفیت متعین نہیں ہوتی اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ معلوم احیا کی کیا صورت ہو گی اور مشاہدہ سے کیفیت متعین ہو جائے گی۔ تو سکون ہو جائے گا کہ احیا موتی کی یہ صورت ہو گی تو اس سوال و جواب کے بعد کسی کو حضرت ابراھیمؑ کے متعلق کسی قسم کا وہم پیدا نہ ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ اس معاملہ میں طلب اطمینان کی ضرورت ہی کیا تھی عام اجمالی کافی تھا گو ایک کیفیت ذہن میں متعین نہ ہوتی اور اگر اس کی ضرورت تھی تو پھر ہر شخص کو اس کا مشاہدہ کرانا چاہئے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ نہیں ممکن ہے حضرت ابراھیم کو کسی خاص وجہ سے (جس کا ہم کو علم نہیں اس کی ضرورت پیش آئی ہو) مگر تبرعاً بتلا دیتا ہوں کہ اہل سیر نے اس کی یہ وجہ بتلائی ہے کہ جب نمرود سے حضرت ابراھیمؑ کی گفتگو وجود صانع اور توحید صانع کے مسئلہ میں ہوئی حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ کہ میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس پر نمرود نے یہ سوال کیا کہ کیا تم نے احیاء و اماتت کا مشاہدہ کیا ہے حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ مشاہدہ تو نہیں کیا لیکن دلیل سے میں جانتا ہوں کہ احیاء و اماتت خدا ہی کا فعل ہے

اس کے بعد حضرت ابراھیمؑ نے یہ درخواست کی کہ اے رب مجھے احیاء واماتت کا مشاہدہ کرا دے (تا کہ میں جاہلوں کے جواب میں یہ کہہ سکوں کہ ہاں میں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے) تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے نماز کی گرانی زائل کرنے کا کیسا عجیب طریقہ بتلایا اور نماز میں بس خشوع ہی ایک گراں ہے باقی افعال اس کے سب آسان ہیں پھر نماز کے اوقات ایسے ہیں جو عموماً فارغ اوقات میں صبح اٹھتے ہی دنیا کا کوئی کام شروع نہیں ہوتا نہ تجارت نہ زراعت نہ ملازمت۔ اور دوپہر کو عموماً لوگ کھانا کھانے اور اپنے گھر پر آتے ہیں اسی وقت ظہر کی نماز فرض کی گئی اور مغرب کے وقت عموماً سب کاروبار بند ہو جاتا ہے اور عشاء کا وقت تو فارغ ہی ہے البتہ عصر کا وقت عموماً فارغ نہیں اس وقت ایک نماز فرض کر کے محبت کا امتحان کیا گیا ہے کیونکہ بعض اہل ہوس بھی ہیں اور جو اسی وقت تک محبت کا دم بھرتے ہیں جب تک ان کی خواہش کیخلاف کوئی بات نہ ہو۔ جیسے ایک شاعر اپنے محبوب کو دعا دیتا ہے۔

بخت خویش برخوردار باشی بشرط آنکہ بامن یارباشی

اس کا اپنا بخت تابعداری میں ہے بشرطیکہ میرے ساتھ میرا ہمنشیں ہو۔

دعا میں یہ بھی شرط ہے کہ میرے ساتھ دوستی رکھے اور میرا کہنا مانے تو صاحب نصیب ہو ورنہ نہیں تو ایسے بوالہوسوں کو عشاق کی صف سے باہر کرنے کے لیے عصر کے وقت ایک نماز فرض کی گئی تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ کون بوالہوس ہے جو اپنی منفعت کو عبادت محبوب پر مقدم کرتا ہے اور کون عاشق صاحب ہے جو محبوب سے کسی وقت رخ نہیں پھیرتا سچے عاشق کی تو یہ شان ہوتی ہے۔

اسکے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں وہ ہوس ناک ہیں جو روبقضا جاتے ہیں

شاعر نے اس شعر میں ایک دوسرے شاعر کا رد کیا ہے جس نے کہا تھا۔

اسکے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں تا نظر کام کرے روبقضا جاتے ہیں

اس نے اس کا رد کیا کہ اہل وفا محبوب کے کوچہ سے اٹھتے ہی نہیں۔

نماز عصر فرض کرنے میں حکمت:

بہرحال عصر کے وقت ہر شخص مشغول ہوتا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے امتحان محبت کے لئے اس وقت کی نماز فرض کر دی مگر اس کو بھی اس طرح آسان کر دیا کہ حافظو اعلی

الصلوات والصلوۃ الوسطی (السنن الکبری للبیھقی: ۳:۲۸۳) (نمازوں کی حفاظت کرو اور عصر کی نماز کی) فرما کر نماز عصر کی فضیلت ظاہر کر کے ہمت بڑھا دی کہ یہ نماز سب سے افضل ہے۔ (فان خیر الامور اوسطھا) (بہترین کام درمیانی درجہ کا ہے) اس لئے اس کی خاص طور پر محافظت کرو۔ اس ترغیب و تاکید سے مسلمانوں کو عصر کی نماز کا خاص اہتمام ہوگیا اور جس چیز کا خاص طور پر اہتمام ہو جاتا ہے وہ دشوار نہیں رہتی۔ پھر نماز کو اس طرح آسان کیا کہ اگر کھڑے نہ ہوسکو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لو بیٹھ نہ سکو تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھ لو بیماری میں وضو نہ ہو سکے تو تیمم کر لو یا سفر میں پانی نہ ملے تو تیمم کی اجازت ہے۔

شریعت اللہ تعالیٰ کی ہے:

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سفر میں پانی نہ پانے والے کو اس کی اجازت ہے کہ بیوی سے مقاربت کر لے اور غسل کی جگہ تیمم کر لے اگر یہ شریعت خدا کی نہ ہوتی تو حکم یہ ہوتا کہ اس حالت میں مقاربت حرام ہے کیونکہ جب سفر میں پانی نہیں ملتا تو ایسے سخت سفر میں اس مستی کی کیا ضرورت ہے جماع کیا جاوے اپنے ہاتھوں ناپاکی میں مبتلا ہوا جائے۔ اور اگر جماع جائز بھی کیا جاتا تو حکم یہ ہوتا کہ اس کو تیمم جائز نہیں جس طرح ممکن ہو مر بھر کر کہیں سے پانی ہی لا دے تا کہ مستی کی سزا بھگتے اور اگر تیمم بھی جائز ہوتا تو وضو اور غسل کے تیمم میں فرق ہوتا وضو کے تیمم میں ہاتھ منہ کا ملنا کافی ہے تو غسل کے تیمم میں شاید مٹی میں لیٹنے کا حکم ہوتا۔

لیڈران قوم کی احکام شریعت سے بے خبری:

جیسے ایک لیڈر نے جس کو تیمم کا طریقہ معلوم نہ تھا اپنی عقل سے یہ سمجھا کہ جن اعضاء پر وضو میں پانی ڈالا جاتا ہے شاید تیمم میں اس سب پر مٹی ڈالی جاتی ہوگی تو آپ نے اول دونوں ہاتھوں پر اوپر نیچے مٹی ملی پھر منہ میں کلی کیلئے بھی مٹی دی اور ایک دفعہ ان ہی صاحب نے موٹر ٹھہرا کر اسی میں بیٹھے نماز پڑھ لی اور پھر بھی وہ قوم کے پیشوا اور لیڈر رہی رہے ایسے ہی لیڈروں کے متعلق کسی نے کہا ہے۔

اذا کان الغراب دلیل قوم　　　سیھد یھم طریق الھا لکینا

جب کسی قوم کا لیڈر کوا ہوا تو وہ عنقریب انہیں ہلاکت کی راہ پر لے جائے گا۔

اور کہا ہے۔

گربہ میر وسگ وزیر وموش را دیوان کنند ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

اگر بلی سردار، کتا وزیر اور چوہا دیوان ہو تو جب سلطنت کے ارکان ایسے لوگ ہوں تو یہ ملک کو ویران کر دیں گے۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ مولوی خود تو سیاسیات میں پڑیں نہیں اور کام کریں نہیں اور دوسروں کو بھی کرنے نہیں دیتے کہ ان کو برا بھلا کہتے ہیں اس شبہ کا جواب میں نے میرٹھ کے ایک جلسہ وعظ میں دیا تھا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ مسائل سیاسیہ میں یہ لال ٹوپی والے ہمارے امام ہیں کیونکہ واقعی ترکوں کو چندہ بھیجنے کی تدبیر کرنا ہمارا کام نہ تھا ہم تو دعا کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے ان لوگوں نے گورنمنٹ سے اس کی اجازت لی اور وہاں امداد پہنچانے کے وسائل معلوم کیے تو ہم نے بھی چندہ میں شرکت کر لی۔ بس ان مسائل میں ہم ان کو امام تسلیم کرتے ہیں مگر امام کو قرآن صحیح یاد نہیں اس لئے مقتدی کو لقمہ دینا واجب ہے، ورنہ سب کی نماز فاسد ہو جائے گی پس امام کو چاہیئے کہ یا تو نماز سے پہلے وہ ہمارے پاس آ کر قرآن صحیح کر لے ورنہ جب غلطی کرے گا تو ہم نماز ہی میں لقمہ دیں گے اور اس کو غلطی پر ٹوکیں گے۔ یعنی مثلاً اگر تم چندہ بلقان کے لئے تجویز کرو کہ مسلمان قربانی کو ترک کر دیں اور ان کی قیمت چندہ میں دے دیں تو ہم اس کا رد کر دیں گے یا تم زکوٰۃ کا روپیہ بدوں تملیک کے بھیجنے لگے تو اس کی بھی مخالفت کریں گے تم کو چاہیئے کہ ہم سے مل کر کام کرو اور مل کر کام کرنے کے معنی یہ ہیں جیسے بڑھئی اور معمار و لوہار مل کر مکان بناتے ہیں جس کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ سب کے سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں بلکہ ایک لکڑی کا کام کرتا ہے اور ایک لوہے کا اور ایک اینٹ گارے کا اسی طرح یہاں مل کر کام کریں گے یہ معنی نہیں کہ مولوی صاحبان بھی جھنڈا لیکر سیاسیات کے میدان میں کود پڑیں۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ جھنڈا تو لال ٹوپی والے اپنے ہاتھ میں رکھیں مگر جو کام کرنا چاہیں اور جو تجویز کریں اسکو شائع کرنے سے پہلے علماء سے پوچھ لیں کہ یہ شریعت کے خلاف تو نہیں پس آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہم لیڈروں کو کام کرنے سے منع نہیں کرتے ہاں تنہا کام کرنے سے منع کرتے ہیں اگر وہ ہم سے قرآن وحدیث پوچھ کر امامت کریں تو ہم ان کے مقتدی بننے کو تیار ہیں لیکن غلط قرآن پڑھ کر امامت کریں گے تو بے شک نہ ہم ان کی اقتدا کر سکتے ہیں نہ دوسروں کو

اقتدا کرنے دیں گے بلکہ ان کی نماز کے فاسد ہونے کو ظاہر کر دیں گے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ جو کام مولوی کرتے ہیں وہ تم نہیں کر سکتے یعنی احکام کا سمجھنا اور جو کام تم کرتے ہو وہ مولوی بھی کر سکتے ہیں بلکہ تم سے اچھا کر سکتے ہیں چنانچہ جو مولوی جھنڈا لے کر سیاست کے میدان میں کودے ہیں وہ تم سے کچھ کم نہیں رہے بلکہ آگے ہی بڑھ گئے گو انہوں نے اس طرح اپنی علمی شان کو برباد کیا ہے الا ماشاء اللہ یہ شبہ کا جواب تھا میں کہہ رہا تھا کہ لیڈر صاحب اپنی عقل سے غسل جنابت کا تیمم کرتے تو وہ ضرور مٹی میں گدھے کی طرح لیٹتے مگر یہ شریعت خدا کی بنائی ہوئی ہے ہر اس شخص کو بحالت سفر مقاربت کی بھی اجازت ہے کہ پھر غسل و وضو دونوں کا تیمم ایک ہی طرح سے ہے صرف نیت کا فرق ہے۔ اور جس حالت میں ان لیڈر صاحب نے بیٹھ کر نماز پڑھی تھی۔ اس حالت میں قعود جائز نہ تھا کیونکہ وہ قیام پر قادر تھے۔ موٹر سے نکل کر زمین پر قیام کے ساتھ نماز پڑھ سکتے تھے ہاں اگر کسی وقت قیام پر قدرت نہ ہو تو قعود بھی جائز ہے۔

فقہاء اور صوفیاء حکماء امت ہیں:

تو یہ احکام شرعیہ زبان حال سے حق تعالیٰ کی محبت و عنایت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ روزہ میں غور کیجئے کہ کس قدر سہولت کی رعایت ہے اگر کسی شخص نے سفر میں رات کو خوب سیر ہو کر کھانا کھالیا ہو اور دن میں اس کو بھوک پیاس کا اندیشہ نہ ہو مثلاً ریل کا سفر ہو جاڑے کا موسم تو اب سوال ہوگا کہ اس شخص کو افطار جائز ہے یا نہیں شریعت کہتی ہے کہ افطار جائز ہے اس کو حضرات فقہائے نے سمجھا ہے حالانکہ سفر میں جواز افطار کی وجہ مشقت ہے اور اس صورت میں کچھ مشقت نہیں ہے مگر حضرات فقہاء حکماء امت ہیں انہوں نے معیار رخصت کو سمجھا ہے اور وہ یہ کہ اصل مدار تو مشقت ہے مگر شریعت نے نفس سفر کو قائم مقام مشقت کے قرار دے دیا ہے اور فرقہ بھی حکماء امت ہے یعنی صوفیہ مگر باوجود دونوں فرقوں کے حکماء ہونے کے پھر جو یہ دونوں آپس میں لڑتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لڑنے والے دراصل حکماء امت نہیں ہیں بلکہ دونوں ناقص ہیں جو اس شعر کا مصداق ہیں۔

اگر از ہر دو جانب جاہلانند اگر زنجیر باشد بگسلانند

اگر دونوں طرف جاہل ہوں اگر ان کو زنجیر سے باندھ دیا جائے تو گدلا ہو جائیں۔

اور جو ان میں سے حکماء ہیں وہ کبھی نہیں لڑتے۔

حکیم کا معیار:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حکیم کا معیار یہ لکھا ہے کہ صوفی بھی ہو فقیہ بھی ہو محدث بھی ہو اور یہ بھی لڑائی ان لوگوں میں ہوتی ہے جو نرے فقہ یا نرے صوفی ہیں۔ غرض شریعت نے اس صورت میں افطار کو جائز کیا ہے اب اگر یہ کہو کہ اس میں تو بے حیائی سی معلوم ہوتی ہے کہ سب روزہ داروں کے سامنے بیٹھے کھا رہے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو تم خود دیکھ لو باقی شریعت میں تو تمہاری اس بے شرمی کی بھی اجازت ہے کیونکہ بے شرمی کی بھی شریعت میں تفصیل ہے ہر بے شرمی حرام نہیں بس وہی حرام ہے جو واقعی بے شرمی ہو۔ خالی بے شرمی حرام نہیں۔ واللہ آپ نے شریعت کے حسن و جمال کو دیکھا نہیں لوگ اس کی حقیقت سے واقف نہیں اس لئے اس سے وحشت کرتے ہیں ورنہ اسکے حسن کی یہ حالت ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پیشانی سے پیر تک جہاں بھی دیکھتا ہوں کرشمہ اور رعنائی دامن دل کھینچتی ہے کہ سب سے زیادہ پر کشش جگہ یہی ہے۔

اور یہ لوگ شریعت سے تو کیا واقف ہوتے ہیں میں تو یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی حقیقت سے بھی واقف نہیں جو کہ ان کی مطلوب ہے اسی لئے اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔ صرف اوپر سے چادر کی بھڑک دیکھ لی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اس کے اندر حسین صورت ہے اگر نقاب الٹ کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ چڑیل ہے۔

پس قامت خوش کہ زیر چادر باشد چوں باز کنی مادر باشد

بہت سی خوش قد جو چادر میں ہے جب چادر کو ہٹاؤ تو نانی معلوم ہوگی۔

اسلئے شریعت نے جہاں آخرت میں تفکر کا حکم کیا ہے وہیں دنیا کی حالت میں بھی تفکر کا حکم کیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. شریعت دنیا کی طرف سے متوجہ کرنے سے ڈرتی نہیں بلکہ بے دھڑک کہتی ہے کہ تم دنیا کی حالت میں اچھی طرح غور کر لو پھر اس کے مقابلہ میں آخرت کو دیکھ لو تو خود فیصلہ کر دو گے کہ قابل رغبت کون ہے یہ تو عبادات میں شریعت کی تیسیر کا نمونہ تھا۔

احکام معاشرت آسان تر ہیں:

اسکے بعد احکام معاشرت کو دیکھو تو جس چیز کو لوگوں نے سب سے گراں تر کر رکھا ہے وہ شریعت میں سب سے آسان تر ہے یعنی نکاح کیونکہ کھانے میں پینے میں پہننے میں کچھ تو صرف کرنا پڑتا ہے نکاح میں کچھ بھی حرج نہیں گواہ بلافیس مل جاتے ہیں۔ قاضی بلافیس مل جاتا ہے اور جو فیس لے اس سے نہ پڑھواؤ بلکہ خود ہی ایجاب وقبول کرلو۔ رہا مہر سو وہ ایسا ادھار ہے کہ بیچاری عورتیں ساری عمر بھی اس کا نام نہیں لیتیں اور جب میاں مرنے لگا تو اس کی کھٹولی کے پاس جا کر کہہ دیتی ہے کہ میں نے مہر معاف کیا۔ اور رامپور میں تو ایک عورت ایسی غریب تھی کہ اسی کا مرد جب بیوی سے لڑتا یہ کہتا کہ لا میرا مہر وہ غریب ڈر جاتی اور سمجھتی تھی کہ مہر میرے ذمہ ہے وہ ظالم یہ قہر کرتا تھا۔ رہے چھوارے سو وہ محض مستحب ہیں اگر ہوں تو ہم خرما رہم ثواب ورنہ خالص ثواب ہے اسی طرح غمی میں بھی شرعاً کچھ خرچ نہیں لوگوں نے خواہ مخواہ اس میں بھی خرچ خود ہی بڑھا لیا ہے چنانچہ دفن کرنے کی جگہ مہیا کرنے میں تو کچھ خرچ ہی نہیں بلکہ گورا میران میں تو کچھ خرچ ہوتا بھی ہے یا لیکن اکثر جگہ اس کو بھی آپ کے بزرگ ادا کر چکے ہیں کیونکہ آجکل اکثر قبرستان پہلے بزرگوں کے وقف کردہ ہیں اور گور غریباں میں تو کچھ بھی خرچ نہیں ہے قبر کھود دینے والے سو بعضے تو نادار مفلس سے کچھ لیتے ہی نہیں اور اگر لیں بھی تو غریب آدمی کو ان کی ضرورت ہی کیا ہے خود قبر کھود کر مردہ دفن کر دیں یا چندہ جمع کر کے مزدوری دیدیں یہی حال کفن کا ہے اگر وسعت ہو تو کفن خرید کر پہنا دو ورنہ وسعت ہو تو چندہ کا کفن ڈال دو۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معمولی کپڑوں میں جن میں مردہ مرا ہے انہی میں دفن کر دو۔ مجبوری کے وقت اس کی بھی اجازت ہے اور نماز جنازہ میں کچھ خرچ ہے ہی نہیں اور جو امام بدوں روپیہ لئے نماز جنازہ نہ پڑھائے (جیسا بنگال میں بعض لوگوں پر شامت سوار ہے) تو ان سے نماز پڑھوانے کی ضرورت ہی نہیں تو خود ہی چار دفعہ اللہ اکبر کہہ کر نماز پڑھ دو جنازہ کی نماز کی نیت نماز جنازہ اور چار تکبیریں ہی فرض ہیں اور باقی دعائیں سنت ہیں یاد نہ ہو تو کچھ ضرورت نہیں۔

فاتحہ تیجہ چالیسواں کے فضول ہونے کی دلیل:

بس غمی میں نماز دفن کفن یہی چیزیں ضروری ہیں ان میں کچھ بھی خرچ نہیں باقی سب غیر

ضروری ہیں جیسے فاتحہ دلوانا تیجہ دسواں چالیسواں کرنا چنانچہ طاعون وہیضہ کے زمانہ میں یہ سب باتیں حذف ہو جاتی ہیں اور نماز جنازہ وکفن دفن حذف نہیں ہوتا یہ خود اس کی دلیل ہے کہ ضروری ہیں اور وہ فضولیات ہیں میں نے ایک جگہ لوگوں سے طاعون کے بعد یہی سوال کیا تھا کہ تم نے اپنے مردوں کی فاتحہ اور تیجہ (دسواں بھی کیا تھا سب نے کہا جی اس کی کسے فرصت تھی میں نے کہا اور نماز وکفن دفن بھی کیا تھا کہا جی ہاں میں نے کہا کہ تم نے اپنے عمل سے خود جتلا دیا کہ یہ تو ضروری ہیں اور وہ غیر ضروری ہیں سب نے اقرار کیا کہ بات تو یہی ہے عام لوگ سچی بات کو جلدی سمجھ جاتے ہیں چنانچہ ایک گاؤں والے نے مجھ سے فاتحہ کی بابت سوال کیا تو میں نے کہا چوہدری جی تم نے کبھی اللہ کے نام پر کپڑا یا مسجد میں سوختہ بھی دیا ہے کہا جی ہاں دیا ہے میں نے کہا کبھی اس پر بھی فاتحہ دی ہے کہا کبھی نہیں میں نے کہا پھر وہ بدون فاتحہ کیونکر قبول ہو گیا اور کھانا بدوں فاتحہ کے کیوں نہ قبول ہوگا یہ سن کر وہ ہنسا اور کہا او جی بس یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔

شریعت میں مہمانی بھی سستی ہے:

معاشرت میں ایک چیز ضیافت ومہمانی ہے تو شریعت کی مہمانی بھی سستی ہے کہ اگر گھر میں کچھ ہو پکا دو جس حال میں میزبان ہو اسی حال میں مہمان رہے۔ چنانچہ ہمارے مولانا گنگوہیؒ ایک بار مولانا حکیم معین الدین صاحب نانوتویؒ کے مہمان ہوئے حکیم صاحب کے یہاں اس دن فاقہ تھا (اور قرض کرنے کی ضرورت نہ تھی) تو انہوں نے مولانا سے صاف عرض کر دیا کہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے۔ ہاں یہاں بعض لوگ آپ کے معتقد چاہا کرتے ہیں کہ آپ کی دعوت کریں۔ اگر آپ فرمائیں تو ان کو اجازت دے دوں فرمایا میں تو تیرا مہمان ہوں جو تیرا حال ہے وہی میرا حال ہے کسی سے کچھ نہ کہو شام تک سب فاقہ سے رہے شام کو ایک مریض حکیم صاحب کے پاس آیا اور شکرانہ صحت میں غالباً گیارہ روپے دے گیا حکیم صاحب نے مولانا سے عرض کہ حضرت اب خدا نے رزق بھیج دیا ہے اب میں ذرا تکلف کے کھانے پکواؤں گا۔ حضرت نے منع بھی کیا کہ تکلف نہ کرو مگر انہوں نے نہ مانا۔ اور کہا کہ دن بھر فاقہ رہا اب جو خدا نے دیا ہے تو کیا اب بھی عمدہ کھانے نہ کھائیں صاحبو! یہ ہے شریعت کی مہمانی جس میں ذرا بھی بار نہیں ہم لوگ تکلف کرکے پریشان

ہوتے ہیں کہ چند قسم کے کھانے پکاتے ہیں اور اگر گھر میں وسعت نہ ہو تو محلّہ سے مختلف کھانے جمع کرتے ہیں پھر اس کو بلی کے گوہ کی طرح چھپاتے ہیں کہ مہمان کو خبر نہ ہو جائے کہ یہ سالن دوسرے گھر سے منگایا ہے۔ شریعت نے ان تکلفات کو مٹا دیا ہے ہمارے یہاں انسپکٹر مہمان ہوئے مگر بندۂ خدا نے پہلے سے خبر نہ کی کہ میں بے مرچ کھانا کھاتا ہوں جب کھانا سامنے آ گیا تب کہا مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا مگر اتفاق سے ایک عزیز کے یہاں کسی بیمار کیلئے بے مرچا کھانا پکا تھا گھر والوں نے وہاں سے ایک پیالہ سالن منگالیا جب وہ دستر خوان پر آیا میں نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ یہ دوسرے گھر سے منگایا گیا ہے ہمارے یہاں اس وقت انتظام نہ ہو سکتا تھا گھر میں سے کہنے بھی لگیں کہ تم نے یہ بات کیوں ظاہر کی میں نے کہا اور کیوں ظاہر نہ کرتا دوسرے کے احسان کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور یہ قصہ تو مولانا گنگوہی کا تھا جو اوپر مذکور ہوا اس سے عجیب ایک قصہ مولوی محمد صاحب وکیل الٰہ آبادی کا ہے یہ لفظ مولوی ان کے نام کا جزو تھا میرے ایک دوست ان کے یہاں مہمان ہوئے تو وہ کہتے تھے کہ شام کو مغرب کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کے بچے خوشی میں یہ کہتے پھر رہے تھے کہ اہاہا جی ہمارے یہاں شیخ جی آئے یہ مہمان یہ سمجھے کہ شیخ جی کوئی بزرگ ہوں گے اور شاید ان کے واسطے کھانے میں تکلف ہو رہا ہوگا جو کھانا اب تک نہیں آیا مگر جب عشاء کا وقت بھی ہو گیا تو مہمان نے ایک ملازم سے پوچھا کہ بھائی وہ شیخ جی کہاں ہیں۔ جس کی آمد سے بچے خوش ہو رہے تھے وہ ہنسنے لگا اور کہا کہ وکیل صاحب کے گھر والے فاقہ کو شیخ جی کہتے ہیں کہ آج ان کے یہاں فاقہ ہے بچے اس کی خوشیاں منا رہے تھے مہمان کو بڑا تعجب ہوا کہ اس شیخ نے بچوں کو بھی فاقہ سے مانوس کر دیا ہے۔ رات بھر بچے بھی بھوکے رہے اور مہمان بھی۔ اب غور کیجئے کہ شریعت کے موافق مہمان داری کتنی بڑی راحت ہے۔

شریعت کا حکم استیذان بڑی راحت ہے:

معاشرت میں شریعت کی ایک تعلیم یہ ہے کہ استیذان کا حکم دیا ہے کہ بدوں اجازت لئے کسی مکان کے اندر قدم نہ رکھو افسوس یورپ اس سے منتفع ہے اور ہم اس سے محروم ہو رہے ہیں۔ شریعت میں اس کا اس قدر اہتمام ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی

کے یہاں مدینہ سے قبا تشریف لے گئے جو دو تین میل کے فاصلہ پر ہے وہاں پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مکان پر تین دفعہ السلام علیکم ااداخل فرمایا صحابی ہر دفعہ سلام کا جواب آہستہ دیتے رہے زور سے جواب نہ دیا تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سلام فرمائیں اور آپ کی دعا سے برکت حاصل ہو۔ تین بار سلام کر کے بھی جب اندر سے اجازت کا جواب نہ آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ کی طرف لوٹ چلے۔ سبحان اللہ جن کی یہ شان ہو۔

گر بر سر وچشم من نشینی ناز ت بکشم کہ ناز نینی

اگر تو میرے لئے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا ناز اٹھاؤں اس لئے کہ تو نازنین ہے۔

وہ دو میل جیسے ہی آئے تھے ویسے ہی واپس چلیں اور کسی قسم کا ملال وغیرہ کچھ نہ ظاہر کریں یہ ہے مساوات رسول بھی قانون پر عمل کرنے میں اپنے کو سب کے مساوی سمجھتے ہیں۔

مساوات شریعت:

اور مساوات یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ خطبہ کیلئے کھڑے ہوئے اور فرمایا اسمعوا واطیعوا۔ سنو اور اطاعت کرو۔ اسی وقت ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا لانسمع و لا نطیع نہ ہم سنتے ہیں اور نہ ہم اطاعت کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیوں کہا یہ دو چادر جو آپ کے بدن پر ہیں مال غنیمت کی ہیں اور غنیمت میں سے ہر شخص کو ایک چادر ملی ہے آپ کے پاس دو کیوں ہیں کہ ایک کو آپ نے لنگی کی جگہ باندھا ہے ایک کو اوڑھ لیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے بھائی تم نے اپنے امیر کے ساتھ بدگمانی کرنے میں جلدی کی۔ اے عبداللہ بن عمر اپنے بھائی کے سوال کا جواب دو اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ آج امیر المؤمنین کے پاس جمعہ کی نماز کے واسطے کپڑے نہ تھے اس لئے میں نے چادر جو مجھے غنیمت سے ملی تھی امیر المؤمنین کو عاریۃً دے دی ہے۔ اسی طرح ان کے پاس دو کپڑے جمع ہو گئے یہ سن کر وہ شخص رونے لگا اور کہا اما الآن فقل نسمع و نطیع لامیرنا۔ ہاں اب فرمائیں اب ہم اپنے امیر کی اطاعت کریں گے ان کے احکام کو سنیں گے۔ حضرات یہ ہے مساوات جس کی نظیر اسلام کے سوا کہیں نہ ملے گی جس کی حقیقت ہے کہ اتباع قوانین شریعت میں حاکم و محکوم غریب و امیر سب مساوی ہیں مساوات کے یہ معنی نہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کسی کو

یہ حکم دیں کہ تم مصر پر جاؤ اور تم ملک شام پر جاؤ۔ تو وہ جواب میں یہ کہے کہ ہم تم دونوں مساوی ہیں ہم ہی تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم چلے جاؤ۔ جو لوگ آج کل مساوات کے مدعی ہیں ان سے یہی صورت پیش کر کے سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ ایسی مساوات کو جائز کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں پھر وہ کس منہ سے مساوات کے مدعی ہیں اگر تم بلا قید مساوات کے مدعی ہو تو پھر کسی حاکم کی اطاعت کسی محکوم پر لازم نہ ہونا چاہئے اور پارلیمنٹ کو بھی عام رعایا پر حکومت کا حق نہ ہونا چاہئے کیونکہ اگر شخصی حکومت مساوات کے خلاف ہے تو جماعت قلیلہ کا جماعت کثیرہ پر حکومت بھی مساوات کے خلاف ہے آج کل اہل مساوات کی بڑی دوڑ یہاں تک ہے کہ عورتوں کو ہم نے مردوں کے مساوی کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ پھر محکوم کو بھی حاکم کے مساوی کرنا چاہئے حاکم کو کیا حق ہے کہ وہ رعایا پر حکومت کرتا ہے اور باپ بیٹے میں اور شاگرد استاد میں بھی مساوات کرنا چاہئے۔ اور اگر ان میں فرق کرنا مساوات کے خلاف نہیں تو پھر شریعت نے جو مرد و عورت میں فرق کیا ہے وہ مساوات کے خلاف کیوں ہے ہاں کسی ملک کے مرد ہی زنانے ہوں تو ان کو عورتوں کے ساتھ مردوں کی مساوات مبارک ہو۔

اہل یورپ عورتوں کی مساوات سے تنگ ہیں:

صاحبو! اخبار دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اہل یورپ عورتوں کی مساوات سے خود تنگ ہو گئے ہیں وہ تو اب کوشش میں ہیں کہ عورتوں کو پھر اصلی حالت پر لائیں۔ تم خواہ مخواہ ان کی تقلید کر کے یورپین بننا چاہتے ہو وہ تو اب ایشیائی بننے کی فکر کر رہے ہیں۔ بہت اچھا اب تم یہ کرو کہ تم یورپ میں بسو! اور یورپ والے ایشیاء میں آجائیں۔

پرسکون زندگی صرف شریعت پر چلنے سے نصیب ہوگی:

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ کی تقلید ہی سے دنیا مل سکتی ہے یہ خیال بالکل غلط ہے واللہ تم شریعت پر چل کر بھی دنیا حاصل کر سکتے ہو بلکہ خوش گوار دنیا دین کے ساتھ میسر ہوتی ہے اور یہ دنیا دین کے ساتھ مثل سایہ کے ہے پرندہ کو پکڑ لو سایہ اس کے ساتھ ساتھ اور تنہا سایہ کو پکڑنا چاہو تو ممکن نہیں پس مسلمانوں کو تو شریعت سے الگ ہو کر دنیوی ترقی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور یہ نسخہ مجرب ہے حضرات صحابہ اس سے کامیاب ہو چکے ہیں اور ایسے کامیاب

ہوئے ہیں کہ دنیا میں ان کی کامیابی کی نظیر نہیں مل سکتی پھر تم یورپ کی تقلید میں کیوں اپنے کو برباد کرتے ہو تمہاری بالکل یہ حالت ہے۔

یک سبد پرنان ترابرفرق سر — تو ہمی جوئی لب نان دربدر
تابزانوئے میاں قعر آب — وزعطش وزجوع گشتی خراب

ایک ٹوکرا روٹیوں کا تیرے سر پر رکھا ہے اور تو ایک روٹی کے ٹکڑے کے لئے دربدر مارا پھرتا ہے زانو تک پانی میں کھڑا ہے اور بھوک اور پیاس سے خراب ہوتا ہے۔

آپ کے پاس ترقی کے اسباب و ذرائع سب سے زیادہ موجود ہیں مگر اپنے گھر سے بے خبر ہو کر آپ دوسروں کے در پر گداگری کرتے ہیں خلاصہ یہ کہ شریعت کی یسر و سہولت کے یہ چند نمونے ہیں جو اس مختصر جلسہ میں اجمالاً ظاہر کئے گئے ہیں اس سے آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مشقت و پریشانی میں پڑنا مطلقاً مجاہدہ نہیں اور نہ اسی میں مطلقاً ثواب ہے بلکہ شریعت نے ہم کو مشقت و پریشانی سے ہر طرح بچانا چاہا ہے۔ بس مجاہدہ وہ مشقت و پریشانی ہے جس میں ہمارے قصد و اختیار کو دخل نہ ہو۔

اہل سلوک کی چند غلطیاں:

اب میں چند جملے اہل سلوک کے متعلق کہہ کر بیان کو ختم کرتا ہوں کیونکہ اہل سلوک اس غلطی میں زیادہ مبتلا ہیں کہ وہ ہر مشقت و پریشانی کو مجاہدہ سمجھتے ہیں۔ میں ان کو تنبہ کرتا ہوں کہ اعمال ظاہرہ کی طرح اعمال باطنہ میں بھی یسر ہی مطلوب ہے عسر مطلوب نہیں مثلاً ذکر میں نیند غالب ہوگئی تو اول تو توجہ الی الذکر سے اس کو دفع کرو اگر دفع ہوگئی تو سمجھ لو کہ وہ نوم کاذب تھی اور دفع نہ ہو تو پڑ کر سو رہو اور مشقت برداشت کر کے نہ جاگو ورنہ مرض لگ جائے گا۔ حدیث میں حضرت زینبؓ کی رسی کا قصہ موجود ہے کہ انہوں نے اپنی نماز کی جگہ ایک رسی باندھ رکھی تھی کہ جب نیند کا غلبہ ہوتا اس سے سہارا لیتیں تاکہ نیند جاتی رہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کاٹ ڈالا اور فرمایا علیکم من الاعمال ماتطیقون فان اللہ لا یمل حتی تملوا (الصحیح لمسلم، صلوۃ المسافرین: باب: ۳۰) کام اتنا ہی کرو جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ تمہاری عبادت (ثواب دینے) سے نہیں گھبرائیں گے بلکہ تم ہی (مشقت سے) گھبرا جاؤ گے

اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا قصہ بھی موجود ہے کہ وہ راتوں کو نوافل پڑھتے اور دن بھر روزہ رکھتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا قم ونم وصم وافطر ۔ کہ تہجد بھی پڑھو اور سویا بھی کرو اور روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو ایک بات تو اہل سلوک سے یہ کہنی تھی دوسرا مسئلہ یہ بتلانا ہے کہ اگر کوئی مشقت و پریشانی تم کو پیش آئے تو اس کو اپنے لئے عقوبت ہی نہ سمجھو جب کہ قصد کو اس میں دخل نہ ہو بلکہ قصد و اختیار آئی ہو تو یہ خیال نہ کرو کہ ہم سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے اس لئے یہ عقوبت پیش آئی بلکہ اس کو یسر و رحمت سمجھو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کہ مشقت کے ساتھ یسر بھی ہے۔ رہا یہ کہ اس سے مراد عسر غیر اختیاری ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے اوپر جس عسر کا ذکر ہے وہ غیر اختیاری ہی تھا چنانچہ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (۲) الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ میں عسر کا ذکر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ثقل وحی وغیرہ کا تھا وہ غیر اختیاری تھا تو اس عسر کے متعلق ارشاد ہے کہ اس کے ساتھ یسر بھی ہے اور اس میں معیت یسر ظاہر ہے کیونکہ اس سے رفع درجات ترقی اجر ہوتا ہے پس ہر پریشانی اور ضیق و قبض وغیرہ کو عقوبت نہ سمجھو بلکہ اس کو رحمت سمجھو۔

تفویض کی ضرورت:

ہمارے حاجی صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ کبھی لطف بصورت قہر ہوتا ہے اور کبھی قہر بصورت لطف ہوتا ہے۔ اس ارشاد کا حاصل یہی ہے کہ نہ لطف سے بے فکر ہو جاؤ۔ نہ صورت قہر سے مایوس ہو جاؤ بلکہ یہ سمجھے کہ شاید یہ رفع درجات کیلئے آیا ہو اور ساتھ میں توبہ و استغفار بھی کرتا رہے تا کہ اگر بالفرض کسی معصیت کی وجہ سے یہ صورت پیش آئی ہو تو اس کا بھی علاج ہو جائے۔ لیکن عقوبت ہونے کا یقین نہ کرے۔ بعض سالکین جن کو حالات و کیفیات کی طلب ہوتی ہے بعض دفعہ ان کو قبض پیش آتا ہے تو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس ہم مردود ہو گئے یہ سخت غلطی ہے بعض نے اس حالت میں خودکشی تک کر لی ہے سو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ سلب کیفیات کو تم نے کس دلیل سے قہر سمجھ لیا لطف حق عطائے کیفیات ہی میں منحصر نہیں بلکہ بعض دفعہ سلب کیفیات لطف ہوتا ہے تا کہ سالک کا عجب زائل ہو جائے اور بسط سے ناز نہ پیدا ہو بلکہ اس میں پستی پیدا ہو جائے اور پستی وہ چیز ہے

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود   ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود   ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

جس جگہ نیچان ہوتا ہے اسی طرف پانی رواں ہوتا ہے جہاں مشکل پیش آتی ہے جواب وہیں دیا جاتا ہے۔ جہاں مرض ہوتا ہے اسی جگہ دوا کی جاتی ہے۔ جہاں مرض ہوتا ہے وہاں شفا آتی ہے۔ فہم و خاطر کا تیز کرنا راہ سلوک نہیں فضل الٰہی سوائے شکستہ دل کے اور کہیں متوجہ نہیں ہوتا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کے کھیت میں پانی آ رہا تھا اس نے ایک ٹیلہ قائم کر کے پانی روک دیا اور ٹیلہ اس لئے بنایا تا کہ اس پر بیٹھ کر تفریح کیا کرے۔ مگر اس نے یہ نہیں سوچا کہ اس ٹیلہ کی وجہ سے کھیت خشک ہو جائے گا حق تعالیٰ نے قبض طاری کر کے پانی کا رستہ کھول دیا اور اتنا زور کا ریلا آیا کہ ٹیلہ سب بہہ گیا اب یہ شخص تو ٹیلہ بہہ جانے سے روک رہا ہے مگر عارف خوش ہے کہ اب کھیت ہرا بھرا ہو جائے گا اور تھوڑی دیر کے بعد جب اس کو کھیت کا منظر نظر آئے گا تو یہ بھی خوش ہو کر یوں کہے گا:

ناخوش تو خوش بود برجان من   دل فدائے یار دل رنجان من

تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے دل ایسے یار قربان جو دل کو رنجیدہ کرے۔

پس تم اپنی تجویز کو دخل نہ دو بلکہ اپنی ترتیب کو خدا کے سپرد کر و تفویض سے کام لو کہ وہ جس طرح چاہیں تربیت کریں خواہ حالات و کیفیات عطا کر کے یا سب کو سلب کر کے

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تو فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط پر عبادت نہ کر کیونکہ اللہ تعالیٰ بندہ پروری کے طریق خود جانتے ہیں یعنی اتنا ثواب عطاء فرماتے ہیں کہ بندہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

تفویض والا بڑی راحت میں ہے اس کو کسی حال میں پریشانی نہیں۔ اگر کسی وقت اس کو پریشانی بھی پیش آتی ہے تو اس میں راحت ہوتی ہے کیونکہ اس نے اپنے ارادہ کو فنا کر کے خدا تعالیٰ کی رضا میں اپنی رضا کو مدغم کر دیا ہے اب جو خدا کی مرضی ہے وہی اس کی مرضی ہے۔

حکایت حضرت بہلول:

حضرت بہلولؒ نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ نہیں ہوتا جو ہوتا ہے اس کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے پوچھا یہ کیونکر؟ فرمایا تو یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں خدا کے ارادہ کے خلاف کچھ نہیں ہوتا اور میرا وہی ارادہ ہے جو خدا کا ارادہ ہے تو میرے ارادہ کے خلاف بھی کچھ نہیں ہوتا۔ صاحبو! رنج وغم اور پریشانی کی حقیقت یہی ہے کہ خلاف ارادہ خلاف توقع کا ظہور ہو اور صاحب تفویض کا ارادہ وتوقع ہی کچھ نہیں ہوتا اس کا تو مذاق یہ ہے

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست　　کفر ست دریں مذہب خود بینی وخود رائی

اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے۔

اب اسے کاہے کی پریشانی اور کس کا غم۔ غم تو اس سے خود پناہ مانگتا ہے۔

یہ تو ہر حال میں خوش رہتا ہے قبض ہو تو خوش بسط ہو تو خوش اور کچھ بھی نہ ہو تو خوش اس وقت یہ بے دھڑک یوں کہتا ہے

روزہا گر رفت گو روباک نیست　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دوست ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے۔

اس شخص کو پوری راحت حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے تفویض وتقدیر کا مسئلہ اسی لئے تو ہم کو بتلایا ہے کہ پریشانی اور غم سے بچے رہیں۔ ذرا تفویض وتقدیر کے منکر تو کوئی نسخہ اس کے مقابلہ میں لائیں ہرگز نہیں لاسکتے۔ اب یہ دعویٰ ہر طرح ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو راحت میں رکھنا چاہتے ہیں اعمال ظاہرہ میں بھی اور اعمال باطنہ میں بھی۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ تم تفویض و توکل اس نیت سے اختیار نہ کرو کہ راحت حاصل ہوگی کیونکہ اس سے راحت تو بہر حال ہوگی مگر اس نیت سے ثواب باطل ہوجائے گا اور ممکن ہے اس نیت کی نحوست سے راحت بھی کم نصیب ہو۔

نیت رضائے حق:

جیسے کسی شخص نے واعظ سے سنا تھا کہ ایک خرچ کرنے دس سے ملتے ہیں اس نے

ایک روپیہ خیرات کر دیا اور گھر میں بیٹھ گیا جب ایک دن گزر گیا اور دس نہ ملے تو میاں کو دست لگ گئے (یعنی دس مع شی زائد مل گئی کیونکہ دست میں تازیادہ ہے) اس حالت میں ایک دن استنجے کے لئے کسی کھیت میں بیٹھا تھا۔ ڈھیلا جو اٹھایا تو اس کے نیچے ایک بٹوا ملا جس کے اندر دس روپے تھے بڑا خوش ہوا اور واعظ سے کہا کہ واقع تم نے سچ کہا تھا۔ کہ ایک کے دس ملتے ہیں مگر اس کے ساتھ مروڑے بھی بڑے غضب کے لگتے ہیں اب سے وعظ میں یہ بھی کہہ دیا کرو کہ مروڑوں کے بعد دس ملتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ اس شخص کو مروڑے اس واسطے لگے کہ اس نے انفاق حقیقی نہ کیا تھا اس نے دس کی نیت سے انفاق کیا محض رضائے حق کا قصد نہ کیا پس تم تفویض میں نیت نہ کرنا۔ سبحان اللہ اہل اللہ کے مقامات اور مقالات بڑے ہی بلند ہیں کہ بلند پرواز بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملنے گئے جب قریب پہنچے تو ان کو خلوت میں یہ کہتے ہوئے سنا۔ **اللھم انی اسئلک التفویض واعوذبک من لذة التفویض** اے اللہ میں آپ سے مقام تفویض مانگتا ہوں اور لذت تفویض سے پناہ مانگتا ہوں یہ دعا سن کر دوسرے بزرگ حیران ہو گئے کہ اللہ اکبر اس شخص کا کیسا بلند مقام ہے اور یہ عارفین کا مقام ہے باقی ہم لوگوں کو عدم لذت سے رنج ہوتا ہے اس لئے ہم کو لذت کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں لیکن نیت لذت کی نہ کرے۔

خلاصہ وعظ:

خلاصہ بیان کا یہ ہوا کہ جن امور میں تدبیر کا کچھ تعلق و دخل نہیں ان میں تو ابتداہی سے تفویض و تسلیم کرنا چاہئے اور جن تدبیر کو بھی کچھ دخل ہے وہاں تدبیر بھی کی جائے مگر نتائج و ثمرات تدبیر میں تفویض کی جائے یہ تجویز نہ کرے کہ میری تدبیر کا ثمرہ یہ ہونا چاہئے بلکہ خدا کے حوالہ کرے کہ وہ جو چاہیں ثمرہ مرتب کر دیں میں اس پر راضی ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ پریشانی اور غم سے نجات رہے گی اور اس آیت سے جس کو میں نے تلاوت کیا تھا اس مضمون کا تعلق یہ ہے کہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی اس نعمت کو بیان فرمایا ہے جو مراکب کے متعلق ہے کہ ہم نے تمہارے لئے مویشی پیدا کیے تاکہ تم ان پر سواری کرو

اور تا کہ وہ تمہارے بوجھ کو ایسے مقامات تک پہنچائیں جہاں پہنچنا بدوں سواری کے تم کو دشوار تھا۔ تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی راحت و آسانی کے سامان پر امتنان فرمایا ہے جس سے ثابت ہوا کہ راحت و آسانی بھی مطلوب ہے اور یہی اس بیان کا موضوع تھا۔ بس تعلق واضح ہے۔ اور گو یہ وعظ پہلے وعظ کا تتمہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے جس کی وجہ تمہید وعظ میں مذکور ہے مگر میں اس کا نام مستقل ہی رکھتا ہوں چنانچہ اس کا نام التیسیر للتسییر تجویز کرتا ہوں یعنی آسانی کرنا دین ودنیا کے سب کاموں کے چلانے میں۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عملی توفیق نصیب فرمائیں اور تمام پریشانیوں سے نجات دے کر اپنے ساتھ وابستہ کرلیں آمین۔

وصلی اللّٰہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ اٰلہ واصحابہ اجمعین

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.

دفع اشکال:

اور بزرگوں سے جو بعض اختیاری مشقتیں منقول ہیں وہ بطور تقرب وتعبد کے نہیں محض بطور معالجہ کے ہیں جس کی تجویز کے لئے مجتہد کا اجتہاد یا شیخ کی اجازت ضروری ہے۔

القرض

یہ وعظ ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ بمقام جامع مسجد دہلی جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر پھر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا جس کو مولانا سعید احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ. وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ (۱۷) عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ

ترجمہ:۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح (یعنی خلوص کے ساتھ قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جاوے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے اور) بڑا بردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کا جاننے والا (اور) زبردست ہے۔ (اور) حکمت والا ہے۔

تمہید

شریعت میں شک کا منشاء حقائق سے عدم واقفیت ہے:

صاحبو! یہ آیتیں سورۂ تغابن کے خاتمہ کی ہیں اور قبل اس کے کہ ان کے متعلق کچھ بیان کیا جائے اور مقصود کی تعیین کی جائے ان کے متعلق جو قصہ اس وقت پیش آیا ہے اس کو عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ خدائی حکمتوں کی کیا شان ہوتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ میں وطن میں تھا کہ میرے پاس دہلی سے خط گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ آج کل مسلمانوں کو پریشانی

زیادہ ہے اوران کو طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں اوراس کا اثر شدہ شدہ عقائد پر ہوتا ہے اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ یہاں آ کر وعظ کے ذریعہ سے ان شبہات کو دفع کیا جائے یہ الفاظ کا حاصل تھا جو کہ میں سمجھتا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی پستی اور تنگی کی حالت ہے جس سے پریشانی پیدا ہوئی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ ان کو شریعت میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ مگر خوب سمجھ لو کہ ان کو جو یہ شکوک ہوئے اس کا منشا عدم واقفیت علی الحقائق ہے کیونکہ جس کو حقائق پر اطلاع ہو جاتی ہے اس کو کبھی قیامت تک شریعت میں شک نہیں ہو سکتا کلام الٰہی میں جس کسی کو شک ہوا ہے وہ اسی عدم واقفیت حقائق سے پیدا ہوا ہے۔

شوکت اور زور خاصہ کلام الٰہی ہے:

اسی لئے تو بڑے بڑے دعوے کے ساتھ صاف طور پر فرما دیا ذالک الکتب لا ریب فیہ (یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں) حضرات! ایسا پر زور دعویٰ ایسی حالت میں کہ اس کی تکذیب کرنے والے ہزاروں آدمی موجود ہوں کوئی نہیں کر سکتا یہ شوکت اور زور خاصہ کلام الٰہی کا ہے غرض باوجود بہت سے شاکین کے موجود ہونے کے لاریب فیہ فرمانا دلیل ہے اس بات کی کہ یہ شک جو ان لوگوں کو پیدا ہوا بوجہ عدم تدبر کے ہوا ہے تو حقیقت میں یہ شک کلام الٰہی میں نہیں بلکہ خود ان میں شک کا منشاء موجود ہے اس طرح اس وقت اس حالت سے بھی جن لوگوں کو شریعت میں شک پیدا ہوا ہے اس کا منشاء ان لوگوں کی عدم واقفیت علی الحقیقت ہے شریعت بالکل محل شک واقع میں نہیں تو میرے پاس اس مضمون کا خط گیا تھا کہ یہاں آ کر مسلمانوں کے شبہات دفع کئے جائیں جس کے جواب میں میرا ارادہ خط لکھنے کا تھا خود آنے کا ارادہ نہ تھا کیونکہ ایک دو وعظ میں سامعین حقائق سے واقف نہیں بن سکتے اور جب تک یہ واقفیت حاصل نہ ہو شک کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

تمہید وعظ:

اس لئے میں وعظ کے لئے اپنے آنے کو بے سود سمجھتا تھا مگر اتفاق سے ایک مقام سے میرے بلانے کی تحریک پہلے سے ہو رہی تھی جس کا راستہ دہلی ہو کر تھا اس لئے میں دہلی آیا اور یہاں آ کر احباب سے ملاقات کی اور اس خط کا حاصل اور اپنا جواب عرض کیا مگر بعد مشورے

کے یہ بات قرار پائی کہ ایک وعظ دہلی میں بھی ضرور ہونا چاہئے جس سے تمام شکوک کا ازالہ نہ گا تو کم از کم اپنی غلطی پر کسی درجہ میں تو تنبہ ہو جائے گا اس لئے میں نے اپنے سفر کے حساب کو بڑھا کر اس بات کو منظور کر لیا اگرچہ اس صورت میں میرا سابق حساب سفر غلط ہو گیا ہے لیکن اس کا احسان کسی پر نہیں خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ مجھ سے یہ کام لے لیں اور میں نے اس کے متعلق آیات بھی چھانٹ لی تھیں جو ان آیتوں کے علاوہ تھیں جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہیں مگر اس تبدیل کا یہ سبب ہوا کہ جب میں نے وعظ کہنا منظور کر لیا تو احباب نے بطور مشورہ کے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت اگر چندہ کے متعلق بھی کچھ ذکر ہو جائے تو مناسب ہو اس وقت تو میں نے اس مشورہ کو منظور نہ کیا اور یہ کہدیا کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی بلکہ اس موقع پر خالص مقصود مذکور ہی کا وعظ ہونا مناسب ہے لیکن انہوں نے فرمایا کہ ایسے موقعہ پر مسلمان خود منتظر رہتے ہیں کہ کچھ تحریک ہو تو دیں۔ چونکہ میری اس رائے کی وجہ یہ تھی کہ شاید تحریک چندہ سے سامعین پر گرانی ہو تو جب میرا اس طرح اطمینان کر دیا گیا کہ سامعین ایسے مواقع میں اس کے منتظر ہوتے ہیں تو کس قدر اس وقت نرم ہو گا لیکن چونکہ میں اس بات کو عام نہ سمجھتا تھا بلکہ یہ احتمال باقی تھا کہ شاید بعض پر اس کی گرانی ہو اس لئے میرا یہ قصد تھا کہ اس موقع کے بعد الگ کسی وقت تحریک چندہ کی کر دوں گا۔ چنانچہ جمعہ کے روز میں نے اس کا بیان بھی کیا تھا اور اسی روز یہ وعدہ بھی کر لیا تھا کہ انشاء اللہ جلسہ عظیم میں یہ بیان نہ ہو گا اس کے بعد مشورہ ہوا اور تجویز قرار پائی کہ مقصوداً تو مضمون وعظ یعنی ازالہ شبہات کا بیان ہو اور تبعاً چندہ کا بھی ذکر کر دیا جاوے میں اس حالت کو لے کر یہاں سے چلا گیا اور جہاں گیا وہاں اس کے قبل کی آیت کو پڑھا اور تتمیم کلام کے لئے اس کے قبل کی آیات کو بھی پڑھ دیا تھا۔

اشارہ غیبی:

پڑھتے ہی خیال آیا کہ یہ جو تین آیتیں اس وقت خود بخود منجانب اللہ تلاوت ہو گئیں تو عجب نہیں کہ اشارہ غیبی ہو اس بات کی طرف کہ انہیں تین آیتوں کو اس سفر میں بیان کیا جائے تو پہلی آیت اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ الخ (بے شک تمہارا مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہے) سیولی میں بیان ہو گئی اس کے بعد دوسری آیت فیروز آباد میں بیان ہوئی اور وہ وہاں کے

مناسب معلوم ہوئی یہ اخیر کی آیت رہ گئی دہلی کیلئے جس کو میں نے اس وقت تلاوت کیا تھا قصہ ان آیتوں کے اختیار کرنے کے متعلق تو اس اشارہ غیبی کے بعد میں یہ سمجھا کہ شاید میری وہ رائے چندہ کے متعلق بیان نہ ہو مناسب نہ ہوگی گو وہ میری رائے مصالحہ پر مبنی تھی مگر اشارہ غیبی کے سامنے سب مصالح گرد ہیں اسی لئے میں نے چندہ کو جزو مقصود قرار دے کر بیان شروع کیا اور دوسری آیات کو نہیں تلاوت کیا اور اس آیت سے بظاہر پہلے مقصود کا پتہ بھی نہیں معلوم ہوتا چنانچہ ترجمہ آیات سے ظاہر ہے کہ اگر تم حق تعالیٰ کو اچھا قرضہ دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے دو چند کر دیں گے اور تمہاری مغفرت فرمادیں گے اور حق تعالیٰ شانہ، قدردان ہیں صاحب حلم ہیں جاننے والے ہیں پوشیدہ ظاہر کے غالب صاحب حکمت ہیں اس ترجمہ کو سن کر ہی آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ وہ پہلا مقصود یعنی ازالہ شبہات اس میں کہیں مذکور نہیں۔ مگر میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ مقصود بھی انہی آیات سے پیدا ہوگا چاہے دوسرا مضمون غالب ہو مگر وہ اصلی مقصود بالکل غائب بھی نہیں بات یہ ہے کہ قرآن شریف کی ہر آیت جامع ہے اگر ایک مضمون اس میں بعبارت النص مذکور ہوتا ہے تو بہت سے مضامین باشارۃ النص و بدلالۃ النص و باقتضاء النص اس سے نکل آتے ہیں چنانچہ میں اسی سے دونوں مقصودوں کو مرتبط کر کے دکھلا دوں گا۔

بیان کے دو جزو:

پس میرے بیان کے دو جزو ہوں گے ایک تو تحریک قرضہ کی اور دوسرے ان شبہات کا زائل کرنا جو اس وقت مسلمانوں کے قلوب میں اس واقعہ خاص کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں جو کہ بظاہر ان آیات کا مدلول نہیں ہوتا مگر حقیقت میں بعد غور کے معلوم ہو جائیگا کہ اس جگہ وہ بھی موجود ہے۔

مضامین قرآنیہ میں ترتیب مرعی نہیں:

اور راز اس میں (یعنی جامعیت کلام الٰہی میں) یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، کا خطاب اپنے بندوں کے ساتھ ایسا ہے جیسا کہ باپ کا خطاب بیٹے سے ہوا کرتا ہے کہ اس میں مصنفین کی طرح ترتیب مضامین کی رعایت نہیں کی جاتی مصنفین تو پہلے ایک باب کو ذکر کرتے ہیں پھر دوسرے کو چنانچہ کتب فقہ کو دیکھئے تو پہلے کتاب الصلوٰۃ ہے پھر کتاب الزکوٰۃ پھر

کتاب الحج علیٰ ہذالقیاس ہرفن کی کتاب میں اسی طرح ترتیب ابواب وفصول کی رعایت ہوتی ہے آج کل لوگ اسی ترتیب کو قرآن شریف میں تلاش کرتے ہیں اور جب نہیں پاتے تو اسے نظر عظمت سے نہیں دیکھتے یا کم ازکم ان کے دلوں میں سوال ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ مضامین قرآنیہ میں ترتیب مرعی نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ آپ نے کلام اللہ پر نظر صحیح نہیں کی آپ نے یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ کو آپ کی ساتھ ضابطہ کا تعلق ہے جیسا کہ آپ کو خدا سے ہے سو یہ باضابطہ تعلق آپ ہی کو مبارک ہو خدا تعالیٰ آپ سے اس کا انتقام نہیں لیتے آپ ہزار بے تعلق کریں لیکن ادھر سے وہی خصوصیت کا علاقہ ہے تو جب یہ سمجھ میں آ گیا کہ حق تعالیٰ شانہ، کو مخلوق کے ساتھ رحمت خاصہ کا تعلق ہے تو اس کا ثمرہ یہی ہونا چاہئے کہ اس کے خطاب میں ترتیب ابواب کا لحاظ نہ ہو کیونکہ شفقت کا خاصہ یہی ہے کہ جب کوئی مرض دیکھا جائے تو اسی وقت اس کا علاج کیا جائے اور اس مرض کے علاج کی بھی رعایت رکھی جائے جیسے باپ کی حالت ہوتی ہے کہ جب بچہ سے ایک خطا دیکھی اس کی اصلاح کردی اور اسی وقت دوسری خطا کا علم ہو گیا تو اس کی بھی اصلاح کردی مثلاً باپ نے بچہ کو دیکھا کہ وہ کھیل کود میں وقت ضائع کر رہا ہے پڑھتا نہیں اس وقت جوش شفقت سے اس کو بلا کر نصیحت کرنی شروع کی تو اگرچہ اس کو جوش ہوا اس کے نہ پڑھنے سے اور کھیل میں وقت ضائع کرنے سے مگر وہ اس کو اس طرح نصیحت کرتا ہے کہ بیٹا وقت ضائع نہیں کیا کرتے تعلیم میں کوشش کرنی چاہئے۔ اخلاق مہذب کرنے چاہئیں اخلاق رذیلہ سے بچنا چاہئے دیکھو نماز بھی پڑھا کرو تلاوت قرآن بھی کیا کرو علیٰ ہذالقیاس وہ اپنی نصیحت میں صرف اس ایک مرض کا علاج نہیں کرے گا جس پر اس کی شفقت کو جوش پیدا ہوا بلکہ ساتھ میں اس کے دیگر امراض کا بھی علاج کرنا چاہے گا جن کا اس کو علم ہے اور اس خطاب میں ہرگز وہ ترتیب کی رعایت نہیں کر سکتا کیونکہ شفقت اس بات کو چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا مہذب اور تمام عیبوں سے پاک ہو جائے۔ جتنے اس میں عیب ہوں سب پر تنبیہ کردی جائے بیان باقی رہے یا نہ رہے۔

شفیق کے کلام میں ترتیب نہیں ہوتی:

اس سے آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ شفیق کے کلام میں ایک ہی وقت میں مختلف

مضامین ہوا کرتے ہیں تو مصنفین کا کلام تو جامع ہونا ضروری نہیں لیکن شفیق کا کلام ضرور جامع ہوگا چنانچہ قرآن کا یہی طرز ہے کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے ساتھ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ بھی مذکور ہے پھر خشوع کی بھی تعلیم ہے پھر عالم بے عمل پر ملامت بھی ہے پھر نماز کی گرانی دفعہ کرنے کا طریقہ بھی مذکور ہے تو بظاہر یہ سب مضامین الگ الگ ہیں کوئی کتاب الصلوٰۃ کا ہے کوئی کتاب الزکوٰۃ کا کوئی باب الاخلاق کا کوئی باب الرقاق کا مگر چونکہ حق تعالیٰ شانہ شفیق ہیں اس لئے ان کے کلام میں حسب ضرورت مضامین مختلف ضرور ہونے چاہئیں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک حکیم صاحب نسخہ لکھوا رہے تھے کہ اس درمیان میں مریض کو نارنگی کھاتے دیکھا بیچ میں پرہیز کی بھی تعلیم کردی اور دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا پھر نسخہ لکھوانے لگے اب اگر کوئی مریض اعتراض کرے کہ یہ عجیب بے جوڑ کلام ہے کہ ابھی تو گل بنفشہ گاؤزبان بتلا رہے تھے ابھی نارنگی کی مضرتوں کا ذکر ہونے لگا تو اس شخص نے قدر نہیں کی طبیب کی شفقت کی کیا طبیب سے آپ کو اس کا انتظار ہے کہ جب آپ پوچھیں اسی وقت پرہیز بتلا دیں اور نسخہ لکھواتے ہوئے اگر آپ کو زہر کھاتے ہوئے دیکھیں تو بوجہ اس کے کہ ترتیب نسخہ میں خلل آتا ہے بیچ میں منع نہ کریں اگر طبیب سے بھی آپ ایسے ہی برتاؤ کی درخواست کرتے ہیں تو واللہ آپ نے طبیب کی کچھ بھی قدر نہ کی اور یوں کہا جاوے گا کہ آپ کو شفاء مطلوب ہی نہیں بلکہ محض رعایت الفاظ کی مقصود ہے۔ پس غضب ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں اس قسم کے شبہات کئے جاتے ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا برتاؤ ہمارے ساتھ غیروں کا سا ہو۔

قرآن پاک میں باوجود طرز شفقت کے ترتیب:

پس اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کلام میں ترتیب کا ہونا ضروری نہ تھا۔ لیکن حق تعالیٰ کی قدرت ہے کہ باوجود طرز شفقت کے اختیار کرنے کے پھر بھی ترتیب اس کے کلام میں موجود ہے ہم لوگ اس سے عاجز ہیں مخلوق کے کلام میں اگر طرز شفقت ہوگا تو ترتیب نہ ہوگی اور ترتیب ہوگی تو شفقت کا انداز نہ ہوگا بلکہ باضابطہ کلام ہوگا مگر یہ کلام الٰہی ہی کی شان ہے کہ باوجود کامل انداز شفقت کے پھر بھی کلام موتیوں کی لڑی ہے کہ کہیں بے ربط نہیں چنانچہ جو کتابیں وجہ ربط میں تصنیف ہوئی ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہوسکتی

ہے۔اس تقریر سے میرا مقصود یہ ہے کہ بوجہ شفقت کے کلام اللہ میں ہر جگہ جامعیت ہے۔
چنانچہ ان آیات میں بظاہر ان شبہات کا جواب نہیں معلوم ہوتا جن کے ازالہ کا اس وقت قصد
ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت میں ظاہراً قرضہ کی ترغیب دی ہے
لیکن دوسرے جزو سے بھی کلام اللہ خالی نہیں ہے چنانچہ میں ان آیتوں سے دونوں کو بیان
کروں گا اور یہ قدرتی بات ہے کہ آیت میں ان دونوں مقصود کی ترتیب بدل گئی ہے جو چیز
میرے خیال میں مقدم تھی (یعنی جواب شبہات) وہ آیت میں موخر ہے اور تابع ہے
اور جو چیز میرے ذہن میں موخر تھی (یعنی ترغیب چندہ) وہ آیت میں مقدم ہے اور متبوع
ہے مگر قدرت کا مقابلہ کرے کون جب اشارہ غیبی اسی طرح ہے تو سر آنکھوں پر ہے اسی ترتیب
سے دونوں کو بیان کروں گا تو یہ تھا وہ قصہ جو ان آیات کے متعلق من جانب اللہ پیش آیا۔

چندہ مانگنے سے عوام کی گرانی کا سبب:

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ چندہ کے متعلق قصداً بیان کرنے کا خیال نہ تھا
اس لئے امید ہے کہ لوگوں پر گراں بھی نہ ہو گا۔اور اگر اب بھی گرانی ہو تو گویا اشارات غیبی
پر گرانی ہو رہی ہے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ میں قصداً مال کے متعلق بہت کم بیان کرتا ہوں
کیونکہ اس سے سامعین پر گرانی ہوتی ہے لیکن جب حقیقی صاحب مال کی طرف اشارہ ہے
کہ مال کے متعلق بیان کیا جائے تو پھر کیوں نہ ہو یہ ساری گرانی اسی لئے ہوتی ہے کہ ہم اس
کو اپنا مال سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

ہر شئی دراصل ملک خداوندی ہے:

یہ سب ملک خداوندی ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں امانت ہیں جن کی آمد و صرف میں
ہم بالکلیہ مختار نہیں بلکہ مثل امین کے ہیں کہ جہاں سے لینے کا حکم ہو گیا وہاں سے لے سکتے
ہیں اور جہاں صرف کرنے کا حکم ہو گا اسی جگہ صرف کر سکتے ہیں۔ ذرا انصاف کیجئے کہ ایک
شخص کی زمین ہو اسی کے بیل ہوں، اسی کا تخم ہو تو پیداوار کس کی ہو گی ظاہر ہے مالک زمین
کی ہو گی پھر اگر وہ اس میں سے خرچ کرنا چاہیں اور نوکر کا جی دکھے تو یہ حماقت ہی نہیں اگر
نوکر کو گرانی ہو تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا زمین تمہاری ہے یا بیل تمہارے ہیں یا تخم تمہارا

ہے۔ جب کچھ بھی تمہارا نہیں تو مالک کے حکم کے خرچ کرنے میں جان کیوں نکلتی ہے۔ بعینہ یہی مثال ہماری ہے کہ یہ اموال جو ہمارے ہاتھ میں ہیں در حقیقت ہمارے نہیں کیونکہ زمین کو ہم نے نہیں پیدا کیا وہ خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ پانی ہم نے نہیں برسایا خدا ہی کی رحمت سے بارش ہوتی ہے۔ آفتاب ہم نے نہیں بنایا جس کی تپش سے کھیتی پکتی ہے۔ بیل وغیرہ ہمارے پیدا کئے ہوئے نہیں جن سے ہل جوت کر تخم پاشی کرتے ہیں۔ تخم ہمارا پیدا کیا ہوا نہیں پھر پیداوار ہماری کدھر سے ہوگئی وہ بھی خدا ہی کی ملک ہوگی ہم صرف اس کے نوکر ہیں جو اس کے حکم مطابق کے اس میں تصرف کرنے کے مامور ہیں۔ چاندی اور سونا معدن سے نکلتا ہے جس کی تکوین میں ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ شانہ، اپنی قدرت سے معدن میں ان چیزوں کو پیدا فرمادیتے ہیں ہم وہاں تخم پاشی بھی جا کر نہیں کرتے تو وہ بھی خدا کی ملک ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ ہاتھ پیر تو ہمارے جو کام ہم ان سے کرتے ہیں وہ ہماری ملک ہونی چاہئیں تو سمجھو کہ حقیقت میں بھی یہ حق تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اسی طرح وہ قوت جس کے ذریعہ سے آپ کام کرتے ہیں وہ بھی بالکل آپ کے اختیار سے باہر ہے خدا تعالیٰ پر کسی کا زور نہ تھا کہ وہ آپ کو قوت عطا ہی فرماتے ممکن تھا کہ آپ کو اپاہج پیدا کرتے یہ بھی ممکن تھا کہ آپ کو ہاتھ پیر عطا ہی نہ فرماتے لنجا منڈا پیدا کر دیتے تو پھر یہ ہاتھ پیر بھی انہیں کی ملک ہوئے ہمارا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اب آپ سمجھیں گے کہ جو شخص اموال کو اپنی ملک سمجھتا ہے وہ احمق ہے ہمارے اعمال بدنی بھی جیسے کہ نماز روزہ ہماری ملک نہیں کیونکہ یہی بدن کے کھیت کی پیداوار ہیں جب کھیت ہمارا نہیں تو پیداوار ہماری کہاں سے ہو جائے گی۔ آپ ناز کرتے ہیں کہ ہم تجارت کرتے ہیں کھیتی کرتے ہیں اس قدر غلہ ہماری ملک ہے اس قدر روپیہ ہمارا مملوک ہے لیکن یہ دیکھا جائے گا کہ جن چیزوں کے ذریعہ سے یہ حاصل ہوئے ہیں یہ کس کی ملک ہیں تب حقیقت معلوم ہوگی تو حالت یہ ہے۔

تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

(تو نے سب چیزیں عطا فرمائیں اور میری سب چیزیں آپ کی ہیں)

اس لئے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ

شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

ترجمہ یہ ہے کہ جو لوگ ان چیزوں کے ساتھ بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے (محض) اپنے فضل سے ان کو عطا کی ہیں وہ اس بخل کو اپنے لئے اچھا نہ گمان بلکہ یہ ان کے لئے (بہت) برا ہے قیامت کے دن ان کو یہی چیزیں جن کے ساتھ بخل کرتے تھے طوق (گردن) بنادی جائیں گی (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کے لئے ہے آسمان وزمین کی میراث اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں پر خبردار ہے۔ صاف صاف فرمارہے ہیں کہ جو کچھ آسمان زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے۔

اموال اور اعمال کی نسبت ہماری طرف کرنے کا سبب:

اور یہ جو کہیں اموال اور اعمال کی اضافت ہماری طرف کردی گئی ہے یہ صرف ہمارا جی خوش کرنے کے فرمادیا گیا ہے کہ یہ تمہاری چیز ہے۔ نیز انتظام تمدن کے لئے یہ نسبت لگادی گئی ہے کیونکہ اگر نسبت بھی نہ ہوتی تو میری ٹوپی آپکے ہاتھ میں ہوتی اور آپ کا عمامہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو اس صورت میں انتظام کیونکر ہوتا جو چیز آپ کے ہاتھ میں وہ بھی خود خدا کی جو میرے ہاتھ میں وہ بھی خدا کی اور بندے خدا کے سب برابر تو اب انتظام کیسے ہوتا اس لئے حق تعالیٰ نے ایک گونہ نسبت ہمارے ساتھ ان چیزوں کی فرمادی تا کہ نظام عالم درست رہے جب اس نسبت کے ہوتے ہوئے یہ حالت ہے کہ دن رات مقدمات کی عدالتوں میں بھرمار رہتی ہے تو عدم نسبت کی حالت میں تو کیا کچھ نہ ہوتا۔ غرض یہ نسبت محض مجازی ہے جو بمصلحت قائم کی گئی ہے حتی کہ جن چیزوں سے اسباب ظاہری کے اعتبار سے بھی یہ نسبت زائل ہوجاتی ہے وہاں بھی انتظام کیلئے ایک نہ ایک نسبت باقی رہتی ہے۔

اوقاف میں تصرف کے لئے متولی کی اجازت ضروری ہے:

مثلاً اوقاف میں کہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے بھی وہ کسی کی ملک شمار نہیں ہوتے مگر ان میں بھی تصرف کی عام اجازت نہیں بلکہ متولی کی اجازت کی ضرورت ہے تو یہاں ایک نسبت متولی کی طرف رکھی گئی ہے اگر چہ... کانہیں بلکہ منتظمانہ ہے مگر نسبت تو ہے یہاں تک کہ مکان

موقوفہ میں ہر شخص جا کر نہیں رہ سکتا جب تک متولی کی اجازت نہ ہو حتیٰ کہ اگر کوئی محلہ کی مسجد کو از سرنو بنانا چاہے تو بدوں اجازت اہل محلہ کے جائز نہیں یہ نسبت اوقاف میں بھی اسی لئے قائم کی گئی ہے تاکہ تمدن خراب نہ ہو ورنہ مال وقف پر ہمیشہ فوجداریاں ہوا کرتیں۔ وہ کہتا میں رہوں تم کہتے میں رہوں خوب فساد بڑھا کرتا متولی کے مقرر ہونے سے یہ فساد رفع ہو گیا۔

شریعت اللہ کی بڑی رحمت ہے:

اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر شریعت نہ ہوتی تو نری حقیقت ہی ہوتی جیسے کہ آجکل کے صوفی کہتے ہیں کہ شریعت کوئی چیز نہیں بس حقیقت اصل ہے اور یہ لوگ تو نہ حقیقت کو سمجھیں نہ شریعت کو لیکن خیر اگر مان بھی لیا جائے تو شاہ صاحب کی مصیبت آجائے گی کیونکہ۔

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست

حقیقت کی رو سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ہے شاہ صاحب کا کچھ بھی نہیں تو چار ہی روز میں میاں بھوکے ننگے نظر آنے لگتے' ساری حقیقت کھل جاتی یہ شریعت ہی کی بدولت شاہ صاحب بنے پھر رہے ہیں کہیں جبہ ہے کہیں دستار تو کیا غضب ہے جس ہنڈیا سے کھائیں اسی میں چھینک کریں ان کی بعینہ وہ مثال ہے۔

یکے برسر شاخ وبن می برید — خداوند بستاں نگہ کرد و دید

کہ شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور پھر یہ ضد کہ اسی شاخ کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ بھلا اس احمق سے کوئی یہ تو پوچھے کہ جب ڈالا ہی کٹ جائے گا تو یہ کہاں سے بچ جائے گا یہ بھی تو گرے گا، یہی حال ہمارے شاہ صاحبوں کا ہے کہ شریعت ہی کی بدولت تو چین کریں اور پھر اسی کی جڑ کاٹیں یہ نہیں سمجھتے کہ اگر آج شریعت نہ ہو تو ہم بھی نظر نہ آئیں گے اور یہی معنی ہیں۔ مولانا کے اس قول۔

سر پنہاں است اندر زیر و بم — فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

لوگ اس کے معنے جانے کیا سمجھتے ہوں گے بعض تو اس کو ایک شاعرانہ مبالغہ سمجھتے ہیں کہ بھلا ایسی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ اس کے کہنے سے عالم میں آگ لگ جائے ہم تو جس مضمون کو چاہیں بیان کر دیں گے کہیں بھی آگ نہ لگے یہ لوگ مولانا کا مطلب نہیں سمجھے مطلب یہ ہے کہ اگر میں راز توحید کو صاف صاف بیان کر دوں کہ کوئی چیز کسی کی بھی ملک

نہیں سب خدا تعالیٰ ہی کی ملک ہے تو عالم درہم برہم ہو جائے اس لئے راز توحید کو صاف صاف نہیں کہتا۔ شریعت کی آڑ لے کر کہتا ہوں کہ نسبت بھی کوئی چیز ہے اور اس نسبت کو شریعت میں اس درجہ قوت دی گئی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے معاملہ میں بھی اس کو محفوظ رکھا ہے یعنی اس تقریر سابق کا تو خلاصہ صرف اس قدر تھا کہ نظام عالم درست رکھنے کے لئے یہ نسبت مجازیہ قائم کی گئی ہے حقیقت میں سب خدا کی ملک ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کی شفقت عجب شان:

تو اس تقریر کا مقتضا یہ تھا کہ مخلوق کے باہمی تعلقات میں تو وہ نسبت محفوظ رہتی مگر جب خدا سے معاملہ ہوتا تو وہ گم ہو جاتی۔ لیکن کیا ٹھکانا ہے شفقت کا کہ حق تعالیٰ اپنے معاملات میں بھی اس نسبت کو محفوظ رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے تو دیکھئے اپنے کو مشتری قرار دیا اور خریدنے والا ظاہر ہے کہ پہلے سے مالک نہیں ہوتا گویا یوں فرماتے ہیں کہ جان و مال سب تمہارا ہیں ہے مگر ہمارے ہاتھ فروخت کر دو اللہ اکبر آپ نے شفقت خداوندی کو دیکھ لیا ایسی شفقت کسی کو بھی ہو سکتی ہے ہرگز نہیں اس جگہ عارفین نے ایک نکتہ خوب بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو اپنے آپ کو خریدار ٹھہرایا اس کو سن کر عوام تو خوش ہوئے کہ اس جان و مال کے بدلے بڑی دولت ہم کو ملے گی۔

کلام اللہ کا عارفین پر اثر:

مگر اہل تحقیق اس آیت کو سن کر شرمندہ ہو گئے کہ حق تعالیٰ اپنی مملوک جان اور مال کو ہماری جان و مال فرماتے ہیں اس سے شرمندہ اس لئے ہوئے کہ ہم لوگ ان چیزوں کو چونکہ اپنا سمجھتے ہیں حق تعالیٰ نے بھی اسی کے موافق کلام فرمایا اور پردہ پوشی کی ہمارے خیال کی غلطی ظاہر کر کے ہم کو رسوا نہیں فرمایا فضیحت نہیں کیا بلکہ رحمت سے اس خیال کو بظاہر صحیح کر دیا کہ ہاں یہ جان و مال تمہارا ہی ہے ہم اپنا نہیں کہتے مگر تم اس کو جنت کے بدلے ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو عارفین پر یہ اثر ہوا اس آیت کا جس نے مارے شرمندگی کے ان کے سر اوپر نہیں اٹھتے اور اس سے حق تعالیٰ کی محبت و معرفت ان کو اور زیادہ ہو گئی۔

مجازی نسبت میں حکمت:

بہر حال اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس مجازی نسبت میں یہ حکمت ہے ورنہ حقیقت میں سب خدا ہی کی ملک ہے مال بھی اور جان بھی بلکہ جان کے حاصل کرنے میں تو ہمارا کچھ بھی دخل نہیں شاید کوئی نوتعلیم یافتہ فرمائیں کہ ماں باپ کا دخل ہے کہ اگر ان دونوں کا اجتماع نہ ہوتا تو جان کہاں سے آتی مگر عاقل جانتا ہے کہ ماں باپ کا دخل صرف اقتران میں ہے پھر اس کی خلقت بالکل انکے اختیار سے باہر ہے چاہے بچہ پورا ہو یا ادھورا اس میں ان کا کچھ اختیار نہیں۔

ثبوت وجود باری تعالیٰ پر ایک لطیفہ:

مجھے ایک لطیفہ اپنے ماموں صاحب کا یاد آیا کہ وہ ایک مدرسہ میں ملازم تھے وہاں ایک ممتحن لامذہب آیا اور بچوں سے پوچھا کہ خدا تعالیٰ کے وجود کی کیا دلیل ہے ماموں صاحب نے کہا بچوں سے کیا پوچھتے ہو مجھ سے پوچھو اس نے کہا آپ ہی بتلایئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ دلیل یہ ہے کہ تم نہ تھے اور ہو گئے۔ اس نے کہا کہ ہم کو تو ہمارے ماں باپ نے پیدا کیا ہے، انہوں نے کہا کہ اگر سلسلہ ختم نہ ہو تسلسل لازم آئے گا اور وہ محال ہے اور اگر سلسلہ ختم کرو گے تو اس کو کس نے پیدا کیا اس کا تو کچھ جواب اس سے نہ بن پڑا کہنے لگا کہ یہ منطقی دلائل نہیں جانتے موٹی بات یہ ہے کہ ہمارے ایک آنکھ ہے تو اس سے کہو کہ ہماری آنکھ درست کر دے۔ ماموں صاحب بڑے ظریف تھے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ذرا دیر کے بعد کہنے لگے میں نے خدا تعالیٰ سے کہا تھا انہوں نے فرمایا کہ میں نے آنکھ بنا دی تھی اس نے ہمارے وجود کا انکار کیا مجھ کو غصہ آیا میں نے آنکھ پھوڑ دی اب اسی سے کہو کہ اپنے ماں باپ سے بنوالے وہ بہت بگڑا مگر کچھ کر نہیں سکا خیر میں نے یہ قصہ اس تائید میں بیان کیا تھا کہ جان کے بارہ میں کسی کا کوئی دخل نہیں اس لئے جان بھی حق تعالیٰ ہی کی ملک ہے۔

خودکشی کے حرام ہونے کا راز:

اور یہی راز اس کا کہ خودکشی حرام ہے اس لئے کہ جان ہماری ملک نہیں خدا تعالیٰ کی ملک ہے اس میں ناجائز تصرف کا ہم کو اختیار نہیں اسی لئے مال میں بھی ہر قسم کا تصرف جائز

نہیں ہر جگہ صرف کرنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ ہم محض تحویلدار ہیں مالک ومختار نہیں لیکن اتنا فرق ہے کہ دنیا میں اگر کوئی خزانچی ہوتا ہے تو خزانچی کو کم ملتا ہے اور تحویل ساری گورنمنٹ یا مالک کی ہوتی ہے اور یہاں اگر دس لاکھ آپ کی تحویل میں ہیں تو مشکل سے ایک ایک لاکھ کی تقسیم کا حکم فرمایا گیا ہوگا اور نو لاکھ پورے آپ ہی کو دیدیئے کہ اپنے صرف میں لاؤ اسی سے تو دھوکہ ہوا کہ ہم یوں سمجھ بیٹھے کہ یہ ہمارا مال ہے اگر تھوڑا سا آپ کو دیکر سارا لے لیا جاتا تو اس وقت آنکھیں کھلتیں کہ ہم مالک نہیں تحویلدار ہیں اب اس رحمت سے دھوکا میں پڑ گئے اور جو لوگ شریف النفس ہوتے ہیں وہ تو رحمت سے اور پگھل جاتے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے ۔

چو باسفلہ گوئی بلطف و خوشی فزوں گرددش کبر و گردن کشی

(جب کسی بدذات سے بات کرتے ہیں لطف و خوشی سے تو وہ تکبر اور غرور سے کہیں بڑھ جاتا ہے)

فضول خرچی کی عجیب مثال:

تو ہم کو یہ زعم ہو گیا کہ ہماری چیز ہے اور پھر اس کو رنڈی بھڑوں پر افتخار و اشتہار موقع پر خرچ کر دیتے ہیں چنانچہ اسی وقت میں بعض لوگوں نے فضول موقع پر دس دس ہزار روپے دے دیئے اور دینی چندہ کے موقع پر مشکل سے سو دیئے ہوں گے ان لوگوں نے دو غلطیاں کیں ایک تو یہ کہ خرچ کے موقع پر دیتے ہوئے ان کے قلب پر گرانی ہوتی ہے دوسرے فضول موقعوں پر خوب خرچ کرتے ہوئے دل پر ہرگز گرانی نہ ہوئی کہ اس کو اپنا سمجھا ورنہ اگر خدا کا مال سمجھتے تو دینی مواقع میں خرچ کرتے ہوئے دل پر ہرگز گرانی نہ ہوتی کیونکہ جب مالک کا اس جگہ خرچ کرنے کا حکم ہے تو کیونکہ خزانچی کو اپنا دل دکھانے کا کیا حق ہے اور ناجائز موقعوں میں صرف کرنے کی ہرگز ہمت نہ ہوتی کیونکہ خزانچی کو کب جائز ہے کہ بلا اجازت مالک کے اس کی ناراضی کے موقع میں صرف کرے۔ پس نہ تو ہر جگہ خرچ کرنا چاہئے اور نہ موقع پر گرانی ہونی چاہئے۔

لا اسراف فی الخیر کا مفہوم:

ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ جو کچھ آتا خرچ کر ڈالتے تھے ایک دوسرے بزرگ نے ان کو لکھا لا خیر في الاسراف انہوں نے اس کے جواب میں لکھا لا اسراف فی الخیر حاصل یہ ہے کہ موقع دیکھنا چاہئے جہاں سارا مال دینے کا موقع ہو سب دو کہ وہ خیر

ہے جہاں ممانعت ہو وہاں رکو کہ ممانعت کا خلاف خیر نہیں ہے۔غرض ہمارے پاس ایک قانون ہے اس کے موافق کرو اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ سارا مال خرچ کرنے کے بعد دیکھنا چاہئے کہ آپ کہاں سے کھائیں گے اگر صاحب توکل ہے ان کو سب خرچ کردینا جائز ہے اور اگر صاحب توکل نہیں بلکہ سارا مال خرچ کر کے کل کو بھیک مانگنا پڑے گی ایسے شخص کو سارا مال خرچ کرنا جائز نہیں۔

غربا خلوص سے چندہ دیتے ہیں:

اور یہ اسراف کا مسئلہ ہمارے بھائیوں کو دینی خرچ کے موقع پر سوجھتا ہے اپنے اخراجات میں کوئی بات اسراف ہی نہیں سمجھتے کیا یہ اسراف نہیں کہ گاڑھا ایک شخص پہن سکتا ہے اور اس کی اسی قدر حیثیت ہے پھر بھی وہ اچکن پہنے دال گوشت کھانے کی حیثیت ہے مگر کباب اور پلاؤ کے بغیر چین ہی نہیں یہ تو اسراف نہیں اور خدا کے رستہ میں پچاس ہزار میں سے پچاس روپے دینا بھی اسراف ہے لوگ آج کل فضول اخراجات کے لئے قرض اور وہ بھی سودی قرض تک لیتے ہیں یہ تو اسراف میں داخل نہیں اور دینی کام کے لئے موجودہ مال سے بھی کچھ نکالنا اسراف ہو گیا۔ یہ لوگ اول تو دینی کام میں کچھ دیتے ہی نہیں اور جو دیتے بھی ہیں تو محض وضعداری سے خلوص بہت کم ہوتا ہے۔صاحبو! خلوص تو غرباء میں ہوتا ہے۔میرٹھ میں ایک غریب پسناری عورت نے دو دو پیسے کر کے کچھ روپیہ جمع کیا تھا اور اس نے دینی موقع پر دے دیا میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ بھی سب دیدیں۔لیکن ذرا اتنا غور کر لیجئے کہ اگر اس وقت میں آپ کے بیٹے کی شادی پیش آجائے تو آپ کتنا خرچہ کریں گے۔پس اسی سے جواب سمجھ لو کہ اس موقع پر کتنا خرچ کرنا چاہئے۔اگر آپ بیٹے کی شادی میں پانچ سو روپے خرچ کرتے تو اس موقع پر چار سو پچاس ہی دیجئے کیا خدا کا اتنا بھی حق نہیں حالانکہ حقیقت میں سب کچھ اسی کا ہے۔اور صاحبو اگر کسی کو مفت دینا گراں ہو تو اس کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں قرض ہی دیدے۔

چندہ کی گرانی دور کرنے کا طریقہ:

اول تو گرانی اس کو ہوگی جس کو دین سے محبت نہیں محب اسلام کو تو گرانی نہیں ہوسکتی

اوراگر کسی کو ہوتو اس کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے جی کو سمجھا لے کہ میں تو قرض دے رہا ہوں ایسی جگہ جہاں سے وصولیابی کی امید ہے روپیہ جمع کرنے سے قرض چلا دینا بہتر ہے کیونکہ اگر آپ کے پاس رہا سویا تو جمع کرو گے اس میں حفاظت کرنی پڑے گی یا تجارت میں لگاؤ گے سو اگر تجارت میں لگا سکو تو خیر لیکن جو روپیہ جمع ہی کرنا پڑے اس کا قرض دے دینا بہتر ہے کہ آپ حفاظت سے بچ گئے اور اس کے ذمہ روپیہ واجب ہو گیا کہ بروقت ضرورت مل جائے گا بعض بزرگوں کا تو معمول یہ رہا ہے کہ کچھ رقم قرض دینے کیلئے الگ کر لیتے تھے یعنی صدقہ وخیرات تو کرتے ہی تھے۔

قرض کی فضیلت:

قرض دینے کی فضیلت سن کر ایک رقم قرضہ علیحدہ کر دیتے تھے کیونکہ قرض دینے کی فضیلت صدقہ سے زیادہ ہے ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ قرض میں ایک کے عوض اٹھارہ ملیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ سے پوچھا کہ اے جبریلؑ یہ کیا بات ہے کہ قرضہ کا ثواب صدقہ سے زیادہ کیا اچھا جواب دیا کہ صدقہ تو وہ شخص بھی لے لیتا ہے جس کو ضرورت نہ ہو اور قرض وہی لیتا ہے جس کی جان پر آبنی ہو تو ایسے شخص کی امداد زیادہ فضیلت ہے صاحبو! اس وقت نہ معلوم کتنے اللہ کے بندے ہوں گے جن کی جان پر بن رہی ہے مگر ہمیں کیا ہم تو آرام سے دونوں وقت کی کھاتے پیتے ہیں اور رات کو سورہتے ہیں

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ٭ حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسرخورند

(اے وہ شخص جس کے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ان شیروں کا حال کیا جان سکتا ہے جو کہ اپنے سروں پر مصیبت کی تلوار کے زخم پر زخم کھائے جاتے ہیں)

مصیبت زدہ کی تکلیف کا اندازہ ناز پروردہ کیسے کر سکتا ہے تو ایسے لوگوں کو اول تو مفت امداد دینی چاہئے اور اگر کسی پر یہ گراں ہو تو میں سہل طریقہ بتلاتا ہوں کہ قرض ہی سے ان کی امداد کرو۔

قرضہ اصطلاحی:

اگرچہ اس آیت میں اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا سے یہ قرضہ اصطلاحی مراد نہیں

بلکہ مراد اس سے صدقہ خیرات ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے بندوں کو بالکل مالک بنا دیا جائے واپس نہ لیا جائے لیکن اگر کسی کو اتنی ہمت نہ ہو تو قرضہ اصطلاحی ہی دے دو اور بطور عموم مجاز اس کو بھی اس میں داخل کیا جاسکتا ہے کیونکہ اصلی مقصود تو انفاق ہے تو قرض سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مراد لیا جائے خواہ بطریقہ تملیک ہو یا بطور قرض ہو تو قرضہ کی فضیلت کا راز آپ کو اس حدیث ابن ماجہ سے معلوم ہو گیا ہو گا اور اٹھارہ کے عدد کی تعیین کا راز بھی میں جمعہ کو بیان کر چکا تھا اب پھر بتلاتا ہوں کہ یہ عدد بظاہر تعجب انگیز ہے کہ نہ دس نہ بیس برابر صدقہ کے ہوتا تو دس ہونا چاہئے تھا دو گنا ہوتا تو بیس کا عدد ہونا چاہئے تھا تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اصل عدد تو بیس ہوتا ہے کیونکہ قرض والا بہت ہی حاجت مند ہوتا ہے ایسے شخص کی امداد صدقہ لینے والے سے مضاعف فضیلت رکھتی ہے مگر چونکہ وہ روپیہ پھر لوٹ آوے گا اس لئے دو عدد کہ روپیہ کا مضاعف ہے ثواب سے کم ہو گئے باقی اللہ جانے تو قرضہ کی رغبت تو آپ کو زیادہ ہونی چاہئے کیونکہ اول تو اس میں ثواب اور فضیلت زیادہ ہے دوسرے وہ مال لوٹ آئے گا تو دنیا بھی لیجئے اور آخرت بھی لیجئے ایسی تجارت ہے کہ سرمایہ بھی بعینہ لوٹ آیا اور نفع بھی زیادہ سے زیادہ مل گیا کیا ٹھکانا ہے کہ ثواب بھی رہا اور وہ قرضہ بھی آ گیا اور لوٹ کر آوے گا بھی اس طرح کہ اس کا نفع آخرت میں المضاعف فرماویں گے اور گناہ معاف فرماویں گے۔ حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت بہت عجیب ہے۔ دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ جس سے رنجش ہوتی ہے اس سے معاملہ نہیں کیا کرتے بلکہ ایسے شخص سے معاملہ کرتے ہیں جو نافرمان آپ کا نہ ہو حق تعالیٰ شانہ، گناہ گاروں نافرمانوں سے بھی معاملہ فرماتے ہیں چنانچہ اس آیت میں ارشاد ہے کہ اگر تم اللہ کو قرض حسن دو گے تو اس کو المضاعف کر دیں گے اور تمہارے گناہ معاف کر دیں گے تو خطاب گنہگاروں ہی کو تو ہے۔

خوب کہا ہے ؎ کہ مستحق کرامت گنہگار انند

اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دنیا میں تو اگر کوئی خطا کر کے معافی چاہتا ہے تو صرف خطا معاف کر دیتے ہیں انعام و اکرام کوئی نہیں دیا کرتا بلکہ معاف کر دینے ہی کو بہت بڑا انعام سمجھتے ہیں حق تعالیٰ شانہ، صدقہ و توبہ کے بعد گنہگاروں کے گناہ بھی معاف فرما دیتے ہیں اور انعام بھی دیتے ہیں یعنی ثواب چنانچہ جا بجا غفور کے ساتھ رحیم بھی وارد ہوا ہے۔ اس

سے خدا کی رحمت تو دیکھئے اور ثواب بھی کس قدر یہ نہیں کہ جتنا خرچ کیا تھا اسی کے برابر بلکہ بڑھا کر دیتے ہیں رہی یہ بات کتنا بڑھا کر دیں گے تو یضاعف سے شاید آپ نے دونا سمجھا ہو گا یہ نہیں بلکہ مضاعف کے معنی مطلق بڑھانے کے ہیں خواہ دونا ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ سے دونے سے زیادہ کو بھی یہ لفظ شامل ہے۔

راہ خدا میں خرچ کی مثال:

کیونکہ دوسری آیت میں اس کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

ترجمہ:۔ جو لوگ اللہ کے رستے میں مال خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی ایسی مثال ہے جیسی ایک دانہ سے سات خوشہ پیدا ہوں اور ہر خوشہ میں سو سو دانہ ہوں تو اس آیت سے معلوم ہو گا کہ ایک چیز دینے سے سات سو حصے اس کے آخرت میں ملیں گے اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں حدیث میں اسکی زیادہ توضیح ہے کہ اگر ایک چھوارہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو حق تعالیٰ شانہ، اس کی پرورش فرماتے ہیں اور بڑھاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ احد پہاڑی کے برابر کر کے اس شخص کو دیں گے اس حدیث کو ہم لوگ پڑھتے ہیں مگر غور نہیں کرتے غور کر کے دیکھئے اگر احد پہاڑ کے تم ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگو چھوارہ کے برابر تو وہ ٹکڑے کس قدر ہوں گے اور خصوصاً اگر ٹکڑے چھوارہ کی جسامت کے برابر نہ کئے جاویں بلکہ چھوارہ کے وزن کے برابر لئے جاویں تو احد پہاڑ چونکہ پتھر ہے اس کا ذرا سا ٹکڑا وزن میں چھوارہ کے برابر ہو جائے گا تو اس صورت میں تو اور بھی زیادہ ٹکڑے ہوں گے۔ تو اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تضاعف سات یا سات کے مضاعف تک محدود نہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اکثر ایسے موقع میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مثال سے سمجھ لو اور حقیقت میں وہ ثواب اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے تو احد ٹکڑوں کے ساتھ بھی ثواب محدود نہیں تو دیکھئے یہ حساب کہاں تک پہنچتا ہے اسی کو فرماتے ہیں مولانا

خودکہ یابد ایں چنیں بازار را
کہ بیک گل میخری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
انچہ دروہمت نیا ید آں دہد

(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے چمن ہی کو خرید لو۔ حقیر اور فانی مال لیتے ہیں اور جان باقی عطا کرتے ہیں جو تمہارے وہم گمان میں بھی نہیں آیا وہ عطا کرتے ہیں)

حضرت یہ تو مال بھی اور جان بھی سب انہی کی ہے وہ مفت مانگیں تب بھی سب قربان کر دینا چاہئے تھا چہ جائیکہ اس قدر ثواب کا وعدہ بھی ہے

ہم چوں اسماعیل پیشش سر بنہ
شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

ہر کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست
نائب ست و دست او دست خداست

(حضرت اسماعیلؑ کے مانند اپنے سر جھکا دو۔ اس کی تلوار کے سامنے ہنسی خوشی جان دے دو جو جان بخشتا ہے اگر وہ قتل کرے جائز ہے، وہ نائب ہے اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے)

جب نائب کا یہ حق ہے تو اصل کا کیا کچھ ہو گا تو حضرت ہم چیز ہی کیا ہیں ہمارا مال ہی کیا ہے وہ اس کو قبول ہی فرمالیں تو بڑی عنایت ہے اس لئے ہمت کر کے بخوشی اللہ کے رستہ میں دینا چاہئے۔ اور اگر آج دریغ کرو گے تو قطع نظر اس کے باز پرس ہو گی۔

مرنے کے بعد راہ خداوندی میں خرچ شدہ مال کام آئیگا:

آپ سے یہ مال چھوٹنے والا ہے آپ مر جائیں گے دوسروں کے کام آئے گا۔ حق تعالیٰ تمہارے نفع کی تدبیر بتلا رہے ہیں کہ موت کے بعد بھی یہ مال تمہارے ہی پاس رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے خطاب کر کے فرمایا کہ وہ کون شخص ہے جس کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا تو ہم میں کوئی بھی نہ ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مال کو جمع کرتا ہے اور اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ مال اس سے چھوٹ جاتا ہے اور اس کے وارث کو ملتا ہے اس شخص کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہے (اگر اس کو اپنا مال پیارا ہوتا تو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا کہ بعد الموت اس کا ثواب اس کو ملتا) صاحبو! میرا مطلب یہ نہیں کہ سارا ہی مال خرچ کر دو اور ورثہ کے لئے کچھ بھی نہ

چھوڑو کہ وہ بعد تمہارے ننگے بھوکے رہیں اس کی بھی حدیث میں ممانعت آئی ہے بلکہ مقصود کہنے سے یہ ہے کہ اس معیار کو پیش نظر رکھو کہ اگر اس وقت آپ کے بیٹے کی شادی ہونے لگے تو آپ کتنا خرچ کریں اور خدا کے کام میں تو اس سے زیادہ خرچ کرنا چاہئے اور کم از کم اتنا تو ضرور خرچ کرنا چاہئے اب میں مضمون کو طول دینا نہیں چاہتا دوسرے مضمون کو شروع کرتا ہوں اور اس میں اختصار یا تطویل خدا کے قبضہ میں ہے ممکن ہے کہ جلدی ختم ہو جائے۔

اب میں اس مضمون کو کھڑے ہو کر بیان کروں گا حق جل وعلا شانہ، نے اس مضمون ترغیب قرضہ کے بعد اس مقام پر اپنی چند صفتیں بیان فرمائی ہیں ان سے وہ مضمون رفع شبہات کا نکلتا ہے جس کو میں اب بیان کروں گا اور آیات کے اخیر میں جو حق تعالیٰ کی صفات مذکور ہوتی ہے ہیں کہ یہ تمام مضمون سابق کا نچوڑ ہوتا ہے اور وہ ماقبل کے ساتھ اس طرح مرتبط ہوتے ہیں کہ مضمون سابق کی علت کی طرح ہوتے ہیں۔ نیز مضمون سابق میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب ان صفات سے ہو جاتا ہے۔

شکور حلیم کا مفہوم:

تو ارشاد فرماتے ہیں **واللہ شکور حلیم** اگر تم حق تعالیٰ کو قرض حسن دو گے تو تمہاری مغفرت کر دیں گے اور اس کو المضاعف کر دیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ قدر داں ہیں (قدر دانی تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا قدر دانی ہو گی اس کی تفصیل ابھی بیان ہو چکی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں حلیم کہ وہ بردبار ہستی ہیں یہ صفت اس لئے بیان فرمائی کہ طاعت میں جو کوتاہی ہو جاتی ہے اس پر نظر نہیں فرماتے بوجہ حلیم ہونے کے دوسرے یہ کہ بعض لوگ ایسے بھی تو ہیں جو طاعت کرتے ہی نہیں بلکہ معاصی میں مبتلا ہیں تو اہل طاعت کی قدر فرماتے ہیں اور اہل معاصی سے حلم اور بردباری فرماتے ہیں کہ ان کو جلدی سزا نہیں ملتی تو حلیم بڑھا کر اہل معاصی کو متنبہ کر دیا کہ سزا نہ ملنے سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ مستحق سزا نہیں بوجہ حلم کے ان کو جلدی سزا نہیں ملتی پھر کسی وقت یعنی آخرت میں سزا دیں گے اور کبھی تھوڑی سی سزا دنیا میں بھی دیدیتے ہیں۔ اور ایک نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے بہت عجیب بات ہے وہ یہ کہ شکور حلیم کو طاعت ومعاصی دونوں کے اعتبار سے نہ مانا جائے بلکہ صرف ایک ہی امر کے متعلق مانا جائے یعنی

طاعت ہی کے متعلق دونوں صفتوں کو قرار دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، تمہاری اطاعت کو بوجہ قدر دانی اور حلم کے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہماری طاعت کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ وہ ہماری طاعت ہے اور ناقص ہیں تو اس لحاظ سے اس کو گستاخی کہا جائے تو عجب نہیں

ہماری اطاعت کی عجیب مثال:

میں اس کو ایک مثال سے عرض کرتا ہوں آپ کو بعض نوکر ایسے نالائق ملے ہوں گے کہ وہ موافق آپ کی طبعیت کے کام نہیں کرتے ہوں گے اس لئے کہ ان کو سلیقہ اور تمیز نہیں اگر پنکھا جھلتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سر میں ماردے گا، ہر دفعہ آپ اپنے سر کو بچاتے ہیں تو اب دو موقعے پیش آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ اس کو ڈانٹ دیں اس وقت تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میری خدمت سے راحت نہیں پہنچی بلکہ تکلیف ہوئی ایک موقع یہ ہے کہ آپ اپنے حلم سے خاموش رہیں اس وقت وہ سمجھتا ہے کہ میں نے میاں کو ایک گھنٹہ کھڑے ہو کر پنکھا جھلا تو میں مستحق جزا و انعام کا ہوں حالانکہ یہ نہیں سمجھتا ہے کہ اس گھنٹہ بھر تک میاں کو ستایا ہے اس سے تو خالی ہی بیٹھا رہتا تو اچھا تھا اس کی خدمت گستاخی کا حکم رکھتی تھی ایسی ہی ہماری عبادت ہے کہ وہ مواقع میں عبادت اور طاعت کہنے کے لائق نہیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ

اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ. (یہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیں گے) کی عجیب تاویل فرماتے تھے جس سے میری اس تقریر کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے تھے کہ اس آیت میں سیئات سے ہماری طاعت مراد ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ، اپنی رحمت سے ان طاعاتِ کو جو کہ درحقیقت سیئات ہیں طاعات سے بدلیں گے تو نامہ اعمال میں چاہئے تو یہ تھا کہ جب ہم نماز پڑھیں ایک گناہ لکھا جاتا مگر رحمت خداوندی سے نماز ہی لکھدی جاوے گی اور بوجہ حلم کے ان کوتاہیوں پر نظر نہ ہوگی ہماری طاعت کی تو یہ حالت ہے۔

سجہ برکف توبہ برلب دل پراز ذوق گناہ   معصیت راخندہ می آید براستغفار ما

تو ایسی نماز پر ثواب تو ثواب اگر مواخذہ نہ ہو اور جان بچ جائے تو بسا ئے غنیمت ہے۔

طاعتم گرسبب وموجب غفران نہ شود   راضیم گر مددے علّت عصیاں نہ شود

(میری اطاعت اگر بخشش کا سبب اور موجب نہ بنیں تو میں اس پر راضی ہوں کہ میرے گناہوں کی علت نہ بن جائے)

اور یہ مذاق کچھ متقدمین صوفیہ کا تراشا ہوا نہیں سلف کا بھی یہ مذاق تھا، احادیث سے صحابہ کے مذاق کا جو پتہ چلتا ہے وہ اسی کے موافق ہے صحاح میں روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ کی گفتگو ہوئی تھی ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ اور گفتگو یہ تھی کہ آپس میں ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ ہم نے جو اعمال کئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور آپ کے بعد ان کی بابت کیا خیال ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہماری تمنا تو یہ ہے کہ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا ہے وہ تو مقبول ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو کچھ کیا ہے اس پر مواخذہ نہ ہو تو بساغنیمت ہے انہیں حضرات کی شان میں یہ آیت ہے وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ یعنی وہ ایسے لوگ ہیں کہ دیتے ہیں جو اموال دیتے ہیں یا وہ جن اعمال کو وجود دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل خدا کے پاس جانے کے خیال سے خائف ہوتے ہیں

تو وہ خوف کس بات کا ہوتا ہے۔ اسی کا تو کہ کہیں کوتاہی اعمال پر سوال نہ ہونے لگے کبھی بجائے ثواب کے پکڑ نہ ہونے لگے۔

حکایت حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ:

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ شیخ سعدیؒ نے گلستان میں لکھا ہے کہ حرم میں حق تعالیٰ اس طرح عرض کر رہے تھے۔

من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر   قلم عفو برگنا ہم کش

(میں نہیں کہتا کہ میری نیکی قبول فرمالے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرے گناہوں پر معافی کا قلم پھیرو۔)

تو ہماری طاعت کا تو پوچھنا ہی کیا حق تعالیٰ شانہ، کی عظمت کے سامنے تو کاملین کی طاعت بھی ہیچ میں ہیں کوئی ان کی عظمت کے لائق کیا طاعت کر سکتا ہے تو ہماری طاعات میں دو پہلو ہوئے۔ ایک یہ کہ ہم نے اپنی استطاعت کے موافق کیا دوسری یہ کہ عظمت الٰہی کے موافق نہیں کیا تو باعتبار اول فرماتے ہیں شکور کہ ہم قدردان ہیں اس طاعت کو بھی جو کہ تم نے اپنی ہمت کے موافق کی ہے قبول کر لیں گے اور بثانی اعتبار سے فرماتے ہیں

حلیم کہ گو ہماری عظمت کے لائق یہ طاعت نہیں مگر طاعت کی نقل تو ہے اور نقل کا حکم بھی
اصل کا سا ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی مٹی کا خربوزہ بنا کر لائے اور اس کو انعام مل جائے تو حالانکہ
وہ خربوزہ واقع میں نہیں مگر اس کی نقل تو ہے اچھی چیز کی نقل پر بھی انعام دیدیا جاتا ہے مگر اس
سے غرور نہ کرنا چاہئے یہ سمجھتے رہنا چاہئے کہ نقل ہے۔

حکایت حضرت اورنگزیب عالمگیر اور بہروپیہ:

اس نقل پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ جب عالمگیر تخت نشین ہوئے تو ایک بہروپیہ آیا
جیسا کہ دستور ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خوشی کے وقت انعام کے امیدوار ہوا کرتے تھے عالمگیر متقی
شخص تھے ان خرافات کی ان کے دل میں قدر نہ تھی ایسے دینے کو اسراف سمجھتے تھے اس لئے
ایک لطافت کے ساتھ دفع الوقتی کی کہ اپنا کمال دکھلا کر مستحق انعام ہو سکتے ہو تمہارا کمال یہ ہے
کہ ہم تم کو نہ پہچان سکیں وہ مختلف اشکال آیا اور پہچانا گیا اتفاق سے عالمگیر کو سفر دکن کا پیش آیا
اس بہروپیہ کو اطلاع ہو گئی وہ پہلے سے آگے جا کر ایک گاؤں میں صوفی بن کر بیٹھ گیا عالمگیر
فقراء کی بہت تعظیم کرتے تھے راستہ میں جہاں کسی بزرگ کا نام سنتے ان کی زیارت کرتے اور
نذر پیش کرتے اس گاؤں پر بھی گزر رہوا۔ (یہ حکایت کتابی نہیں سنی ہوئی ہے) معلوم ہوتا ہے
کہ یہاں بھی ایک بزرگ رہتے ہیں تو اول وزیر کو بھیجا کہ ان بزرگ کو دیکھ کر آؤ کہ کیسے ہیں
اس کو بھی دھوکہ ہوا کہ اس نے کہا واقعی بہت بڑے صوفی ہیں اس کے بعد عالمگیر خود گئے ان کو
بھی بہت اثر معلوم ہوا اور آبدیدہ ہو گئے اور چلتے ہوئے ایک ہزار کا توڑہ پیش کیا اس نے انکار کیا
بادشاہ نے بہت ہی اصرار کیا اس نے ایک نہ مانی بادشاہ اپنا سا منہ لے کر روپے ساتھ لے
آئے جب عالمگیر اپنے خیمہ میں پہنچے تو پیچھے پیچھے بہروپیہ بھی پہنچا اور جھک کر سلام کیا عالمگیر
نے پہچان لیا کہ اس بہروپیہ نے مجھے دھوکہ دیا یہی صوفی بن کر بیٹھا تھا اور مجھے پتہ بھی نہ چلا
معمولی انعام کیلئے حکم دیا اس نے سر آنکھوں پر رکھ کر قبول کئے۔ اور بادشاہ کو دعائیں دینے
لگا۔ عالمگیر نے کہا کہ ہم تمہارے کمال کے قائل ہو گئے مگر ساتھ ہی حماقت کے بھی قائل ہیں
ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس وقت ہم تم کو ہزار دیتے رہے اور تم نے نہ لئے اور اب
اس سے کم پر راضی ہو گئے۔ اس نے کیا حیرت انگیز جواب دیا ہے کہ۔ حضور اگر میں اس وقت

لے لیتا تو نقل ٹھیک نہ ہوتی اس وقت تو میں درویشوں کا بہروپ بنائے ہوئے تھا اس کا یہی مقتضا تھا جو میں نے کیا وہ درویش کیا جس کی ذرا سی بات پر رال ٹپک پڑے صاحبو! ہم اس بہروپیہ کے بھی برابر نہیں اس سے بھی بدتر ہیں اس نے تو اپنے بہروپ کی رعایت اس قدر کی کہ دنیا پر لات ماردی اور ہم حکم خداوندی کی بھی رعایت نہیں کرتے حرص و طمع کے مارے مال گھر میں جمع کئے ہوئے ہیں حکم الٰہی کے بعد بھی حرص کو نہیں چھوڑتے اور خرچ نہیں کرتے۔

طاعات کے دو پہلو:

خلاصہ یہ کہ ہماری طاعات میں دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے شکور فرمایا گیا اور دوسرے کے اعتبار سے حلیم فرمایا گیا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ یعنی حق تعالیٰ جاننے والے ہیں پوشیدہ اور ظاہر کے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا تاکہ لوگ خلوص سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں کیونکہ دارومدار ثواب کا خلوص پر ہے اور خدا تعالیٰ کو دلوں کی باتوں کا علم پورا پورا ہے اس کے سامنے کوئی حیلہ بہانہ چل نہیں سکتا۔

صفات خداوندی عزیز اور حکیم کا مفہوم:

اس کے بعد ارشاد ہے العزیز الحکیم یعنی حق تعالیٰ شانہ، غالب ہیں، صاحب حکمت ہیں یہ اس لئے فرمایا کہ اجر دینے کا جو پہلے وعدہ فرمایا تھا اس پر شاید کسی کو یہ شک ہوتا کہ معلوم نہیں دیں گے بھی یا نہیں تو فرماتے ہیں کہ خدا ہر شے پر غالب ہے ان کو ایفاء وعدہ سے کوئی امر مانع نہیں اس کا وعدہ خلاف نہیں ہو سکتا اس پر پھر کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ جب غالب ہیں ابھی کیوں نہیں دے دیتے دیر کس لئے کی جاتی ہے اس شبہ کو حکیم سے قطع فرمادیا کہ وہ صاحب حکمت ہیں ان کا ہر کام حکمت سے ہوتا ہے اس دیر میں بھی حکمت ہے یہ تو صفات کا بیان تھا۔ اب میں عزیز حکیم سے استنباط کرتا ہوں۔ ان شبہات کا جواب جو آج کل لوگوں کو پیش آرہے ہیں اور شبہات عجب نہیں کہ مختلف ہوں مگر سب کا مختصر جواب سن لیجئے۔

مسلمانوں کی پستی اور کفار کے غلبہ عروج کے شبہ کا جواب:

۱۔ مختصر اس لئے کہتے ہوں کہ طویل جواب میں سامعین کی طبعیت کو انتشار ہو جاتا ہے

حاصل تمام شبہات کا یہ ہے کہ آج کل مسلمان پستی کی حالت میں ہیں اور کفار کو غلبہ و عروج ہے تو بعض لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ قرآن شریف میں تو ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ کہ اللہ کی جماعت غالب رہا کرتی ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کل غالب کون ہے۔ آج کل تو کفار ہی غالب ہیں تو اس سے ان کا حزب اللہ ہونا لازم آتا ہے۔ صاحبو! سمجھ لیجئے کہ یہ ارشاد الٰہی بالکل ٹھیک ہے میں آپ کو اس کا جواب سناتا ہوں اور جواب کی وجہ سے اس وقت ہمیں اپنی اور اپنے بھائیوں کی حالت کے متعلق کچھ کہنا پڑتا ہے۔ اگر چہ یہ موقع شکایت کا نہ تھا لیکن اب چونکہ خدا تعالیٰ تک اعتراض پہنچتا ہے (سبحانہ) اس لئے مجبوراً لب کشائی کرتا ہوں۔

کیا ہم حزب اللہ کہلانے کے مستحق ہیں:

صاحبو! یہ ارشاد عالی بالکل بجا اور درست ہے مگر آپ نے جو خدا تعالیٰ پر الزام دیا تو ذرا اپنی حالت کو بھی دیکھا ہوتا کہ آپ (حزب اللہ) گروہ خداوندی بننے کے قابل بھی ہیں یا نہیں افسوس ہماری اس وقت بالکل وہی مثال ہوگئی ایک عورت کی انگلی پر بچہ کو پاخانہ پھراتے ہوئے کچھ پاخانہ لگا رہ گیا تھا اس نے اسی انگلی کو ناک پر رکھ کر چاند دیکھا تو اس وقت چاند دیکھنے کے ساتھ بد بو بھی آئی تو آپ فرماتی ہیں اونھ اب کے چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ چاند میں بدبو کیوں ہوتی، اس نے اپنی خبر نہیں لی بدبو اسی میں تھی یہی بعینہ ہماری حالت ہے کہ اپنے جرائم کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور اپنے آپ کو صاف سمجھتے ہیں ہماری تو وہ حالت ہے جو مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد ہمچوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(اے سادہ لوح تم خود اپنے پر حملہ کرتے ہو جس طرح اس شیر نے اپنے پر حملہ کیا تھا)

تو ہم خدا پر کیا الزام رکھیں گے اپنی زبان سے اپنے ہی عیب بیان کر رہے ہیں ہماری وہ حالت ہے کہ ایک حبشی بدشکل جا رہا تھا راستہ میں آئینہ پڑا ہوا پایا، اس کو اٹھا کر جو دیکھا تو اس میں اپنی پاکیزہ صورت نظر آئی جھنجھلا کر پھینک دیا اور آپ فرماتے ہیں کہ ایسا بدشکل تھا جب ہی تو کوئی پھینک گیا۔ یہی ہمارا حال ہے کہ اپنے عیوب دوسرے میں نظر آتے ہیں اور دوسرا بھی کون؟ ذات حق تبارک و تعالیٰ شانہ، ہائے افسوس۔

اپنے عیوب دوسروں میں نظر آنے کی عجیب مثال:

مجھے اس حالت پر ایک اور حکایت یاد آئی کہ ایک احمق بڈھا بیٹھا ہوا تھا اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا ایک ٹکڑا لوٹے میں گر پڑا اس نے لوٹے میں سے وہ ٹکڑا نکالنا چاہا تو اسے اپنی شکل لوٹے میں نظر آئی یہ سمجھا کہ اس نے ٹکڑا چھین لیا ہے تو اس نے باپ سے شکایت کی اس نے جو لوٹے میں ہے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے باپ صاحب جو اس لوٹے میں سے ٹکڑا نکالنے گئے تو انکو بھی اپنی صورت مع ریش مبارک پڑی تو آپ اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تف ہے تیری اوقات پر کمبخت اس لمبی ڈاڑھی کے ساتھ بچہ کا ٹکڑا لیتے ہوئے شرم نہ آئی۔ تو ہماری مثال ایسی احمق کی سی ہے کہ ہم خود اپنے ہی کو برا کہہ رہے ہیں اور اپنے ہی عیبوں کا پردہ فاش کر رہے ہیں ذات حق اس سے بہت برتر ہے کہ اس کی طرف ذرا بھی کسی عیب کی نسبت ہو سکے اس کی ذات تمام عیبوں سے پاک ہے ہم نے اپنے عیبوں سے یہاں تک آنکھیں بند کیں ہیں کہ کھلی ہوئی سیاہی بھی نظر نہیں آتی۔ صاحبو! ذرا اپنی مجموعی حالت کو تو دیکھو اور پھر اپنے کو خدا کا گروہ کہتے ہوئے شرماؤ۔ صاحبو! اگر آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کا کوئی مردہ زندہ ہو جائے اور ہماری اس حالت کو دیکھے تو شاید وہ ہمیں مسلمان اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہ سمجھے اس کو اس وقت کی اور اس وقت کی حالت میں زمین آسمان کا تفاوت نظر آئے گا۔ کیا صاحبو! اس وقت یہی حالت تھی ہماری آمدنی کی جو آج ہے کہ حلال وحرام کا کچھ بھی خیال نہیں۔ کیا یہی حالت تھی ہمارے اخلاق کی جو آج ہے کہ دیگر اقوام بھی دیکھ کر طعنہ دیتی ہیں۔

ما انا علیه و اصحابی کا مفہوم:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت کے بہتر فرقے ہوں گے جس میں سے جنت میں ایک جائے گا وھو ما انا علیه و اصحابی (تفسیر ابن کثیر: ۴:۰۳۲) اور فرقہ وہی جو میری اور میرے صحابہ کی طرز پر ہو اور ما انا علیہ واصحابی صرف نماز روزہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ معاشرت کو بھی عام ہے اور یہاں سے میں ایک شبہ کو رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید کوئی صاحب اعتراض کریں کہ آج کل تو کوئی بھی ما انا علیہ واصحابی پر پورا عامل نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ باریک کپڑے یہ طرز و انداز لباس کا جواب ہے۔ کہاں

تھا یہ سواریاں ریل وغیرہ کہاں تھیں تو سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق ہو یا قول کے تو اگر ایک عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق نہیں مگر قول کے مطابق ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً اس کی اجازت دی ہے تو وہ بھی ما انا علیہ واصحابی میں داخل ہے تو اب یہ شبہ جاتا رہا ما انا علیہ واصحابی کے خلاف وہ عمل ہوگا جو نہ عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ کے مطابق ہو نہ قول سے اس کی اجازت نکلتی ہو جو کام دونوں کے خلاف ہوگا وہ البتہ مخالفت ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہوگا۔

دور حاضر کے مسلمانوں کی حالت زار:

اس کو خوب سمجھ لیجئے اس تعمیم کے بعد اب میں پھر شکایت کا اعادہ کرتا ہوں کہ کیا ہماری کوئی بھی حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مطابق ہے۔ لوگوں کی اب یہ حالت ہے کہ دین کے پانچ ارکان ہیں ان میں سے کوئی بھی درست نہیں سب سے پہلا جزو عقائد ہیں ان کی یہ کیفیت ہے کہ ہر طرف بدعات اور الحاد کا شیوع ہو رہا ہے اور الحاد بھی کیسا جو شرک سے بڑھ کر ہے کیونکہ شرک میں خدا تعالیٰ کے کمال کا انکار مشرکین نہیں کرتے وہ لوگ خدا کو بھی مانتے ہیں گو اس کے ساتھ دوسرے کو بھی مانتے ہیں اور اصل شرک کا منشا تعظیم حق ہی ہے مگر مشرکین کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے اپنے زعم میں وہ تعظیم کرتے تھے مگر حقیقت میں اس سے اور نقص لازم آ گیا بہر حال ان کی نیت تو تعظیم کی تھی۔ بات یہ ہے کہ شرک اس لئے پیدا ہوا کہ مشرکین کے ذہن میں یہ مقدمہ جم گیا کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی چیزوں کا حق تعالیٰ سے مانگنا خلاف ادب ہے اس لئے ایک خدا ایسا بھی ہونا چاہئے جس سے چھوٹی چیزیں مانگی جاویں مگر بے وقوف یہ نہ سمجھے کہ جس کو ہم بڑی چیز سمجھتے ہیں حق تعالیٰ کے نزدیک بھی اس چھوٹی ہی کے برابر ہے وہاں تو ہر کام ذرا سے اشارہ میں ہوتا ہے کیا چھوٹا کیا بڑا تو اگر چھوٹی چیز کا مانگنا بے ادبی ہے تو بڑی کا بھی مانگنا خلاف ادب ہوگا کیونکہ یہ فرق ہمارے اعتبار سے ہے قدرت کے سامنے سب برابر ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی جڑ ہی کاٹ دی ارشاد فرماتے ہیں کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹے تو بھی خدا سے مانگو نمک بھی حق تعالیٰ سے مانگو اس میں یہی راز ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سلطنت اور نمک سب برابر ہیں سب ا

ن سے ہی مانگو بہرحال عظمت کی حفاظت کے قصد سے شرک پیدا ہوا۔ اگرچہ اس سے حفاظت ہوئی نہیں تو مشرک گو سب سے بدتر ہے مگر اس نے عظمت خداوندی کو تو مانا۔

اہل سائنس فطرت ہی کو فاعل مانتے ہیں:

اور آج کل ایسا الحاد پھیلا ہے کہ بعض خدا ہی کے منکر ہیں یا اگر اس کو مانتے ہیں تو بالکل بے کار سمجھتے ہیں یعنی اس وقت سائنس کا ایسا شیوع ہوا ہے کہ اکثر مسلمانوں کے دلوں میں اسکے مسائل جمے ہوئے ہیں زیادہ تر نو تعلیم یافتہ جماعت اس کی گرویدہ ہے اور سائنس میں قدرت کا صاف انکار ہے کیونکہ اس کا مسئلہ ہے کہ خلاف فطرت کچھ نہیں ہوسکتا گویا فطرت ہی کو فاعل مانتے ہیں خدا کوئی چیز نہیں تو عقائد کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان میں جو عقیدہ اصل الاصول ہے یعنی توحید اور وجود صانع عالم کا اقرار اسی میں آج کل لوگ متردد ہیں۔ رہا دوسرا حصہ رسالت کا تو اس میں بھی سخت کوتاہی کی جارہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر نکتہ چینیاں ہوتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عظمت ہونی چاہیے تھی کہ آپ کے ارشادات کو سر آنکھوں سے قبول کیا جاتا آج کل اس کا پتہ نہیں غضب ہے کہ ہر شخص دین میں رائے دینا چاہتا ہے کیا عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کا نام ہے جن لوگوں کی عظمت قلوب میں ہے جیسے کہ بادشاہان دنیا ان کے احکام میں نکتہ چینیاں کرتے ہوئے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا رہی قیامت تو اس کا تو شاید خواب ہی آ گیا ہوگا بعض کو اسی میں بھی شک ہے اور دوسرا حصہ اعمال کا ہے۔ سو دیکھ لیجئے کہ مردوں میں سے نمازی کتنے ہیں، پھر نمازیوں کے گھر جا کر دیکھ لیجئے کہ گھر میں نمازی کتنے ہیں نہ بیوی نمازی ہے نہ نوکر اور جوان سے کہا جائے کہ تنبیہ کرو تو کہتے ہیں ہم نے بہت سمجھایا کوئی مانتا ہی نہیں میں کہتا ہوں کہ اگر کھانے میں گھر والے نمک تیز کر دیا کریں تو کیا وہاں بھی ایک دفعہ کہنے کے بعد خیال کر لیا ہے کہ بہت سمجھا دیا نہیں مانتے جو جانے دو وہاں ایک دفعہ کہہ کر کوئی بھی خاموش نہیں ہوتا بلکہ ڈنڈا لے کر تیار ہو جاتے ہیں تو کیا نماز پر بھی کبھی نا خوشی ظاہر کی ہے اس کہنے کو کہنا نہیں کہا جاتا۔ یاد رکھو اسی کا مواخذہ آپ سے بھی ہوگا۔ اور زکوۃ تو شاید کبھی دیتے ہوں وہاں تو یہی خیال رہتا ہے چالیس ہزار میں سے ایک ہزار نکلیں گے اور جو لوگ دیتے بھی ہیں تو بعض ان میں سے بڑی چالاکیاں کرتے ہیں۔

کان پور میں ایک شخص یہ کیا کرتے تھے کہ ہنڈیا میں روپے بھر کر اوپر سے اناج بھر دیتے تھے اور ایک غریب آدمی کو دیدی اور پھر اس سے خود ہی خرید لی زکوٰۃ بھی اس طرح ادا ہو جائے گی اور روپیہ گھر کا گھر ہی میں رہے گا۔ بعض لوگ حج کرنے نہیں جاتے کہ تجارت کے کاروبار سے فرصت نہیں۔ افسوس دنیا میں اس درجہ انہماک ہوا ہے کہ فریضہ اسلام کی بھی پرواہ نہیں ہے معاملات میں ان کی تو ایسی گندی حالت ہے کہ خدا کی پناہ کوئی ایک آدھا آدمی ایسا ہوگا جو کہ سود سے بچتا ہو آج کل سود اس کو سمجھتے ہیں کہ ایک روپیہ دے کر سوا روپیہ لیا جاوے۔

بیع فاسد کی تمام صورتیں سود ہیں:

یادرکھو بیع فاسد کی تمام صورتیں سودی ہیں بیجک آجانے پر مال کا بیچنا یہ بھی سود ہے اور ناجائز۔ سینکڑوں مسلمان ایسا کرتے ہیں میں نے قریب ہی بیان کیا تھا۔

آج کل معاملات میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں:

حلال وحرام کا معیار آج کل یہ رہ گیا ہے کہ جس کھانے میں گھی زیادہ ہو حلال ہے ورنہ حرام استغفر اللہ یہ بھی کچھ کم جہالت ہے۔ صاحبو! آپ خوب سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ معاملات میں کبھی کوئی شخص علماء سے رجوع نہیں کرتا صرف وکیلوں سے قانونی سوال وجواب کر کے تسلی کر لیتے ہیں اگر آپ نے کبھی کوئی گاؤں خریدا ہوگا تو اس کا مسودہ کسی وکیل سے تو لکھوالیا ہوگا مگر کسی عالم سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی ہوگی۔ غرض معاملات میں آج کل حلال وحرام کی کوئی بھی تمیز نہیں کیونکہ اس کو دین سے خارج سمجھ کر رکھا ہے۔ دین صرف نماز روزہ کو سمجھ رکھا ہے۔

آج کل کی ساری معاشرت کا خلاصہ:

اس کے آگے معاشرت ہے کہ آج کل اس کی حالت تو نور علی نور ہو رہی ہے ساری معاشرت کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ غیر قوموں کی تقلید پر فخر کیا جاتا ہے اٹھنے بیٹھنے میں کھانے پینے میں وضع میں لباس میں یہاں تک کہ لہجہ میں بھی غیر قوموں کی تقلید کی جاتی ہے اگر کوئی حدیث **من تشبہ بقوم فھو منھم** (سنن ابی داؤد: ۴۰۳۱) (جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے) پڑھ دے تو متعصب کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ **من تشبہ بقوم فھو منھم** (جو کسی قوم سے مشابہت اختیار

کرے وہ انہی میں سے ہے) تو تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے اس کا انکار کوئی کر ہی نہیں سکتا اور اگر ایسا نہیں ہے تو ذرا آپ اپنی بیگم صاحبہ کا لباس تو پہن کر مجمع میں چلے آیئے اگر اور بھی کچھ نہیں تو کم از کم زنانے پن کا خطاب تو ہر طرف سے مل ہی جائے گا تو اگر کسی نے آپ کو کافروں کا لباس پہنے ہوئے دیکھا کہ ان کے مشابہ کہہ دیا تو کیا ظلم کیا۔

اخلاق حسنہ کا نام ونشان مسلمانوں میں مٹ رہا ہے:

اخلاق کی حالت یہ ہے کہ جو اچھے اخلاق تھے ان کا نام ونشان مسلمانوں سے مٹتا جاتا ہے۔ اخلاص شکر وصبر توکل حمیت وغیرت تواضع، مروت، ہمدردی، رحم، ایفاء وعدہ یہ اخلاق حسنہ ہیں۔ ہمارے اندر ان کی بجائے ریا، فخر، تکبر، حسد، کینہ، بخل، خلاف وعدگی اور جھوٹ وغیبت رہ گئے ہیں تو دین کے پانچ اجزاء تھے عقائد عبادات، معاملات ومعاشرت واخلاق پانچوں کی یہ حالت ہے جو میں نے عرض کی، پھر ہم اپنے کو اللہ کی جماعت بتلاتے ہیں اور مستحق بنا چاہتے ہیں عزت وترقی وغلبہ کے اور جب پستی ہوتی ہے تو سوال کرتے ہیں کہ یہ وعدہ الٰہی کے خلاف کیوں ہوا۔ کیا۔ اب بھی ہمارا منہ سوال کا ہے حزب اللہ ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

ہمارا کونسا وقت گناہ سے خالی ہے:

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ہم پر پکڑ میں کمی ہو تو یہ تعجب کی بات ہے اگر ایک جرائم پیشہ اگر دس سال تک بچا رہے تو اس پر تعجب ہوسکتا ہے نہ اس کی گرفتاری پر مگر آج کل ہمارے بھائی مسلمانوں پر جن میں میں بھی داخل ہوں جب کوئی مصیبت آتی ہے تو آپس میں یوں کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کسی گناہ میں پکڑے گئے افسوس بجائے اس کے کہ یوں کہتے اللہ اکبر حق تعالیٰ کس قدر حلیم ہیں کہ بہت دنوں کے بعد پکڑا۔ الٹی اپنی براءت ظاہر کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے۔ ارے ظالم گناہ سے خالی ہمارا کونسا وقت گزرتا ہے۔ ہم کو تو اگر روٹی ملے تو تعجب ہونا چاہئے۔ تندرستی رہے تو حیرت کی بات ہے اور مواخذہ پر تو تعجب ہونا ہی نہ چاہئے۔ اگر اس پر یہ اشکال کیا جائے کہ اس سے تو لازم آتا ہے کہ حزب اللہ (اللہ کا گروہ) کبھی دنیا میں ہوا ہی نہ ہو کیونکہ انبیاء اور اولیاء پر بھی مصائب آئے تھے تو کیا وہ بھی گناہ کی بدولت ہے۔

مصیبت کی صورت:

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی حقیقی مصیبت جب آتی ہے گناہ ہی کی وجہ سے آتی ہے باقی ان حضرات پر مصیبت کی صورت ہوتی ہے حقیقت مصیبت ان میں موجود نہیں ہوتی ان کو اس میں ایک لطف آتا ہے بھلا مصیبت میں بھی کسی کو لطف آیا ہے وہ ان کے امتحان اور رفع درجات کے لئے صورۃ مصیبت ہوتی ہے اور جہاں صحابہ کرام یا اولیاء اللہ سے پریشانی کی مصیبت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس سے بھی کوئی لغزش ہوئی ہے چنانچہ غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت تیراندازوں کی ایک جگہ متعین فرمادی تھی جب وہ غنیمت کے لئے وہاں سے ہٹ گئے تو شکست ہوگئی۔ اسی لئے ارشاد فرماتے ہیں قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا یعنی جو کچھ واقعہ شکست غزوہ احد میں ہوا یہ تمہاری طرف سے ہوا۔ شیطان نے ان کو پھنسا دیا بوجہ بعض گناہوں کے تو ایک جماعت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل نہیں کیا تھا اس کے وبال میں صحابہ گرفتار ہوگئے۔ اور اس کا دوسرا جواب بھی ہے مگر یہی جواب کافی ہے۔

مسلمانوں کی پستی کا اصلی سبب:

اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ جو لوگ آج کل ترقی اور عروج وغلبہ پائے ہوئے ہیں وہ کون سی اللہ کی جماعت ہیں ان کو غلبہ کیوں حاصل ہوا تو سمجھو کہ یہ شبہ بالکل غلط ہے اس کو طالب علم خوب جانتے ہیں کہ اس آیت میں یوں ارشاد فرمایا ہے جو اللہ کی گروہ ہے وہ غالب ضرور ہوگی یہ نہیں فرمایا کہ جو غالب ہو وہ اللہ کی گروہ ہے جو اس کی ایسی مثال ہے کہ ہم یوں کہیں کہ ہر انسان جاندار ہے یہ بات صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جاندار انسان ہو جائے بہت سے جاندار انسان نہیں جیسے گھوڑے، گدھے، تو انسان ہونے کے لئے تو جاندار ہونا لازم ہے مگر جاندار ہونے کے لئے انسان ہونا لازم نہیں۔ طالب علمی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ کل انسان حیوان سے کل حیوان انسان لازم نہ آئے گا تو کسی جماعت کے عروج اور غلبہ سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ اللہ کی جماعت ہے ہاں جو اللہ کی جماعت سچی ہوگی وہ ضرور غالب ہوگی مگر ہم ایسے ہیں کہاں اب رہا یہ سوال کہ اچھا اس میں کیا حکمت ہے کہ کفار کو عروج غلبہ دیدیا گیا جب وہ خدا کے باغی ہیں اور سرکش ہیں تو ان کو یہ عزت کیوں حاصل ہوئی تو اس کی

وجہ یہ ہے کہ آپ اپنی حالت کو ذرا غور سے دیکھئے کہ آپ کے ساتھ دو قسم کے لوگ تعلق رکھتے ہیں ایک دوست دوسرے دشمن دوستوں سے ذرا سی بات پر رنج ہوجاتا ہے اور دشمن کے ذرا سے ہنر کی قدر ہوتی ہے جب یہ قاعدہ سمجھ میں آگیا تو اب سنئے کہ جو لوگ حق تعالیٰ شانہ، کے ساتھ مدعی محبت ہیں ان سے ذرا سی بات میں عتاب ہوجاتا ہے اور کفار باغی ہیں ان کی ذرا سی خوبی پر انعام ہوجاتا ہے اب دیکھئے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جس میں کوئی معصیت نہ ہو اور کوئی کافر ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی خوبی نہ ہو اوران کی جزا کی بابت یہ قانون ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ جو شخص (اپنے اعمال خیر سے) محض حیات دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (کا حاصل کرنا) چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزاء) ان کو اس (دنیا) ہی میں پور طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے اس دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے اس (دنیا) میں جو کچھ کیا تھا وہ (آخرت میں سب کا سب) ناکارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ اب بھی بے اثر ہے۔ کہ دنیا کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ ان کے اعمال کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں پورا کردیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے آخرت میں سوائے جہنم کے کچھ نہیں اور مسلمانوں کے لئے ارشاد ہے۔

اَعَدَّاللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (کہ ان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے جنت تیار کر رکھی ہے تو ان کا اجر تو موجود ہے آخرت میں اور کفار میں جو خوبیاں اور بھلے کام ہیں ان کا اجر دنیا میں موعود ہے تو ان کو یہاں غلبہ وعزت دے دی جاتی ہے کیونکہ آخرت میں ان کا کچھ نہیں اور مسلمانوں کی جو طاعات ہیں ان کا اجر آخرت میں موعود ہے اور معصیت کا اثر کبھی دنیا میں بھی پہنچ جاتا ہے۔

مسلمانوں پر نزول مصائب کا سبب:

اس لئے کبھی ان پر معاصی کے مصائب بھیج دی جاتی ہیں مگر یہ یاد رکھا جائے کہ

انجام متقین ہی کے لئے اچھا ہوتا ہے کہ کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ تو کسی معصیت اور ذلت سے گھبرانا نہ چاہئے بلکہ یہ سمجھنا چاہئے انشاء اللہ اس کا انجام ہمارے لئے اچھا ہوگا اور یہ جواب تو اس وقت جبکہ یہ پستی اور ذلت بوجہ معاصی کے مانی جائے مگر مصیبت کبھی دوسری وجہ سے بھی آتی ہے یعنی رفع درجات کے لئے اس کو خوب سمجھ لیجئے کیونکہ مولویوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ وہ تو کہتے ہیں کہ مصیبت بوجہ گناہ کے آتی ہے حالانکہ ہم نے بزرگوں کو بھی مبتلائے مصیبت دیکھا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ مولوی یہ نہیں کہتے کہ صورت مصیبت بھی ہمیشہ معاصی ہی کے سبب سے آتی ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ صورت مصیبت معصیت کی وجہ سے بھی آتی ہے اور اس باب میں ان کی دلیل یہ ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ اور تم کو (اے گناہ گارو) جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے کاموں سے (پہنچتی ہے) لیکن اس کے مخاطب اہل معاصی ہیں صلحاء اس کے مخاطب نہیں۔

صلحاء کو رفع درجات کیلئے مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے:

حاصل کلام یہ ہوا کہ خطا کار پر تو مصیبت گناہ کی وجہ سے آتی ہے اور صلحاء پر اس لئے آتی ہے۔

زاں بلا ہا کانبیا برداشتند　　سر بہ چرخ ہفتمیں افراشتند

(انبیاءؑ نے اسی طرح مصائب برداشت کئے ساتوں آسمان سر پر اٹھائے)

حضرات! خبر بھی ہے انبیاءؑ کون ہیں ان سے زیادہ حق پر کون ہوگا۔ لیکن ان پر بھی مصائب صوریہ نازل ہوئے ہیں کہ ایک تاریخ میں ستر ستر نبی شہید ہوئے ہیں اگر آپ اس وقت ہوتے تو مولویوں کی جان کھا جاتے۔ پس یاد رکھئے کبھی تو مصیبت سے عقوبت اور سزا مقصود ہوتی ہے اور کبھی رفع درجات چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ یعنی کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ جنت میں فوراً چلے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تمہارے اوپر وہ حالت تو گزری ہی نہیں جو کہ پہلوں پر آئی تھی کہ

ان کو مصیبت مالی و جانی اس قدر پہنچی اور ایسے جھڑ جھڑائے گئے کہ رسول اور مومنین سب کہنے لگے کہ خدا تعالیٰ کی امداد کب ہوگی۔ سنو کہ امداد خدائی نزدیک ہی ہے۔

حضرات یہ قریب حق تعالیٰ کے یہاں کا قریب ہے جس کو ہم اندازہ نہیں کر سکتے ایک جگہ قیامت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا

(یہ لوگ اس دن کو (بوجہ اعتقاد نفی کے وقوع سے) بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم اس کو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں۔

حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کی تباہی کے لئے دعا فرمائی تھی تو اسی وقت ارشاد ہو چکا تھا۔ قد اجيبت دعوتكما کہ تمہاری دعا قبول ہوگئی مگر اس کا ظہور چالیس سال کے بعد ہوا۔ غرض انبیاءؑ سے زیادہ کون مقبول ہوگا ان پر بھی مصائب آئی ہیں وہاں کون سے گناہ کی سزا تھی وہ اسی رفع درجات کے لئے تھی دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اٰمنا کہنے سے وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔ حالانکہ ان سے پہلوں کی ہم آزمائش کر چکے ہیں (تو ان کو بھی جانچیں گے) صاحبو! آپ کبھی امتحان دیتے ہیں یا نہیں اس وقت حق تعالیٰ شانہ، آپ کا امتحان لے رہے ہیں کہ ذرا جھڑ جھڑا دیا کیونکہ ہم آرام کے عادی ہو گئے تھے ذلت و مصیبت سے ہمارا امتحان کیا گیا ہے جس میں ہماری حالت یہ ہونی چاہئے ؂

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی عطائے تو

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

صاحبو! ہمارا مذہب تو عشق ہے کیونکہ ہم مومن ہیں اور مومن کی شان یہ ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی مومنین کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے اور آپ کو معلوم بھی ہے عشق کس کا نام ہے آپ تو یہ سمجھے ہوں گے کہ آرام کا نام عشق ہے ہرگز نہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ سنئے اس کا نام عشق ہے۔ ؂

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن ۔۔۔ دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن گاہ کافر شدن گاہ مسلماں بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ ہو جانا۔ دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضہ میں دے دینا اور حیران رہنا۔ محبوب کی زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرہ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا ہے کبھی باقی رہنا)

کافر و مسلمان بودن سے مراد ہے فنا بقاء خلاصہ یہ ہے کہ عاشق اپنے اختیار میں نہیں ہوا کرتا تو ہم بھی اپنے اختیار میں نہیں ہیں محبوب حقیقی کے ہاتھوں سارا معاملہ چھوڑ دینا چاہئے وہ جو چاہیں کریں آپ کون ہیں تجویز کرنیوالے کہ آپ کو عروج ہی ہو ترقی ہی حاصل رہے حق تعالیٰ شانہ، چاہتے ہیں کہ دیکھیں آپ کو ان سے کتنی محبت ہے کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے بلاؤں کا امتحان بھی ہوا کرتا ہے اگر آپ اس سے پھسل گئے تو وہ حالت ہوگی جس کی بابت ارشاد ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ. فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ. خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ یعنی بعض لوگ حق تعالیٰ شانہ، کی عبادت (اوپرے دل سے کرتے ہیں) تو اگر (عبادت کے بعد) کوئی اچھی حالت پیش آگئی تو اسلام پر مطمئن ہو گئے اور اگر کوئی مصیبت پیش آگئی تو الٹے پھر گئے دنیا و آخرت دونوں میں ناکام ہوئے یہی ہے کھلی ناکامی بعض لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے بھی تھے کہ اسلام لاتے تھے اگر اس کے بعد بیوی نے بچہ دے دیا اولاد ہو گئی یا غنیمت کا مال حاصل ہو گیا تو قلب کو اطمینان ہو گیا ورنہ دین کو چھوڑ دیتے تھے تو ایسا ہونا چاہتے ہو تو دوسرے مقام پر ارشاد ہے فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ یعنی بعض انسانوں کی یہ حالت ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ، اس کا امتحان اس طرح لیں کہ اس کو عزت و نعمت عطا فرمائیں تو وہ (خوش ہو کر) کہتا ہے کہ خدا نے میری عزت کی اور اگر اس طرح آزمائش کریں کہ اس کی روزی تنگ کر دیں تو کہتا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا اور اب وہ خدا سے ناراض ہو جاتا ہے ایک مقام پر حق تعالیٰ نے ان دونوں باتوں کو ذکر فرمایا ہے کہ تمہاری مغلوبیت میں چند حکمتیں تھیں اور کفار کا غلبہ ان کے اہل حق ہونے کی دلیل نہیں۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ یعنی اگر تم کو کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے مخالفوں کو بھی اس جیسا زخم لگ چکا ہے اور ان ایام کو ہم لوگوں میں نوبت بنوبت پھیرتے رہتے ہیں (اور تمہاری اس مصیبت میں حکمت یہ تھی کہ) حق تعالیٰ شانہ مومنوں کو جانچ لیں اور تم میں سے بعض کو شہید بنا دیں اور حق تعالیٰ شانہ، ظالموں کو نہیں چاہتے۔ اور تاکہ مسلمانوں کو منافقوں سے الگ کر دیں اور کافروں کو مٹا دیں آیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم جنت میں ابھی سے داخل ہو جاؤ اور حق تعالیٰ نے مومنوں کو اور صابرین کو جانچا بھی نہیں۔

مصیبت کی عجیب حکمت:

واللہ مصیبت کی عجیب حکمت بیان فرمائی مسلمانو! یہ مصیبت ظاہر میں مصیبت ہے ورنہ حقیقت میں راحت ہے۔ کیونکہ اسکی بدولت سب کو دین کی طرف توجہ ہو گئی ہے۔ اس راز کو جو سمجھ گئے ہیں وہ بلاؤں پر خوش ہوتے ہیں۔ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی ناخوشی خوشی میری جان پر ہے دل تو محبوب ہی کا ہے)

بس زبون وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا

(تم بالکل وسواس سمجھے جاؤ گے اگر محبوب کے طرب و بلا میں فرق سمجھو گے)

عارف شیرازی صبر کی فضیلت میں فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش

حق تعالیٰ نے مصیبت کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی ہے ویعلم الصابرین یعنی تاکہ مصیبت کی وجہ سے صابرین غیر صابر سے ممتاز ہو جائیں اور حق تعالیٰ اپنے صابر بندوں کو جانچ لیں صاحبو! اگر ہمیشہ راحت ہی رہا کرے تو صبر کا کونسا موقع ہوگا۔

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش   بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال　　　مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(اے باغ کے مالی اگر تو چند روز کے لئے پھول کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے تو جدائی کے کانٹوں کے ظلم پر تجھ کو صبر بلبل اختیار کرنا چاہیئے۔ اے دل محبوب کی زلف کی قید میں پھنس کر پریشان ہو کر مت چیخ عقلمند پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر برداشت سے کام لینا چاہیئے۔

اور اگر کسی کو اپنے علم وعمل پر ناز ہو کہ بلا میں استبعاد ہونے لگے تو اس کے لئے فرماتے ہیں۔

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافری ست　　　راہرو صد ہنر دارد ہم توکل بایدش

(تقویٰ اور عقل بھروسہ طریقت میں کفر ہے۔ رہرو کے پاس اگر سو ہنر بھی ہوں تب بھی اسے توکل کرنا چاہیئے)

تو صاحبو! کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ مصیبت بھیج کر آپ کو صابر بنانا چاہتے ہیں کیا آپ کو خدا کی رحمت سے مایوسی ہو گئی ہے کیا یہ خیال ہے ہمیشہ یہی حال رہے گا۔ دیکھئے صاحب مالک خدا کا ہے آپ کون ہیں رائے دینے والے کہ یہ ہو وہ نہ ہو جبکہ نوکر کو آپ کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں تو آپ کو خدا تعالیٰ کے معاملات میں دخل دینے کا کیا اختیار ہے آپ کا تو کام یہ ہے کہ جب مصیبت آئے اپنے اعمال پر نظر کیجئے اور ان میں جو کوتاہی ہو گئی ہے اس کی اصلاح کیجئے یہ کیا خرافات ہے کہ مصیبت کے وقت بجائے اپنی اصلاح کے خدا کی شکایات کرنے لگے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

غم چو بینی زود استغفار کن　　　غم بامر خالق آمد کارکن

ہرچہ برتو آید از ظلمات و غم　　　آں زبیباکی و گستاخی است ہم

(جب تجھ کو کوئی تکلیف آئے جلد توبہ استغفار کر کیونکہ اللہ کے حکم سے تکلیف آتی ہے تجھ پر جو بھی ظلمات و غم آئیں وہ بھی ہماری بے باکی و گستاخی کے سبب ہیں)

اب نفس شبہات تو بحمداللہ تعالیٰ سب رفع ہو گئے مگر ان شبہات کی تقریر لوگ آج کل مختلف طریقوں سے کرتے ہیں ان طرق تقریر کو بھی بیان کر کے اجمالاً اس کا رد کئے دیتا ہوں اگرچہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ میری اس تمام تقریر کو ان شبہات پر منطبق کر کے جواب

بآسانی معلوم ہوسکتا ہے مگر تبرعاً شک کرنے والوں کے الفاظ ہی سے شبہ کو بیان کر کے اس کا بھی رد کیے دیتا ہوں۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ آج کل مسیحی ترقی پر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی تثلیث کی طرفداری کرتے ہیں۔

حق اور ناحق کا مدار دلائل پر ہے:

تو صاحبو! سمجھ لیجئے کہ حق ناحق کا مدار غلبہ وترقی پر نہیں بلکہ اس کا مدار دلائل پر ہے۔ ورنہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خبر دے چکے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ دنیا میں کافر ہی کافر ہوں گے۔ مسلمان کوئی نہ ہوگا تو کیا اس وقت اسلام حق نہ رہے گا۔ صاحبو! اگر دین کے حق ہونے کی یہی علامت ہوا کرے کہ اس کے متبعین ترقی اور غلبہ پر ہوں تو دنیا دارالا بتلاء نہ ہوتی ایمان بالغیب کچھ نہ رہتا جانچ اور آزمائش نہ ہوسکتی اس لئے کہ کامیابی کی طرف تو سب ہی آیا کرتے ہیں خوب سمجھ لو کہ حق ناحق کا مدار دلائل پر ہے کامیابی یا ناکامی دنیا پر نہیں ہے۔ پس اگر کسی وقت اہل تثلیث ترقی پر ہوں اور ان کو غلبہ حاصل ہو تو تثلیث حق نہ ہو جائے گی بلکہ حقیقت میں اس وقت بھی اسلام ہی حق ہوگا اس کی ایسی مثال ہے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس گرفتار ہوں اور ایک باغی سلطنت ابھی تک گرفتار نہ ہو تو بتلایئے ان دونوں میں افضل واعلیٰ کون ہے بظاہر تو سپرنٹنڈنٹ سے باغی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرام سے پھرتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے نہ پابندی ہے نہ کسی کی غلامی اور سپرنٹنڈنٹ بظاہر ادنیٰ معلوم ہوتا ہے کہ محبوس ہے، قید خانہ میں پڑا ہوا ہے کچھ نہیں کرسکتا مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ گو قید میں ہے باغی سے بہر حال افضل ہے کیونکہ وہ جب رہا ہوگا پھر حاکم کا حاکم ہے بلکہ وہ قید میں بھی حاکم ہے کیونکہ حکام کی قید بھی دوسروں کی قید سے سہل ہوتی ہے ان کا پورا اعزاز قید میں بھی ہوتا ہے۔ اور باغی اگرچہ بھاگا پھرتا ہے مگر جب گرفتار ہوگا جان سے مار ڈالا جائے گا اور اس کی لاش جانوروں اور کتوں کے آگے ڈال دی جائے گی اور وہ ہر وقت خطرہ میں ہے اس لئے کہ باغی ہے اور سپرنٹنڈنٹ کو قید میں بھی انعام سلطانی کی امید ہے کیونکہ اس نے کبھی تو خدمات کی ہیں۔ پس کامیابی وناکامی دنیا پر مدار ہرگز نہ رکھنا چاہئے۔

مصیبت میں اپنی زبان بند رکھنی چاہئے:

بلکہ مصیبت کے وقت اپنی حالت کو درست کرنا چاہئے اور زبان کو بند کرنا چاہئے اس لئے کہ اس سے آپ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں بہتر یہ ہے کہ ذرا بیداری پیدا کیجئے اور دینی حالت کو درست کر لیجئے کیونکہ اگر اس بک بک سے حق تعالیٰ شانہ، کو غصہ آ گیا اور ہمیشہ پستی ہی رہی کبھی راحت نصیب نہ ہوئی تو آپ کی اس بک بک سے کیا فائدہ ہوگا بلکہ اس بک بک سے وہاں کا (یعنی آخرت کا) گھر بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور اگر آپ کو ہمیشہ ترقی حاصل رہی تو اس سے کتنی دیر کا فائدہ ہوگا آخر دنیا فنا ہوگی وہاں پھر اعمال کی باز پرس ہوگی بلکہ تمام ترقی و راحت کی ضرورت بھی اس لئے ہے تاکہ اطمینان سے احکام خداوندی پر عمل کیا جائے ارشاد ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں) پس آرام دینے سے غرض حق تعالیٰ کی یہی ہوتی ہے کہ شریعت پر پوری طرح عمل کیا جائے اس کے احکام کی اشاعت کی جائے۔

خوردن برائے زیستن وذکر کردن ست　　　تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست

ترجمہ: کھانا زندہ رہنے اور ذکر کرنے کیلئے ہے جبکہ تو اسکا معتقد ہے کہ زندگی کھانے کیلئے ہے۔

حق تعالیٰ شانہ، نے مسلمانوں کو بہت کچھ ترقی و عروج دیا تھا اور اس سے غرض یہ تھی کہ دین کو قائم کریں دین کو رونق دیں انہوں نے سمجھا کہ یہ عروج و عیاشی برتنے کے لئے دیا ہے اس پر یہ سزا ہوئی کہ اب مسلمان پستی کی حالت میں ہیں اب ان پر جو کچھ بھی مصائب آئیں اس کی سزا ہے حق تعالیٰ شانہ، فرماتے ہیں۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (کیا وہ اس (امر) کو نہیں دیکھ رہے ہے کہ ہم زمین کو ہر (چہار) طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں)

اس شبہ کا جواب اچھی طرح بحمداللہ ہو گیا۔ اگر اب بھی اس کا کوئی جز و رہ گیا ہو تو اس کو صاف کر لیجئے کیونکہ راحت دنیا اور ترقی مال و دولت سے زیادہ اس کی حفاظت ہے اصل مقصود ایمان ہے ترقی مقصود نہیں۔ پس اگر کوئی شبہ اب بھی رہ گیا ہو تو ضرور پوچھئے۔ زبان، خط سے پوچھئے۔ ایک مولوی سے تسلی نہ ہو تو دوسرے تیسرے سے پوچھے دیکھئے اگر آپ

کے سر میں درد ہو جائے تو اس کے لئے ایک طبیب سے رائے لیتے ہیں اس سے نفع نہ ہو دوسرے سے رجوع کرتے ہیں تیسرے سے درخواست کرتے ہیں تو کیا دینی مرض کی اتنی بھی پرواہ نہیں ایمان کی اتنی بھی قدر نہیں۔

تمام مسلمانوں کے لئے ضرورت دعا:

میں پھر کہتا ہوں کہ اپنی حالت کو درست کرو اور جناب باری میں اپنی اور تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائیں انشاء اللہ تمہاری دعاء مقبول ہوگی۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے تو بہت دعائیں کیں قبول ہی نہیں ہوتیں حالانکہ وعدہ ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ مگر صاحبو! آپ نے قبولیت دعا کے معنی سمجھے ہیں کہ جو مانگا تھا وہی مل جائے۔ اس کو تو قرآن نے ایک جگہ صاف کر دیا ہے۔ فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِکُوْنَ دیکھئے ان شاء کی قید موجود ہے تم جب دعا کرتے ہو تو اگر حق تعالیٰ چاہتے ہیں اس مصیبت کو زائل کر دیتے ہیں اور یہ بھی وعدہ اس وقت ہے جب کہ ہماری دعاء دعاء بھی ہو۔ یہاں تو دعا کی صورت ہی ہوتی ہے حقیقت کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ دعا کی حقیقت یہ ہے کہ ظاہر و باطن درست کر کے دل سے مانگی جائے دیکھئے اگر کوئی شخص حاکم کے پاس درخواست لیکر جائے مگر حلیہ یہ ہو کہ سر سے پیر تک گوہ میں لپٹا ہو تو کیا اس کی درخواست قبول ہو سکتی ہے ہرگز نہیں بلکہ دور ہی سے نکال دیا جائے گا۔ کیونکہ ایسی حالت سے کوئی شخص دربار میں نہیں جا سکتا اب اپنا ظاہر دیکھئے کہ از سرتاپا حرام سے بھرا ہوا ہے غذا اکثر حرام ہوتی ہے اکثروں کی کمائی حرام کی ہوتی ہے تو اس حالت میں دعا کیا قبول ہو۔ ایک حدیث شریف میں وارد ہے۔

ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

یہ حالت وارد ہے مطعمه حرام و مکسبه حرام فانی یستجاب له اگر ظاہر کسی نے درست بھی کر لیا تو دل سے دعا نہیں نکلتی شاید ایک دو مرتبہ تو کسی کی آنکھ میں دعا کرتے ہوئے آنسو آ گئے ہوں گے ورنہ آموختہ سا پڑھ لیا جاتا ہے۔ کیا درخواست ایسی ہی ہوا کرتی ہے کیا کوئی حاکم کی طرف پیٹھ کر کے بھی درخواست دے سکتا ہے مگر ہم حق تعالیٰ سے ہمیشہ اسی طرح دعا مانگتے ہیں۔ کیونکہ دل اس طرف متوجہ نہیں ہوتا مارا مارا پھرتا ہے۔

اور حدیث شریف میں ہے ان اللہ لایستجیب الدعاء عن قلب لاہ (مسند احمد ۲:۱۷۷ بلفظ آخر) کہ خدا تعالیٰ غافل دل سے دعاء کو قبول نہیں فرماتے اور اگر کوئی کہے کہ اچھا اکثروں کی دعا قابل قبول نہیں تو کیا کسی کی بھی قابل قبول نہیں ہوتی کوئی تو اللہ کا بندہ دل سے دعا کرتا ہوگا میں کہتا ہوں کہ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ دعاء مقبول نہیں ہوتی ممکن ہے کہ جو کچھ تھوڑی بہت عزت وراحت ہے وہ اسی دعا کی برکت سے ہو ورنہ نہ معلوم کیا حالت ہو جاتی۔

مسلمانوں کی پستی میں حکمت:

یہ تھا کہ ضروری مضمون جو بفضلہ تعالیٰ بیان ہو گیا۔ اب یہ بات رہی کہ اس آیت میں یہ اشارہ کہاں ہے اور کس طرح ہے تو سنئے ان شبہات وجوابات کی طرف عزیز حکیم میں اشارہ ہے۔ جب فرمایا گیا کہ حق تعالیٰ شانہ، غالب ہے تو شبہ پیدا ہوا کہ پھر اہل حق کو پستی اور مغلوبیت کیوں ہوتی ہے اس کے جواب کے لئے حکیم ارشاد فرمایا کہ وہ پستی اور مغلوبیت اس لئے نہیں ہوتی کہ حق تعالیٰ غالب نہیں بلکہ کسی حکمت سے ہوتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ حکیم بھی ہیں تو کسی حکمت کی وجہ سے کبھی اہل حق پستی میں آجاتے ہیں تو سارے شبہات العزیز کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان شبہات میں کچھ استبعاد نہیں کیونکہ ان کا منشاء بھی ایک صفت خداوندی ہے۔ لیکن شبہ کرنیوالوں نے صفت حکمت پر نظر نہیں کی ورنہ پریشانی نہ ہوتی اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی اسی پر بیان ختم کرتا ہوں۔ اور وہ حکایت میری ہی ہے۔

شبہات سے پریشانی کا سبب صفت حکیم سے غفلت ہے:

ایک مرتبہ مجھ پر ایک وسوسہ کا غلبہ ہوا کیونکہ جب طلب دل میں ہوتی ہے تو اس میں وساوس سے طرح طرح کی پریشانی ہوتی ہے اور اس وجہ سے ہم آپ کے ان شبہات کی بھی ممنون ہیں کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ طلب دین کی دل میں ہے۔ غرض مجھ کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ خدا تعالیٰ کے طالب بہت سے ہیں اور خداوند جل وعلا کو ان کا علم بھی ہے اور قدرت بھی سب طرح کی ہے وہ قادر ہیں کہ جب چاہیں واصل کریں اور اسی کے ساتھ رحمت بھی ہے اور رحمت کا مقتضا قدرت کے ساتھ مل کر یہ تھا کہ طالب کو فوراً واصل کردیں دیر کیوں ہوتی ہے اس خیال سے

طبیعت بہت پریشان ہوئی اس وقت میرے پاس مثنوی شریف تھی میں نے مثنوی کو کھول کر دیکھا کہ شاید میرے اس شبہ کا اس میں کچھ جواب ملے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مولانا کی روح آکر بتلا گئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ بزرگوں کے کلام میں برکت ہوتی ہے پریشانی میں اس کو کھول کر دیکھنے سے کوئی بات من جانب اللہ ایسی نکل آتی ہے جس سے تسلی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت اس شبہ کا عجیب جواب نکلا بلکہ تمام شبہات کی تقریر پہلے موجود تھی پھر جواب موجود تھا اشعار یہ تھے

چارہ می جویدپئے من دردتو　　　　می شنودم دوش آہ سرد تو

یعنی میرے واسطے تیری طلب علاج تلاش کر رہی ہے اور میں آہ سرد بھی سن رہا ہوں اس میں طلب کی تسلیم اور علم کا اثبات ہے۔

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار　　　　راہ نمایم وادہم راہ گزار

اس میں قدرت کا ثبوت ہے کہ ہم قادر ہیں کہ تمہیں رستہ بتلا دیں۔

تا ازیں طوفان دوراں وارہی　　　　برسر گنج صالم پانہی

یعنی ہمیں قدرت ہے کہ ہم تم کو فوراً واصل کر دیں اور ان پریشانیوں سے چھوٹ جاؤ اس میں رحمت کا ذکر ہے ان سب مقدمات کی تسلیم کے بعد ایک نئے مقدمہ پر تنبیہ ہے اور اسی میں جواب یعنی یہ سب ٹھیک ہے مگر تم ایک بات سے چوک گئے ہو اس پر نظر نہیں کی۔

لیک شیرینی ولذات مقر　　　　ہست براندازہ رنج سفر

یعنی اپنی قرارگاہ کی لذت تعب سفر کی مقدار پر معلوم ہوا کرتی ہے جتنی تکلیف سفر میں ہوئی ہوگی اسی قدر لطف گھر پہنچ کر آئے گا اس میں بیان ہے حکمت کا یعنی یہ تمام تاخیر اور دیر اس لئے ہو رہی ہے تاکہ اس کے بعد جب تمکین حاصل ہو تو اس کی قدر ہو اور لذت زیادہ حاصل ہو۔

آنگہ از فرزند وخویشاں برخوری　　　　کز غریبی رنج و محنت ہا بری

یعنی ان پریشانیوں میں حکمت یہ ہے کہ اس کے بعد جو دولت ملے گی اس کی قدر ہوگی

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد　　　　گوہر طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص ارزاں خریدتا ہے ارزاں دیتا ہے ایک چھوٹا بچہ موتی اور روٹی کے بدلے دے دیتا ہے)

خلاصہ اس مقام پر تمام مقدمات شبہات کو تسلیم کر کے ایک نیا مقدمہ بتلا کر سب کا جواب دیدیا جس سے ہم بے خبر تھے بعینہ یہی حال ہمارا ہے کہ ایک مقدمہ سے غافل ہورہے ہیں یعنی صفت حکیم سے اس لئے شبہات سے پریشانی ہے اس صفت پر غور کرنے سے تمام شکوک حل ہو جائیں گے۔ اس وقت ایک ولایتی مولوی صاحب نے کھڑے ہو کر باآواز بلند سوال کیا کہ قرآن میں ہے اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ تو غیر صالحین ارض کے مالک ہیں فرمایا کہ اس سے مراد امۃ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہ آیت پیشین گوئی ہے جو کہ پوری بھی ہو چکی قاعدہ کلیہ نہیں کہ ہمیشہ صالحین ہی مالک ہوں گے یعنی مطلق ہے دائمہ نہیں جس سے شبہ کیا جائے (اس کے بعد فرمایا کہ) اب میں وعظ ختم کر چکا ہوں ایک ضروری گزارش ہے کرتا ہوں کہ میں نے جب وعظ کا وعدہ کیا تھا تو یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ اور کوئی صاحب تقریر نہ کریں اس کو شاید کوئی صاحب تفرد پر محمول فرماویں لیکن یہ تو خدا کو معلوم ہے کہ میری کیا نیت ہے پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجھے جلسہ کا صدر بنایا گیا ہے اسلئے میں اس وعدہ کی بنا پر بھی اور بحیثیت صدارت بھی منع کرتا ہوں کہ اب کوئی صاحب تقریر نہ کریں، البتہ اس کے بعد شاید امام صاحب کچھ فرمائیں تو اس کو سن لیجئے گا وہ شاید چندہ کی تحریک فرمائیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ، ہمارے اعمال کو درست فرمائیں. آمین.

(آمین والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ

علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین)

الشکر

یہ وعظ ۸ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ بمقام تھانہ بھون مکان بیری والا جوکہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ پچاس منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔ مستورات بھی تھیں جس کو مولانا محمد عبداللہ گنگوہی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ

ترجمہ:۔اس میں نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کیلئے جو صابر اور شاکر ہو۔

یہ جملہ ایک آیت طویلہ کا جزو ہے اس سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں اور اس کا تتمہ اس جملہ کو قرار دیا ہے۔اور اس مختصر جملہ میں فضیلت اور مدح کے ساتھ دو بڑی چیزوں کا ذکر ہے۔

تمہید

حق تعالیٰ شانہ کی دو پسندیدہ چیزیں:

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک وہ دونوں شے پسندیدہ بلکہ واجب اور مامور بہ کے درجہ میں ہیں اور وجوب اور ضرورت بھی ان کی اس درجہ ہے کہ کوئی وقت ان کی ضرورت سے خالی نہیں ہے کبھی ایک کی کبھی دوسری کی نوبت بنوبت ہر وقت ضرورت ہے کوئی حالت ایسی نہیں ہے کہ دونوں کی یا ایک کی ضرورت نہ ہو پس ظاہر ہے کہ ایسا امر کس درجہ کا ضروری ہوگا۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض عبادات اور مامور بہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ خاص خاص

اوقات میں ضروری ہوتے ہیں جیسے نماز روزہ باوجودیکہ اسلام کے ارکان اور شعائر ہیں لیکن بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت یہ صرف غیر ضروری ہی نہیں بلکہ معصیت ہوجاتے ہیں۔

ایسی عبادات جو بعض اوقات معصیت ہوتی ہیں:

چنانچہ عین دوپہر یا غروب یا طلوع آفتاب کے وقت نماز منہی عنہ ہے۔ بقرعید کے دن روزہ ممنوع ہے اور اسی طرح مکلفین کے اعتبار سے بھی ان کو عموم نہیں چنانچہ حائضہ اور نفساء اگر نماز روزہ ادا کریں تو گناہ ہے۔

بعض غیر ضروری امور:

اور بعض امور ایسے بھی ہیں کہ خاص خاص اوقات میں تو نہیں لیکن غیر ضروری ہیں نماز روزہ ہی کو یہاں بھی لے لیجئے کہ بعد ادائے فرائض وسنن ضروری نہیں رہتے تطوع کے درجہ میں آجاتے ہیں۔

ہر وقت کے ضروری کام:

اور بعض امور وہ ہیں کہ وہ ہر وقت اور ہر شخص کے لئے ضروری ہیں یعنی جن اوقات میں آدمی غیر مکلف ہوتا ہے جیسے نوم جنون نابالغی اس کے سوا ہر وقت ضروری کسی وقت اور کسی حالت کی قید نہیں صبح شام لیل ونہار وضو بے وضو غیر قبلہ رخ ہر وقت ضروری ہیں اس شان کی بھی بہت سے عبادات ہیں منجملہ ان کے دو وہ ہیں جن کا ذکر حق تعالیٰ نے اس جزو آیت میں فرمایا ہے چنانچہ مختصراً حاصل مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض آیات قدرت کو بیان فرما کر فرماتے ہیں۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ. یعنی ہم نے جو اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں ان کو دیکھتے سب ہیں لیکن ان کو آیات قدرت سمجھنا پھر اس سمجھنے سے منتفع ہونا ہر ایک کے لئے نہیں۔

انتفاع کی دو شرطین:

بلکہ اس انتفاع کی دو شرطیں ہیں ایک کو لفظ صبار سے تعبیر فرمایا اور دوسری کو شکور سے یعنی جس شخص کے اندر دو صفتیں ہوں اول صبر دوسرے شکر وہی ہماری آیات قدرت سے نفع حاصل کرتا ہے یہ ہے اس آیت کا حاصل اس مقام سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صفتوں کی کس درجہ مدح فرمائی ہے کہ ان آیات قدرت سے منتفع ہونے کا موقوف

علیہ قرار دیا ہے۔ اور اسی سے دونوں صفتوں کا وجوب بھی مفہوم ہو گیا ہوگا کیونکہ واجب کا موقوف علیہ واجب ہے اور آیات الٰہیہ سے اعتبار کا واجب ہونا ظاہر ہے۔ اب یہ سمجھئے کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ایسی عبادتیں کہ جن کی ہر وقت ضرورت ہے متعدد ہیں پھر ان میں سے صبر شکر کو جو میں نے اس وقت بیان کے لئے اختیار کیا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

صبر و شکر کے امر میں ہماری کوتاہی:

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم لوگوں کے اندر ان دونوں امر میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے جو دنیا دار ہیں ان کی تو شکایت ہی کیا ہے جو دین دار کہلاتے ہیں وہ بھی نماز روزہ کو تو ضروری جانتے ہیں اور ان کا اہتمام بھی ایک درجہ میں ہے لیکن بہت تاریخیں ایسی گزری ہوں گی کہ ایک دفعہ بھی صبح سے شام تک بڑی سے بڑی نعمت پر بھی شکر نہ کیا ہوگا کیسی غضب کی بات ہے کہ جس شے کی ہر وقت ضرورت ہو اس سے ہمارے ہفتے کے ہفتے اور مہینے کے مہینے خالی گزر جائیں ایسے ہی صبر کے اندر بہت کوتاہی ہے۔ بہت سے مقام اور مواقع ایسے پیش آتے ہیں ہم کو ضرورت صبر کی ہوتی ہے لیکن ہم سے اس میں بہت کوتاہی ہوتی ہے وجہ ان دونوں میں کوتاہی کی یہ ہے کہ دونوں کے مواقع اور محال سے بے خبری ہے شکر تو صرف کھانا کھانے یا لذیذ شے یا ٹھنڈا پانی پینے کے بعد سمجھ رکھا ہے اور صبر کا موقع صرف کسی عزیز کے مرنے کے بعد قرار دیا ہے کہ کوئی اپنا عزیز مرے تو روئے نہیں اور منشاء اس تمام تر کوتاہی کا ان دونوں کی حقیقت نہ جاننا ہے بالخصوص عورتیں تو ان کی حقیقت سے بالکل ہی ناواقف ہیں۔ اور جس قدر مفہوم دونوں کا سمجھ رکھا ہے اس میں بھی بہت کوتاہی ہے۔ بہر حال چونکہ صبر و شکر کی ہر وقت ضرورت تھی اور ان میں کوتاہی بھی عام تھی اور نیز ان کی حقیقت سے بے خبری تھی۔

عورتوں میں صبر و شکر کی کمی:

ادھر عورتوں کی بھی اصلاح مقصود ہے اس لئے ان میں یہ دونوں صفتیں بہت کم ہیں بلکہ کالعدم ہیں اس لئے اس بیان کو اختیار کیا گیا یہ تو تمہید تھی اب مقصود عرض کیا جاتا ہے کہ اول صبر و شکر کی حقیقت سمجھو اس کے بعد دونوں کے محل معلوم کرو کہ کس موقع پر صبر کا حکم ہے اور کس موقع پر شکر کا۔ پھر اپنے افعال سے موازنہ کرو اس سے اس کی ضرورت کا

ہر وقت اور ہر شخص کو ہونا جس کا میں نے اول دعویٰ کیا تھا اور اس میں کوتاہی کا عام ہونا اور حقیقت نہ جاننا جملہ دعویٰ خود ثابت ہو جائیں گے۔

صبر کی حقیقت:

سمجھ لینا چاہئے کہ صبر کی حقیقت ہے ضبط النفس علی 'ماتکرہ یعنی ناگوار امر پر نفس کو جمانا اور مستقل رکھنا آپے سے باہر نہ ہونا اور وہ ناگوار امر خواہ کچھ خواہ کسی کا مرنا ہو یا کوئی اور ناگوار امر ہو چنانچہ مواقع صبر کو کسی قدر بسط کے ساتھ عنقریب بیان کیا جاوے گا اس سے تعمیم سمجھ میں آجائے گی۔ اور شکر کہتے ہیں حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرنا خواہ وہ نعمت کھانا ہو یا پانی یا اور شے اور قدر کرنا دل سے بھی اور زبان سے بھی اور دیگر جوارح سے بھی۔ لوگ شکر کی حقیقت صرف اتنی ہی سمجھتے ہیں کہ زبان سے کہہ لیا الحمد للہ یا اے اللہ شکر ہے بس شکر ادا ہو گیا۔

شکر کی حقیقت:

شکر یہ ہے قلب اس کا معترف ہو اور منعم حقیقی کی نعمتوں سے متاثر ہو اور زبان اور دیگر جوارح پر بھی اس کا اثر ہو آگے اس کے مواقع بھی بیان کیے جاویں گے۔ اب مواقع صبر شکر کو سمجھ لیجئے دونوں کی تعریف سے اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا ہو گا کہ صبر کا موقع مصیبت ہے اور شکر کا محل نعمت ہے۔ اتنی بات تو سب کو معلوم ہے لیکن اس میں غلطی یہ واقع ہوئی ہے کہ صبر کا موقع خاص مصیبت اور شکر کا ایک خاص نعمت کو سمجھا ہے اس لئے ان دونوں یعنی مصیبت و نعمت کی حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے۔

نعمت کی حقیقت:

نعمت کی حقیقت یہ ہے النعمۃ حالۃ ملا ئمۃ للنفس نعمت وہ حالت ہے جو نفس کے لئے خوش گوار ہو۔

مصیبت کی حقیقت:

اور مصیبت کہتے ہیں حالۃ غیر ملائمۃ للنفس (مصیبت وہ حالت ہے جو نفس کو ناگوار ہو) کو تفصیل اس محل کی یہ ہے کہ۔

انسان پر دو قسم کے حالات آتے ہیں:

انسان پر دو قسم کے حالات آتے ہیں۔ بعض تو وہ ہیں جو اس کی مرضی کے موافق ہیں اور بعض وہ ہیں جو مرضی کے موافق نہیں۔ اول موقع شکر کا ہے ثانی محل صبر کا اول میں نفس کا اقتضا فرح اور فخر اور اس کو اپنے کسب اور اپنی تدبیر سے سمجھنا اور منعم حقیقی کو فراموش کر دینا اور اس نعمت کو اس طرف نسبت نہ کرنا ہوتا ہے پس شکر یہ ہے کہ اس نعمت کو حق تعالیٰ کی طرف سے جانے اتراوے نہیں اپنا کمال نہ سمجھے غافل اور ناسی نہ ہو اور نعمت میں مشغول ہو کر رب نعمت کو نہ بھولے بلکہ نعمت اس کے لئے اور زیادہ موجب تذکرہ ہو جاوے اب یہ نعمت عام ہے خواہ کھانا ہو یا پانی ہو یا کپڑا ہو یا کوئی ناگوار حالت نہ ہو اور ثانی میں نفس کا اقتضاء یہ ہوتا ہے کہ استقلال نہ ہو جزع فزع شکوہ شکایت ہو ضروری اطاعت ترک ہو جاوے پس صبر یہ ہے کہ نفس کو روکا جاوے اور جمایا جاوے اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا جاوے۔ اب یہ مصیبت عام ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ صبر مرنے ہی پر ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ مصیبت کی حقیقت یہ ٹھہری کہ جو ناگوار حالت ہو تو وہ ناگواری جیسے کسی کے مرنے سے ہوتی ہے ایسی دوسری موقع پر بھی ہوتی ہے۔

ناگواری کے دو محل:

چنانچہ اس ناگواری کے دو محل ہیں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس میں بہت عموم ہے اول موقع کوئی مصیبت مثلاً کسی عزیز کا مرنا یا اپنا کسی عزیز کا بیمار ہونا یا مال ضائع ہونا کسی تمنا کا حاصل نہ ہونا، دوسرا موقع ناگواری کا عبادت ہے کہ اس میں بھی نفس کو ناگواری پیش آتی ہے جیسے نیند چھوڑ کر اپنے بدن کو گھسیٹ کر تہجد پڑھنا نفس چاہتا ہے کہ سوتا رہوں لیکن یہ نفس کے ساتھ منازعت کر کے اور اس کو اس کے مرغوب سے روک اٹھتا ہے پس معلوم ہوا کہ ناگواری عبادت میں بھی ہوتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔ **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسباغ الوضوء علی المکارہ** (مسند احمد: ۲: ۳۰۱) یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کی علامت وضو کو باجود ناگواریوں کے کامل کرنا یعنی جاڑے کے دن ہیں سردی بہت ہو رہی ہے لحاف سے ہاتھ نکالنے تک کو جی نہیں چاہتا مگر

اس حالت میں بھی وضو پورا پورا کیا ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھویا دیکھئے حدیث میں مکارہ کا لفظ ہے جس سے ناگواری کا عموم صاف معلوم ہوتا ہے اور مجھے اس ناگواری کے ثابت کرنے کے حدیث کی ضرورت نہ تھی لیکن اس میں میرا ایک مقصود ہے اور وہ یہ کہ

ناگواری نفس کی حالت میں عبادت کی فضیلت:

اکثر سالکین کا مقصود ذکر و شغل سے یہ ہوتا ہے کہ عبادت آپ سے آپ ہونے لگے نفس کو ناگواری اور کشاکشی نہ ہو چنانچہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم کو اتنا دن ہوگئے ذکر و شغل کرتے ہوئے مگر نفس کے اندر یہ بات پیدا نہیں ہوئی حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ناگواری کے ہوتے ہوئے عبادت کرنے کی فضیلت اور مدح بیان فرماتے ہیں علی المکارہ کے لفظ سے اہل لسان خود معلوم کر سکتے ہیں کہ مبالغہ کے لئے فرمایا ہے پس مبالغہ کے ساتھ عبادت کا ذکر ہو وہ عمل اعلیٰ درجہ کا ہوگا اگر یہ حالت مذموم ہوتی جیسی سالکین سمجھتے ہیں تو اس کی مدح کیوں فرماتے پس ناگواری فضیلت کو اور زیادہ بڑھانے والی ہے پس اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ ذاکر کو جب ذکر و شغل میں ناگواری اور کشاکشی ہو تو اور زیادہ خوش ہو کہ ہمارا اجر بڑھا اور یاد رکھو یہ کشاکشی جس کو تم مذموم سمجھتے ہو یہ ہی ترقی کا سبب ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان کا کمال ہی کیا ہے۔ ہاں دوسری صورت جو ضد ہے کہ عبادت میں لذّت اور حلاوت ہو یہ بھی ایک کمال ہے مگر یہ دوسرے اعتبار سے ہے اس کے کمال ہونے سے یہ کیسے لازم آیا کہ ناگواری کمال نہیں ہے بلکہ جس قدر مشقت زیادہ ہو خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہئے کہ باوجود اس کے کہ ہم کو ناگواری تھی لیکن پھر بھی حق تعالیٰ نے ہم سے یہ کام لے لیا۔ بہر حال مشاہدہ سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ جیسے مصیبت کے اندر ناگواری ہوتی ہے عبادت کے اندر بھی ہوتی ہے۔ پس صبر کا تعلق دو چیزوں سے ہوا ہے مصیبت سے بھی اور عبادت سے بھی مصیبت میں تو صبر یہ ہے جزع فزع نہ کرنا اور عبادت یہ ہے کہ باوجود ناگواری کے نفس کو اس پر جمانا اور ناگواری کی پرواہ نہ کرنا چاہئے چنانچہ دونوں کی نسبت ارشاد ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا اصْبِرُوْا تو مصائب میں صبر کرنا اور صابروا دوسروں کو صبر کی تعلیم کرنا اور رابطو عبادت کے اندر جمار ہنا۔

رباط کی تفسیر:

چنانچہ رباط کی تفسیر حدیث میں آئی ہے کہ ایک نماز پڑھکر دوسری نماز کی انتظار میں بیٹھے رہنا اور یہ ہی مفہوم صبر کا ہے مصیبت میں اس کا نام صبر ہوا اور عبادت میں اسی کو رباط سے تعبیر فرمایا۔ پس صاف معلوم ہو گیا کہ صبر کے دو محل ہیں مصیبت اور عبادت۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ صبر اور شکر کیا چیز ہیں۔

ناگواری کی حالت میں صبر اور راحت نفس کے وقت شکر واجب ہے:

اور یہ بھی واضح ہوا ہو گا کہ ان کی ہر وقت ضرورت ہے اس لئے کہ انسان پر دو حالتوں میں سے ایک حالت کا رہنا لازمی ہے تو ایسی حالت ہو گی کہ جب راحت ہو گی اور یا موجب ناگواری ہو گی اس کے سوا تیسری حالت نہیں اور راحت سے میری مراد لذت نہیں تا کہ یہ شبہ ہو کہ ایک حالت یہ بھی تو ہے کہ نہ لذت ہو نہ مصیبت ہو بلکہ مراد راحت ہے اس حالت کا گوارا ہوتا ہے پس گوار حالت پر شکر اور ناگوار پر صبر ضروری ہے پس معلوم ہوا کہ انسان پر ہر وقت یہ دو عبادتیں بطور مانعۃ الخلو کے واجب ہیں یعنی ایسی حالت کوئی نہیں ہے کہ اس میں بھی واجب نہ ہو یا ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں دونوں واجب ہوں مثلاً ایک ناگوار حالت پیش آئی تو صبر واجب ہوا اور عین اس حالت میں بہت سی اس پر نعمتیں بھی ہیں بلکہ یہ ناگوار حالت بھی اگر غور کیا جاوے تو ایک نعمت ہے تو بعینہ اسی وقت میں اس اعتبار سے شکر بھی واجب ہے۔ اب ہم کو اپنی حالت کا موازنہ کرنا چاہئے کہ ہم کتنا صبر و شکر کرتے ہیں حالت ہماری وہ جیسا جس کو حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا(۱۹) اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا(۲۰) وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا یعنی انسان خفیف الحرکت اور اوچھا اور بودا لچر ہے اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا جس وقت کوئی مصیبت آتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے یعنی صبر نہیں کرتا اور جب کوئی خیر اس کو لاحق ہوتی ہے تو خدا کی نعمتوں کو روکتا ہے یعنی دوسروں سے بخل کرتا ہے یہ ناشکری ہے اس لئے کہ قدر نعمت کی نہ کرنا ناشکری ہے اور قدر کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ جیسے خدا تعالیٰ نے تم پر احسان کیا

ہے تم خدا کے بندوں کے ساتھ احسان کرو پس دوسروں سے نعمت روکنا بھی ناشکری ہے غرض ہماری یہ حالت ہے کہ مصیبت میں جزع اور نعمت کے بجائے شکر کے منع۔

نعمتوں کی دو اقسام:

اب نعمتوں میں بھی غور کر لیجئے جو کہ محل ہیں شکر کا اگر چہ احصاء نعمتوں کا محال ہے لیکن جو نعم ہم کو معلوم ہیں سو وہ دو قسم کے ہیں دنیویہ اور دینیہ دنیویہ تو یہ ہیں کہ تندرستی چشم و گوش، ہاتھ پاؤں، نوکر چاکر، عزت و آبرو، بیوی بچے، مکان جائیداد، دینیہ یہ ہیں کہ اپنی محبت و معرفت عطا فرمائی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اپنی مرضیات اور نا مرضیات سے آگاہ فرمایا اگر ہم کو مطلع نہ فرماتے اور ہم کو اپنی رائے اور عقل اور سلیقہ پر چھوڑ دیتے اور پھر ان غلطیوں پر مواخذہ فرماتے تو ان کو حق حاصل تھا دیکھو۔ دنیا میں نوکروں کو کہا جاتا ہے کہ ہمارے اشارہ پر چلو اگر کچھ مخالفت کرتے ہیں مواخذہ کرتے ہیں، باز پرس کرتے ہیں کہ تم نے ہمارے اشارہ کو نہیں سمجھا تو باوجود ایک قلیل معاوضہ کے جب ہم کو یہ حق ہے تو کیا حق تعالیٰ کو حق نہ تھا کہ ہم کو ہماری عقل پر چھوڑ دیتے اور معاصی پر مؤاخذہ کرتے اگر ایسا کرتے تو کیسی سخت مصیبت ہوتی اس لئے کہ ہماری عقل مرضیات و نامرضیات کے ادراک کیلئے کافی نہ تھی ایسا نہیں، کیا بلکہ تمام احکام کو صاف صاف بیان فرما دیا ہے اور ایک مرتبہ نہیں۔

کلام اللہ میں احکام مکرر سہ کرّر بیان کا سبب:

بلکہ مکرر سہ کرر بیان فرمایا کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا ہم نے کیا کیا کہ اس کی قدر تو کی نہیں برعکس اس میں شبہات نکالنے لگے کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو مکرر کیوں بیان فرمایا ۔اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت یہ ہی ارشاد فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا یعنی ہم نے لوگوں کے لئے طرح طرح سے اسلئے بیان کیا ہے تا کہ نصیحت قبول کریں اس کی قدر اس کو ہوگی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے دیکھو باپ بیٹے کو کس کس طرح سمجھاتا ہے صرف ایک مرتبہ سمجھانے پر اکتفا نہیں کرتا اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد مواخذہ کرتا ہے بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے۔ دوسری تیسری چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے جب تک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اس کو چین نہیں آتا جب بالکل

لاچار ہوجاتا ہے مجبوری زجروتوبیخ سے کام لیتا ہے پھراس میں بھی ایلام اور ایذاء مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مدنظر ہوتی ہے حق تعالیٰ کو باپ سے بدر جہازیادہ شفقت ہے اوراس کو باپ سے زیادہ اس کے مصالح کی رعایت ہے اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں نوع بنوع کے طرز سے بیان فرمایا ہے اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ کو بیٹے کے حال پر جو عنایت ہے اس کا منشا تو غرض ہے کہ باپ کو ہی امید ہوتی ہے کہ بیٹا میرے کام آوے گا یا یہ کہ اس سے میرا نام چلے گا اور کچھ نہیں یہ تو ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ ایسا کیا علاقہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے مادہ اس کی تربیت واصلاح کی طرف مضطر ہوتا ہے اور اسی سے اس کو راحت ہوتی ہے بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہے غنی بالذات ہے اور نہ ہماری طرح کسی شی سے وہ متاثر ہوتے ہیں ہم تو محبت سے یا کسی دوسری غرض سے مجبور بھی ہوجاتے ہیں اور وہاں چونکہ غنی ذاتی ہے اس لئے کسی شے کی احتیاج نہیں اور ماسوااس کے سب محتاج ہیں۔ بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے اس لئے کہ اگر عالم میں انسان نہ رہے تو کسی شے میں کوئی خلل نہ آوے سب اپنے ہی حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شے بھی رہے تو انسان کی بقاء دشوار ہوجاوے مثلاً پانی نہ رہے ہوا نہ رہے یا آگ نہ رہے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر انسان ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں۔

انسان کے محتاج ہونے کا راز:

اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شے کا محتاج ہے اور یہ بات کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا سو راز اس میں یہ ہے کہ اس کو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب نہ ہوجاوے اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگادی گئی ہیں کہ جب ناز اور فخر ہو تو فوراً اس طرف بھی نظر کرلے کہ میں کیا ناز کروں میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں۔ اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہوں گی۔ بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شے انسان کی محتاج نہیں اور اللہ تعالیٰ کو انسان کی تو کیا احتیاج ہوتی جن چیزوں کا خود انسان

محتاج ہے اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں بلکہ یہ امر عقلاً ونقلاً ثابت ہے کہ شے اپنے وجود اور بقاء میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے پس حق تعالیٰ کے اس استغناء اور انسان کے احوج ترین مخلوقات ہونے کا اقتضاء تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخاطب نہ بناتے لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے حقوق تو ضرور ہی ہوتے پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا نہ جاتا تو سخت مصیبت ہوتی جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلاتے ہیں خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور ایک دو ہی کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتنا مزاج شناس ہو کہ اشارے کو سمجھے علی حزیں شاہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضانی کا نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ علی حزین شاہ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے بادشادہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیج دیا علی حزیں باغ میں بیٹھے تھے اور نیا خدمت گار باغ کے دروازے پر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا اس خادم نے وہ رقعہ پہنچا دیا اس میں درخواست تھی کہ لیموں عنایت فرمایئے علی حزیں نے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دے دیا یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو تو بند کر لیا اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں یہ کس بات پر بگڑے ہیں اتفاق سے وہاں رمضانی بھی آ نکلا۔ اس سے خدمت گار نے سارا قصہ بیان کیا رمضانی نے کہا چہرہ پر بل ڈال کر رقعہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ لیموں دیدو، لیموں ترش ہوتا ہے انہوں نے چہرہ ترش کر کے بتلا دیا خادم یہ سن کر بھاگا اور سوچا کہ میں یہاں رہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔ یہ حکایت صحیح ہے یا غلط ہے بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے تو حق تھا، لیکن کیسی مصیبت ہوتی اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا سو ایسا نہیں کیا بلکہ ایک ایک مضمون کو خوب کھول کر دو دو مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیج دیتے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے میں دقت ہوتی ہے بلکہ ایک عجیب اور فطرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنس بشر سے ہونا ایک نعمت ہے:

وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جن کی شان یہ ہے

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہماری جنس سے ہونا ایک نعمت تو یہ ہے اس لئے اگر کسی فرشتہ یا جن و بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مر جاتے اور آپس میں کچھ مناسبت بھی نہ ہوتی آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبہ سے گزار کر الہ تک پہنچا دیں گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافی ہے حالانکہ یہ عین رحمت الٰہی اور عین کمال نبوی بھی ہے کہ بشر ہو کر قرب کے ایسے درجہ پر تھے کہ یہ کمال تھا اور رحمت اسلئے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لا دیں سو ان عبدیت کو مٹانے والوں کی وہی حالت ہے۔

یکے بر شاخ بن مے برد

کہ ایک شیخ جس شاخ پر بیٹھا تھا اسی کو کاٹتا تھا۔

اسی صفت کے ذریعہ سے تو ہم کو ہدایت ہوئی اور یہ ظالم اسی کو اڑانا چاہتے ہیں۔ اور اپنے نزدیک اس کو مدح اور شان بڑھانا سمجھتے ہیں اور بشریت کے اثبات کو تنقیص کہتے ہیں نعوذ باللہ۔ الحاصل اثبات میں ایک نعمت تو یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر بنایا دوسرے یہ کہ عزیز علیه ماعنتم یعنی ارشاد ہے کہ امتیو تمہاری مشقت ان پر بہت شاق ہے حریص علیکم بالمؤمنین رؤف الرحیم ۔تم پر حریص اور مومنین کے ساتھ شدت سے رحمت فرمانے والے ہیں۔ کیا ٹھکانا ہے آپ کی شفقت کا ہم تو تمام رات آرام سے سوویں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے تمام رات کھڑے ہو کر گزار دیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و رحمت:

ایک مرتبہ ایک آیت میں صبح ہو گئی وہ آیت یہ ہے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَکِيْمُ

(یعنی اے اللہ اگر آپ ان کو عذاب کر دیں تو آپ کے بندے ہیں اور اگر ان کے لئے بخشش فرما دیں تو آپ غالب ہیں حکمت والے ہیں، اور ہم تو سوتے بھی نہ تھے بلکہ معدوم محض تھے سو ہم ناکاروں کیلئے جن کا اس وقت وجود بھی نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تعب اٹھاتے تھے اور فکر میں گھلے جاتے تھے چنانچہ ارشاد ہے۔

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم شاید اس غم میں ہیں کہ یہ مومن نہیں ہوئے آپ اپنی جان ہلاک کردیں گے اور یہ سب مجاہدہ اور محنت ہمارے لئے تھی ورنہ خود تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی۔ لِیَغْفِرَلَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادیں) تو آپ کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ اتنا تعب برداشت فرماویں۔) غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود ہمارے لئے سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے حاصل یہ کہ نعمتیں خواہ دینی ہوں یا دنیوی ہم پر ہر وقت بے شمار نعمتیں ہیں اسی لئے ارشاد ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا یعنی اگر تم اللہ کی نعمت کو شمار کرو تو احاطہ نہیں کر سکتے اور بعض نعمتیں وہ ہیں جن کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا وہ بھی ملا لو تو یہ مضمون اور بھی مؤکد ہوتا ہے۔

وجودی اور عدمی نعمتیں:

شرح اس کی یہ ہے کہ نعمتیں دو قسم کی ہیں وجودی اور عدمی لوگ وجودی کو شمار کرتے ہیں مثلاً رزق ملنا، کپڑا ملنا، مال حاصل ہونا ان کو تو نعمتیں جانتے ہیں اور عدمی کی طرف کسی کا ذہن ہی منتقل نہیں ہوتا حالانکہ وہ اپنے اسباب کے اعتبار سے بے انتہا ہیں مثلاً اس وقت ہم آرام اور عافیت سے بیٹھے ہیں اس مکان کی چھت ہم پر نہیں گرتی یہ دیواریں نہیں گرتیں، آسمان سے پتھر نہیں برستے کوئی سانپ بچھو درندہ ہم کو نہیں ستاتا چور رہزن ڈاکو نہیں لوٹتے۔ بستی میں امن وامان قائم ہے۔ کوئی ہم کو زہر نہیں دیتا کوئی قتل نہیں کرتا۔ روٹی ہم کھاتے ہیں قبض نہیں ہوتا ہضم ہو جاتی ہے۔ لقمہ گلے میں پھنس کر نہیں مرتے۔ پانی پیتے ہیں گلے میں نہیں رکتا۔ ہاتھ پاؤں ہمارے چلتے ہیں رہ نہیں جاتے۔ آنکھوں کا نور سلب نہیں کیا جاتا کانوں کی سماعت نہیں لیجاتی اسی طرح بے شمار نعمتیں ہیں کہ اگر رات دن شمار کرنے لگیں تو شمار نہیں کر سکتے۔ غرض ہر وقت بے شمار نعمتیں ہیں اب فرمایئے کہ ہم کیا شکر ادا کر رہے ہیں۔ خیر اس پر تو ہم کو قدرت نہیں کہ تمام نعمتوں پر شکر ادا کریں اس لئے کہ ان نعمتوں کا احصاء محال ہے۔ لیکن جس قدر قدرت ہے اتنا بھی نہیں کرتے۔ بعض دن

چوبیس کے چوبیس گھنٹے ایسے گزر جاتے ہیں کہ اس میں زبان سے بھی ایک مرتبہ الحمد للہ نہیں کہتے اگر کوئی ذہین آدمی کہے کہ ہم تو پانچ وقت نماز میں الحمد پڑھتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ یہ تمہارا الحمد للہ کہنا محض درجہ عنوان میں ہے درجہ معنون میں نہیں یہ چھلکا ہے جس میں گری نہیں ۔ یعنی الفاظ شکر ہیں اور شکر نہیں اور جب شکر کے معنی نہیں تو شکر نہیں جیسے کوئی بادام خریدے اور اس میں سے مغز نہ نکلے اور نرا چھلکا ہو تو اس کو بادام نہ کہیں گے اسی طرح ہر عمل کا ایک مغز اور روح ہے اور ایک پوست اور صورت ہے ۔

شکر کی روح:

پس روح شکر کی یہ ہے کہ منعم اور نعمت کی دل سے قدر ہو ۔ میں اس کو ایک مثال سے عرض کرتا ہوں اس شکر کی حقیقت ذہن نشین ہو جائے گی وہ یہ ہے کہ مثلاً آپ کا کوئی دوست ہو کہ جس پر آپ مال و جان نثار کرنے سے دریغ نہ کرتے ہوں اور وہ آپ کو عنایت و لطف سے کوئی شئے ہدیۃً بھیجے اور اس سے پہلے اس محبوب نے کبھی آپ کو منہ بھی نہ لگایا تھا اس وقت آپ کی کیا حالت ہوگی ۔ دفعتاً آپ کی حالت بدل جائے گی اور غایت فرحت سے شادی مرگ ہو جائے تو عجب نہیں اور اس شئے کو آپ چومیں گے سر پر رکھیں گے آنکھوں سے لگائیں گے سب کو دکھلاتے پھریں گے کہ ہمارے دوست نے ہم کو یہ تحفہ بھیجا ہے اگر ممکن ہوگا تو اس کو اٹھا کر تبرکات اور منجملہ یادگار کے قرار دے کر رکھیں گے اور اس دوست کے ساتھ پہلے سے دس گنی محبت زیادہ ہو جاوے گی غرض ایک خاص جوش و خروش ہوگا اور اس کے لئے اطاعت بھی لازم ہوگی کہ اگر اس وقت وہ دوست سر بھی مانگے تو حاضر ہے عمر بھر میں حق تعالیٰ کی کسی نعمت پر ایک ہی مرتبہ کوئی بتلا دے کہ کسی کی یہ حالت ہوتی ہو حالانکہ ہر ساعت میں نعمتوں کی ہم پر بارش ہے اور نری الحمد للہ پڑھنے سے کیا ہوتا ہے اگر کوئی کہے کہ ہر حالت کا پیدا ہو جانا ہماری وسعت میں نہیں ہے تو کھانا تو ہم پہلے کھا لیتے ہیں لیکن یہ کود پھاند ہم سے نہیں ہو سکتی ۔ بات یہ ہے کہ امور اختیاریہ میں بھی اس کا ہر مرتبہ اختیاری نہیں ہوتا صرف مرتبہ غیر اختیاری ہوتا ہے مگر باوجود اس کے بھی اس کو اختیاری محض مراتب ابتدائیہ کے سبب کہا جاتا ہے جیسے یوں کہا جاوے کہ تحصیلداری مل جانا اختیاری ہے مطلب

اس کا یہ ہے کہ جو اس کا طریقہ ہے کہ پاس حاصل کرو امتحان دو شرائط اس کی جمع کر دیہ اختیاری ہے غرض طریقہ کسی شے کا جب اختیاری ہوتا ہے تو اس شے کو اختیاری ہی کہتے ہیں اور دوسری مثال لیجئے ایک شخص علامہ دوراں ہے اگر کوئی چاہے کہ میں آج ہی ایسا ہو جاؤں تو غیر اختیاری ہے لیکن جو اس کا قاعدہ اور طریقہ ہے اس کے اعتبار سے اختیاری ہے ایسے ہی شکر کے مراتب ہیں ابتدائی درجہ تو مرتبہ عقلی ہے کہ حق تعالیٰ کو منعم حقیقی جاننے اور عقلاً اس کی قدر پہچاننے اور انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ اس کا اثر طبع اور جوارح اور حرکات و سکنات میں نمایاں ہو جیسا میں نے مثال میں عرض کیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ سے محبت حاصل کرنے کا طریقہ:

اور طریقہ تحصیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچا کرو اور یاد کرو اور ہر نعمت کو اس کی طرف سے جانو رفتہ رفتہ حق تعالیٰ سے محبت ہوگی اور شکر کا درجہ کاملہ نصیب ہو جاوے گا جیسے کوئی عالم ہونا چاہے تو اول الف با تا شروع کرتا ہے بتدریج علم کامل تک نوبت پہنچ جاتی ہے پس جب حقیقت شکر کی یہ ہوئی ہم جو دیکھتے ہیں تو اپنے اندر کوئی درجہ شکر کا نہیں پاتے نہ عقلی درجہ ہے نہ طبعی دونوں سے معرا ہیں اس لئے شکر خواہ عقلی ہو یا طبعی اس کے لوازم میں سے ہے منعم کے حقوق کو ادا کرنا اور اس کی نافرمانی نہ کرنا اب دیکھ لیجئے کہ ہم سے صبح شام تک کتنی طاعت ہوتی ہے اور کتنی نافرمانیاں غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ کوئی وقت بھی نافرمانی سے خالی نہیں گزرتا مگر ہم نے نافرمانیوں کی فہرست چونکہ بہت مختصر بنا رکھی ہے اس لئے ہم کو یہ امر معلوم نہیں ہوتا ہم چوری، زنا، غصب، قتل ناحق، شراب پینے وغیرہ کو محض گناہ سمجھتے ہیں اور حالانکہ گناہ ہاتھ سے بھی ہوتا ہے پاؤں سے بھی ہوتا ہے آنکھ سے بھی ہوتا اور سب سے زیادہ یہ کہ قلب ہمارا بہت گندہ ہے قلب میں حسد، تکبر، حرص، حب مال، حب جاہ کینہ بھرا ہوا ہے نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور قلب میں یہ بلائیں بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب ہم ہر وقت نافرمانی میں مبتلا ہیں تو کھل کھیلیں اور جن نافرمانیوں سے محفوظ ہیں اس میں بھی مبتلا ہو جاویں اس لئے کہ جتنے جرائم سے بچیں بہتر ہے ورنہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص پر ایک مقدمہ قائم ہو وہ اور جرائم کا بھی مرتکب ہونے لگے اس کو تو

یہ چاہئے کہ اس مقدمہ سے بھی کسی طرح بری ہو میرا مقصود اس تعمیم نافرمانی کے بیان سے صرف اس شخص کو جتلانا ہے جو ناز کرتا ہے کہ ہم بڑے فرمانبردار ہیں الحاصل نافرمانیوں کا ارتکاب کرنا بڑی ناشکری ہے یہ تو بیان تھا نعمتوں اور اس کے شکر کے متعلق۔

صبر کے دو محل:

دوسری حالت ہے صبر۔ اس کے دو محل ہیں۔ اول تو مصیبت چنانچہ ارشاد ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ. قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ صابرین کو جن کی حالت یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں سب اللہ کی ملک ہیں اور ہم اسی کی طرف جانے والے ہیں بشارت دیجئے یعنی وہ حضرات شکوہ وشکایت کرتے اور ان کے دل میں حق تعالیٰ کی ناشکری اور بے تعلقی نہیں ہوتی اب ہم اپنی حالت دیکھیں کہ ہمارا کیا معاملہ ہے ہماری حالت یہ ہے کہ ادنیٰ سی مصیبت میں شکوہ وشکایت اور جزع فزع زبان پر آجاتا ہے اور اگر زبان پر نہیں آتا تو دل میں تو ضروری ہوتا ہے۔ دوسرا محل صبر کا عبادت ہے۔ اس کی ہی نسبت ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ . یعنی اے ایمان والو صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد چاہو۔ یہاں دو چیزوں کو جمع کر کے صرف صلوٰۃ کا مضمون بیان کرنا باوجودیکہ مقام مقتضیٰ ہے کہ دونوں کا بیان ہو کہ قرینہ اس کا ہے کہ اوپر صبر وصلوٰۃ کا مجموعہ ایک ہی چیز ہے یعنی صبر علی الصلوٰۃ اور یہ اسی قید سے محکوم علیہ ہے لکبیرۃ کا ورنہ خالی صلوٰۃ میں کوئی گرانی نہیں اور اوپر اس مضمون پر حدیث اسباغ الوضوء علی المکارہ سے استدلال ہو چکا ہے جو بالکل ہی صریح ہے پس صبر کے دو محل ہوئے مصیبت اور عبادت۔ مصیبت کے متعلق جو ہمارا برتاؤ ہے وہ کچھ تو اوپر آچکا ہے۔ اور آئندہ مفصل بیان ہو گا۔ اول عبادت کو لیجئے، عبادت بہت ہیں ان میں نماز ہی کو دیکھ لیجئے۔ صبر کے معنی تو یہ تھے کہ ہم اس حقوق وآداب پر نفس کو مجبور کرتے ہیں یعنی نفس کے خلاف ہم اس کے اہتمام میں اور اس کی تکمیل میں اپنی پوری وسعت خرچ کر دیتے اور حتی الوسع خشوع وخضوع حضور قلب سے ادا کرتے۔

ہماری نماز کی مثال:

مگر ہماری نماز ایسی جو بصورت ہوتی ہے کہ خشوع دوسرے درجہ میں ہے ارکان بھی با قاعدہ ادا نہیں ہوتے نہ رکوع درست ہے نہ سجدہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ پس نام نماز کا ہے باقی حقیقت اور مغز تو ہے نہیں اس نماز کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی دوست سے آپ فرمائش کریں کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے وہ دس دن کے بعد چار آدمیوں کے سر پر ایک کھٹولہ لادے اور اس پر چادر پڑی ہو پوچھا کہ یہ کیا ہے جواب دیا کہ جناب آپ نے آدمی لانے کے لئے ارشاد فرمایا تھا میں آدمی لایا ہوں دوست نے کہا کہ میاں یہ کیسا آدمی ہے دیکھیں تو چادر اتاری تو کیا منظر نظر آیا کہ ایک مضغہ گوشت ہے ہاتھوں سے لولا پاؤں سے لنجا، اندھا، گونگا، بہرا، جذامی غرض دنیا بھر کے عیب اس میں موجود مگر ہاں حیوان ناطق کا اطلاق اس پر صحیح ہے یعنی تعریف آدمی کی اس پر صادق ہے۔ اس پر وہ دوست یہ ہی کہے گا تم بھی عجیب احمق ہو یہ کوئی آدمی ہے یہ کس کام کا ہے پس صاحبو جیسے وہ لغۃً آدمی ہے اسی طرح ہماری نماز بھی لغۃً نماز ہے مگر باعتبار اس کے اغراض مختصر کے وہ نماز نہیں اور جس طرح سے آدمی کا لانا سبب ناراضی صاحب فرمائش کا ہے اسی طرح ہماری ایسی نماز کا پیش ہونا بھی فی نفسہ موجب عتاب حق تعالیٰ شانہ کا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نماز چھوڑ بیٹھو۔

اعلیٰ درجہ کی نماز حاصل کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے:

مقصود یہ ہے کہ اس کمی کی اصلاح کرو اور اسی اصلاح میں جب تک اعلیٰ درجہ کی نماز حاصل نہ ہو سعی کرتے رہو کہ درجہ علیا صلوٰۃ کا حاصل ہو جاوے۔ جب تم اپنی سعی کرلو اور پھر بھی وہ درجہ میسر نہ ہو تو عند اللہ بری ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ایسے کریم ہیں کہ وہ ایسے ہی قبول فرمالیں گے شکایت تو اسی کی ہے کہ اس طرف توجہ ہی نہیں پس سعی کے بعد ہم جیسی نماز پڑھیں گے اگر وہ صلوٰۃ مطلوبہ کے درجہ میں بھی نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کا کام ایسا وسیع ہے کہ وہ اسی کو مطلوب کے درجہ میں کر دیں گے۔ چنانچہ اسی بنا پر آیت فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔

(پس یہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے ۔)

تفسیر حضرت مرشدی علیہ الرحمتہ یہ فرماتے تھے کہ سیئات سے مراد ہمارا نماز روزہ ہے کہ در حقیقت ہی عبادت نہیں بلکہ واقع میں گستاخی اور بے ادبی ہے اور ہم ایسی عبادت کو پیش کر کے بے ادب بنتے ہیں جیسے اس آدمی کا لانے والا بے ادب اور احمق شمار کیا گیا تھا اور ہمارا ایسے عبادات پر اپنے کو مستحق اجر سمجھنا ایسا ہی ہے کسی آقا کا گستاخ نوکر پنکھا جھلے اور ہر دفعہ میں اس کے سر پر پنکھا مارتا ہو اور پھر انعام کا طالب ہو اس پر تو اگر وہ آقا سزا ہی نہ دے تو بڑی عنایت ہے اسی طرح ہماری عبادت بے ادبی اور گستاخی ہے اس پر اگر ہم کو سزا بھی نہ ہو تو بڑی رحمت ہے لیکن حق تعالیٰ کی وہ رحمت ہے کہ ہمارے اس گمان کے موافق کہ ہم ان کو عبادت سمجھے ہوئے ہیں سچ مچ عبادت کر کے اس پر بھی ثواب دیں گے امراء کے یہاں دیکھا ہوگا کہ غرباء مٹی کے خربوزے تربوز بنا کر لاتے ہیں ان کو بھی انعام ملتا ہے ایسی ہی یہ ہماری نماز ہے کیا عجب ہے جو اس پر بھی انعام مل جاوے لیکن واقع میں تو ضرورت اسی کی ہے کہ ہماری ایسی نماز ہو جیسی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اور جب تک یہ حاصل نہ ہو سعی کرتے رہیں غضب تو یہ ہے کہ ہماری تو صورت نماز بھی درست نہیں کیونکہ درستی ہوتی ہے صبر سے یعنی خلاف نفس مشقت اٹھانے سے اور اس سے نفس گھبراتا ہے بلکہ بعضوں نے تو یہ حکم لگا دیا ہے کہ ہم سے خشوع خضوع حضور قلب نماز میں ہو ہی نہیں سکتا میں کہتا ہوں کہ ہو کیوں نہیں سکتا مگر ہاں ذرا نفس کو روکنا پڑتا ہے اور اس میں ہوتی ہے مشقت اس لئے اس سے جی گھبراتا ہے باقی ہو سب کچھ سکتا ہے۔

نماز میں حضور قلب حاصل کرنے کا طریقہ:

چنانچہ اس کا طریقہ عرض کرتا ہوں اگر اس طریقہ پر عمل کرو تو دیکھیں کیسے حضور قلب اور خشوع خضوع نہ ہو وہ یہ ہے کہ فلسفی اور عقلی قاعدہ ہے کہ النفس لا تتوجه الیٰ شیئین فی آن واحد یعنی نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا نماز میں دل حاضر نہ ہونے کی وجہ اصل یہ ہے کہ دل دوسری طرف متوجہ ہے۔ آپ اس کو نماز کی طرف اس طرح متوجہ کریں کہ نماز یاد سے نہ پڑھیں بلکہ ہر جزو کو سوچ سوچ کر ادا کریں یعنی جو حرکت

ساز میں آپ کریں اور جو کلمہ بھی زبان سے کہیں بلا ارادہ نہ کہیں ہر کلمہ اور ہر رکن کے ادا کرنے کے لئے مستقل ارادہ کریں اسی طور سے تمام نماز ختم کر دیں اس میں اول تو مشقت ہوگی اس لئے کہ نفس خوگر ہو رہا ہے میدانوں میں اور بازاروں میں گھومنے اور دوستوں سے باتیں کرنے کا اس لئے اس کو یہ روک بہت گراں ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی عادت ہو جائے گی اب تو ہماری نماز کی ایسی مثال ہے کہ جیسے گھڑی کہ اس کو ایک مرتبہ کوک دو وہ ۲۴ گھنٹہ پورے کر کے ہی دم لے گی اس طرح ہم کو اللہ اکبر کہہ کر بس سلام پھیرنے کے بعد ہی خبر ہوتی ہے۔ رکوع، سجدہ، قومہ، قیام قرأت سب آپ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ پس ساری خرابی نماز کو صرف مشق سے بلا سوچے یاد پڑھنے کی ہے اور علاج بالضد ہوتا ہے پس نماز میں جو کچھ کرو یا کہو سوچ کر اور ارادہ سے کہو مثلاً سبحانک اللّٰھم پڑھو تو اس کلمے کے کہنے کے لیے ارادہ کرو دوسرا کلمہ کہنے کے لئے مستقل ارادہ کرو چند روز اس طرح نماز پڑھنے سے پھر نفس اسی کا خوگر ہو جاوے گا لیکن اس میں کامیابی کے لئے تقاضا اور جلدی نہ کرنا چاہئے۔ رفتہ رفتہ سب کام بن جاوے گا

صوفی نشود صافی تادر نکشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

ترجمہ:۔ (بدوں مجاہدات وریاضت کے اصلاح درست نہیں ہو سکتی خامی دور ہونے اور پختگی ہونے کے لئے ریاضات اور مجاہدات کی ضرورت ہے)

پس معلوم ہوا کہ عبادات کے اندر جو خرابیاں ہیں وہ بے خبری کی وجہ سے ہیں۔ دوسرا محل صبر کا تھا مصائب اس میں ہماری یہ کیفیت ہے کہ ذرا سر میں درد ہو جائے سارے شہر میں گاتے جائیں گے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ بیماری کو بالکل ظاہر نہ کرے بضرورت تو ظاہر کرنا ہی ضروری ہے شریعت نے ہم کو اعتدال سکھلایا ہے اور یہ ہی مشکل ہے واللہ یہ تو آسان ہے کہ کسی سے نہ کہیں اور یا سب سے کہیں لیکن یہ موقع ضرورت میں کہیں اور بلا ضرورت زبان نہ ہلاویں اس میں نفس کو بڑی مشقت ہوتی ہے۔

حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص بارادہ بیعت آیا حضرت نے فرمایا کہ کچھ دنوں کھانا کم کھاؤ جب بیعت کریں گے۔ ایک روز کے بعد وہ شخص پھر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت اگر حکم ہو تو روزہ رکھ لوں مگر یہ تو بڑی مشکل بات ہے کہ

سامنے مزہ دار حلال طیب کھانا موجود ہو اور پھر کم کھاؤں، حضرت نے فرمایا کہ اسی منہ سے کہتے ہو کہ اللہ کا نام لوں گا اتنا بھی نہ ہو سکا۔صاحبو سنت کا اتباع اسی واسطے تو لوگوں کو ناگوار ہے کہ اس میں ہر امر میں اعتدال رکھا ہے اور یہ نفس کو بھاری اور کٹھن ہے اور منشأ اس ناگواری کا یہ ہے کہ نفس چاہتا ہے آزادی کو اور نیز شہرت کو تو اس کو اپنے حظوظ بالکلیہ ترک کر دینا تو اس لئے آسان ہے کہ اس میں ایک آزادی ہے اور مخلوق کی نظروں میں بڑائی ہے کہ فلاں درویش کھانا نہیں کھاتے۔ اتنے برسوں سے انہوں نے کھانا پانی چھوڑ دیا ہے۔اور اعتدال دشوار ہے کہ اس میں شہرت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں صورتاً امتیاز نہیں ہوتا یہی تو وجہ ہے کہ درویشوں کی صورت بنالینا آسان ہے لیکن سنت پر عمل کرنا لوگوں کو دشوار نظر آ رہا ہے۔پس یہ سنت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص عبادت کو آوے اور برابر یہ ہی کہتے ہیں کہ میں اچھا ہوں وہ بیچارہ تو ہمدری کی راہ سے حال پوچھتا ہے اور یہ ایسے تقوے میں آئے کہ اس سے اپنا حال بھی ظاہر نہیں کرتے پس ایسے وقت یہ ہی سنت ہے کہ کہے کہ مجھ کو بخار ہے فلاں حکیم کا علاج ہے آپ بھی دعائے صحت کریں ہاں اگر کوئی مغلوب الحال ہو تو وہ دوسری بات ہے۔

مغلوب الحال کامل نہیں ہوتا:

لیکن یاد رکھو مغلوب الحال کامل نہیں ہوتا گو یہ حالت محمود ہو لیکن کمال نہیں کمال وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ایک مغلوب الحال کی حکایت لکھی ہے کہ انہوں نے قیام کیا جب تک ندا نہیں آئی رکوع نہیں کیا۔رکوع میں گئے تو وہاں ہی رات گزار دی جب تک ندا نہیں آئی قومہ نہیں کیا قومہ کیا تو اب سجدہ میں نہیں جاتے ظاہراً تو لوگوں کے نزدیک یہ شخص بڑا ولی ہے لیکن کمال نہیں۔

کمال صلوٰۃ:

حالانکہ کمال صلوٰۃ وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں اعتدال ہوتا تھا۔

بلاضرورت مرض ومصیبت کا اظہار مناسب نہیں:

پس بیماری کے اندر بھی اعتدال یہ ہے کہ موقع پر اظہار میں ظاہر کرے اور اور بلاضرورت

خاموش رہے اور حضرت عمر فاروقؓ بیمار ہوئے لوگوں نے پوچھا کہ اے امیر المؤمنین کیسا مزاج ہے فرمایا اچھا نہیں لوگوں نے کہا آپ شکایت کرتے ہیں فرمایا کیا میں اپنے رب کے سامنے قوت اور پہلوانی ظاہر کروں غرض جہاں موقع ہو ظاہر بھی کرے اور تدبیر بھی کرے یہ خلاف صبر نہیں چنانچہ اس کی دلیل اسی وقت سمجھ میں آئی حضرت یعقوبؑ نے یوسف کی جدائی کی مصیبت میں فرمایا تھا۔ يَاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ یعنی ہائے افسوس یوسف پر، اس پر بیٹوں نے کہا کہ تم تو ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتے رہو گے۔ تو اس کے جواب میں فرمایا

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّىْ وَحُزْنِىْٓ اِلَى اللّٰهِ یعنی میں تم سے نہیں کہتا میں تو اپنے درد وغم کی اپنے اللہ سے شکایت کرتا ہوں پھر اسی کے ساتھ ہی حضرت یعقوبؑ نے تدبیر بھی فرمائی چنانچہ يٰبَنِىَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ یعنی اے میرے بیٹو جاؤ اور یوسف کا پتہ چلاؤ جامعیت انبیائی کا حصہ ہے۔ بہر حال ثابت ہوا کہ اپنی مصیبت اپنے مرض کو بلا ضرورت گاتا نہ پھرے اور موقع ضرورت میں ظاہر کرے۔

صبر و شکر کی مشترکہ حالتیں:

تیسری ایک قسم عقلی اور ہے یعنی وہ حالت جس کے متعلق صبر و شکر دونوں ہوں اور وہ حالت کوئی جداگانہ نہیں بلکہ جو مواقع صبر کے ہیں وہ بعینہ محل شکر کے بھی ہیں اور اسی طرح جو حالتیں شکر کی ہیں وہ صبر کی بھی ہیں اور اگرچہ ظاہراً تقسیم کا مقتضی تو یہ تھا کہ تین قسمیں جدا جدا ہوتیں اول جس سے شکر محض کا تعلق ہو۔ دوسرے جس سے صبر محض کا۔ تیسرے مرکب لیکن ایسی کوئی حالت نہیں کہ جس میں صبر محض یا شکر محض ہو بظاہر مصیبت ایسی حالت ہے کہ اس میں صرف صبر ہے لیکن ابھی معلوم ہوگا کہ اس کا تعلق شکر سے بھی ہے اور اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے مثلاً ایک شخص بیمار ہوا اور طبیب نے مسہل تجویز کیا لیکن وہ طبیب کسی وجہ سے ناراض ہو گیا نسخہ مسہل کا لکھ کر نہیں دیتے بڑی کوشش کے بعد وہ راضی ہوئے اور نسخہ لکھا اب بتلایئے کہ یہ حالت شکر ہے یا نہیں بیشک شکر کی بات ہے۔ چنانچہ اس طبیب کا شکر یہ ادا کیا جاتا ہے حالانکہ مسہل پینے میں اور دستوں میں سخت تکلیف ہے لیکن اس پر بھی شکر یہ طبیب کا کیا جاتا ہے تو وہ وجہ کیا ہے وجہ یہی ہے کہ مادہ فاسدہ کا ازالہ ہو کر یہ بیمار بالکل صحیح

وتندرست ہو جاوے گا تعجب کی بات ہے طبیب اگر نسخہ مسہل لکھے اس کا شکر یہ ادا کیا جاوے اور اللہ میاں اگر مسہل تجویز کریں تو ان کا شکر نہ کریں۔اب رہی یہ بات کہ مرض اور مصیبت مسہل کیوں کر رہے۔اس کو میں بتاتا ہوں۔صاحبو یہ روحانی مسہل ہے۔اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں چنانچہ حدیثوں میں کثرت سے آتا ہے کہ اہل مصیبت کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔حق تعالیٰ کی رضا بڑھتی ہے کسی کا بچہ مر جاتا ہے تو اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنایا جاتا ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے ''بیت الحمد'' بیت الحمد نام ہونے اور بیت الصبر نام نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں ہم کو حمد بھی سکھلائی گئی ہے۔

مصیبت بھی بڑی نعمت ہے:

پس صاف معلوم ہوا کہ مصیبت بھی بڑی نعمت ہے ایک حکایت یاد آئی۔حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہ کے یہاں ایک مرتبہ اسی کا ذکر تھا کہ بلا بھی نعمت ہوتی ہے ایک شخص آہ آہ کرتا حاضر ہوا کہ حضرت بڑی تکلیف ہے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اس تکلیف کو دور کر دیں مجھے خیال ہوا کہ حضرت دعا کریں گے یا نہیں اگر کریں گے تو ابھی بیان فرما رہے تھے کہ بلا بھی نعمت ہے اس کے خلاف ہوگا اور اگر نہیں کریں گے تو اس کی دل شکنی ہوگی۔حضرت نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے سبحان اللہ کیا دعا فرمائی۔مضمون یہ تھا کہ اے اللہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ بلا بھی ایک نعمت ہے لیکن ہم ضعیف ہیں ناتواں اپنے ضعف کی وجہ اس نعمت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔اے اللہ اس نعمت کو نعمت صحت کے ساتھ مبدل فرما دیجئے۔بہر حال حدیث سے بزرگوں کے ملفوظات سے یہ امر ثابت ہے کہ بلا بھی نعمت ہے پس وہ موقع جیسے صبر کا ہے اس طرح شکر کا بھی ہے اگر کوئی کہے کہ جب نعمت ہے تو مصیبت کدھر سے ہوئی۔بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک صورت مصیبت صورت کے اعتبار سے تو مصیبت اور حقیقت کے اعتبار سے جب کہ اس کی غایت اور منفعت پر نظر ڈالی جاوے تو وہ نعمت ہے مثلاً مرض ہے صورت کے اعتبار سے کہ جسم کو تکلیف ہوتی ہے درد ہوتا ہے مصیبت ہے لیکن غایت اس کی یہ کہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں نفس میں تہذیب آتی ہے نعمت اسی طرح نعمت بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ موقع صرف شکر کا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا

ہے کہ صبر کا بھی موقع ہے مثلاً کسی کے پاس مال آیا شکر کی حالت تو ظاہر ہے لیکن وہاں بھی واجب ہے اس طور سے کہ حدود شرعیہ سے اس کے خرچ کرنے میں آگے نہ بڑھے نفس کو روکے اور حد سے زیادہ اس سے خوش نہ ہو پس مصیبت نعمت عبادت تینوں حالتوں میں صبر وشکر دونوں واجب ہیں بحمد اللہ میرا وہ دعویٰ ثابت ہو گیا ہے صبر وشکر ہر حالت میں ضروری ہے اب ایک بات رہ گئی وہ یہ ہے کہ جب صبر وشکر ہر وقت واجب ہے تو کسی کو شبہ ہو کہ بس نماز روزہ چھوڑ کر انا للہ اور الحمد للہ پڑھا کریں اس شبہ کے ورود سے میں اپنے دعوے سے رجوع نہ کروں گا اور یہی کہوں گا کہ ہاں ہر وقت صبر وشکر ضروری ہیں لیکن صبر وشکر صرف انا للہ اور الحمد کا نام نہیں ہیں آپ بھول گئے میں نے اول عرض کیا تھا کہ صبر نام ضبط نفس کا ہے اور اسکا تحقق نماز روزہ سب ہی پر ہوتا ہے، شکر قدر دانی کا نام ہے اور انا للہ اور الحمد للہ صورت شکر وصبر کی ہے۔ پس عین حالت نماز روزہ حج زکوٰۃ میں دونوں کا تحقق ہو سکتا ہے، پس اب کوئی اشکال نہ رہا۔ اس تقریر سے صبر وشکر کی ضرورت تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔

حصول صبر اور شکر:

اب سمجھئے کہ ان دونوں کا طریقہ تحصیل کیا۔ ان کی تحصیل میں آپ کو دو اور چیزوں کی ضرورت ہوگی خشیت اور محبت خشیت سے نفس کو حدود پر ضبط کرو گے یہ صبر ہے اور محبت سے منعم کی قدر ہوگی اور یہ شکر ہے اور جب دونوں چیز جمع نہ ہوں گی تو صبر اور شکر حاصل نہ ہوں گے اس لئے کہ محبت نہ ہوئی نری خشیت ہی ہوئی تو انعام سے لذت نہ ہوگی اور اگر نری محبت وخشیت نہ ہو تو ناز ہو جاوے گا اور نفس حدود سے آزاد ہو جاوے گا۔ اگر کوئی کہے کہ خشیت اور محبت دونوں کیسے جمع ہو سکتے ہیں عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی کسی پر عاشق ہو تو دیکھئے اس کو محبوب کی محبت بھی ہے اور اس سے خوف بھی ہے کہ وہ ناراض نہ ہو جائے جب مخلوق کی محبت میں یہ دونوں جمع ہو جاتے ہیں تو خالق کی محبت میں تو بدرجہ اولیٰ جمع ہو جاویں گے اور خود خشیت اور محبت کے پیدا ہونے کا یہ طریقہ ہے اپنے اوقات میں سے ایک گھنٹہ اس کام کے لئے علیحدہ کر لو اور اس کو دو حصوں پر منقسم کر لو آدھ گھنٹہ تو بیٹھ کر اپنی نافرمانیاں اور ان کی سزاؤں کو سوچا کرو کہ ہم نے فلاں دن یہ گناہ کیا تھا اور اس کی یہ سزا ہم کو ملنے والی

ہے۔ فرشتے گھسیٹ کر دوزخ میں لے جاویں گے اور وہاں نوع بنوع کا عذاب ہوگا اسی طرح جتنی نافرمانیاں یاد آویں فرداً فرداً اس کو اور اس کے متعلق جو سزا ہے اس کو سوچو اور دوسرے آدھ گھنٹہ میں نعمتوں کو سوچو اول سے خشیت اور ثانی سے محبت منعم حقیقی کی پیدا ہوگی۔ یہ طریقہ تو صبر اور شکر کے پیدا ہونے کا تھا۔

صبر و شکر کی حفاظت کا طریق:

اب ایک طریقہ ان دونوں کی حفاظت کا ہے جیسے درخت ہوتا ہے کہ ایک طریقہ تو اس کے اگنے اور جمنے کا ہے اور ایک طریقہ اگنے کے بعد اس کی حفاظت ونشو ونما کا ہے اسی طرح ان دونوں کی حفاظت کا طریقہ بھی ہے وہ ذکر اللہ اور صحبت اہل اللہ ہے ۱۵۔۱۵ منٹ ان کے لئے بھی آپ نکالیں ۱۵ منٹ خلوت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر لیا کریں اور ۱۵ منٹ کے لئے کسی اللہ والے کے پاس بیٹھ جایا کریں۔

ان شاء اللہ اس طریقہ سے تم کو صبر و شکر کا اعلیٰ مرتبہ نصیب ہوگا جو موقوف علیہ ہے حق تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں سے منتفع ہونے کا اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو صبر و شکر کی اس طریقہ کے تحصیل پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں. آمین.

تحقیق الشکر

یہ وعظ ۲۶ محرم ۱۳۳۹ھ شب جمعہ بمقام تھانہ بھون بر مکان اہلیہ صغریٰ حضرت حکیم الامت ؒ جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ ۲۰ منٹ ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً چالیس تھی۔ مستورات کا مجمع بھی تھا جس کو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ط وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ

ترجمہ:۔اے داؤد علیہ السلام کے خاندان والوتم سب شکریہ میں نیک کام کرو اور میرے بندوں میں شکرگزار کم ہی ہوتے ہیں۔

تمہید

ایک ذات پر انعام سے پورے خاندان کو نفع عظیم:

یہ ایک بہت بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں حضرت سلیمانؑ کا قصہ مذکور ہے اور ان نعمتوں کا ذکر ہے جو سلیمانؑ کو دی گئی تھیں وہ آیت یہ ہے۔

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّھَا شَھْرٌ وَّ رَوَاحُھَا شَھْرٌ. وَاَسَلْنَا لَہٗ عَیْنَ الْقِطْرِ ط وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْہِ بِاِذْنِ رَبِّہٖ ط وَمَنْ یَّزِغْ مِنْھُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْہُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ یَعْمَلُوْنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ط وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ

(اور سلیمان (علیہ السلام) کے ہوا کو مسخر کردیا کہ اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی

ہوتی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی اور ہم نے ان کے تانبے کا چشمہ بہادیا۔ اور جنات میں بعضے وہ تھے جو ان کے آگے کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم سے اور ان میں سے جو شخص ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھادیں گے وہ جنات ان کے لئے وہ چیز بناتے جو ان کو منظور ہوتا بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔ اے داؤد (علیہ السلام) کے خاندان والو تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو اس کے بعد سلیمان علیہ السلام کو اس آیت میں خطاب ہے اور اس میں ان کو شکر کی تعلیم ہے مجھے مقصود اس وقت صرف اس جزو کا بیان کرنا ہے۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ؕ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ اس میں حضرت سلیمانؑ کو شکر کی تعلیم دی گئی ہے مگر عنوان ایسا ہے کہ تمام خاندان کو حضرت سلیمان کے علاوہ بھی شامل ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ انعامات تمام خاندان پر ہیں اس لئے شکر کی بھی سب کو تعلیم دی گئی حالانکہ وہ انعامات خاص سلیمانؑ کے ساتھ مخصوص ہیں پھر عام عنوان کے ساتھ خطاب کیونکر کیا گیا بات یہ ہے کہ خاندان میں جب کسی ایک پر انعام ہوتا ہے تو اس سے سارے خاندان کو نفع پہنچتا ہے اس لئے گو ظاہر میں ایک خاص ذات پر انعام ہے مگر حقیقت میں وہ سارے خاندان کو شامل ہے۔ بڑے آدمی سے خاندان کو ایک ادنی نفع تو یہی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے سارا خاندان معظم ہو جاتا ہے سب کی عظمت لوگوں کی نگاہوں میں ہوتی ہے۔

خاندانی عظمت:

دیکھئے ایک شخص حاکم ہے اس کا کوئی عزیز آپ کے پاس آئے اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ حاکم کا عزیز ہے تو خواہ مخواہ اس کی خدمت کرنے کو جی چاہے گا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ تمنا بھی نہیں ہوتی کہ حاکم کو میری خاطر و مدارات کی اطلاع بھی ہو۔ تم اس کی خاطر و مدارات کر کے دل میں شرمندہ ہوتے ہو کہ ہم سے کچھ بھی حق ادا نہیں ہوا اور اس سے کہتے ہو کہ میری اس خدمت کی اطلاع حاکم صاحب سے نہ کیجئے گا میں نے کیا ہی کیا ہے جس کا ذکر کیا جائے اور اسی طرح ہر شخص اپنے دل میں ٹٹول کر دیکھ لے کہ ایک بڑے شخص کی وجہ سے تمام خاندان کی عظمت ہوتی ہے اور اس کی خدمت کو جی چاہتا ہے خواہ دینی عظمت ہو یا دنیوی چنانچہ مشائخ کی

طرف منسوب ہونے سے ایک خاص جماعت کی نظروں میں وقعت ہوتی ہے علماء کی طرف منسوب ہونے سے اہل علم میں وقعت ہوتی ہے یہ تو دینی عظمت ہے سلاطین اور حکام کی طرف منسوب ہونے سے اہل دنیا کی نظر میں وقعت ہوئی یہ دنیوی عظمت ہے یہ تو ادنی معظم کی طرف منسوب ہونے سے تمام خاندان کو نفع ہوتا ہے پھر جس خاندان میں کوئی نبی ہو اس کی عظمت کا کیا پوچھنا کیونکہ انبیاءؑ دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے معظم ہوتے ہیں بعض انبیاءؑ تو سلاطین بھی تھے اور بالخصوص حضرت داؤد و سلیمانؑ کی سلطنت تو مشہور کہ ایسی بادشاہت نہ کسی کو نصیب ہوئی نہ آئندہ نصیب ہوگی۔ تو ان کی برکت سے ان کا خاندان دینی حیثیت سے بھی معظم تھا۔ اور سلطنت کی وجہ سے بھی اور اگر کوئی نبی صاحب سلطنت بھی نہ ہوں تاہم ان میں فطری طور پر ایک شان جلالت ایسی ہوتی ہے کہ سب پر اس کا اثر ہوتا ہے۔

فیوض خاصہ صرف اہل خاندان کو ملتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے باب میں ارشاد ہے وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا الخ اس کے علاوہ ایک اور خاص نفع بھی خاندان کو پہنچتا ہے کہ جو دوسروں کو نہیں پہنچتا وہ یہ کہ جس خاندان میں کوئی نبی یا ولی یا شیخ ہو اس کے بعضے فیوض خاصہ خاص خاندان والوں ہی کو پہنچتے ہیں دوسرے لوگ خاندان والوں کے درجہ میں ان فیوض خاصہ سے مستفید نہیں ہو سکتے وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل خاندان کو اس نبی سے ایک خاص فطری مناسبت ہوتی ہے جدید مناسبت اور تعلق پیدا کرنے کی ان کو ضرورت نہیں ہوتی دوسرے وہ لوگ ہر دم ان کے حالات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں ان کے مزاج کو خوب پہچانتے ہیں ان کے جزئیات احوال کا علم ان کو دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ہر وقت وہ ان کی پیش نظر ہوتے ہیں اجنبی آدمی دو چار مہینے میں کیا معلوم کر سکتا ہے اسی واسطے مشہور ہے صاحب البیت ادری بما فیہ گھر والا خوب جانتا ہے کہ گھر میں کیا ہے علماء کی اہل کو اور مشائخ کی اہل کو ان کی ہر وقت کی صحبت ہوتی ہے عام لوگوں کو ان کی برابر اطلاع نہیں ہو سکتی۔

اجنبی کو شیخ سے مناسبت تامہ حاصل کرنا آسان نہیں:

ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی اجنبی آدمی بوجہ خلوص اور محبت زائدہ کے ان سے زیادہ حاصل کر جائے مگر ایسے اجنبی نکلیں گے اجنبی آدمی کو شیخ سے مناسبت تامہ اور درجۂ فنا حاصل کرنا سہل نہیں

کسی کسی کو ایسا ہو بھی جائے تو شاذ و نادر بات ہے عادت غالبہ یہی ہے کہ جس قدر قرب ہوتا ہے اسی قدر نفع ہوتا ہے اور زیادہ قرب خاندان والوں کو ہوتا ہے اور ان میں بھی بالخصوص گھر والوں کو اسی لئے مثل مشہور ہے اہل البیت ادریٰ بمافیہ گھر والوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعدد ازواج میں حکمت:

یہ بھی ایک حکمت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بیبیاں کیں کیونکہ وہ ان احکام کو جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں مشاہدہ کے سبب دوسروں سے زیادہ سمجھ سکتی تھیں اور دوسری عورتیں تو صرف سوال اور استفتاء کر کے معلوم کر سکتی تھیں پھر اول تو سوال ہر ہر چیز کا دشوار ہوتا ہے گاہ گاہ کسی بات کو پوچھ سکتے ہیں۔ دوسرے استفتاء کرنے والا اس بات کو پوچھے گا جو اس کے نزدیک سوال کے قابل ہوں گی تو ایسا بہت ممکن ہے کہ اس کے علاوہ اور باتیں بھی دریافت کے قابل ہوں جن کی طرف اس کو التفات بھی نہ ہو۔ اس لئے استفسار کے ذریعہ سے ہر حال کو معلوم نہیں کیا جا سکتا بخلاف اس کے جو شخص ہر وقت پاس رہتا ہے اس کو بدوں پوچھے ہی بہت سی باتیں خود بخود معلوم ہوتی رہیں گی اس لئے بھی آپ نے متعدد نکاح کئے تاکہ ایسے احکام کا بھی اور آپ کی اندرونی حالت کا بھی علم ان متعدد بیبیوں کو ہو جائے تو وہ بآسانی بہت زیادہ عورتوں کو تبلیغ کر سکیں گی۔ چنانچہ اسی قرب و خصوصیت کی وجہ سے عورتوں میں تو ازواج مطہرات کا علم زیادہ تھا بہت سے مردوں سے بھی زیادہ تھا چنانچہ بہت دفعہ اکابر صحابہؓ کو ان کی احتیاج پڑتی تھی بالخصوص حضرت عائشہؓ کا علم تو بہت ہی زیادہ تھا صحابہؓ مشکل مسائل میں بکثرت آ کر تشفی و تسلی حاصل کرتے تھے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعداد ازواج میں یہ بھی حکمت تھی کہ اس کے گھر والے زیادہ ہوں گے تو احکام مخصوصہ کا علم بھی ان کو پوری طرح ہو گا ایک یاد و عورت سے اس قدر مسائل کا احاطہ عادۃً ضرور دشوار ہوتا۔

قرب کو زیادت فیض میں بڑا دخل ہے:

غرض کہ قرب کو زیادت فیض میں بہت بڑا دخل ہے اسی بناء پر بعض لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا تھا ھل خصکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بشیء دون الناس کہ حضرت کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص علوم ایسے عطا فرمائے جو اور آدمیوں کو نہیں بتلائے بعض لوگوں کا یہ خیال تھا۔

کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرب ہے اس لئے ممکن ہے کہ ان کو کچھ اسرار وغیرہ کی باتیں دوسروں سے الگ بتلا دی ہوں جیسا کہ اب بھی بعض غلاۃ صوفیہ کا یہ خیال ہے سو اس وقت بھی بعض لوگ اس خیال کے پیدا ہو گئے تھے اور حضرت علیؓ کے سامنے ہی تشیع کی بنیاد قائم ہو گئی تھی بعض لوگ ان کو حضرات شیخین سے بھی افضل سمجھنے لگے تھے چنانچہ یہ سوال بھی حضرت علیؓ سے ایسے ہی لوگوں نے کیا تھا۔

بعض غلاۃ صوفیاء کی من گھڑت روایت:

بعض غلاۃ صوفیا نے تو اس میں یہاں تک زیادتی کی ہے کہ اس بارے میں ایک روایت گھڑی ہے کہ شب معراج میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نوے ہزار کلمات کے ساتھ تکلم فرمایا تھا۔ تیس ہزار تو عام لوگوں تک پہنچانے کے تھے اور تیس ہزار خواص کے لائق تھے اور تیس ہزار خاص الخواص کے لائق اسرار تھے۔ آپ نے امتحان کیلئے پہلے حضرت ابو بکرؓ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں تم کو وہ خاص اسرار بتلا دوں تو تم کیا کرو گے انہوں نے جواب دیا کہ میں پہلے سے زیادہ عبادت کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم اس قابل نہیں پھر حضرت عمرؓ کو بلایا اور ان سے بھی یہی سوال کیا وہ بولے کہ میں خلق اللہ کی بہت خدمت کروں گا آپ نے فرمایا تم بھی اس قابل نہیں پھر حضرت عثمانؓ کو بلایا نہ معلوم انہوں نے کیا جواب دیا آپ نے فرمایا کہ تم بھی اس قابل نہیں پھر آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بلایا ان سے بھی وہی سوال کیا کہ اگر ہم تم کو خاص اسرار بتلاویں تو تم کیا کرو گے انہوں نے کہا میں پردہ پوشی کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں تم اس قابل ہو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سب اسرار ان کو بتلا دیئے۔ ظالم نے گھڑنے میں بھی غضب کیا ہے بھلا کوئی اس سے پوچھے کہ تم کو یہ خبر کیسے ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نوے ہزار باتیں حق تعالیٰ نے کی تھیں کیا تم وہاں کھڑے تھے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا (کیا تم حاضر تھے جس وقت اللہ تعالیٰ

نے تم کو اس کا حکم دیا) ایک بزرگ سے کسی نے یہی سوال کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج میں حق تعالیٰ کی کیا کیا باتیں ہوئیں انہوں اس کا عجیب جواب دیا فرمایا ۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں　　　　بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(کس کی ہمت ہے کہ باغباں سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور بادصبا نے کیا کیا) کہ اس وقت کس کی جرات ہے جو ان باتوں کو پوچھ سکے یا کس کی ہمت ہے کہ معلوم کر سکے اور بیان کر سکے قیامت کے دن جب حقائق کا انکشاف ہوگا اس وقت پوچھا تو شاید بتلا دیا جاوے۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات صحابہ کو تنہائی میں ان سے بلا کر یہ سوال کیا تھا کیا تم وہاں حاضر تھے اور یہ سوال و جواب کھڑے سن رہے تھے یہ قصے بالکل غلط اور موضوع ہیں بہر حال اس قسم کے خیالات اس زمانہ میں بھی پیدا ہونے لگے تھے اور اسی وقت سے یہ باتیں مشہور چلی آ رہی ہیں یا تو نقل در نقل آ رہی ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذکاوت:

یا یہ کہا جائے کہ آج کل کے شیعوں اور جاہل صوفیوں کے دل میں بھی وہی باتیں آتی ہیں جو پہلے لوگوں کے دل میں آتی تھیں۔

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (ان سب کے قلوب باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں) اور منشاء ان خیالات کا یہ تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذکاوت اور نور فہم اعلیٰ درجہ کا تھا ان کے قضاء یا فیصلے اور حکیمانہ اقوال بہت عجیب و غریب ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ خاص اسرار دوسروں سے علیحدہ بتلائے ہیں اس وجہ سے یہ سوال کیا گیا جس کا جواب حضرت علیؓ نے بڑی تاکید کے ساتھ قسمیں کھا کر یہ دیا **والذی برأ النسمة وفلق الحبة ماخصّنا رسول الله علیه وسلم بشی الامافی هذه الصحیفة اوفهماً اوتیه الرجل فی القرآن** قسم اس ذات کی جس نے جان کو پیدا کیا اور دانہ کو پھاڑا (اور اس میں سے درخت وغیرہ کو نکالا) کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں کیا مگر وہ باتیں جو اس صحیفے میں ہیں یا وہ فہم جو انسان کو قرآن سمجھنے کے لیے عطا ہوا اور صحیفہ میں تو بعض احکام زکوٰۃ اور صدقہ کے متعلق تھے

جو دیگر صحابہ کو بھی معلوم تھے اور فہم ایسی چیز ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دینے کی نہ تھی ہاں یہ نعمت حق تعالیٰ کے دینے کی تھی۔ حضرت علیؓ کے جواب کا حاصل ظاہر ہے یعنی جن لوگوں کا میری نسبت یہ خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خاص علوم بتلائے ہیں یہ خیال بالکل غلط ہے البتہ حق تعالیٰ نے مجھے قرآن کی فہم عطا فرمائی ہے جس وجہ سے یہ عجیب وغریب فیصلے اور حکیمانہ اقوال میری زبان سے نکلتے ہیں۔ مگر بعض لوگ پھر بھی ایسی بھدی طبیعت کے تھے کہ ان کا خیال نہ بدلا اور انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ حضرت علیؓ تقیہ کرتے ہیں اور بات کو چھپانا چاہتے ہیں چنانچہ اب بھی بعض نادان مقتدا اپنے شیخ کے بارے میں کچھ سے کچھ خیال پکا لیتے ہیں اور اگر وہ اس کی تردید کریں تو یوں کہتے ہیں کہ یہ حضرت کی تواضع ہے۔

حکایت حضرت گنگوہیؒ:

حضرت مولانا گنگوہیؒ کی مجلس میں ایک دیہاتی شخص نے دوسرے کو آہستہ سے کہا کہ حضرت نے جو فلاں مسجد کی درستی کا اہتمام فرمایا ہے حضرت کو کشف ہوا تھا مولانا نے یہ بات سن لی۔ پکار کر فرمایا ہے کہ مجھ کو کشف وغیرہ کچھ نہیں ہوا جو کوئی میری نسبت کا ایسا خیال رکھے وہ بالکل غلط ہے تو وہ صاحب چپکے سے دوسرے آدمی سے کیا کہتے ہیں کہ پڑے کہوانہیں کہنے دو انہیں کشف ہوا تھا۔ اب بھلا اس کا بھی کچھ علاج ہے کہ شیخ کی تردید کے بعد بھی اس کی بات نہیں مانی جاتی اور اپنے اعتقاد پر اصرار کیا جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فہم قرآن کا خصوصی علم:

یہی حال حضرت علیؓ کے بعد معتقدوں کا تھا کہ وہ پھر بھی اپنے اسی خیال پر جمے رہے حالانکہ حضرت علیؓ قسم کھا کر اس کی غلطی ظاہر کر چکے اور بتلا چکے کہ مجھے کوئی خاص علم قرآن وحدیث کے سوا حاصل نہیں البتہ قرآن کا فہم حق تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے اگر یہ کوئی خاص بات ہو تو ہو۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ دوسرے صحابہ کو قرآن کا فہم نہ تھا مطلب یہ ہے کہ مجھے قرآن کا فہم حق تعالیٰ نے کچھ دوسروں سے زیادہ عطا فرمایا ہے چنانچہ آپ کا یہ مقولہ تھا کہ اگر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھنے بیٹھوں تو ستر اونٹوں کا بوجھ ہو جائے اور ختم نہ ہو اور غالب وجہ ان علوم کی حضرت علیؓ کا قرب خاص تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیونکہ آپ حضور صلی اللہ

۔یہ وسلم کے داماد تھے اور داماد بمنزلہ اولاد کے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی بھی تھے اور چچا بھی کیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار۔ اگرچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے مگر طبعی محبت کی وجہ سے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت خدمت اور حمایت کی تھی مگر آہ وہ کام نہ آئی۔

بزرگوں سے محض طبعی محبت کامیاب نہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں سے اگر طبعی محبت ہو اور عقلی نہ ہو تو ہیچ ہے۔ اور یہ مطلب نہیں کہ اس سے دنیا میں بھی نفع نہ ہوگا۔ دنیا میں تو اسے کچھ نہ کچھ نفع ہو ہی جائے گا کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ . (جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دے دیں گے) مگر آخرت میں کچھ نفع نہیں ہوتا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ . (یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں) پس کفار جو کچھ اعمال صالحہ کرتے ہیں اس سے دنیا میں ان کو کچھ مل جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ اتنا ملتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی نہیں ملتا اور وجہ اس کی یہ ہے ان کا سارا ثواب یہیں دے دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کا ثواب آخرت کے لئے ذخیرہ ہوتا ہے اس لئے دنیا میں ان کو زیادہ فراخی کم میسر ہوتی ہے۔

کفار کے عذاب میں تفاوت کے دلائل:

اور نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں بھی گو نجات کا نفع نہ ہو مگر پھر بھی کفار کے عذاب میں تفاوت ہوگا جیسا کہ اہل ایمان کے درجات میں تفاوت تو جس کا کفر اشد ہوگا اس کو عذاب بھی سخت ہوگا اور جس کا کفر خفیف ہوگا اس کو پہلے شخص کی بہ نسبت عذاب بھی کم ہوگا اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جہنم کے لئے درجات اور طبقات مختلف ہونا نصوص سے معلوم ہوتا ہے ان المنافقين في الدرک الاسفل من النار . فرماتے ہیں کہ منافقین جہنم میں سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے نیچے کے طبقہ میں عذاب سخت ہے تو جو لوگ اوپر کے طبقہ میں رہیں گے ان کا عذاب منافقین سے ہلکا ہوگا۔

ابوطالب کو آپ کی حمایت سے نفع:

دوسرے ابوطالب کے بارے میں حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب نے آپ کے ساتھ بہت جان نثاری کی تھی اس سے کچھ نفع بھی ہوا آپ نے فرمایا نعم لو لا انا لکان فی الدّرک الاسفل من النار والاٰن فی رجلہ نعلان من النار یغلی بہ دماغہ (کما قال) کہ بے شک ان کو میری نصرت وحمایت سے نفع ہوا ہے اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے نیچے والے طبقے میں ہوتے اور اس وقت صرف ان کے پیروں میں دو جوتیاں آگ کی ہیں جن سے ان کا بھیجا پکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود پھر بھی افسوس کے ساتھ یہی کہا جاتا ہے کہ ابوطالب کی طبعی محبت کام نہ آئی کیونکہ اصل نفع تو یہ ہے کہ جہنم سے نجات ہو جائے سو یہ ان کو حاصل نہیں ہوا۔ باقی عذاب کم ہو جانا یہ بھی اگرچہ ایک قسم کا نفع ہے جس کا نفع ہونا خود ان کو بھی معلوم نہ ہوگا کیونکہ اس وقت وہ اگرچہ پوری طرح آگ میں نہیں ہیں صرف آگ کی دو جوتیاں ان کے پیروں میں ہیں جن سے ان کا دماغ پکتا ہے مگر وہ اب بھی یہی سمجھتے ہوں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو عذاب نہیں۔ تیسری دلیل کفار کے عذاب متفاوت ہونے کی عقلی ہے وہ یہ کہ بعض کفار بہت ظالم ہوتے ہیں بعضے رحمدل ہوتے ہیں بعضے خائن وغاصب ہوتے بعضے دیانتدار اور سخی ہوتے ہیں کوئی فرعون ہے کوئی غریب کمزور تو ظاہر یہ ہے کہ ان کے عذاب میں بھی تفاوت ہوگا مگر جتنا جس کے لئے تجویز ہو جائے گا پھر اس سے کم نہ ہوگا اور ابدالاباد کے لئے جہنم سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ غرض ابوطالب کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور نصرت کا یہ حال تھا کہ باوجود اختلاف دین کے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بے حد جان نثار تھے اور آپ کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور ان کے ایمان نہ لانے کا آپ کو افسوس اور قلق بھی بہت تھا پھر ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب بھی بہت تھا ایک تو چچا تھے دوسرے آپ کے مربی تھے کہ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد انہوں ہی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاد کی طرح بلکہ اولاد سے بھی زیادہ محبت کے ساتھ پرورش کیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس احسان کو کب بھول سکتے تھے بھلا ان کو تو آپ کیسے بھولتے غیروں کے

بھی ذرا سے احسان کو آپ نہیں بھولتے تھے۔ غزوہ بدر میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر کافروں کو قتل اور ستر کو قید کیا اور مقتولین کو ایک کنویں میں ڈلوادیا اس کے بعد آپؐ نے ان ستر آدمیوں کی نسبت جو قید ہو کر آئے تھے۔

مطعم بن عدی کا شکریہ:

فرمایا لو کان مطعم بن عدی حیاً و کلمنی فی ھو لاء النتنی لترکتھم له (سنن أبي داؤد: ۲٦۸۹) ۔اھ کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور مجھ سے ان سڑیل کافروں کی نسبت کچھ کہتے تو میں ان کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا اور فدیہ معاف کر دیتا ۔راوی حدیث اس حدیث کو بیان کر کے اخیر میں کہتے ہیں یشکرلہ کہ اس بات سے ہے آپ مطعم بن عدی کے ایک احسان کا شکریہ ظاہر فرمانا چاہتے تھے اور وہ احسان یہ تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس ہوئے اور اہل طائف نے ایمان قبول نہ کیا آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئے اور شریر لڑکوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا کہ وہ کمبخت آپؐ کے اوپر ڈھیلے پتھر پھینکتے تھے تو آپ وہاں سے مغموم ہو کر لوٹے اور مکہ کے قریب آ کر ٹھہرے اور مطعم بن عدی کو یہ کہلا کر بھیجا کہ میں مکہ میں داخل ہوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں مکہ والے مجھ کو ایذا نہ دیں اگر تم مجھ کو اپنی پناہ میں لے لو تو میں مکہ میں آ جاؤں چنانچہ مطعم بن عدی نے بیت اللہ میں کھڑے ہو کر کفار مکہ سے خطاب کر کے کہہ دیا کہ محمد بن عبداللہ کو میں نے پناہ دی ہے وہ میری حمایت میں ہیں خبردار ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے اس کے بعد آپ مکہ میں تشریف لائے۔ تو غزوہ بدر میں آپ کو اس کا یہ احسان یاد آ گیا اور یہ فرمایا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتا اور ان سڑیل کافروں کی سفارش مجھ سے کرتا تو میں اس کی سفارش قبول کر لیتا اور ان سب کو چھوڑ دیتا تو جب آپ غیروں کا اتنا احساس مانتے تھے تو اپنوں کو تو آپ کہاں بھول جاتے۔ ایک تو یہ مقدمہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ نصوص سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شکر کا تتمہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ محسن نہ ہو تو اس کی اولاد کے ساتھ احسان کیا جائے۔

باپ کے مر جانے کے بعد اس کا حق:

حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے باپ کے مرجانے کے بعد اس کا حق میرے ذمہ کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے دوستوں کے ساتھ احسان کرو اور جو قرابت اس کی وجہ سے ہے اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو تو جب دوستوں کے ساتھ احسان کرنے سے بھی باپ کا حق ادا ہوتا ہے تو اس کی اولاد کے ساتھ احسان کرنے سے اس کا حق کیونکر نہ ادا ہوگا۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ:

دوسری دلیل حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ کے ساتھ رہنا چاہا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ میرے معاملہ میں صبر نہ کر سکیں گے کیونکہ آپ بعض باتوں کو خلاف شریعت دیکھ کر پریشان ہوں گے چونکہ موسیٰؑ کو وحی کے ذریعہ سے خضرؑ کا مقبول خدا ہونا معلوم ہو چکا تھا اس لئے وعدہ فرمالیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میں سب باتوں پر صبر کروں گا۔ خضرؑ نے فرمایا کہ پھر شرط یہ ہے کہ کسی بات پر مجھ کو ٹوکا نہ جائے جب تک میں خود ہی اس کی حقیقت نہ بتلادوں غرض اس قول واقرار کے بعد دونوں حضرات تشریف لے چلے راستہ میں دریا پڑا اور دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے کشتی والے خضرؑ کو پہچانتے تھے دونوں کو سوار کرلیا خضرؑ نے پہلی بات یہ کی کہ اس کشتی کا ایک تختہ بیچ میں سے نکال دیا جس سے پانی بھر کر غرق ہو جانے کا خوف تھا حضرت موسیٰؑ اس حرکت سے بے چین ہو گئے کہ ایک تو کشتی والوں نے ہم پر احسان کیا اس کا بدلہ شکر کی جگہ ان کو یہ دیا کہ کشتی کے غرق کرنے کا کام کیا انہوں نے حضرت خضرؑ سے کہا یہ کیا بات ہے کیا تم کشتی والوں کو غرق کرنا چاہتے ہو یہ تو بہت ہی بے جا بات ہے خضرؑ نے کہا کہ دیکھئے میں کہتا نہ تھا کہ آپ سے میرے معاملات پر صبر نہ ہو سکے گا موسیٰؑ نے معذرت کی کہ مجھ کو یاد نہ رہا تھا اس مرتبہ معاف کرو۔ پھر آگے چلے تو ایک نابالغ معصوم بچہ کو خضرؑ نے مار ڈالا۔ موسیٰ سے اس پر بالکل نہ رہا گیا اگرچہ شرط یاد تھی مگر ایک معصوم کے قتل پر بے چین ہو گئے اور پھر خضرؑ کو ٹوکا کہ یہ تو تم نے بڑا بھاری جرم کیا کہ ایک معصوم کو ناحق مار ڈالا انہوں نے پھر وہی شرط یاد دلائی موسیٰؑ نے فرمایا کہ اس کے بعد اگر میں ٹوکوں تو پھر آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا پھر ایک گاؤں میں پہنچے ان صاحبوں کو بھوک لگ رہی تھی گاؤں والوں سے

دعوت کی درخواست کی کہ ہماری دعوت ضیافت کر دو وہ ایسے ظالم تھے کہ صاف جواب دے دیا یہ بھی نہ دیکھا کہ ہم سے دعوت مانگ رہے ہیں پورے ہی کم قسمت تھے کہ ایسے لوگ خود دعوت مانگیں اور وہ ٹکا سا جواب پکڑا دیں خیر یہ دونوں حضرات خاموش رہے اس کے بعد خضرؑ نے اس گاؤں میں ایک دیوار شکستہ دیکھی جو گرا چاہتی تھی اس کو انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کرامت کے طور پر سیدھا کر دیا ہمارے موسیٰؑ تو صاحب جلال تھے ان سے نہ رہا گیا فرمایا جس بستی کے لوگوں نے ہمارے ساتھ ایسی بے مروتی کی ان کے ساتھ آپ کو مروت کی کیا ضرورت تھی اگر دیوار گر پڑتی اور اگر آپ کو ایسا ہی مروت کا جوش تھا تو اجرت لے کر درست کی ہوتی تا کہ اس اجرت ہی سے ہم کھانا وغیرہ خرید کر کھا لیتے خضرؑ نے کہا کہ بس حضرت اب ہماری اور آپ کی جدائی ہے آپ نے دوسری شرط کو بھی نہ نباہا۔ اس کے بعد خضرؑ نے سب باتوں کی حقیقت بتلائی کہ میں نے کشتی کا تختہ اس لئے توڑا تھا کہ پیچھے ایک ظالم بادشاہ صحیح سالم کشتیوں کو غصب کرتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ یہ کشتی ضبط نہ ہو کیونکہ اس کے مالک ہمارے محسن تھے اس لئے میں نے اس میں عیب ڈال دیا اور جب وہ اس کو چھوڑ کر چلا گیا پھر کشتی والوں نے درست کر دیا۔ اور لڑکے کو اس لئے قتل کیا کہ اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ اگر یہ بالغ ہوگا تو کافر ہو جائے اور اس کے والدین مسلمان تھے اور ان کو اس سے محبت بہت تھی اگر یہ بڑا ہو کر کافر ہوتا تو اندیشہ تھا کہ ماں باپ بھی اس وجہ سے کافر ہو جاتے اس لئے میں نے اس کو مار ڈالا۔ اور دیوار کو میں نے اس لئے درست کیا کہ اس کے مالک دو یتیم بچے تھے جن کا خزانہ اس کے نیچے دبا ہوا تھا اگر وہ گر پڑتی تو ان کا خزانہ لٹ جاتا اس کے بعد یہ بھی فرمایا۔ وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا. فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ. اور ان کا باپ نیک شخص تھا تو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ وہ دونوں یتیم جوان ہو کر اپنا خزانہ خود نکال لیں یہ رحمت تھی خدا تعالیٰ کی طرف سے اس جگہ پر مفسرین نے متنبہ فرمایا ہے کہ وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رحمت میں باپ کی صلاحیت کو بھی دخل تھا اگرچہ مفسرین کی اس تنبیہ کی ضرورت نہ تھی اور نہ اس تنبیہ پر آیت کی دلالت کا مدار ہے عقل سے خود یہ بات آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ اگر باپ کی صلاحیت کو

خضرؑ کے فعل میں کچھ دخل نہ ہوتا تو ان کو اس جملے کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی وَکَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا مگر خدا تعالیٰ مفسرین کو جزائے خیر دے کہ وہ بدیہی باتوں پر بھی تنبیہ کر دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کو اس طرف التفات نہ ہو تو التفات ہو جائے اور سچی بات یہ ہے کہ بعض باتیں تو مفسرین کے بیان کے بعد ہی معلوم ہوتی ہیں اگر وہ بیان نہ کرتے تو شاید ادھر التفات ہی نہ ہوتا۔ ان کے بتلانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیان کی کیا ضرورت تھی۔

آباؤ اجداد کی برکت سے اولاد کو نفع:

غرض اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ آباؤ اجداد کی برکت سے بھی اولاد کو نفع ہوتا ہے مگر یہ مومنین کے واسطے ہے اور کفار کے بارے میں یہ ارشاد ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ نہ ان میں تعلقات رہیں گے نہ آپس میں ایک دوسرے کا حال پوچھیں گے۔ مومنین کی اولاد کے بارے میں ایک آیت میں صاف موجود ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا اتباع کیا ہو تو ہم اس اولاد کو آباؤ اجداد ہی سے ملا دیں گے یعنی اگر اولاد کا درجہ کم ہوگا اور باپ کا درجہ بلند ہوگا تو اس اولاد کو بھی باپ ہی کے درجہ میں کر دیں گے تاکہ اولاد کے قرب سے آباء کو انس زیادہ ہو آگے فرماتے ہیں۔ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ یعنی ان باپ دادوں کے اعمال سے ہم کچھ کم نہ کریں گے اس میں بعض وہمیوں کے شبہ کا جواب ہے وہ یہ ہے کہ اولاد کو باپ کے پاس پہنچانے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ اولاد کے اعمال تو ادنیٰ درجہ کے قابل ہیں اور باپ کے اعلیٰ درجہ کے تو کچھ باپ کے اعمال کم کر کے اولاد کی طرف لگا دیئے جائیں اور اوسط نکال کر دونوں کو درمیانی درجہ میں رکھ دیا جائے کچھ باپ کی طرف کم کر دیا اور کچھ اولاد کی طرف بڑھا دیا تو فرماتے ہیں یہ صورت نہ ہوگی آباء کے اعمال میں کمی نہ کی جائے گی بلکہ ابناء کے اعمال میں زیادتی کر کے اس کو اسی درجہ میں پہنچا دیں گے جہاں ان کے آباء ہیں باقی اس کے علاوہ جو اس آیت میں تحقیقات ہیں وہ تفسیر سے معلوم کر لی جائیں اس وقت میں تفسیر بیان نہیں کرتا محض تائید کر رہا ہوں کہ حق تعالیٰ آباء اجداد کی وجہ سے اولاد کو بھی نفع پہنچاتے ہیں پھر حضور صلی

اللہ علیہ وسلم جو تخلقوا باخلاق اللہ کے کامل مظہر تھے آپ عادت الٰہیہ پر کیوں عمل نہ کرتے تو کیا آپ ابو طالب کے احسانات کو بھول جاتے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ احسان و شفقت فرما کر ان احسانات کا شکریہ عمل نہ کرتے نہیں آپ ضرور کرتے اور کر کے دکھا بھی دیا۔

حضرت علیؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حسی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علیؓ سے بہت تعلق تھا جس کو آپ ؐ نے مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ظاہر بھی فرمایا ایک دفعہ ارشاد فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ (سنن الترمذی: ۳۷۱۳) جس کا میں دوست علی بھی اس کے دوست ہیں اسکے بعد حضرات صحابہ نے نہایت مسرت کے ساتھ حضرت علیؓ کو مبارک باد دی کہ انت مولانا کہ آپ ہمارے دوست (یا آقا) ہیں۔ ایک بار فرمایا انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ (الصحیح لمسلم فضائل الصحابة: ۳۰) تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی۔ حضرات شیعہ اس کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں اس سے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کا مسئلہ نکالتے ہیں۔ اس وقت میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا مگر ان احادیث سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علیؓ سے قرب اور تعلق بہت تھا اور قرب حسی تو ضرور ان سے زیادہ تھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب معنوی:

گو قرب معنوی بعض صحابہ کو زیادہ ہو جیسا کہ واقعات شاہد ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تمام صحابہ پریشان ہو گئے اگر کوئی شخص مستقل رہنے والا ثابت قدم تھا تو وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے اس وقت تمام صحابہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ واقعی ابو بکر صدیقؓ ہم سب سے افضل اور اعلم ہیں صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی اس وقت ان کے خیال سے وہ آیات بھی غائب ہو گئیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر تھا کہ آپ کا بھی وصال ہو جائے گا جیسا کہ دوسرے انبیاء گزر گئے اور عام لوگ وفات پاتے ہیں جس وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ممبر پر کھڑے ہو کر یہ آیات پڑھی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ

انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نرے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم کل الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جائے گا تو خدا تعالیٰ کا نقصان نہ کرے اور اللہ تعالیٰ جلد ہی ثواب دیگا شکر گزار لوگوں کو) اور انک میت وانھم میتون ٥ ثم انکم یوم القیٰمۃ عند ربکم تختصمون (آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے) اس وقت صحابہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سب کی زبانوں پر یہی آیتیں تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیتیں گویا آج ہی نازل ہوئی ہیں۔ حضرات صوفیہ نے اس واقعہ کا راز بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی آپ سے بعد نہ ہوا تھا جیسا قرب حیات میں تھا وصال کے بعد بھی ویسا ہی حاصل تھا اس لئے ان کو دوسرے صحابہ کی طرح بدحواسی اور زیادہ پریشانی نہیں ہوئی وہ اسی طرح مستقیم رہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مستقیم تھے یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حضرت عمرؓ کے لئے آیا ہے لو کان بعدی نبیاً لکان عمر (سنن الترمذی: ۳۶۸۶) اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے اور حضرت صدیقؓ کے بارے میں یہ بات نہیں فرمائی اس کے جواب مختلف طور پر علماء نے دیئے ہیں مگر مجھ کو اپنے استادؒ کا جواب زیادہ پسند ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاھب

حضرت صدیق اکبرؓ کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق فنائے تام:

مولانا نے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ حضرت صدیقؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرب اور فنائے تام کا ایسا تعلق تھا کہ وہاں بعدی کہنے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ بعدیت کیلئے غیریت ضروری ہے اور حضرت صدیقؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گویا غیریت بالکل نہ تھی وہ تو گویا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(میں آپ کا ہو گیا آپ میرے ہو گئے میں مثل بدن ہو گیا آپ مثل جان ہو گئے تا کہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں اور آپ دو ہیں کا مصداق تھے اس لئے حضرت صدیقؓ کے واسطے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو ابو بکر ہوتے۔ ان میں بعدیت اور غیریت کا مرتبہ ہی نہ تھا۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا محض ان نکات پر مدار نہیں بلکہ نصوص قرآنیہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤ وغیرہ اس کے کافی دلائل ہیں قرآن میں اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (غم مت کرو خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) فرمایا جس وقت حضرت صدیقؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرنے کے لئے غار ثور میں جا کر چھپے اور کفار نے ان کو تلاش کیا اور غار تک پہنچ گئے اور یہاں تک کہ حضرت صدیق نے ان کو چلتا پھرتا دیکھا تو وہ گھبرا گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔غم مت کرو خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ معنا میں حضرت صدیقؓ بھی تھے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی کامل معیت اور موافقت معلوم ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤ تو بکثرت ایسے تھے جن سے حضرت صدیق کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کامل اتحاد صاف صاف معلوم ہوتا ہے بلکہ حق تعالیٰ نے بعض اسباب ایسے جمع کر دیئے ہیں جن میں اشارہ آپ کے کامل اتحاد کی طرف نکل سکتا ہے۔

علماء مشائخ کا ایک خلاف سنت عمل:

چنانچہ ایک اشارہ اسی واقعہ ہجرت سے معلوم ہوگا جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی ہے تو آپ نے اہل مدینہ کو تاریخ سے اطلاع نہ دی تھی کہ آپ کس دن مدینہ پہنچیں گے۔ صحابہ ہر روز مدینہ سے باہر آپ کے اشتیاق میں آتے تھے اور دوپہر کے قریب واپس ہو جاتے تھے۔ مجھے اس واقعہ سے آج کل کے علماء اور مشائخ کا طرز دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان میں یہ عرف اور رسوم خلاف سنت کیوں ہیں کہ پہلے اپنی آمد کی تاریخیں مقرر کرتے ہیں تا کہ اس تاریخ پر ان کا شاندار استقبال ہو پھر کہیں موٹر لے آتے ہیں کہیں گاڑی میں سے گھوڑے کھول کر الگ کئے جاتے ہیں اور آدمی گاڑی کو کھینچتے ہیں اور علماء مشائخ ہیں کہ ان باتوں سے خوش ہیں زبان سے منع بھی نہیں کیا جاتا یہ سب وہ تکلفات ہیں جو یورپ سے

منقول ہیں مجھے شکوہ ہی نہیں ہے بلکہ افسوس ہے آخر خلاف سنت ان رسوم اور تکلفات کو اپنے لئے کیوں گوارا کیا جاتا ہے پھر بعض دفعہ ان تکلفات میں جانیں تک ضائع ہو جاتی ہیں۔

ایک عربی خواں لیڈر کا غلط فتویٰ:

کان پور میں ایک قومی لیڈر کے استقبال میں لوگوں نے ایسا ہی کیا کہ گاڑی سے گھوڑے کھول کر الگ کر دیئے اور آدمیوں نے خود گاڑی کھینچی گھوڑے کھل کر بے قابو ہو گئے ایک گھوڑے نے ایسی لات پھینکی کہ ایک آدمی کے ایسی لگی کہ وہ فوراً ہی مر گیا۔ حدود سے تجاوز کرنے کا ہمیشہ یہی انجام ہوتا ہے پھر طرہ یہ کہ اس وقت کے ایک عربی خواں لیڈر نے (جن کا نام لینا میں نہیں چاہتا) یہ فتویٰ دیا کہ غسل و کفن نہ دیا جائے یہ شہید ہوا۔ نامعلوم انہوں نے کس قاعدہ سے یہ فتویٰ دیا شہید تو وہ ہے جو کافروں کے ہاتھ سے مارا جائے یا کوئی مسلمان آلہ جارحہ سے ظلماً اس کو قتل کرے تو کیا ان کے نزدیک وہ سب مسلمان کافر تھے یا ظالم بن کر تلواریں لے کر اس پر چڑھ آئے تھے۔ اس فتویٰ کا منشاء صرف یہ تھا کہ اولیاء مقتول ان لوگوں کو گالیاں دیتے کہ ان کمبختوں کے استقبال میں ہمارا آدمی مارا گیا انہوں نے اولیاء مقتول کا جی خوش کرنے کے لئے یہ فتویٰ تراش لیا کہ یہ شہید ہوا ہے مگر کمال یہ ہے اس فتوے کو کسی نے بھی قبول نہ کیا اس کو غسل بھی دیا اور کفن بھی دیا یہ نتیجہ ہوا گھوڑے کھولنے کا کیونکہ گھوڑا جب تک سوار کے نیچے ہو یا گاڑی میں جتا ہوا ہو اس وقت تک دبا ہوا رہتا ہے اور جب اس کو کھول کر خالی لے جایا جائے خاص کر ہجوم میں وہ تو ضرور شرارت کرتا اور لاتیں پھینکتا ہے اس حالت میں کسی کے لات لگ جائے اور نازک موقع پر پڑ جائے تو جان کا خطرہ ہے مگر عوام تو جوش استقبال میں مست ہوتے ہیں اور لیڈر کی خوشی سے پھولے نہیں سماتے سب کے سب ان حرکات میں مشغول ہو جاتے ہیں اور انجام کو کوئی نہیں سوچتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کا واقعہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ باتیں کہاں تھیں نہ آپ کو استقبال کی خواہش تھی نہ ان تکلفات کو آپ پسند فرماتے تھے حتیٰ کہ تاریخ سے بھی آپ نے اطلاع نہیں دی تھی حضرت صحابہؓ ہر روز ہتھیار لگا کر مدینہ سے باہر آتے تھے وہ بھی استقبال کیلئے نہیں بلکہ اس ضرورت

سے کہ مدینہ میں آپ کے مخالف بھی اس وقت تک موجود تھے صحابہ ہتھیار لگا کر اس لئے آتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حفاظت کے ساتھ مدینہ میں لائیں غرض کہ روز آتے تھے اور پھر جاتے تھے اس میں جو لطف ہے وہ تاریخ مقرر کرنے میں کہاں کہ روزانہ شوق کو ترقی ہوتی ہے آخر کار اسی طرح ایک دن دوپہر تک انتظار کر کے بستی کی طرف لوٹ ہی رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی گھاٹیوں میں سے آفتاب و ماہتاب کی طرح نمودار ہوئے

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

(ہم پر بدر نے طلوع کیا ثنیات الوداع سے۔ ہم پر شکر خدا تعالیٰ کرنا فرض ہے جب تک اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے والا ہے)

اور سب سے پہلے آپ کو ایک یہودی نے دیکھا جو کسی اونچے مقام پر اپنے مال تجارت کی آمد کے انتظار میں چڑھا ہوا تھا اس نے آپ کو دور ہی سے دیکھ لیا کہ پہچان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی ہیں یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم یہودی آپ کو اس طرح پہچانتے تھے جیسے آدمی اپنے لڑکوں کو بخوبی پہچانتا ہے کہ دھوکہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک حتیٰ کہ خط و خال تک بیان کیا گیا ہے، چنانچہ اب بھی توراۃ میں آپ کا حلیہ موجود ہے۔ براہین رحیمیہ ایک کتاب ہے اس میں مصنف نے توراۃ کے وہ مضامین نقل کئے ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مذکور ہے۔ اس میں یہودی نے حضرات صحابہؓ کو جو ابھی انتظار کرتے کرتے لوٹ رہے تھے آواز دی کہ ہذا جدکم یہ ہے تمہارا مطلوب یہ ہے تمہارا نصیب یہ ایسا محاورہ ہے جیسے ہمارے یہاں بولتے ہیں کہ نصیب جاگ گئے صحابہ فوراً الٹے پیروں پھرے دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لا رہے آپ کے ساتھ مدینہ میں خدمت کیلئے حضرت ابوبکرؓ کا ایک غلام بھی تھا اور ایک شخص راستہ جاننے والا ساتھ تھا آمد کے اول روز کا واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرات صحابہ جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غائبانہ ایمان لے آئے تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے نہ تھے ان کو تامل ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں تو ظاہر میں حضرت ابوبکر بڑے معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے بال سفید ہو چکے تھے حالانکہ وہ عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو

سال چھوٹے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قویٰ بہت اچھے تھے آپ کے بال اس وقت بالکل سیاہ تھے حالانکہ اس وقت آپ کی عمر ۵۳ سال کی تھی بلکہ آپ کا اعتدال مزاج اور قویٰ کی عمدگی ایسی تھی کہ ساری عمر بھی آپ کو بڑھاپا نہ آتا۔

سورہ ہود میں شان جلال کا ظہور زیادہ ہے:

مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے کی وجہ ایک حدیث میں خود بیان فرمائی ہے ارشاد فرماتے ہیں **شیبتنی سورۃ ھود** (مشکوۃ المصابیح: ۵۳۵۳) کہ مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے ورنہ مجھے بڑھاپا نہ آتا۔ سورۃ ہود کی وجہ سے آپ کے بوڑھے ہو جانے کی علت مشہور ہے کہ اس میں امم سابقہ کا اور ان پر عذاب نازل ہونے کا ذکر بہت ہے ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے ہیں **انی اعلمکم باللہ واخشاکم للہ** (کتاب الشفاء ۲: ۱۹۳) کہ میں تم سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہوں اور سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہوں تو اس سورۃ میں شان جلال کا زیادہ ظہور ہے اور جب جلال کا ظہور ہوتا تو مقربین بھی تھرا جاتے ہیں ادھر تو آپ کی معرفت اور خشیت کامل اس پر سورۃ ہود میں جلال کا زیادہ ظہور اور عذاب کا بکثرت ذکر تو خوف وخشیت نے آپ کی قوت کو کمزور اور بالوں کو سفید بنا دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھاپے کا سبب:

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ سورۂ ہود میں ایک آیت ایسی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سخت حکم کیا گیا ہے **فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ** کہ جس طرح آپ سے کہا گیا ہے اسی طرح مستقیم ہو جایئے اور حق تعالیٰ کے ارشاد کے موافق استقامت بڑی بھاری چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں **استقیموا ولن تحصوا** (مشکوۃ المصابیح: ۲۹۲) کہ مستقیم رہو مگر استقامت کا حق ادا نہیں کر سکتے تو جیسی استقامت حق تعالیٰ کو محبوب ہے ویسی انسان سے عادتاً دشوار ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ جس استقامت کا آپ کو امر ہوا ہے ویسے ہی مستقیم رہئے اس بار عظیم نے آپ کو بوڑھا بنا دیا بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ بھی ایسا مشکل حکم نہ تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو استقامت پر جمے ہوئے تھے بلکہ اس کے ساتھ ایک اور حکم ہے وہ بالکل ہی کمر توڑ دینے والا

ہے فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ کہ جس طرح آپ کو حکم ہوا ہے اسی طرح مستقیم رہئے اور آپ کے ساتھ جو ایمان لائے ہیں وہ بھی مستقیم رہیں۔ اس جملہ نے آپ کو کمزور بنادیا کیونکہ دوسروں کی ذمہ داری بڑی مشکل ہے آپ اپنی ذات پر پورا اختیار رکھتے تھے مگر دوسروں کو بھی ویسا ہی مستقیم بناویں جیسا کہ حکم ہوا ہے یہ بڑا بار عظیم تھا اس فکر میں آپ گھلتے رہتے تھے کہ میری طرح سب ہی لوگ پوری طرح مستقیم ہو جائیں۔ تحصیلدار کو اپنی فکر تو ہوتی ہے اپنے عملہ کی بھی فکر ہوتی ہے اگر عملہ میں کوئی خرابی ہوتی ہے تو اس سے تحصیلدار کو بھی ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے اسی لئے حدیث میں ہے لاتسودوا وجھی یوم القیمۃ کہ قیامت کے دن میرا منہ کالا مت کر دینا یعنی مجھ کو شرمندہ مت کرنا ہمارے اعمال بد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شرمندگی کیسی آپ کو یہ ندامت کیوں ہوگی یہ وہی سنت الٰہی ہے جس کو سعدیؒ اس شعر میں فرماتے ہیں

کرم بین ولطف خداوندگار گنہ بندہ کردہ است واوشرمسار

یعنی حق تعالیٰ کا لطف وکرم دیکھو کہ بندہ گناہ کرے اور حق تعالیٰ شرمند ہوں اور حق تعالیٰ کو یہ حیا اس سے ہے کہ ہمارا ہو کر یہ حرکت یہی سنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ہم کو قیامت کے دن شرمندہ نہ کرنا یعنی شرمندگی کہ ہمارے کہلا کر یہ حرکت غرض کہ آپ کو اس فکر نے گھلا دیا تھا کہ میں اپنے آپ تو مستقیم بن سکتا ہوں مگر ساتھیوں کا ذمہ دار کون ہوا اس غم نے آپ کو بوڑھا کر دیا پھر یہ غم زندگی ختم ہونے کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا۔

وصال کے بعد بھی ہمیں آپ کا رنجیدہ کرنا:

افسوس یہ ہے کہ ہمارے ہاتھوں ایسے رحیم وکریم وشفقت ورافت کرنے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال کے بعد بھی رنج پہنچتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ہفتہ میں دو تین مرتبہ میرے پاس امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں نیک اعمال کو دیکھ کر آپ خوش ہوتے ہیں اور گناہوں کو دیکھ کر غمگین یہی وہ حقیقت ہے جو اس ایرانی پر منکشف ہوئی تھی جو مرزا قتیل دہلوی کے دیوان کو دیکھ کر اس کو صوفی وعارف سمجھ کر ایران سے اس کی زیارت کو چلا تھا کیونکہ قتیل کا کلام تصوف کے مضامین لئے ہوئے ہوتا تھا پھر جب دہلی پہنچا اور مرزا قتیل سے ملا تو

اس کو داڑھی منڈاتے پایا طالب چونکہ آزاد ہوتا ہے اس لئے فوراً سوال کیا کہ آغا ریش می تراشی قتیل نے اس کا جواب بھی تصوف کے رنگ میں دیا بلے ریش می تراشم ولیکن دل کسی نے خراشم ایرانی نے اس کا ایسا پاکیزہ جواب دیا کہ قتیل کا سارا بناوٹی تصوف رکھا رہ گیا اس نے کہا ارے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراش یعنی جب تیرا یہ فعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچتا ہے کہ تم کو یہ بھی خبر نہیں کہ کتنے بڑے دل کو صدمہ پہنچا رہے ہو۔ یہ حقیقت مرزا قتیل پر جب منکشف ہوئی تو وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا اور جب ہوش آیا تو بزبان حال یہ شعر اس کی زبان پر تھا ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کر دی　　مرا باجانجاں ہمراز کر دی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے محبوب حقیقی تک پہنچا دیا)

طلب بھی عجیب چیز ہے:

واقعی طلب بھی عجیب چیز ہے یہ بے کار نہیں جاتی وہ ایرانی اپنی اصلاح کے واسطے مرزا قتیل کے پاس آرہا تھا اس کی وجہ صورت دیکھ کر اس کو افسوس ہوا ہوگا کہ میری ساری محنت رائیگاں گئی مگر حق تعالیٰ نے اس کی محنت کو دنیا میں بھی ضائع نہ کیا اس کے ذریعہ سے مرزا قتیل ہی کی اصلاح کر دی جس کا اس کو اجر عظیم ملا ہوگا اور اپنی طلب اور سعی کا ثواب جدا رہا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قویٰ ایسے عمدہ تھے کہ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو آپ کو غالباً اخیر عمر تک بھی بڑھاپا نہ پہنچتا اب اس سے اندازہ کیجئے کہ اس اسباب کے ہوتے ہوئے جو حقیقت میں انسان کو گھلا دینے والے ہیں پھر بھی آپ کے قویٰ کیسے زبردست تھے کہ اخیر عمر میں آپ کے معدودے چند بال سفید ہو گئے تھے جو بیس سے زیادہ نہ ہوں گے اس لئے ہجرت کے وقت بظاہر حضرت ابوبکرؓ بڑے معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے بال زیادہ سفید ہو گئے تھے تو اکثر لوگ انہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر مصافحہ ان سے کرتے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا ادب:

اب حضرت صدیق اکبرؓ کا ادب دیکھئے کہ مصافحہ سے انکار نہ کیا جوان سے مصافحہ کرتا اس سے مصافحہ کر لیتے تھے اور یہ نہ کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرو رسول صلی اللہ علیہ

وسلم آپ ہیں راحت رسانی اس کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا اہم سوال ہوتا تو خود کبھی مصافحہ نہ کرتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو تکلیف دیتا سادگی یہ تھی جو حضرت صدیقؓ کے فعل سے ظاہر ہوتی ہے کہ ایسے موقعہ پر بڑوں کو کلفت سے بچانا چاہئے خود ہی مصافحہ کر لیا تو کیا حرج ہوا۔ بزرگوں کی راحت رسانی کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے مگر آج کل تعظیم میں ایسا غلو کیا جاتا ہے کہ راحت پہنچانے کی مطلق فکر نہیں کی جاتی غرض کہ لوگ آتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کو السلام علیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے جاتے تھے اور مصافحہ کرتے جاتے تھے اس وقت تک سب لوگ یہی سمجھتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی ہیں یہاں تک جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آنے لگی اس وقت حضرت صدیقؓ کھڑے ہو کر ایک کپڑا لے کر آپ پر سایہ کرنے لگے جب صحابہ کو خبر ہوئی کہ آقا یہ ہیں اور جن سے ہم مصافحہ کرتے تھے وہ غلام ہیں پھر صحابہ کا ادب یہ تھا کہ دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرنے کا قصد نہیں کیا اگر آج کل کے لوگ ہوتے تو یہ معلوم کر کے کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ نہیں کیا بلکہ آپ کے خادم اور رفیق سے کیا ہے دوبارہ پھر آپ سے مصافحہ کرتے مگر حضرات صحابہ ان تکلفات سے بری تھے۔ تو اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ظاہر ہوا ہے اس سے غایت درجہ اتحاد معلوم ہوتا ہے کیونکہ لوگ حضرت ابوبکر کو السلام علیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے اور انہی سے مصافحہ کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا۔

حضرت ابوبکرؓ کو فنافی الرسول کا رتبہ حاصل تھا:

عارفین نے اس واقعہ کا نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو جو مرتبہ فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا ہوا ہے جس کی وجہ سے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غایت درجہ اتحاد نصیب تھا اس کے اظہار کے واسطے حق تعالیٰ نے یہ صورت واقعہ ظاہر کر دی اور حضرت صدیق کو ہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی زبان سے کہلوا دیا اور اہل حال صوفیوں کو خشک فتوے سے بچا دیا۔ صدیق کا مقام ایسا عالی ہوتا ہے کہ اس کے علوم کا ماخذ بھی وہی ہوتا ہے جو نبی کا ماخذ ہے اور جو بات نبی کے دل میں آتی ہے وہ صدیقؓ کے دل پر بھی فائض ہوتی ہے مگر صدیق کے علوم کا اعتبار نبی کی تائید کے بغیر نہیں ہوتا۔

نبی اور صدّیق کے علم میں فرق:

ماخذ اگرچہ ایک ہے مگر نبی کا علم خطا سے محفوظ ہے اور اس کا علم قطعی ہے اور صدیق کا علم ظنی ہوتا ہے جس کی صحت کے لئے تائید نبی کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کی عبارت کا ایک مفہوم:

چنانچہ شیخ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے اور اس اخیر زمانہ میں مولانا اسماعیل شہیدؒ نے بھی اس کو لکھا ہے میں نے خود تو مولانا شہیدؒ کی تصانیف میں یہ مضمون نہیں دیکھا تھا مگر ایک سوال میرے پاس آیا جس سے معلوم ہوا کہ مولانا نے بھی یہ مضمون بیان فرمایا ہے جن صاحب نے خط میں وہ مضمون لکھا تھا وہ اس کی وجہ سے سخت پریشان تھے کیونکہ بظاہر الفاظ ایک امر منکر کے موہم تھے اور اول وہلہ میں تو میں بھی دیکھ کر گھبرا گیا تھا مگر الحمدللہ کہ پھر جلد ہی مطلب سمجھ میں آ گیا۔ مولانا نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے

''صدیق شاگرد انبیاء ہم می باشد وہم استاد انبیاء ہم''

وہ صاحب یہ مطلب سمجھے تھے کہ صدیق انبیاً کا شاگرد بھی ہوتا ہے اور استاد بھی ہوتا ہے اور استاد بھی پہلے پہلے میرا بھی ذہن اسی طرح گیا اور میں نے اس کو اس مضمون کی طرف لے گیا جو شیخ ابن عربیؒ نے خاتم الولایت کے بارے میں لکھا ہے انہوں نے خاتم الولایت سے بعض علوم میں انبیاء کو مستفید لکھا ہے جو کہ بہت ہی سخت بات ہے مگر پھر میں نے دیکھا کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ کی عبارت میں لفظ ہم دو جگہ آیا ہے یعنی وہم استاد انبیاء ہم جس سے معلوم ہوا کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ کا وہ مطلب نہیں جو شیخ ابن عربی نے لکھا ہے آپ کا مطلب بالکل صاف ہے۔ ہم استاد کہتے ہیں ساتھی کو جو ایک استاد میں دوسرے کا شریک ہو تو لفظ ہم مکرر ہونے سے مطلب بالکل صاف ہو گیا ہے حاصل یہ ہے کہ صدیق انبیاء کا شاگرد بھی ہوتا ہے اور ان کا ہم استاد یعنی استاد بھائی اور ساتھی اور شریک بھی ہوتا ہے سو یہ وہی بات ہے جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ صدیق کے علوم کا ماخذ بھی وہی ہوتا ہے جو انبیاء کے علوم کا ماخذ ہوتا ہے اس لحاظ سے تو وہ انبیاء کا شریک اور ساتھی ہے مگر اس کے علوم کا اعتبار بدون تائید نبی کے نہیں ہوتا اس لحاظ سے وہ شاگرد انبیاء ہے۔

یہودیوں نے شیخ ابن عربیؒ کے کلام میں تحریف کی ہے:

باقی اس میں شیخ ابن عربیؒ نے جو خاتم الولایت کے بارے میں لکھا ہے وہ بے شک بہت ہی سخت بات ہے وہ تو اس کو صاف صاف انبیاء کا استاد لکھتے ہیں کو جو کہ بہت موحش مضمون ہے اگر چہ اس میں تاویل ہوسکتی ہے جس کو میں نے اپنی شرح فصوص میں لکھا ہے مگر پھر بھی دل اس لفظ کو قبول کرنے اور ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوتا اس لئے میں تو اس کو بالکل غلط سمجھتا ہوں یا تو شیخ ہی کا کشف غلط ہو یا کسی نے ان کی کتاب میں یہ مضمون الحاق کر دیا ہو اور اس میں کچھ شیخ کی بے ادبی نہیں شیخ کا ادب یہی ہے کہ ان کو ان خرافات سے بری کیا جائے۔ علامہ شعرانیؒ نے یواقیت و جواہر میں اس کی تصریح کی ہے کہ بعض یہودیوں نے شیخ کے کلام میں تحریف بھی کی ہے اس لئے ان کا کلام میں جو مضمون خلاف شریعت ہوگا ہم اس کو شیخ کی طرف ہرگز منسوب نہ کریں گے ضرور اسے الحاقی کہیں گے اور اگر کوئی اس کو تسلیم نہ کرے تو ہم صاف یہی کہیں گے کہ شیخ کا کشف غلط ہے اور کشفیات میں غلطی ہو جانا کوئی بعید بات نہیں۔ جب مطلقا صدیق کے علوم کا اعتبار نبی کی تائید کے بغیر نہیں ہوتا تو شیخ کے علوم کا بھی اعتبار شریعت کی تائید کے بغیر کیونکر ہوسکتا ہے۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضرت صدیقؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب معنوی بہت زیادہ تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو قرب حسی زیادہ تھا اور قرب حسی کو بھی بہت دخل ہے فیوض و برکات زیادہ حاصل ہونے میں پس حضرت علیؓ کے ان علوم میں قرب کو بڑا دخل تھا چنانچہ ان کے اقوال نہایت نپے تلے ہوتے ہیں حکماء میں وہ بہت بڑے حکیم ہیں۔ پس خاندان والوں کو چونکہ نبی یا ولی سے قرب حسی زیادہ ہوتا ہے ان کو دوسروں کی نسبت زیادہ فیض ہوتا ہے وہ اس کے عادات واطوار سے دوسروں کی نسبت زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی دوسرے لوگوں میں جب کسی کو قرب معنوی اور محبت وخلوص زیادہ ہوتا ہے تو وہ خاندان والوں سے بھی بڑھ جاتا ہے مگر ایسا کم ہوتا ہے اکثر خاندان والوں ہی کو بوجہ مناسبت اور قرب کے زیادہ نفع ہوتا ہے۔

حضرت داؤدؑ کے پورے خاندان کو شکر کا حکم:

اس لئے اس آیت میں داؤدؑ کے تمام خاندان کو خطاب کیا گیا ہے اگر چہ جن انعامات

کا یہاں ذکر ہے وہ ظاہر میں خاص داؤد وسلیمانؑ پر ہوئے ہیں مگر اس تمام تقریر سے معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہ انعامات تمام خاندان کو شامل ہیں۔ خاندان میں ایک شخص کے مقبول ہو جانے سے ظاہری اور معنوی دونوں طرح کے فیض خاندان والوں کو دوسروں سے زیادہ حاصل ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ طالب بھی ہوں اور ان فیوض و برکات سے فائدہ اٹھانا بھی چاہیں اس لئے حق تعالیٰ نے داؤدؑ کے پورے خاندان کو متنبہ فرمایا ہے کہ یہ انعامات تم سب پر ہیں سب کو ان کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

اعمال صالحہ ہی شکر کے غایت ہیں:

فرماتے ہیں اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (اے داؤدؑ کے خاندان والو تم سب شکر یہ میں نیک کام کرو) یہاں شُکْرًا مفعول بہ نہیں ہے ورنہ اس کے لئے واشکروا کافی تھا بلکہ مفعول لہ ہے اور اعملوا کا مفعول بہ یہاں بھی وہی مقدر ہے جو اس کے قبل ملفوظ ہے یعنی وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (نیک عمل کرو) یہاں یہ مفعول لہ اس لئے بڑھایا تا کہ اس سے معلوم ہو جاوے کہ شکر ہی غایت ہے اعمال صالحہ کی یعنی اعمال صالحہ اسی لئے وضع کئے گئے کہ اس سے شکر کا ضروری اور مہتم بالشان ہونا معلوم ہو گیا ہوگا مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا زیادہ مقصود تھا اور میں مستورات کے خیال سے سہل مضامین بیان کرنے کا قصد کر رہا تھا۔ معلوم یہ تمہید لمبی کیسی ہوگئی مگر امید ہے کہ وہ سمجھ گئی ہوں گی گو سب مضامین مع ہیئت ترکیبیہ نہ سمجھی ہوں مگر ہر جز وفرداً فرداً ان کی سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا۔ خیر یہ مضامین بھی ضروری تھے جو اہل علم کے کام کے ہیں۔ میرا مقصود یہ تھا کہ آج کل ہم لوگوں میں یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ہم میں شکر کا مادہ کم ہے۔

شکر کی کمی کا ایک سبب:

ہم لوگ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا بہت کم شکر کرتے ہیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ بعضوں کو تو خدا تعالیٰ کے احسانوں کا علم بھی نہیں چنانچہ اگر کوئی غریب مصیبت زدہ خدا تعالیٰ کا شکر کرے تو اس سے بعضے لوگ کہتے ہیں کہ تو کس چیز کا شکر کرتا ہے تیرے پاس کونسی نعمتیں ہیں افسوس! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا علم بھی نہیں بعض لوگ بیماری میں زیادہ گھبرا جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی شکایتیں کرنے لگتے ہیں حالانکہ بیماری کے اندر بھی غور سے دیکھا جائے تو خدا تعالیٰ کی نعمتیں ضرور ہوتی ہیں مگر اپنے سے زیادہ بیمار کو دیکھا جائے تو اس وقت حقیقت معلوم

ہو کہ یہ بیماری بھی اس کے لحاظ سے ایک بڑی نعمت ہے پھر خدا تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان کہ بیماری دی تھی تو اس کے ساتھ دوا کے دام بھی دیئے عطار اور حکیم اور تماردار بھی پیدا کئے پھر بعض دفعہ اس بیماری میں خود بہت سی مصلحتیں بعد کو معلوم ہوتی ہیں۔ ایک صحابی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس کی حکمت ان کو حضرت علی و حضرت امیر معاویہؓ کی لڑائی کے وقت معلوم ہوئی کہ جو تندرست تھے اکثر اس میں شریک ہوئے اور ان صحابی سے کسی نے شریک ہونے کو کہا ہی نہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لنگڑے ہیں لڑائی سے معذور ہیں اور اگر کسی نے کہا بھی تو وہ اپنی ٹانگ کا عذر بیان کر کے چھوٹ گئے اس وقت ان کو اپنی ٹانگ ٹوٹنے کی قدر ہوئی کہ اس نے بہت کام دیا کیونکہ ان لڑائیوں میں جو خون ہوئے ہیں وہ بہت محترم خون تھے دونوں طرف صحابہ ہی صحابہ تھے اول تو مطلق مسلمان کا خون محترم ہے پھر صحابہ کا خون تو بہت ہی محترم ہے اس میں ہاتھ رنگنے سے بچ جانا بہت بڑی نعمت تھی۔ اب ہم کو اس میں گفتگو بھی نہ کرنا چاہئے کہ کون حق پر تھے۔

حضرات صحابہؓ نفسانیت سے پاک تھے:

حضرات صحابہ نفسانیت سے پاک تھے انہوں نے جو کچھ کیا محض للّٰہیت سے کیا ان تمام جھگڑوں کا منشاء اجتہادی غلطی تھی سو مجتہد کو غلطی پر ثواب ملتا ہے بس اس سے زیادہ گفتگو فضول ہے اس بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقولہ بہت ہی عجیب ہے وہ فرماتے ہیں **تلک دماء طهر الله عنها ايدينا فلنطهر عنها السنتنا** یہ ایسے خون ہیں کہ خدا تعالیٰ ان سے ہمارے ہاتھوں کو پاک صاف رکھا ہے تو ہم کو زبانیں بھی ان سے پاک رکھنی چاہئیں۔ جب خدا تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو ان سے ملوث نہیں کیا تو ان کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کر کے ہم نے اپنی زبانوں کو کیوں گندہ کیا۔ دوسرے یہ اختلاف بڑوں بڑوں کا ہے چھوٹوں کا اس میں بولنا زیبا نہیں۔ باپ اور چچا میں اگر جھگڑا ہو تو دونوں کی اولاد کو اس میں بولنا اور ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بے ادبی کرنا ہرگز مناسب نہیں کیونکہ آخر تو وہ دونوں بھائی بھائی ہیں آپس میں ایک دوسرے کو وہ جو چاہیں کہہ لیں مگر چھوٹوں کی زبان سے کوئی شخص اپنے بھائی کی توہین گوارا نہیں کر سکتا۔ غرض بعض دفعہ وہ مصیبت ہی خود نعمت ہوتی ہے جس کا نعمت ہونا بعد میں معلوم ہوتا ہے اور اگر اپنی محبت بھی خدا تعالیٰ نے دی ہو تو تب تو بیماری کا لطف بہت آتا ہے تکلیف اور درد بھی راحت ہی معلوم ہوتا ہے۔

از محبت تلخہا شیریں شود

(راستہ کی ساری تلخیاں محبت سے شیریں ہو جاتی ہیں)

عاشق تو بیماری اور درد میں یہ کہتا ہے

دردازیارست ودرماں نیز ہم   دل فدائے آں شدو جاں نیز ہم

(درد بھی محبوب کا دیا ہوا ہے دوا بھی وہی کرے گا میں تو دل وجان سے اس پر فدا ہو چکا ہوں)

عاشق کو محبوب کی مار میں وہ لطف آتا ہے جو دوسروں کے پیار میں بھی نہیں آتا دیکھو اگر کسی کا محبوب پیچھے سے آ کر عاشق کی آنکھیں بند کر کے اس کو زور سے دبا لے تو اول تو گھبرائے گا کہ یہ کون ہے مگر صورت دیکھ کر پہچان کر وہ کس درجہ خوش ہوتا ہے اب تو وہ چاہے گا کہ اور زور سے دبائے اور اس کی کوشش کرے گا کہ اپنے بدن کو اس کے سینے سے خوب لگا دے بلکہ اگر محبوب پوچھے بھی کہ اگر دبانے سے تکلیف ہوتی ہو تو تجھ کو چھوڑ کر فلانے کو جو میرا دوسرا عاشق ہے دبالوں تو وہ یوں کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ بنے۔ دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ ان پر آپ کا خنجر ہے)

تو جو لوگ بیماری میں گھبرا جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے شکایتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان کے دل محبت سے خالی ہیں ورنہ ان کو درد میں بھی لطف آتا۔ عارفین سے اس کی لذت کو پوچھو وہ بیماری میں کیسے مسرور ہوتے ہیں گو ظاہر میں تکلیف ہوتی ہو۔

جو کشف قرآن وحدیث کے خلاف ہو وہ غلط ہے:

بلکہ بعض عارفین کو تو اس لذت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ وہ یہ سمجھ کر منشاء اس لذت کا معرفت ہے یوں کہنے لگے کہ کفار کو بھی کچھ مدت کے بعد جہنم کا عذاب معلوم نہ ہوگا کیونکہ اس وقت ان کو حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی اور معرفت کے بعد وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اس معرفت کی لذت میں ان کو جہنم کے عذاب کا احساس نہ ہوگا بلکہ ان کو اس میں بھی لذت آئے گی۔ اس میں متن شیخ ابن عربی کا ہے اور شرح ایک بزرگ نے کی ہے۔ شیخ ابن

عربی نے صرف اتنا کہا تھا کہ اہل جہنم کو ایک مدت بعد عذاب کا احساس نہ ہوگا۔ ایک بزرگ شارح نے اس کی علت یہ بیان کردی کہ ان کو اس وقت معرفت نصیب ہوجائے گی اور معرفت کے بعد عذاب لذیذ معلوم ہوگا جیسا کہ عارفین کو دنیا کی تکالیف اور بیماریاں اسی معرفت سے لذیذ معلوم ہوتی ہیں مگر قواعد سے یہ متن اور شرح دونوں غلط ہیں۔ نصوص قرآنیہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو ہمیشہ عذاب کا احساس ہوگا اور دن بدن عذاب میں زیادتی معلوم ہوگی۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ. لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ . زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ

(ان سے عذاب ہلکا نہ ہونے پائے گا اور نہ اس کو مہلت دی جائے گی جب ایک مرتبہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کردیں گے تا کہ عذاب چکھتے رہیں ان کو ہم بڑھادیں گے عذاب پر عذاب بدلہ میں ان کی شرارت کے) ان صاف اور صریح آیات کے بعد ہرگز اس قول کی صحت قابل تسلیم نہیں شیخ نے تو محض ایک کشف لکھا ہے اور دلیل کچھ بیان نہیں کی تو ہم صاف کہتے ہیں کہ جو کشف قرآن وحدیث کے خلاف ہو وہ بالکل غلط ہے اور شارح نے جو اس کی دلیل بیان کی ہے اس میں ان کو دھوکا ہوا ہے وہ لذت کا مدار نفس معرفت پر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ لذت کا مدار معرفت اور محبت کا مجموعہ ہے۔ سو ہم نے مانا کہ کفار کو ایک وقت میں معرفت نصیب ہوجائے گی۔ مگر یہاں کہاں سے معلوم ہوا کہ ان کو محبت بھی حاصل ہوجائے گی۔ کفار کو محبت خاک نصیب ہوگی۔ بلکہ عجب نہیں کہ معرفت کے بعد ان کو خدا تعالیٰ سے بغض وعداوت پہلے سے زیادہ ہوجاوے۔ کیونکہ جب تک کہ ان کو خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ تھی نہ معلوم وہ اس عذاب کی وجہ اور علت کیا سمجھتے ہوں گے اور معرفت کے بعد تو ان کو صاف معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ کے حکم سے ہم کو عذاب ہورہا ہے اور ہماری یہ تکلیف اس کی مشیت سے ہے تو اس حالت میں محبت پیدا ہوگی یا بغض زیادہ ہوگا۔ اس لئے یہ دلیل بالکل غلط ہے۔ اور میں تو کیا چیز ہوں جو ان حضرات کی غلطیاں نکالوں۔

حضرت حاجی صاحبؒ طریق باطن کے امام تھے:

یہ سب حضرت حاجی صاحبؒ کا طفیل ہے کہ طریق باطن کے دھوکوں پر بحمد اللہ جلدی اطلاع ہوجاتی ہے حضرت حاجی صاحبؒ بیشک اس فن کے امام تھے اور ہم ان کو ان حضرات سے کچھ کم نہیں سمجھتے اور یہ حضرت حاجی صاحب ہی کے علوم ہیں جن سے

حضرت شیخ ابن عربی رحمہ اللہ بہت بڑے ولی اللہ تھے:

ان اقوال کا غلط ہونا معلوم ہوجاتا ہے اور ان کے منشاء پر اطلاع ہوجاتی ہے کہ یہ دھوکہ ان کو کس بات سے ہوا ہے پس یہ قول یا تو حضرت شیخ سے حالت سکر میں صادر ہوا ہے جس میں وہ معذور تھے اور حالت سکر کے اقوال ماننے کے لئے ہم کو مجبور نہیں کیا جاسکتا یا یہ کہ یہ بھی شیخ پر افتراء ہے جیسا کہ اعداء نے اور بھی ان پر افتراءات کئے ہیں۔ مگر ان غلطیوں کے باوجود شیخ اب بھی ویسے ہیں حسین ہی جیسا کہ وہ ان اغلاط سے پہلے حسین تھے ان کے عارف اور بہت بڑے ولی ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ انہوں نے اگر ایک دو جگہ لغزش کی ہے تو ہزار جگہ ایسی تحقیقات بھی بیان کی ہیں جن سے قرآن وحدیث کی حقیقت اور عظمت معلوم ہوتی ہے جس نے شریعت کے اس قدر اسرار بیان کئے ہوں اس سے ایک دو جگہ لغزش بھی ہوجائے تو اس سے اس کے حسن میں کیا فرق آسکتا ہے۔ حسین چہرہ میں سیاہ تل سے رونق ہی بڑھتی ہے حسن کم نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے ریاضتیں بہت کی ہیں انوار کو بہت غذا بنایا ہے اس کی وجہ سے یہ دل بھی کہیں نہ کہیں نکل آتے ہیں جو بہت کھاتا ہے اس کے پھوڑے پھنسیاں بھی نکلتی ہیں اور ہم نے کھایا ہی کیا ہے جو ہمارے پھنسیاں نکلیں یہ حضرات کام بہت کرتے تھے ان پر حالات اور کیفیات بھی ویسی ہی قوی وارد ہوتی تھیں جن سے مغلوب ہوکر کبھی کبھی ان کے منہ سے ایسی باتیں بھی نکل گئیں اور ہم نے کام ہی کیا کیا ہے جو حالات اور کیفیات کا غلبہ ہو مگر الحمد للہ کہ حالات اور کیفیات اگر ایسی نصیب نہ ہوئیں تو یہ ایک دولت بہت بڑی حق تعالیٰ نے عطا کی ہے کہ ہمارے علوم صحیح ہیں اور بحمد اللہ اب تک اپنے عقائد میں کوئی غلطی معلوم نہیں ہوئی۔ غرض کہ عارفین کو بیماری اور تکلیف میں ایسی لذت ہوتی ہے کہ بعض لوگوں کو اہل دوزخ کے بارے میں معرفت حاصل ہونے کے بعد لذت اور خفت عذاب کا دھوکہ ہوگیا ہے۔ بیماری میں اگر اور بھی کوئی نعمت معلوم نہ ہو تو یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ خدا تعالیٰ نے صرف تندرستی ہی چھین لی اور ایمان سلب نہیں کیا ایمان وہ دولت ہے کہ اس کے سامنے سب دولتیں ہیچ ہیں۔ ابد الآباد کی راحت یعنی جنت اسی کی بدولت ملتی ہے۔ ایک کابلی کا قول ہے کہ کافر کے پاس کیا رکھا ہے اس کے

پاس کچھ بھی نہیں ہمارے پاس وہ نعمت ہے جس کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے اندر وہ چیزیں ہیں کہ ان کے سامنے کافر کی سب راحت وآسائش ہیچ ہے واقعی سچ کہا کیونکہ ایمان کی بدولت جنت میں ہر کوئی مسلمان کو اتنا ملے گا کہ دنیا و مافیہا کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں تو اس کابلی کو اپنے ایمان پر بڑا ناز تھا اور واقعی یہ دولت ہی ایسی ہے۔

ایک شاکر بزرگ کی حکایت:

ایک بزرگ کے سر سے پیر تک زخم ہی زخم تھے اس حالت میں بھی وہ شاکر تھے ہر وقت خدا تعالیٰ کا شکر کرتے رہتے تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کس چیز کا شکر کرتے رہتے ہیں آپ کے بدن کا کوئی حصہ بھی تو ایسا نہیں جو صحیح سالم ہو فرمایا میں اس کا شکر کرتا ہوں کہ ایمان نہیں چھینا تو اب یہ تکلیف محدود ہے دل کو سمجھا لیا ہے کہ مرتے ہی جنت میں پہنچ جاؤں گا چند روز تکلیف سے پریشانی کیسی اور اگر خدانخواستہ ایمان بھی سلب ہو جاتا تو پھر اس تکلیف کا کبھی خاتمہ ہی نہ ہوتا میں اس کا شکر کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اس کلفت کو محدود کر دیا ہے۔ پس مسلمان کے پاس یہ کچھ تھوڑی دولت ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو ایمان عطا فرمایا ہے جس کی بدولت اس کی تمام کلفتیں ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ کفار کی حالت کیسی افسوس ناک ہے کہ ان کی کلفت کا خاتمہ ہی کسی دن نہ ہوگا۔ اور اگر غور کیا جائے تو ایمان کے علاوہ حق تعالیٰ کی نعمتیں اور بھی بہت سی ہیں جو ہر دم ہم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو رہن کے واسطے مکانات دیئے جن سے گرمی اور سردی میں راحت ملتی ہے۔ پہننے کو کپڑے دیئے ہیں۔ ہوا اور پانی آگ اور دھوپ یہ نعمتیں ایسی ہیں کہ کسی کے بھی قبضہ میں نہیں مگر حق تعالیٰ نے ہم کو مفت عنایت فرمائی ہیں۔ اور اسی طرح ہر شخص اپنی اپنی حالت میں غور کرے تو اس کو خدا تعالیٰ کے انعامات اس کثرت سے اپنے اوپر معلوم ہوں گے جن کا انکار نہیں ہو سکتا اور ساتھ ہی اس کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم ان نعمتوں کا کچھ بھی شکر ادا نہیں کرتے۔

عورتوں میں ناشکری کا زیادہ مادہ ہے:

خصوصاً عورتیں کہ ان میں تو ناشکری کا بہت ہی زیادہ مادہ ہے۔ حدیث میں عورتوں کی

بابت ارشاد ہے تکثرن اللعن وتکفرن العشیر (الصحیح للبخاری المتقین ۱: ۸۳)
کہ تم لعنت اور پھٹکار کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ اکثر عورتیں تو ایسی ہی ہیں جو شوہر کی
ناشکری زیادہ کرتی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی بندیاں شوہر کا شکر ادا کرتی ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کے
شکر سے غافل ہیں خاوند کا اس لئے شکر کرتی ہیں کہ وہ چھنا چھن روپے لاتا رہتا ہے پہننے کو زیور
اور کپڑے عمدہ بنا دیتا ہے تو اس کو تو روپیہ اور زیور لاتے ہوئے دیکھتی ہیں اسلئے اس کا شکر ادا
کر دیتی ہیں اور خدا تعالیٰ کو کچھ دیتے دلاتے دیکھا نہیں اس لئے خدا تعالیٰ کا دھیان بھی نہیں آتا
اور کسی کو ذرا بھی خیال نہیں ہوتا کہ سب نعمتیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس کا شکر بھی کرنا چاہے۔
البتہ کھانا کھا کر عورتیں اتنا ضرور کہہ دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تیرا شکر بس ان کا بڑا شکر کھانے کے
وقت ادا ہوتا ہے اور اس زبانی شکر ہی کو وہ شکر سمجھتی ہیں اس لئے شاید ان کو یہ خیال بھی ہوا ہو کہ
ہم تو دونوں وقت کھانا کھا کر خدا تعالیٰ کا شکر کرتے ہیں پھر ہم کو ناشکر کیوں کہا جاتا ہے۔

شکر کی حقیقت:

سو بات یہ ہے کہ ان کو ابھی تک شکر کی حقیقت ہی معلوم نہیں ہوئی حقیقت معلوم ہو
جائے تو وہ خود کہیں گی کہ واقعی ہم بہت ناشکری کرتے ہیں۔ اس غلطی میں اکثر لوگ بتلا ہیں
کہ وہ زبان سے اللہ تعالیٰ تیرا شکر کہنے ہی کو شکر سمجھتے ہیں اس غلطی کو قرآن شریف نے دفع
کیا ہے۔ فرماتے ہیں اعملو اٰال داوٗد شکراً اے ال داوٗد شکر کے لئے عمل کرو۔ اس
سے معلوم ہوا کہ شکر کا تعلق عمل سے بھی ہے صرف قول ہی سے تعلق نہیں۔

شکر کا محل عام ہے:

اگر شکر کا تعلق صرف قول سے ہوتا تو اعملوا نہ فرماتے شکرا فرماتے۔ پس قرآن
میں شکر کے لئے اعملوا فرمانا اس کی صاف دلیل ہے کہ شکر کا تعلق عمل سے بھی ہے۔
اور یہی ہمارے علماء نے لکھا ہے کہ شکر کا محل عام ہے لسان و قلب و اعضاء سب سے شکر ہوتا
ہے اس مضمون کو ایک شاعر نے بھی بیان کیا ہے۔

افادتکم النعماء منی ثلثة یدی ولسانی والضمیر المحجبا

(میری نعمتوں میں سے جو تم کو عطا کی گئی ہیں تین نعمتیں تو لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچاتی ہیں ہاتھ، زبان، دل)

تو حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ شکر کے لئے عمل کرو۔ اور عورتیں صرف کھانا کھا کر یا سونے کے کڑے پہن کر زبانی شکر کرتی ہیں۔ وہ بھی شوہر کے سامنے نہیں نہ اس کے سامنے پہن کر جائیگی اس کے سامنے زبان سے بھی کبھی شکر نہیں کریں گی اس کے سامنے تو ہر چیز کو کم ہی ظاہر کریں گی تاکہ آج سونے کے کڑے لایا ہے تو کل کو خوشامد میں سونے کی کڑیاں لاوے گا شہتیر لاوے گا۔ سونے چاندی سے ان کو کبھی سیری ہی نہیں ہوتی۔

عورتوں کو اپنے شوہروں کے شکر کی ضرورت:

مگر سب ہی ایسی نہیں بعض عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ایسی بھی ہیں جو شوہر کو معظم سمجھتی ہیں۔ اس کی لائی ہوئی چیزوں کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتی ہیں اور جن کا اس حدیث پر عمل ہے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ (سنن الترمذی: ۱۹۵۵) جس نے آدمیوں کا شکر نہیں کیا وہ خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کرتا۔ سو یاد رکھو کہ جب تک شوہر کا شکر نہ کرو گی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے ہاں تیرا شکر بھی قبول نہ ہوگا۔ خدا تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ جب ہم کوئی نعمت اپنے کسی بندے کے ذریعہ سے تم کو دیں تو ہمارے شکر کے ساتھ اس آدمی کا شکر بھی کرو۔ غرض شکر کی حقیقت یہ ہے کہ زبان سے بھی شکر کرو ہاتھ اور پاؤں سے شکر کرو۔ دل سے بھی شکر کرو اور زبان کا شکر یہی نہیں ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ تیرا شکر کہہ دیا کرو بلکہ زبان کو ان کاموں میں مشغول کرو جو خدا تعالیٰ کو پسند ہیں اور ان باتوں سے بچاؤ جن سے وہ ناراض ہوتے ہیں۔ زبان سے خدا تعالیٰ کا ذکر کرو قرآن کی تلاوت کرو۔ مسئلے مسائل پڑھو دوسروں کو بتلاؤ زبان سے غیبت نہ کرو۔ چغلی نہ کھاؤ۔ جھوٹ نہ بولو۔ یہ زبان کا شکر ہے۔ کان کے متعلق شکر یہ ہے کہ اچھی باتیں سنو۔ قرآن اور مسئلے مسائل اور اللہ تعالیٰ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنو۔ غیبت اور چغلی اور حکایات وشکایت نہ سنو۔

دل کا شکر:

دل کے متعلق شکر یہ ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

پیدا کرو۔ تواضع اور مسکنت اور توکل اور خوف خدا تعالیٰ پیدا کرو۔ اور بری عادتیں اس میں سے نکال دو۔ تکبر اور حسد اور عجب وغیرہ سے اس کو پاک وصاف رکھو کسی کو حقیر نہ سمجھو۔

اپنے خاتمہ بالخیر ہونے کا علم کسی کو نہیں:

علماء نے لکھا ہے کہ مومن جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے اس وقت تک مومن نہیں اس کی حقیقت تو اہل حال سمجھتے ہیں مگر اس کی ایک ظاہری توجیہ تو یہی ہے کہ خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں اس لئے بالتعیین کسی کافر سے اپنے کو افضل نہ کہے کیا خبر ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو جائے اور خدانخواستہ ہمارا خاتمہ برا ہو جائے تو وہ ہم سے افضل ہو جائے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پڑوس میں ایک بنیا رہتا تھا وہ مرگیا تو مولانا نے اس کو جنت میں پھرتا دیکھا پوچھا کہ لالہ جی تم یہاں کہاں؟ کہنے لگا مولوی جی مرتے وقت میں نے ان کہنی (یعنی کلمہ شریف) کہہ لی تھی اس وقت تک فرشتے نظر نہ آئے تھے وہ ان کہنی قبول ہوگئی۔ لیجئے لالہ جی نے ساری عمر تو کفر میں گزاری اور اخیر عمر میں جنت لے مرے تو خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں اس لئے کسی خاص شخص سے خواہ وہ کافر ہی ہو اپنے کو افضل نہ سمجھے۔ البتہ اجمالاً یہ عقیدہ رکھے کہ جن کا خاتمہ ایمان پر ہوگا وہ ان لوگوں سے اچھے ہیں جو کافر مریں گے۔ نیز دل میں کسی مسلمان سے دنیاوی معاملات کی وجہ سے عداوت نہ رکھے یہ دل کا شکر ہے۔

سارے بدن کا شکر:

اور سارے بدن کے متعلق یہ شکر ہے کہ عورت کوئی ایسا کپڑا نہ پہنے جس سے بدن جھلکے۔ اور نامحرم سے پردہ میں کمی نہ کرے۔ اپنی مسلمان بہن کے سامنے بڑا بننے یا اترانے کے واسطے کوئی بڑھیا کپڑا یا زیور نہ پہنے جس سے اس کا دل ٹوٹے۔ اسی طرح مرد کوئی لباس خلاف شرع نہ پہنے۔

کامل شکر:

غرض کامل شکر یہ ہے کہ تمام اعضاء زبان اور ہاتھ دل سب کے سب خدا تعالیٰ کی

عبادت میں مشغول ہوں دل میں محبت و معرفت الٰہی ہو۔ اور کسی عضو سے گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ اس وقت تم شاکر ہو گی۔ اس لئے کہ تم کو ایک احکام جاننے کی۔ دوسرے ہمت کی ضرورت ہوگی۔ سو بحمد اللہ اس وقت علم کا سامان بہت آسان ہو گیا ہے ضروری معلومات کے لئے بہشتی زیور کے حصے بھی کافی ہیں۔ سو سب سے پہلے تو علم کا اہتمام کرنا چاہئے دوسری ضرورت ہے ہمت کی کہ دل سے یہ ہمت کرلو کہ ہم خدا تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہ کریں گے اگر کوئی غیبت اور شکایت کی باتیں کرے اس کی بات ہرگز نہ سنو چاہے کوئی ہو اگر کہیں خلاف شرع رسمیں ہوں وہاں کبھی نہ جاؤ چاہے۔ ساری برادری ناراض ہو جائے کچھ پرواہ نہ کرو۔

ذکر اللہ سے ہمت میں برکت ہوتی ہے:

قیامت میں یہ برادری کام نہ آئے گی تمہاری ہمت ہی کام آئے گی۔ پھر اس ہمت کو برکت اور قوت اللہ اللہ کرنے سے ہوتی ہے اس لئے کچھ ذکر شروع کر دو اور یہ مت سمجھو کہ اصلاح کے لئے بس تسبیح پڑھ لینا کافی ہے یہ تنہا کافی نہیں اس سے تو صرف ہمت کو قوت ہو جاتی ہے دل میں انوار پیدا ہوتے ہیں اور ان سے عمل میں برکت ہوتی ہے اور اصل ضرورت عمل کی ہے۔ اسی طرح یہ خیال نہ کیا جائے کہ ذکر و شغل کرنے سے پھر ہمت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہمت سے تو پھر بھی کام لینا ہوگا۔ اگر ہمت ہی ہار دی تو پھر بیچاری تسبیح کیا کر لے گی۔ پھر اس سب کی امانت کے لئے ایک کام یہ کرو کہ سوتے ہوئے موت کا مراقبہ کرو۔ یہ سوچو کہ ایک دن ہم دنیا سے جانے والے ہیں موت کے فرشتے ہماری جان نکالیں گے اس وقت دنیا کے تمام دھندے خود بخود چھوٹ جائیں گے اور اس وقت ہم کو نیک کاموں کی حسرت ہوگی کہ ہم نے نیک کام بہت زیادہ کیوں نہ کئے تو ہم کو چاہئے کہ ابھی سے برے کاموں کو چھوڑ دیں اور نیک کاموں کا شوق کے ساتھ اہتمام کریں اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگیں پھر قبر کا حال سوچو پھر حساب و کتاب اور قیامت کا تصور کرو۔ یہ سمجھو کہ ایک دن خدا تعالیٰ کے سامنے جانا ہے حق تعالیٰ سب کاموں سے سوال کریں گے قیامت میں گناہ گاروں کو رسوائی ہوگی اس مراقبہ سے خدا تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوگا بہت سے کام خوف سے درست ہو جاتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی شکایت:

اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ اس میں حق تعالیٰ بندوں کی شکایت فرماتے ہیں اور ایسی شکایت ہے کہ اگر ہم باغیرت ہوتے تو مرجاتے فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں شکرگزار بہت کم ہیں۔ زیادہ ناشکرے ہیں یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی آقا اپنے نوکروں کو سنا کر کہے کہ نمک حلال نوکر بہت کم ہیں ظاہر ہے کہ غیرت مند تو اس بات سے زمین پر گڑ جائے گا، اس سے یہ بھی بات معلوم ہوگئی کہ شکر فقط زبان ہی سے نہیں ہوتا کیونکہ زبانی شکر تو ہر شخص کرسکتا ہے زبان سے تو اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے ہر آدمی کہہ لیتا ہے اگر شکر کی یہی حقیقت ہوتی تو حق تعالیٰ اتنی بڑی شکایت نہ فرماتے کہ میرے بندوں میں شکرگزار کم ہیں معلوم ہوا کہ شکر کا زیادہ تعلق عمل سے ہے اور بے شک عمل کرنے والے بہت تھوڑے ہیں اسی لئے یہ شکایت کی گئی۔ تو صاحبو! ہم کو حق تعالیٰ کی شکایت سے غیرت کرنی چاہئے اور اپنے تمام اعمال کو درست کرنا چاہئے اس وقت ہم شاکر کہلا سکتے ہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم کی توفیق اور عمل کی ہمت عطا فرماویں۔

اس کے بعد حسب معمول حضرت والا نے خاموشی کے ساتھ دعا فرمائی اور سب حاضرین نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اے اللہ تعالیٰ اس ناچیز غلام اور عبدالمنان کو بھی شاکروں میں داخل فرما۔ اور اس کو اپنے مقبول بندے حضرت حکیم الامتؒ کے برکات وفیوض سے متمتع فرما کر ایمان کامل پر خاتمہ نصیب فرمائیے۔ آمین.

واخر دعوٰنا اَنِ الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین. ۱۲ جامع

التنبہ

یہ وعظ ۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۱ھ بروز جمعہ بمقام جامع مسجد تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ ۵۵ منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۷۵ تھی۔ جس کو مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ (۴۲) فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۴۳) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۴۴) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ط وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ترجمہ:۔ اور ہم نے امتوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزر چکی ہیں پیغمبر بھیجے تھے سو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تا کہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے لیکن ان کے قلوب تو سخت ہی رہے اور شیطان ان کے اعمال کو ان کے خیال میں آراستہ کر کے دکھلاتا رہا پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیئے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں وہ اترا گئے ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا تو وہ بالکل حیرت زدہ ہو گئے پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی تعریف کے لائق ہیں جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

تمہید

ملت اسلامیہ کا خاص امتیاز:

یہ چند آیتیں ہیں سورہ انعام کی ان آیتوں میں جو مضمون مذکور ہے وہ اس وقت کی حالت کے مناسب ہے اور اسی لئے مضمون کو اس وقت اختیار کیا جاتا ہے یعنی ہر وقت میں انسان کی ایک حالت ہوتی ہے اور اس حالت کے مناسب حق تعالیٰ کے کچھ احکام ہوتے ہیں انسان کی کوئی ایسی حالت نہیں ہے جس کے متعلق قرآن میں کوئی نہ کوئی حکم مذکور ہے نہ ہو خواہ بلاواسطہ خواہ بواسطہ حدیث کہ حدیث میں اس حالت کے متعلق کچھ حکم ہوتا ہے سو حدیث بھی قرآن ہی کی تفصیل ہے بہرحال قرآن میں ہو یا حدیث میں شریعت اسلامیہ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ کوئی حالت اور مواقع ایسا نہیں جس کے متعلق اس شریعت میں کوئی حکم نہ ہو اور اس کا راز یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی الایتہ۔ ترجمہ یہ ہے کہ کیا انسان چاہتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے یعنی ایسا نہیں ہوسکتا مہمل وہ ہے جس کے واسطے کوئی حکم نہ ہو کوئی اس سے تعرض نہ کرے جیسے ہندو بیل کو سانڈ بنا کر چھوڑ تے ہیں کہ چاہے وہ کھیت کھا لے چاہے کچھ نقصان کردے مگر اس سے کچھ تعرض نہیں کرتے اور اس سے کچھ نہیں کہتے۔ تو اگر انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے اور آزادی میں اپنی راحت سمجھتا ہے کیونکہ اس میں خواہش نفسانی اچھی طرح پوری ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ بڑے رحیم کریم ہیں چونکہ آزادی میں اس کی مضرت تھی اس لئے اس کو آزاد نہیں کیا بلکہ اس کے واسطے احکام نازل فرما کر مقید کر دیا اگر اس کو مقید نہ کیا جاتا تو ایسی مثال ہوتی جیسے طبیب کسی مریض کو آزاد کردے کہ جو کچھ چاہے کھائے پیئے پرہیز کسی چیز کا نہیں اب ظاہر ہے کہ اس مریض کا کیا حشر ہوگا اس مثال پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ طبیب تو ادویہ واغذیہ کے خواص کا صرف جاننے والا ہے وہ خاص اس کے ہاتھ میں نہیں اس لئے اس کی شفقت تو اسی میں ہے کہ مریض کو مقید کرے اگر اس نے آزاد کر دیا تو وہ دوائیں اور غذائیں ایک دن ایسا اثر پیدا کریں گی کہ جو وہ اس کے اختیار سے باہر ہوگا بخلاف حق تعالیٰ کے کہ سب خواص اشیاء ان کے ہاتھ میں ہیں ان کو قدرت

ہے کہ آزاد کر کے پھر ان اشیاء کے خواص کے اثر کو ظاہر نہ ہونے دیں مثلاً حکیم کی شفقت تو اس میں ہے کہ زہر سے منع کرے کیونکہ اگر منع نہ کیا تو اس کی خاصیت طبیب کے ہاتھ میں تو ہے نہیں وہ ایسا اثر کرے گا جس کو طبیب نہیں روک سکتا اور حق تعالیٰ کے ہاتھ میں زہر کی خاصیت ہے۔اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ زہر کھا کر کوئی بھی نہ مرے وہ اس کے اثر کو روک سکتا ہے تو رحمت وشفقت کے لئے خدا کو یہی کیا ضرور تھا کہ انسان کو مقید ہی فرماوے شفقت کا یہ بھی تو ایک طریقہ تھا کہ آزاد کر کے خواص اشیاء کے اثر کو روک دیتے جیسا کہ خدا نے آگ کو ابراہیمؑ پر گلزار کر دیا۔ داؤدؑ کے لوہے کو نرم کر دیا۔ ایسا ہی اوروں کیلئے بھی کر دیتے ہیں تو دراصل یہ شبہ مسئلہ تقدیر کے متعلق ہے اس کا جواب وہی ہے جو مسئلہ قدر کا ہے جس میں زیادہ گفتگو کرنے سے شریعت نے ہم کو منع کر دیا ہے۔ مجملاً جواب کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بعض مصالح اس کو مقتضی ہوئیں کہ ہر شے میں کوئی خاصیت واثر رکھا جائے جو اس شے کے لئے لازمی ہو کفر وایمان ایک خاصیت ہے علم وجہل میں ایک خاصیت طاعت و معصیت میں ایک خاصیت ہے۔ اور یہ بات نہیں کہ شریعت نے مسئلہ قدر میں گفتگو کرنے سے روکنے میں ہم پر جبر کیا ہے کہ دل مانے یا نہ مانے اس کو بلا گفتگو مانا جائے۔

حق تعالیٰ شانہ، کی عجیب رحمت:

بلکہ حق تعالیٰ شانہ، کی عجیب رحمت ہے کہ اس نے اسباب میں ہماری امداد بھی کی کہ جس مقدار پر مسئلہ تقدیر کی ہم کو تعلیم دی گئی ہے اس کو فطری بنا دیا ہے بلکہ فطرت اس سے گھبراتی ہے چنانچہ طبائع سادہ ہیں وہ اتنا کہہ دینے سے مطمئن ہو جاتی ہیں کہ میاں کی مصلحت اس کو مقتضی تھی اور اگر اسباب بیان کرنے لگو تو طبعیت کو قرار نہیں ہوتا اور وجہ یہ ہے کہ سب اسباب حادث ہیں ہر ایک سبب کے لئے کوئی مسبب ہوگا۔ آخر میں قرار اسی سے ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی اسی کو مقتضی تھی کسی کو کوئی مہلک مرض ہوا اور وہ مر جائے اب اگر اسباب بیان کرنے بیٹھو تو کوئی کہتا ہے کہ فلاں چیز دی تھی اس سے پیٹ میں سدہ پیدا ہو گیا ہے اس سے پاخانہ پیشاپ بند ہو گیا کوئی کہتا ہے کہ دماغ کو گرمی چڑھ گئی سرسام ہو گیا ہر ایک کو کچھ نہ کچھ خیالات پیدا ہوں گے مگر اس سے سوائے کلفت زیادہ ہونے کے کچھ حاصل نہ ہوگا جو

سادہ طبیعتیں ہیں وہ یہی کہیں گے کہ میاں کہاں جھگڑا باندھا خدا کو یہی منظور تھا اس کی اسی میں مصلحت تھی سبحان اللہ حق تعالیٰ نے کیا تائید فرمائی ہے کہ جتنا ہم کو تقدیر کے ماننے پر حکم ہے اسی کو فطری بنا دیا ہے کہ ہمیشہ طبیعت کو اسی سے قرار ہوتا ہے تو چونکہ مسئلہ تقدیر کی طرف فطرت کیخلاف ہے اس لئے میں نے بھی اس شبہ کے جواب میں تفصیل کو چھوڑ دیا اور اجمال پر اکتفا کیا

ہر چیز کی ایک خاصیت حق تعالیٰ شانہ کی حکمت ہے:

وہ یہ کہ حق تعالیٰ کی حکمتیں لاانتہا ہیں اور نہیں حکمتوں کا یہ مقتضا ہے کہ ہر شے میں ایک خاصیت رکھدی ہے۔ جس کا اثر ضرور ظاہر ہوتا ہے اب وہ سوال نہیں ہو سکتا کہ شفقت کا بھی ایک طریقہ تھا کہ آزاد کر دیا جاتا اور خواص اشیاء کے اثر کو روک دیا جاتا اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ خدا کی حکمت اسی کو مقتضی ہے کہ جس شے میں جو خاصیت ہے وہ اس کا اثر ظاہر ہو زنا میں جو ظلمت اور وحشت ہے وہ ضرور ظاہر ہوگی ظلم کا جو وبال ہے وہ یقیناً ہو کر رہے گا زمین دبانے کا جو قہر ہے وہ ضرور پڑے گا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ حق تعالیٰ کی رحمت اسی میں ہے کہ آزاد نہ کیا جائے بلکہ مقید کر دیا جائے لہٰذا ہر حالت کے متعلق حق تعالیٰ کے کچھ احکام ہیں جس کو شریعت میں مفصلاً بیان کیا گیا ہے انہیں حالات میں سے ایک وہ حالت ہے جس میں ہم مبتلا ہو رہے ہیں تو اس کے متعلق کچھ احکام ہوں گے میں ان کو اس وقت بیان کر دینا چاہتا ہوں وہ حالت یہ ہے کہ دو مہینہ سے ہماری بستی میں طاعون پھیل رہا ہے اور عرصہ سے لوگ اسی کے قصہ میں ہیں بلکہ بعضوں کو تو جب سے طاعون آیا ہے ایک شغل ہاتھ آ گیا گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور مرنے والوں کے شمار معلوم کرتے ہیں اگر دو پہر تک کوئی نہ مرے تو کہتے ہیں میاں ابھی شام کو آنے دو وہ شام کا انتظار کرتے ہیں اگر شام تک سن لیا کہ کوئی مرا ہے تو تحفہ کے طور پر کہتے ہیں کہ لو میاں تم تو کہتے تھے کہ آج کوئی نہیں مرا فلاں مرا ہے ان لوگوں کے تو طاعون کا آنا اور باعث غفلت ہو گیا کہ انہوں نے اسی کو لہو ولعب بنا لیا مگر تا ہم ہم اکثر لوگ اس وجہ سے پریشان ہیں اور ان پر طاعون کے آنے کا اثر بھی ہوا ہے اور ان کے دل پر چوٹ بھی لگی ہے مگر انہوں نے یہ غضب ڈھایا کہ ان میں سے بعض تو مصیبت سے پریشان ہو کر خدا کی ناشکری کرتے ہیں جب کوئی مر جاتا

ہے تو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جس سے خدا کی شکایت ٹپکتی ہے یہ لوگ خدا کو رائے دیتے ہیں کہ ایسا کیوں کر دیا یا یوں کیوں نہ کیا اگر چہ صریح الفاظ سے نہ کہیں کہ ہم خدا کو رائے دیتے ہیں مگر ان کی باتوں سے مفہوم یہی ہوتا ہے غور کیجئے۔

حق تعالیٰ شانہ، کی شکایت کا سبب:

ہم نے بعضوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ فلاں تو وقت سے پہلے مر گیا ابھی اس نے دیکھا ہی کیا تھا اب یہ رائے دینا نہیں تو اور کیا ہے گویا خدا کے احکام میں نقص نکالتے ہیں گویا یہ شخص موت کے وقت کو خدا سے زیادہ جانتا ہے جو کہتا کہ فلاں وقت سے پہلے مر گیا۔

تو صاحبو! بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کے دماغ سڑ گئے ہیں ہم اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں مثل مشہور ہے کہ اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہیں گزرتا اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ ایک حکایت بھی مشہور ہے کہ ایک اونٹ کی اور چوہے کی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ دونوں سیر کو چلے راستہ میں دریا مل گیا تو اونٹ تو اس میں گھس گیا چوہا کنارہ ہی پر رہ گیا تو اونٹ نے اس سے کہا کہ چلے آؤ پانی بہت کم ہے صرف ٹخنوں تک پانی ہے چوہے نے کہا اجی حضور ذرا اپنی ٹانگوں پر نظر کیجئے تمہارے ٹخنوں تک پانی ہے میں تو ڈوب ہی جاؤں گا چوہے کی یہ بات سن کر اونٹ کا دماغ کہاں تھا سمجھا کہ میں بہت ہی بڑا ہوں مگر خدا کی رحمت ہوئی کہ راستہ میں ایک پہاڑ پڑ گیا اب اونٹ کی گردن نیچی ہوئی کہ نہیں کوئی مجھ سے بھی اونچا ہے۔ صاحبو! ہماری حالت اس اونٹ کی سی ہو رہی ہے ایک تو خود ہم میں خناس سما رہا تھا اوپر سے لوگوں کی تعظیم نے ہمارا ناس کر دیا اب ہم اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے یہاں تک دماغ سڑا کہ حق تعالیٰ کے افعال و تصرفات میں عیب نکالتے ہیں اور اعتراض و شکوہ شکایت کرتے ہیں۔ گویا خدا نے ہماری مرضی کے خلاف کیوں کام کیا۔ صاحبو! اگر حاکم دنیوی کسی مقدمہ میں آپ کے خلاف ڈگری کر دے اگر چہ اس سے غلطی ہی ہو گئی مگر سامنے یہی کہو گے کہ حضور بجا کیا درست کیا مجھے ایک اپنے دوست کی حکایت یاد آئی کہ جن کا نام اس وقت بیان کرنا مناسب نہیں جانتا کہ کسی حاکم کے یہاں ان کا مقدمہ تھا، اتفاق سے حاکم نے ان کے خلاف فیصلہ کر دیا پھر اس حاکم نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس شخص کا میری

طرف کیا گمان ہے اس نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے ان سے گفتگو کی اور دھوکہ دیا کہ اپنا نام اس کے کسی دوست کے نام پر بدل دیا کیونکہ اس میں آواز نہیں پہچانی جاتی اور یہ کہا کہ فلاں حاکم نے بڑا ظلم کیا کہ آپ کو ہرادیا ہے حالانکہ آپ حق پر تھے مجھے اس کا سخت افسوس ہے اس وقت ان کے دل میں خدا کی طرف سے بات آگئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گفتگو کرنیوالا خود وہی حاکم ہو اس لئے کوئی ایسی بات نہ کہنی چاہئے جس پر گرفت ہو سکے انہوں نے یہ جواب دیا کہ نہیں صاحب ہمیں حکام سے بدگمانی نہیں کرنی چاہئے وہ ظلم نہیں کر سکتے وہ اپنی طرف سے حق معلوم کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں انہوں نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ عین عدل ہے۔ تو صاحبو! دیکھئے اس احتمال پر کہ کہیں حاکم نہ سن رہا ہو ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے کام پر اعتراض کیا جائے اور حاکم حقیقی جس کے بارہ میں یقین ہے کہ وہ سنتا اور دیکھتا ہے بے باکانہ گستاخیاں کرتے ہیں اور اسی کے فیصلوں میں عیوب اور نقائص نکالتے ہیں۔

احکام الٰہیہ میں نکتہ چینی کتنی بڑی گستاخی ہے:

افسوس ہے کہ حاکم مجازی کے فیصلہ میں نکتہ چینی نہ کرسکیں اور حاکم حقیقی کے احکام میں بے دھڑک نکتہ چینیاں کرتے ہیں حق تعالیٰ حلیم و کریم ہیں ورنہ گستاخی تو ایسی سخت ہے کہ سب ایک طرف سے کردیئے جاتے مگر شائد اس لئے کچھ نہیں کہا جاتا کہ لوگ ناواقفی سے ایسا کرتے ہیں بے ادبی کا قصد تو نہیں کرتے۔ مگر ناواقفی کی وجہ سے وہ گستاخی ہو جاتی جیسا کہ گنواروں سے حکام دنیا مواخذہ نہیں کرتے مگر صاحبو! گنوار ہونا خود ایک بہت بڑا عیب ہے حکام ناواقف سمجھ کر گنواروں سے کچھ مواخذہ نہ کریں تو وہ حکام کے مقرب بھی نہیں ہوتے تو ایسے لوگ خدا کے یہاں درجہ کمال میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک خدا اس کے سوا ہمارا کوئی نہیں پھر اس کے ہم مقرب نہ ہوں اور وہ ہم سے ناخوش ہوں۔ اور یہ بات کہ ناواقفی سے گستاخیاں کرتے ہیں میں نے اس لئے کہہ دی کہ شاید تم کہو کہ یہ باتیں تو ہمارے ذہن میں بھی نہیں آئیں جو تم نے اس وقت گنائی ہیں تو صاحبو ہم اگرچہ قصداً گستاخی نہ کریں مگر ہماری جہالت سے گستاخی ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک دوست تھے عبدالرحمٰن خان صاحب ان سے بہت نفع تھا کیونکہ وہ دیہات میں جا

کرگاؤں والوں کی اصلاح کیا کرتے تھے جہاں علماء بھی نہیں جاتے کیونکہ مولوی تو اسی جگہ جاتے ہیں جہاں سمجھدار لوگ ہوں دیہات میں مولوی کم جاتے ہیں تو انہوں نے اپنا قصہ بیان کیا کہ ایک دفعہ میں ایک گاؤں سے چلنے لگا تو ایک گوجر کے لڑکے نے مجھے روکنا چاہا کہ ابھی ٹھہر جائیں میں نے کہا بھائی مجھے ضروری کام ہے۔ تو اس نے اپنے چچا یا دادا کو پکارا کہ یہ پیر تو ٹھہرتا نہیں تو وہ گوجر کیا کہتا ہے کہ پیر کی دادی کی یوں توں کروں یہ پیر ایسے ہوں ہیں۔ اور خیر سے دونوں خان صاحب سے مرید بھی تھے خان صاحب نے اس سے کہا کہ شاباش چوہدری مرید ہو کر میری ہی دادی کو سنگوانا تھا، گوجر نے کہا کہ پیر برا مت مان ہم گنوار ایسے ہی ہوں۔ تو گو خان صاحب نے اس کی جہالت کی وجہ سے اسے کچھ نہ کہا مگر یہ بھی نہیں کہ وہ اس کو مقرب بنا کر پہلو میں بٹھاتے ہوں گے تو اگرچہ ناواقف ہونے کی وجہ سے ان لوگوں سے حق تعالیٰ مؤاخذہ نہ فرماویں مگر یہ لوگ خدا کے مقرب بھی نہیں ہوتے۔ جب خدا تعالیٰ اس کو پسند نہیں فرماتے تو ہم آپس میں کسی کو گالی دیں یہ کب پسند ہو سکتا ہے کہ خود ان کو بے نقط سنا دیں اور اگر سمجھ کر قصد سے کہا ہے تب تو مؤاخذہ یقینی ہے اور خسارہ تو ہر حال میں ہے۔ بھلا کتنا بڑا ظلم ہے کہ جو بات ہم کسی حاکم کے مجازی کو بھی نہ کہہ سکیں وہ حاکم حقیقی کو بے خوف خطر کہتے ہیں۔ تو خسارہ سے تو کوئی حالت نہیں۔ ایک تو یہ حالت جو ہم کو پیش آ چکی ہے یعنی طاعون کا آنا۔

اب ایک دوسری حالت اس کے فی الحال پیش آ رہی ہے اور اس کا تعلق ان سے ہے جن کو شہر کے حالات سے اطلاع رہتی ہے، بہت سے ایسے ہیں کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں شہر میں کیا ہو رہا ہے اور یہ اچھی حالت ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی بیمار ہو تو اسے پوچھنے ہی نہ جاوے یہ تو ضروری بات ہے میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی خبروں کی ہر وقت تلاش میں رہنا جیسا کہ بعض نے اسی کو مشغلہ بنا رکھا ہے یہ برا ہے بعض احباب نے مجھ سے بذریعہ خطوط دریافت کیا تھا کہ بستی میں بیماری کی کیا حالت ہے تو میں نے جواب میں یہ لکھدیا تھا کہ سنا ہے کہ اب کمی پر ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایک مرتبہ میں اور بھائی اکبر علی دونوں کھانا کھا رہے تھے بھائی نے پوچھا کہ آج کونسا دن ہے تو میں نے کہا سنا ہے کہ بدھ ہے تو اس پر والد صاحب نے میرے ایک طمانچہ مارا تھا کہ کیا تم کو خبر نہیں یوں کہتے ہو کہ سنا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں والد صاحب کی طرح یہ شخص بھی مجھ کو بے وقوف نہ بنائے کہ شہر میں رہتے ہیں

اور پھر بیماری کی خبر نہیں کہ لکھتے ہیں میں سنا ہے مگران دونوں واقعوں میں فرق ہے روزہ تو خود رکھتا تھا اس میں یہ کہنا کہ سنا ہے واقعی بے وقوفی کی بات تھی اور بیماری کا مشاہدہ تو ہے نہیں سننے کی اس لئے فرصت نہیں کہ کام بہت ہیں واللہ اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ جو اپنے کام ہیں وہی اچھی طرح پورے ہو جائیں تو شہر کے حالات معلوم کرنے تو کہاں مہلت ملے۔

اپنی حالت سے بے خبری:

مجھے صاحبو حیرت ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو فرصت کیسے ملتی ہے جو حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ. کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل کیلئے کیا بھیجا ہے یہ نہیں فرمایا وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ نفس غیرک لغد. مگر آج کل ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے کوئی طاعون میں مرجائے تو لوگ مجمع میں بیٹھ کر اسکا تذکرہ کرتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ میاں کیسے قہر الٰہی میں نہ مرتا اپنی بہو کو بری نظر سے دیکھتا تھا ایک بولے کہ طاعون کیسے نہ ہو پرایا مال بھی کھایا کرتا تھا دوسروں کے اعمال کی سب خبر رکھتے ہیں اپنی خبر نہیں کہ رات دن جھوٹ ، غیبت ، بہتان میں گزرتا ہے۔ رشوت اور سود کا مال کھاتے ہیں اس کا تو ایک کام طاعون کا سبب بن گیا اور اپنا یہ گناہوں کا پہاڑ بھی کچھ کرتا۔ ہاں اگر طبیب کو ان حالات کی اطلاع رہے تو اس کے لئے البتہ زیبا ہے کیونکہ اس سے اس کو معالجہ کی طرف توجہ زیادہ ہو جاتی ہے غرض جن لوگوں کو اس کی تفتیش ہے ان سے اس دوسری حالت کی اطلاع ہوئی ہے اور وہ طاعون کا اب کم ہونا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اب کچھ کم ہے تو یہ دو حالتیں ہوئیں ایک طاعون کی زیادتی دوسری اس کے بعد اب اس کمی کی اور اس بیشی کمی سے ایک مجموعی حالت متحقق ہوئی یعنی ایک بلا کا آجانا پھر اس کا کم ہو جانا تو چونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہر حال کے متعلق ہیں تو اس مجموعی حالت کے لئے بھی کچھ حکم ہوگا اس وقت میں سناتا ہوں۔

وعظ میں کس قسم کے مضامین بیان کرنے چاہئیں:

اور صاحبو! وعظ میں یہی باتیں ہیں جو سننے اور سنانے کے قابل ہیں اکثر لوگ قصے اور مثنوی کو وعظ سمجھتے ہیں جس وعظ میں کوئی قصہ نہ ہو نہ شعر پڑھا جائے اس کو لوگ وعظ ہی نہیں جانتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مذاق بگڑ گئے ہیں ورنہ وعظ تو احکام کے بیان کرنے کا

نام ہے مگر احکام میں بھی بعض وہ احکام ہیں جو مشہور ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ جن کو اکثر لوگ جانتے ہیں زیادہ سنانے کے قابل وہ احکام ہیں جن کی لوگوں کو خبر نہیں یہاں بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ جن کو بالکل معلوم نہیں کہ بلا کے متعلق کیا احکام ہیں۔

بلا کے آنے اور جانے کے وقت کے احکام:

اس لئے ضرورت ہے کہ بتلا دوں بلا کے آنے کے وقت خدا کے کیا احکام ہیں۔ حق تعالیٰ اس آیت میں پہلی امتوں کی حکایت بیان فرماتے ہیں اور یہ مضمون دوسری جگہ بھی ایک آیۃ میں اسی کے قریب قریب مذکور ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَھْلَھَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّھُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الْحَسَنَۃَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ

ترجمہ:۔ یعنی ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہوتا کہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دیں یہاں تک کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور اس وقت برائے کج فہمی کہنے لگے کہ ہمارے آباؤ اجداد کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھی ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا اور ان کو خبر بھی نہ تھی۔

اور یہ دوسری جگہ اس مضمون کا آنا میں نے طلبہ کے لئے بیان کیا ہے کیونکہ ایک مضمون کے دو مقام میں ہونے سے ان کو فائدہ ہوتا ہے کہ ایک آیت کے بعض الفاظ کی توضیح و تفسیر دوسری آیت سے ہو جاتی ہے ورنہ عوام کے لئے اس کی ضرورت نہیں حق تعالیٰ جل شانہٗ ایک قصہ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے امتوں کی طرف رسول بھیجے تھے مگر وہ قصہ ایسا نہیں جیسا کہ آج کل قصہ کہانی لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس میں اول سے آخر تک کسی کی سوانح مذکور ہوں بلکہ وہ قصہ ہے بصورت شکایت اور اس میں مضمون بھی ایسا ہی ہے جو قصہ کے طور پر نہیں ہے اس لئے اگرچہ لفظاً خبر ہے مگر حکماً انشاء ہے اور یہی کیا جتنے قصے پہلوں کے قرآن میں جا بجا مذکور ہیں وہ سب ایسے ہی ہیں کہ ان سے مقصود اخبار نہیں بلکہ وہ سب حکم انشاء میں ہیں گویا ان

قصوں میں ہم کو یہ حکم ہوتا ہے کہ جو امتیں تم سے پہلے گزر گئی ہیں ان کے حالات دیکھ کر عبرت حاصل کرو اور یہ خدا کی بڑی رحمت ہے کہ ہم کو سب امتوں کے بعد میں پیدا کیا تا کہ پہلوں کے حالات دیکھ کر عبرت اور نصیحت حاصل کر سکیں جیسا کہ مکتب کے لڑکوں میں سے جس کا سبق استاد پیچھے سنے اس پر گویا بڑی عنایت کی اور جس کا سب سے پہلے سنے اس کی کم بختی آ جاتی ہے تو خدا کی بڑی نعمت ہے کہ ہم کو بعد میں پیدا کیا تو فرماتے ہیں کہ ہم نے پہلوں پر رسول بھیجے تھے پھر ہم نے ان کو شدت اور تکلیف سے پکڑا۔

انفسی اور آفاقی مصائب:

کلفتیں اور مصیبتیں دو طرح کی ہوتی ہیں داخلی اور دوسری خارجی یا یوں کہو کہ ایک انفسی ایک آفاقی یہ ہے کہ مثلاً کوئی دشمن چڑھائی کر کے چلا آوے۔ انفسی وہ کہ خود اپنے بدن میں کوئی مرض ہو باساء سے مراد آفاقی ہے اور ضراء سے مراد نفسی بلیات ہیں اور یہاں ایجاز سے اصل کلام اس طرح ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ (اور ہم نے اور امتوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزر چکیں رسول بھیجے تھے سو ہم نے انکو پکڑ لیا) تا کہ تضرعوا کے مقابل کوئی شئے مذکور ہو یعنی ان لوگوں نے تضرع نہ کیا بلکہ تکذیب کی تو ہم نے ان کو عذاب دیا جب انہوں نے سرکشی کی تو ہم نے ان کو مصائب میں گرفتار کیا۔ اس سے ایک فائدہ مستقلہ نکل آیا وہ یہ کہ مصیبت جب آتی ہے تو گناہ کی وجہ سے آتی ہے خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے پہلی امتوں کے پاس رسول بھیجے تو انہوں نے سرکشی کی ہم نے ان کو مصائب میں مبتلا کیا تا کہ وہ تضرع کریں۔ یہ تو بیان تھا مصائب کے آنے کا اسکے بعد ان مصائب سے ان کے متاثر نہ ہونے کا ذکر مع الشکایت ہے کہ اس وقت انہوں نے تضرع کیوں نہ کیا جبکہ ہم نے ان کو باساء میں گرفتار کیا تھا باساء یہاں عام ہے یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ بعد بلا آنے کے تضرع کرتے اور زاری کرتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ ان کے دل اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر دیا یعنی اپنے اعمال سیئہ کی طرف ان مصائب کو منسوب نہیں کیا پس یہ حالت تو مشابہ ہماری پہلی حالت کے ہے کہ اسی طرح ہم پر طاعون آیا مگر اس پر متنبہ نہ ہوا کہ یہ ہمارے اعمال کے سبب سے

ہے تا کہ اصلاح کر لیتے جس پر حق تعالیٰ کو شکایت ہے اس کے بعد ارشاد ہے کہ پھر جب بھول گئے اس چیز کو جس کی یاددہانی کرائے گئے تھے یعنی جب وہ مصیبت وغیرہ کو بھول گئے کیونکہ قاعدہ ہے کہ مصیبت اول اول یاد رہتی ہے پھر مساوات سی ہو جاتی ہے اور یاد نہیں رہتی ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ بیس سیر کے گیہوں ہو جانے پر سارے شہر میں شور مچ جایا کرتا تھا اور خلق اللہ پریشانی ہو جاتی تھی اب دس سیر ہو جانے پر بھی کسی کو خبر نہیں ہوئی غرض جب وہ مصائب کو بھول گئے تو ہم نے ابواب نعمت خوب کھول دیئے۔

دوسرے کی حالت سے عبرت حاصل کرنا سعادت ہے:

یہی مضمون دوسری آیت میں ان لفظوں سے ہے ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا الخ اب ان کی وہ غلطی اور پختہ ہو گئی کہ یہ اعمال کی وجہ سے نہیں ورنہ ہمارے اعمال تو اب بھی ویسے ہی ہیں پھر وہ نعمتیں ہم کو کیوں ملتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ مصیبت کا آنا ایک اتفاقی امر تھا اور ایسا ہی تھا جیسے آباؤ اجداد کو بھی ایسے واقعات پیش آئے اور ختم ہو گئے حتیٰ کہ جب وہ اترانے لگے تو خدا نے ان کو دوبارہ پکڑا یہاں تک کہ نا امید ہو گئے اور ان کی جڑ کٹ گئی اور خدا ہی کی تعریف ہے یہ دوسری حالت ہماری دوسری حالت کے مشابہ ہے کہ بیماری کم ہونے لگی تو لوگ بے فکر ہونے لگے اور تھوڑا بہت جو احتمال تھا وبال معاصی کا بھی رخصت ہونے لگا اور اس کے بعد اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً بہت خوف دلاتا ہے کہ ایسا نہ ہو پس لوگ تو بیماری کے جاتے رہنے سے خوش ہوتے ہیں اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت موجودہ غفلت میں بیماری کا جاتا رہنا اس کے آنے سے زیادہ خوفناک ہے۔ اور اس موقع پر وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ محاورہ کے موافق ہے کیونکہ جب ظالم ہلاک ہوتا ہے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ الحمد للہ ظالم شخص ہلاک ہو گیا ایسے ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ظالمین کی جڑ کٹ گئی اور خدا کا شکر ہے۔ یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب ہمیں چاہئے کہ اس قصہ پر اپنی حالت کو منطبق کر کے عبرت حاصل کریں کیونکہ یہ قصے اسی لئے ہیں خصوص اس موقع پر تو قصہ کا پیرایہ بھی نہیں بلکہ اس میں ان لوگوں کی شکایت ہے کہ انہوں نے عذاب کو اپنے اعمال کی وجہ سے نہ سمجھا اور تضرع وزاری کیوں نہ کی:

قصہ عبرت:

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُوْلِي الْاَلْبَابِ. (یعنی انبیاءؑ وامم سابقین کے قصے میں سمجھدار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے) حالانکہ قصہ یوسفؑ سے کوئی نتیجہ لفظوں میں نہیں بتلایا تھا مگر پھر بھی فرمادیا کہ یہ قصہ عبرت ہے تو جہاں نتیجہ نصاً مذکور ہو یقیناً عبرت ہی کیلئے ہے چنانچہ اس آیت میں جو قصہ مذکور ہے اس پر یہ نتیجہ مرتب فرمایا کہ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا کہ ان لوگوں نے بعد نزول عذاب تضرع کیوں نہ کیا صاف صاف شکایت فرمارہے ہیں اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں — خود حقیقت نقد حال ماست آں
نقد حال خویش راگر پے بریم — ہم زدنیا ہم زعقبے برخوریم

(یعنی دوستو یہ داستاں سنو کہ واقعہ میں ہماری ہی حالت کے مطابق ہے یعنی اگر اپنی موجودہ حالت میں غور وفکر کرتے رہا کریں تو دنیا وآخرت دونوں جہانوں کا ہم کو نفع حاصل ہو) گویا دوسرے کی حالت سے عبرت حاصل کرنا اور اس کو اپنے اوپر منطبق کرنا بھی سعادت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان پر پہلے احکام الٰہی آئے تھے بذریعہ انبیاءؑ ہمارے پاس بھی احکام آئے ورثۃ الانبیاء کے ذریعہ سے انہوں نے نافرمانی کی ہم نے بھی نافرمانی کی جس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

صورت بہیں حالت مپرس

(صورت دیکھو تو حال دریافت کرنے کی ضرورت نہیں) اگر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو اور ہم کو دیکھے ہرگز نہ پہچان سکے کہ ہم آپ کی امت ہیں کیا آپ غیبت کیا کرتے تھے کیا آپ کا لباس ایسا ہی تھا آپ کے وقت میں بھی یہ کھیل تاش وگنجفہ تھے کیا نعوذ باللہ آپ میں ایسا ہی ظلم تھا کہ جس کی چاہی زمین دبالی جس کا چاہا روپیہ مارلیا اگر کوئی ہمیں سلام کرلے تو ناخوش ہوتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سلام کیا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ کا انتقال ہوا تو آپ کے صرف دو چار آنسو نکل گئے اور یہاں آسمان اور زمین ایک رل ہوجاتا ہے۔ غرض ہماری حالت بگڑی ہوئی ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تمام جسم داغ داغ ہو رہا ہے کہاں کہاں روئی رکھیں یعنی ہماری حالت خراب ہے کس کس کا ذکر کریں)

اس حالت کو دیکھ دیکھ کر کوئی صاحب ذوق کہتا ہے ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب　　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

کہ اے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ذرا خواب راحت سے اٹھئے تو سہی دیکھئے آپ کی امت کس بلا میں گرفتار ہے۔

بعد وصال امتیوں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دہی:

صاحبو! ایک پیغمبر کی جان اور آپ پر دو دو دفعہ ہفتہ میں ساری امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں خیال تو کیجئے کہ آپ کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی الگ الگ ہر شخص کے اعمال پر نظر فرما کر رنجیدہ ہوتے ہوں گے آپ کو تو ہم سے اتنی محبت کہ ہمارے لئے یہاں تک دعائیں کیں کہ قدم مبارک سوج گئے اور ہم نے آپ کو بعد وفات بھی راحت نہ پہنچائی تو آپ کا کیا حال ہوگا اور پھر برے کام کر کے ہم لوگ اصرار کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اللہ غفور رحیم ہے تو پیغمبر پر ایمان بھی نہ لائے ہوتے تب بھی اللہ غفور رحیم ہے۔ صاحبو! جب ہماری یہ حالت ہے تو ہم رسولؐ کے کہاں ہوئے ہم تو اپنے نفس کے بندہ ہیں تو جیسے پہلوں نے رسول کی نافرمانی کی تھی ویسے ہی ہم نے رسول کی نافرمانی کی پیغمبر نے شادی کے طریقے بتلا دیئے اور ہم ضد کر کے اس کے خلاف کرتے ہیں پھر علماء پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ سختی کرتے ہیں چنانچہ مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کو ایک بڑھیا نے پکڑا کہ میں نے سنا ہے تو بی بی کی صحنک کو منع کرتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ان کے ابا منع کرتے ہیں اسی طرح یہاں تو یہ حالت ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

یعنی جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما گئے ہیں وہی کہتے ہیں اگر شک ہو تو کتابیں کھول کر دیکھ لو کہ ہم نے منع کیا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، جب تم نے ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ شروع کر دیا تو علماء کیونکر منع نہ کریں برے کاموں کو چھوڑ کر

ہمارے جو نیک اعمال ہیں ہم نے ان میں بھی اپنی رائے کو دخل دیا اور رسول کی مخالفت سے باز نہ آئے مثلاً مسجد بنانا ایک نیک کام ہے مگر اس میں بھی ہم رسول کا مقابلہ کرتے ہیں نقش نگار منع ہے روشنی بہت زیادہ کرنا منع ہے مگر رمضان میں اکثر مساجد میں روشنی ہوتی ہے اگرچہ ہمارے قصبہ میں یہ رواج کم ہو گیا کیونکہ افلاس نے پورا وعظ کر دیا نہ وہ آدمی رہے طاعون سے مر مرا گئے نہ مال رہا اس لئے ہماری بہت بڑی اصلاح تو افلاس ہی نے کر دی نہ وہ روشنی رہی نہ تاش گنجفہ رہا تنگدستی نے پورا علاج کر دیا غرض ہم لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہر شے میں ایک نیا طریقہ نکال لیا ہے جیسے ان لوگوں کی نافرمانی بڑھ رہی تھی ایسے ہی ہماری نافرمانی بڑھ رہی ہے یہ دو حالتیں ہوئیں تیسری حالت ان کی یہ تھی کہ ان کو حق تعالیٰ نے عذاب میں گرفتار کیا تھا اب ہم پر طرح طرح کی بلائیں آتی ہیں غدر کے بعد سے حق تعالیٰ نے ہم کو مہلت دی مگر جب ہم باز نہ آئے تو ایک پیادہ سرکاری مقرر کر دیا وہ طاعون ہے واقعی یہ ایسا عذاب ہے جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا ہر سال موجود ہو جاتا ہے تمام اطبا اس کے اسباب میں حیران ہیں کوئی تدبیر اس کے دفعیہ میں کارگر نہیں ہوتی لاٹوس صاحب لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ تم لوگ بیفکر رہو ہم کسی تدبیر پر مجبور نہیں کرتے کیونکہ یہ خدا کا قہر ہے اس کا مقابلہ گورنمنٹ نہیں کر سکتی۔ صاحبو! ایک غیر مسلم شخص کی زبان پر یہ بات آ گئی ہے کہ خدا کا قہر ہے۔

طاعون میں بھی مسلمانوں کی بے حسی:

ہم کیسے مسلمان ہیں کہ ہماری زبان پر بھی یہ کلمہ نہیں آتا اگر یوں کہا جائے کہ ہم دل سے سمجھتے ہیں تو بتلائے اس کے آثار کیا ہیں کتنے لوگ ہیں جنہوں نے طاعون کے خوف سے بہنوں کے حق دیئے ہیں کتنے آدمیوں نے موروثی زمینیں چھوڑ دی ہیں بلکہ بعضوں کی تو طاعون میں موج آ رہی ہے ایک جارج سے طاعون کے زمانہ میں کسی نے پوچھا کہ کیسے گزرتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ موج آ رہی ہے کیونکہ آمدنی خوب ہو رہی تھی جیسے دوا فروش طاعون وغیرہ سے خوش ہوتے ہیں ان کی موج آئی ہے استغفر اللہ جیسے بنیوں کو قحط سے خوشی ہوتی ہے بعضوں نے اس سے اثر بھی حاصل کیا تا کہ یہ شکایت نہ رہے کہ طاعون کو قہر الٰہی سمجھ کر کیا آثار ظاہر ہوئے سو انہوں نے یہ اثر لیا کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر رو لئے مگر کسی کا حق ادا نہیں کرتے

گر جان طلب مضائقہ نیست　　　　وزر طلبی سخن درین ست

(اگر جان مانگو تو حاضر ہے اور اگر مال مانگو تو یہ بہت مشکل ہے)

مصیبت کا اصل اثر:

جیسا مولانا نے ایک اعرابی کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کا کتا سفر میں مرنے لگا وہ اس کے پاس بیٹھا رو رہا تھا لوگوں نے پوچھا کیا حال ہے کہا میرا رفیق بھوک سے مرتا ہے سامنے ایک تھیلہ نظر آیا کسی نے پوچھا اس میں کیا ہے کہنے لگا روٹیاں تو پوچھا گیا کہ پھر رونے کی کیا بات ہے اس کو بھی کھلا دے نہ مرے گا کہنے لگا کہ اتنی محبت نہیں کہ داموں کی چیز کھلاؤں اور آنسوں تو مفت کے ہیں جتنے چاہوں بہادوں یہی مثال ہمارے بعض بھائیوں کی ہے کہ ان پر اس مصیبت کا یہ اثر تو ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر رو لیتے ہیں آنسوؤں میں کیا خرچ ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اعمال کی اصلاح کر لیں آئندہ کے لئے گناہوں سے توبہ کر لیں لوگوں کے حقوق دیدیں تیلی کے بیل کی طرح جہاں تھے وہاں ہی ہیں نہ طاعون سے پہلے کوئی اصلاح کی نہ طاعون کے آنے کے بعد تو ہمارا یہ حال بھی ان کی حالت کے مشابہ ہے انہوں نے بھی عذاب آنے پر تضرع وزاری نہیں کی تھی اور اس کو اپنا ثمرۂ اعمال نہ سمجھے۔ ہم نے بھی مصائب سے عبرت حاصل نہیں کی اور خدا کی طرف رجوع نہ کیا جس طرح شیطان نے ان کے اعمال کو نگاہوں میں آراستہ کر رکھا تھا ویسے ہی ہم بھی اپنے اعمال کو اچھا سمجھتے ہیں ہمیں کبھی مصیبت کے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ ہماری شامت اعمال سے ہے اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو غیروں کے اعمال کا اثر سمجھتے ہیں مجلس میں بیٹھ کر محلہ کے قصے بیان ہوتے ہیں ایک صاحب کہتے ہیں کہ فلاں شخص اپنی بہو کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے دوسرے بولے کہ فلاں شخص کا فلانی عورت کے ساتھ ناجائز تعلق ہے۔ تیسرے کہتے ہیں پھر بھلا طاعون کیوں نہ آوے گویا خود تو جبریل میکائیل ہیں کہ ان سے کوئی گناہ ہوتا ہی نہیں اگر طاعون آئے گا تو دوسروں سے ناجائز تعلقات کی وجہ سے آئے گا اس کے کہنے والے کے گناہوں کو اس میں کوئی عمل دخل نہیں صلحاء سلف تو باوجود کمال تقدس کے اپنے ہی کو تمام بلاؤں کا سبب سمجھتے تھے، ایک مرتبہ بصرہ میں قحط ہوا تو لوگ پریشان ہو کر حضرت ذوالنون بصریؒ کے پاس دعا کرانے گئے آپ سن کر رونے

لگے افسوس میرے گناہوں کی وجہ سے اب مخلوق مصیبت میں گرفتار ہونے لگی فرمایا کہ صاحبو! یہ سب میری شامت اعمال ہے مجھ کو شہر سے باہر نکال دو تو امید ہے کہ تمہارے اوپر سے یہ بلا ٹل جائے ہماری حالت اسکے برعکس ہے کہ خود سرتا پا گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر خیال یہ ہے کہ طاعون وغیرہ اور لوگوں کے ناجائز افعال کا اثر ہے۔

ہماری حالت پہلوں کے مشابہ ہے:

غرض ہماری یہ حالت بھی پہلوں کے مشابہ ہے کہ وہ بھی اپنے اعمال کو اچھا سمجھتے تھے اور نزول بلا میں اعمال کا دخل نہ سمجھتے تھے ہماری بھی وہی حالت ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ

یعنی جب نزول بلیات سے انہوں نے عبرت حاصل نہ کی اور اپنے اعمال کی اصلاح نہ کی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس مصیبت کو بھول گئے تو ہم نے ہر چیز یعنی ہر نعمت کے دروازے کھول دیئے اس وقت مجھے اس حالت کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے کیونکہ مضمون سابق پہلے بھی بیان ہو چکا ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ جب سے طاعون میں کمی ہے کچھ لوگ زیادہ غافل ہو چکے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کمی ہو گئی مگر سمجھتے ہو یہ کمی کیسی ہے یہ قہر ہے بصورت لطف پہلے قہر بصورت قہر تھا۔ اس سے بچنا دشوار نہ تھا مگر اس سے بچنا بڑا مشکل ہے کیونکہ بظاہر سکون معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہ امتحان ہے اور ڈھیل ہے زہر اگر زہر کی صورت میں ہو تو اس سے بچنا سہل ہے مگر مٹھائی میں تو زہر بڑا سخت ہے اس سے بچنا اسی کا کام ہے جو نہایت ہی محتاط ہو تو فرماتے ہیں کہ جب وہ مصیبت کو بھول گئے تو ہم نے ان پر خیر کے دروازے کھول دیئے پھر جب وہ خوش ہو گئے اور اترانے لگے تو ان کو دوبارہ دفعۃً پکڑ لیا پس وہ ناامید ہو کر رہ گئے بعض لوگ طاعون کے موقع میں کہا کرتے ہیں ذرا طبیعت کو چین ہو اطمینان ہو تو نماز پڑھیں گے علم دین پڑھیں گے اس بے چینی میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تو اب ہم ان کو دیکھیں گے کہ وہ اپنی کیسی اصلاح کرتے ہیں کیونکہ اصلاح کبھی فکر سے ہوتی ہے کبھی بے فکری سے حق تعالیٰ نے دونوں حالتیں دکھا دیں اب بھی اگر اصلاح نہ کی تو بہت

وبال ہوگا جس طرح کافروں کو پہلی بیماری قحط وغیرہ بھیج کر ہلکی سی سزا دی تھی جب وہ باز نہ آئے تو سخت سزا دی اور جڑ تک کاٹ دی تو صاحبو! یہ سزا تو بید لگنے کی مثل تھی اب اگر اصلاح نہ کی تو پھانسی کی سزا ہوگی۔ حق تعالیٰ نے اول تو احکام بھیج کر حجت تمام کی پھر ارسال حوادث سے پھر رفع حوادث سے اب کونسا عذر باقی ہے کہ ہم اپنی اصلاح کریں۔ صاحبو! مجھے سخت خوف ہے کہ اس امن کے زمانہ میں بھی ہم نے اپنی حالت درست نہ کی تو کہیں سخت پکڑ نہ ہو۔ حق تعالیٰ نے پہلوں کی دو شکایتیں کی ہیں ایک تو یہ ہے کہ بلا آنے کے وقت ان لوگوں نے تضرع وزاری نہ کی دوسرے بلا کے ٹلنے پر وہ اترانے لگے۔

بلا کے دوحق:

تو بلا کے دوحق ہیں آنے کے وقت تو یہ حق ہے کہ تضرع وزاری کریں اور گناہوں سے معافی مانگیں مغفرت چاہیں دوسرا حق یہ ہے کہ جب بلا ٹل جائے اترائیں نہیں۔

اترانے کی مذمت:

حق تعالیٰ نے ایک اور مقام پر بھی اس اترانے کی مذمت بیان فرمائی ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا

یعنی تمہارا پروردگار تمہارے لئے سمندر میں کشتیاں چلاتا ہے پھر وہاں جب تم کو کوئی طوفان وغیرہ کا حادثہ آتا ہے تو تمہیں سوائے خدا کے کوئی یاد نہیں رہتا پھر جب نجات دے کر خشکی میں پہنچا دیتے ہیں تو تم اعراض کرنے لگتے ہو کیا تم کو اس سے اطمینان ہوگیا کہ ہم تم کو خشکی میں دھنسا دیں جیسا کہ قارون کو خشکی ہی میں دھنسا دیا تھا اگر یہ سمجھو کہ یہ تو بڑا قدیم قصہ ہے تو یاد کرلو کانگڑہ میں کیا ہوا کہ سارا گاؤں زلزلہ میں دھنس گیا بستی کی بستی تباہ ہوگئی تو

خدا تعالیٰ جیسے دریا میں ہمارے ڈبونے پر قادر ہے خشکی میں دھنسانے پر قادر ہے اس کے نزدیک خشکی تری سب برابر ہے ایک ملاح سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے کہا دریا میں کہا اور ماں کہاں مری کہا دریا میں پھر کہا تمہارے دادا کہاں مرے کہا دریا میں کہا کہ تم بڑے بیوقوف ہو کہ پھر بھی دریا کو نہیں چھوڑتے ملاح نے پوچھا کہ حضرت آپ کے والد صاحب کہاں مرے کہا گھر میں دادا کہاں مرے کہا وہ بھی گھر میں مرے اس نے کہا کہ آپ بھی بہت بڑے بیوقوف ہیں کہ پھر بھی اسی گھر میں رہتے ہیں سبحان اللہ حقیقت میں خوب جواب دیا خشکی ہی میں کیا اطمینان ہے مکان گر پڑے تو کیا ہو سکتا ہے آگ لگ جائے تو کیا ہو سکتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم جو دریا سے نکلتے ہی پھر سرکشی کرنے لگے تو کیا اس سے اطمینان ہو گیا کہ ہم تم کو خشکی میں دھنسا نہیں سکتے یا ہم تند ہوا نہیں بھیج سکتے اگر تم اسکو بعید سمجھتے ہو تو کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ تم کو دوبارہ کسی ضرورت کی وجہ سے دریا میں لوٹا دیں کہ پھر سفر دریا کرو اور کشتی میں سوار ہو اور ہم تم کو غرق کر دیں۔ صاحبو! طاعون رفع ہو گیا تو خوشی کیا ہے خدا کو قدرت ہے کہ ایک مہینہ کے بعد پھر ہوا لوٹا دے یا اور کوئی مصیبت بھیج دے جب خدا کو سب قدرت ہے تو اترانا کیسا۔

فرح بطر اور فرح شکر میں فرق:

ہاں مصیبت زائل ہو جانے پر خدا کا شکر کرنا چاہئے یہ خوشی ممنوع نہیں یہ تو فرح شکر ہے یہ عمدہ حالت ہے ممنوع فرح بطر ہے جس کو اترانا کہتے ہیں یہ مذموم ہے اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ فرح بطر کے بعد غفلت ہوتی ہے فرح شکر کے بعد غفلت نہیں ہوتی اب فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں ہے آزماؤ کہ یہ خوشی کیسی ہے اگر دل میں خوف خدا رہا اور نمازی ہو گئے لوگوں کے حقوق ادا کر دیئے تو یہ فرح شکر ہے اگر ایسا نہ ہوا تو فرح بطر ہے اس سے ڈرنا چاہئے خدا جانے پھر کیا بلا نازل ہو جائے۔ اور آفات دو قسم کی ہیں آفاقی انفسی آفاقی تو جیسے لڑائی ہو جائے مرض عام پھیل جائے۔ انفسی یہ ہے کہ اپنے اوپر کوئی بلا آئے جس میں سب سے بڑھکر قساوت قلبی ہے کہ گناہ کرتے کرتے دل سخت ہو جائے جس سے روز بروز غفلت بڑھتی جاتی ہے یہ سخت آفت ہے اس سے رفتہ رفتہ کبھی ایمان جاتا رہتا ہے خدانخواستہ ایمان گیا تو آخرت برباد ہوئی لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا خوش اقبال تھا کہ کھاتے پیتے عیش میں مر گیا۔

دنیا کی زیادتی کی عجیب مثال:

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ جولوگ دنیا کی زیادتی پر اور اس کی راحت پر خوش ہوتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے کہ ایک بھنگی کہے کہ میں نے آج اتنے ٹوکرے کمائے دوسرا کہے کہ میں نے تجھ سے زیادہ کمائے یہ خوش اقبالی نہیں یہ تو بداقبالی کی علامت ہے کہ ایک بار گراں لاد کر لے گیا اس نے اپنے ساتھ وہ جنس لی جو وہاں کام نہیں آتی اس نے وہ سکہ لیا جو رائج نہیں جیسے اگر کسی حاجی کے پاس پیسے ہی پیسے ہوں تو وہ بمبئی سے آگے مفلس ہے کیونکہ ہندوستانی پیسے آگے نہیں چلتے مولانا فرماتے ہیں ۔

کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر تہیدست رادل...... پراگندہ تر

یعنی بازار جس قدر بھرا ہوا زیادہ ہوتا ہے تنگ دست کا دل اسی قدر پراگندہ ہوتا ہے۔

اعمال صالحہ سے حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے:

تو صاحبو! جہاں پیسے کمائے ہیں جو بمبئی سے آگے نہیں چلتے روپے اشرفی بھی کمالو تاکہ مکہ مدینہ میں بھی کام آئے ورنہ وہاں تو مفلس رہو گے اور یہ تمثیل روپے پیسے کی اس جگہ خوب ہی چسپاں ہے کیونکہ پیسہ صورتاً بھی کثیف اور روپیہ لطیف ہوتا ہے یہی حال متاع دنیا اور آخرت کا ہے دوسرے جیسا روپیہ ہندوستان میں بھی کام آتا ہے اور مکہ مدینہ میں بھی ۔ ایسے ہی اعمال آخرت کہ وہاں تو کام آتے ہی ہیں یہاں بھی کام آتے ہیں ۔ اس لئے اعمال آخرت سے حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے ۔ خدا کی خوشی کو معلوم کر کے اس شخص کا دل خوش ہوتا ہے ۔ دنیا میں دیکھ لیجئے کہ صرف حاکم کی خوشی کے واسطے کیا کچھ کیا جاتا ہے اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ صاحب کلکٹر مجھ سے خوش ہوتے ہیں تو خیال کیجئے کہ اس کو خوشی ہو گی یا نہیں ایسے ہی اللہ والے بھی حق تعالیٰ کی خوشی معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں دنیا میں بھی آرام ان کو ہی ہے دوسرے یہ کہ خدا سے ان کو محبت ہے کچھ بھی نہ ہو تو محبت کی لذت ہی بڑی چیز ہے پھر محبت بھی کس کی اللہ تعالیٰ شانہ کی جس سے بڑھکر صاحب حسن جمال کوئی نہیں ہو سکتا ایک کسی کی محبت میں تو یہ لطف آتا ہے کہ گھر بار

تک لٹا دیتے ہیں جس سے بدنامی ہوتی ہے ذلت بھی ہوتی ہے پھر خدا کی محبت میں کیوں لذت نہ ہوگی جس میں سب سے بڑی کامیابی کی بھی امید ہے ۔

عشق مولےٰ کے کم از لیلےٰ بود گوئے گشتن بہر اواولےٰ بود

(حق تعالیٰ شانہ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہووے محبوب حقیقی کے لئے تو کوچہ گردی کرنا بہت ہی بہتر ہے)

محبان حق تعالیٰ شانہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں:

محبت والے ہر حال میں خوش رہتے ہیں چاہے غم ہو یا خوشی ہو۔ آزما لیجئے کہ ایک وہ شخص ہے جس کے دل میں خدا کی محبت ہے بیوی مرگئی بچے مرگئے سب کچھ ہوگیا مگر اس شخص کے بجز چند آنسو بہنے کے کچھ نہیں ہوتا بات یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب خدا کی چیزیں ہیں جب تک اس نے چاہا ہمارے پاس رکھیں جب چاہا چھین لیں اللہ والے کا دل مصیبت میں بھی مطمئن ہوتا ہے یہ اپنی تسلی کرتا ہی ہے دوسروں کی بھی تسلی کرتا ہے مگر جس شخص کے دل میں خدا کی محبت نہیں جہاں اس کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے پریشان ہوجاتا ہے اس کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے خدا کی شکایت کرتا ہے ایک طبیب نے اپنی لڑکی کے مرنے پر کفریہ کلمات کہے تھے۔ صاحبو! اگر آپ نے اپنی مرضی کے موافق ایک نہایت عمدہ مکان بنوایا ہو اور تمہارا نوکر یہ کہے کہ مجھے تو یہ چیزیں اس جگہ اچھی معلوم ہوتی ہیں جہاں آپ نے رکھی ہیں وہاں اچھی نہیں لگتیں تو یہ نوکر آپ کے نزدیک سزا کے قابل ہے یا نہیں آپ اس کے ایک طمانچہ ماریں گے کہ بدتمیز ہم نے مکان تیری خوشی کے لئے بنایا ہے یا اپنی خوشی کیلئے ۔ تو رائے دینے والا کون ہوتا ہے مگر افسوس ہم خدا کی چیزوں میں بے خوف وخطر جو چاہے کہتے ہیں اگر ہم ان کو خدا کی چیزیں سمجھتے تو کبھی شکایت دل میں نہ آتی تو صاحبو! یہ خدا کی چیزیں ہیں تم ان کو اپنی کیوں سمجھتے ہو پھر خدا کو اختیار ہے جس چیز کو چاہے مکان دنیا میں رکھے جس کو چاہے مکان آخرت میں رکھے ۔ تم کو راضی رہنا فرض ہے ناراض ہونا بدتمیزی ہے رضا ومحبت سے دنیا میں بھی راحت حاصل ہوتی ہے حضرت بہلولؒ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا کہ

کیا حال پوچھتے ہو اس شخص کا جس کی خواہش کے موافق دنیا کے سارے کام ہوں پوچھا حضرت یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ سارے کام ایک شخص کی خواہش کے موافق ہوتے ہوں فرمایا کہ جس شخص نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو ہر کام اس کی خواہش کے موافق ہی ہوتا ہے آپ کو معلوم ہوا کہ دنیا بھی اگر درست ہے تو دین والے ہی کی ہے۔ دنیا یہ نہیں کہ ہزاروں روپے ہوں ٹھم ٹھم ہو نوکر ہوں دنیا یہ ہے کہ دل چین سے ہو واللہ اگر دل چین سے ہے تو صرف اللہ والوں کا ہے۔

مال اور اولاد کی بے حد محبت وبال جان ہے:

دنیا والوں میں سے جس کو دیکھو ایک نہ ایک غم میں گرفتار ہے۔ کوئی بیماری میں چیخ رہا ہے، کسی کو اولاد سے بے حد محبت ہے۔ ایک بیگم کو اپنے بچوں سے محبت تھی وہ ان سب کو اپنے پاس ایک فرش پر لٹاتی تھی اور رات کو بار بار اٹھ کر دیکھتی بھی کہ کوئی غائب تو نہیں ہو گیا کیا یہ عذاب نہیں۔ بعض لوگوں کو حق تعالیٰ مال کی محبت سے عذاب دیتے ہیں۔ مشہور ہے کہ بخیل جب مسجد میں جایا کرتا تھا گھر کا چراغ گل کر جاتا تھا ایک مرتبہ بھول گیا تو مسجد سے لوٹ کر آیا باندی نے پوچھا کہ خیر ہے کیوں لوٹ کر آئے کہا میں چراغ گل کرنا بھول گیا تھا اس نے کہا میں ایسی غافل نہیں تھی میں نے تمہارے جاتے ہی گل کر دیا تھا مگر مجھے تو اس کی فکر ہے کہ تم جو لوٹ کر آئے اس میں تمہارا جوتا گھس گیا ہوگا۔ بخیل صاحب نے باندی کی بڑی تعریف کی کہ اسی طرح کفایت سے خرچ کیا کرتے ہیں اور میرے جوتوں کی تو فکر نہ کر کیونکہ لوٹتے ہوئے میں نے بغل میں دبا لئے تھے۔ تو کیا یہ مال کی محبت وبال جان نہیں ہے کہ جبکہ ہر وقت انسان اسی ادھیڑ بن میں لگا رہے اب میں نے آپ کو اچھی طرح دکھلا دیا کہ دنیا کی بھی راحت اسی کو ہے جس کا دین اچھا ہے۔

توکل سے اطمینان اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے:

حضرت بہلولؒ سے کسی نے کہا کہ روٹی گراں ہو گئی کہا ہم کو کیا فکر ہے ہماری روٹی کا ذمہ انہوں نے لیا ہے اور ہم پر عبادت فرض کی ہے کہ ہم کو عبادت میں لگنا چاہئے روٹی وہ آپ

دیں گے۔ مولانا فتح محمد صاحبؒ کے پاس ایک طالب علم مثنوی پڑھنے آیا تو آپ نے پوچھا کہ روٹی کا کیا انتظام ہوگا۔ اس نے کہا حضرت آپ روٹی کی فکر نہ کریں مجھے کتاب پڑھادیجئے مولانا نے فرمایا کہ آخر بغیر کھائے جیوگے کس طرح اس نے کہا کہ اللہ دے گا اور جو نہ دے گا تو اپنی جان لے لیگا یعنی بہت سے بہت بھوکا مرجاؤں گا اس سے زیادہ تو کچھ نہ ہوگا اور اس سے بڑھکر کیا خوش قسمتی ہوگی کہ طالب علمی میں موت آجائے مولانا نے فرمایا کہ بھائی تو پڑھ لے گا تیرے واسطے کچھ انتظام وغیرہ کی ضرورت نہیں دوسرے روز محلہ کے لوگ دعوت کرنے لگے کئی مہینے تک خوب دعوتیں رہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ سارا کام چھوڑ کر اس طالب علم کی طرح دعوتوں پر پڑے رہیں نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ توکل حاصل کرنا چاہئے اگر کسی کو توکل کے بعد روٹی بھی نہ ملے تو اس کو سکون واطمینان قلب حاصل ہوگا۔ تو اصلاح اعمال وہ چیز ہے جس میں آخرت کا تو بھلا ہے ہی دنیا کی راحت بھی اسی سے حاصل ہے خصوصاً اگر تندرستی بھی ہو اور بقدر ضرورت غنا اور فراغت بھی ہو تو پھر اس شخص سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں حدیث میں ہے۔ نعمتان مغبون فیھما کثیر من الناس (ای لا ینتفع بھما الناس) الصحۃ والفراغ۔ (الصحیح للبخاری: ۸: ۱۰۹) (دو نعمتیں ایسی ہیں اکثر آدمی ان سے منتفع نہیں ہوتے ایک صحت دوسرے فراغت) ولنعم ماقیل ؎

خوشا روز گارے کہ دارد کسے | کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر ضرورت یسارے بود | کند کارے اے مرد کارے بود

یعنی وہ شخص بڑا خوش قسمت ہے کہ خداتعالیٰ اس کو حرص سے بچاوے اور بقدر ضرورت غنا دے کام میں لگا رہے۔

وقت ایک نعمت عظمیٰ ہے:

صاحبو! وقت کو غنیمت سمجھو کہ یہ بھی نعمت عظمیٰ ہے یہاں ایک دفعہ سبحان اللہ کہا اور سارا آسمان ثواب سے بھر جاتا ہے پھر اس ایک دفعہ سبحان اللہ کہنے کو ترس جاؤ گے بعض طبائع میں ناقدری ہوتی ہے وہ اس کی قدر نہیں کرتیں مگر مرنے کے بعد معلوم ہوگا اس وقت اس کی قدر ہوگی سب چیزیں رکھی رہ جائیں گی۔

بے فکری کے زمانہ میں فراغت سے عبادت کرنا چاہئے:

اب میں وعظ کو ختم کرتا ہوں میرا مقصود یہ تھا کہ طاعون کے چلے جانے سے بے فکری نہ ہو اور اس وقت پہلے سے زیادہ کام کرنا چاہئے ہمیں صحابہ کا مذاق اختیار کرنا چاہئے ان حضرات کا کیا اچھا مذاق تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ جب قیصر وکسریٰ کے ملک فتح ہوں گے اور ان کے خزانے تمہارے قبضہ میں آویں گے تم لوگ اس وقت کیا کرو گے صحابہ نے عرض کیا اذن نتفرغ للعبادت. صاحبو! ہم بھی انہیں کے متبع ہیں ہمارا بھی یہی حال ہونا چاہئے کہ جب خدا تعالیٰ بے فکری دے تو فراغت سے اس کی عبادت میں مشغول ہوں اور وقت کو غنیمت سمجھیں یہ تو مقصود تھا کہ ختم ہو چکا۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہمارے اوپر سے بلاؤں کو دور کرے اور بلاؤں کو ہمارے لئے ذریعہ عبرت بنائے اور نیک اعمال کی توفیق مرحمت ہو۔ فقط۔

فوائد الصحبۃ

یہ وعظ ۶ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ بروز جمعۃ المبارک بمقام کاندھلہ مکان مولوی رضی الحسن صاحب جو کہ حضرت والا نے کھڑے ہوکر بعد نماز جمعہ تا مغرب باستثنائے مقدار ادائے نماز عصر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً تین سو ۳۰۰ سے زائد تھی۔ جس کو مولانا سعید احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. قال اللّٰہ تعالیٰ وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡھَہٗ وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡھُمۡ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ وَکَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا

اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضائی جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیاوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے۔ اور اس کا (یہ) حال حد سے گزر گیا ہے۔

تمہید

عوام وخواص کی مشترکہ ضرورت:

یہ ایک آیت ہے سورۂ کہف کی اس میں ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے اور وہ ایسا مضمون ہے کہ اس کی ضرورت عام ہے عوام وخواص سب کے لئے اور ظاہر ہے کہ ایسا مضمون جس کی ضرورت عوام وخواص سب کے متعلق ہو نہایت ہی ضروری ہوگا۔ تفصیل اس

کی یہ ہے کہ ضرورتیں بعض تو صرف عوام کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض صرف خواص کے اور بعض عوام وخواص دونوں مشترک ہوتی ہیں ۔ اور ہر چند کہ پہلی دونوں ضرورتیں بھی اپنے اپنے درجہ میں ضروری ہوتی ہیں لیکن جو ضرورت مشترک ہو وہ نہایت ہی ضروری ہو گی ۔ نیز دوسری وجہ اس کے اہم ہونے کی یہ بھی ہے کہ قاعدہ ہے کہ بعض ضروریات کی تو اہل ضرورت کو اطلاع ہوتی ہے ۔ مگر کسی وجہ سے اس پر عمل کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے اور بعض کی تو اطلاع ہی نہیں ہوتی ۔ تو بعضے امور ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عوام کے نزدیک نہایت ہی خفیف ہوتے ہیں لیکن واقفین حقائق کے نزدیک وہ نہایت ہی اہم ہوتے ہیں اسی طرح اعمال وامراض میں بھی بعض تو ایسے نہیں کہ ان کی سب کو اطلاع ہے اور گو وہ بھی ضروری ہوتے ہیں مگر زیادہ ضروری وہ ہیں جن کی اطلاع ہی نہ ہو ۔ اس آیت میں ایسا مضمون بیان کیا گیا ہے جس کی ضرورت مشترکہ کے ساتھ خود خبر بھی بہت کم لوگوں کو ہے ۔ اور یہ بے خبری کا دعویٰ یا تو لوگوں کے عقیدے سے دریافت کر لیجئے کہ اس مضمون کے متعلق کیا عقیدہ ہے یا طرز عمل سے کیونکہ جس امر کے ساتھ غیر ضروری کا سا برتاؤ کیا جاوے گا یہی سمجھا جاوے گا کہ اس کی ضرورت کی اطلاع ہی نہیں ۔ خاص کر جبکہ عقیدہ بھی کسی درجے میں شہادت دے ۔ میں اس مضمون کی اجمالی تعیین کئے دیتا ہوں پھر ترجمہ سے تفصیلاً متعین ہو جاوے گا ۔

شانِ نزول :

مگر ترجمہ سے قبل اس کے شان نزول کا بیان کر دینا مناسب ہے ۔

امت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شفقت امت پر ہے حتیٰ کہ امت دعوت پر بھی اس کا پتہ کتب سیر و تواریخ واحادیث سے چل سکتا ہے ۔ ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا شفقت تھی سب پر اور اثر اس شفقت کا یہ تھا کہ آپ ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ امت کو کس طرح نفع پہنچے ۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس سوچنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی کوئی خاص غرض تھی یا اپنے کسی خاص نفع کی تحصیل مقصود تھی ہرگز نہیں بلکہ محض امت کے نفع اور اسکی بہبودی کے لئے یہ دوسری بات

ہے کہ اس تدبر و تبلیغ پر بلا قصد ثواب مرتب ہو جاوے اور اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع بھی پہنچے۔ لیکن یہ نفع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کے وقت پیش نظر نہ تھا اور اسی نفع کے اجر تبلیغ کی بنا پر خدا تعالیٰ نے ان کفار کے متعلق جن سے بالکل یاس ہو گیا تھا۔

آیت سواء علیہم پر ایک شبہ اور اس کا جواب:

یہ فرمایا کہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ نہیں فرمایا کہ سواء علیک کیونکہ آپ کے لئے انذار و عدم انذار مساوی نہیں تھا بلکہ انذار پر ثواب مرتب ہوا جو کہ عدم انذار کی صورت میں نہ ہوتا اور یہیں سے اہل علم کے نزدیک اس اعتراض کا بھی جواب ہو جاوے گا کہ جب آپ کا انذار و عدم انذار مساوی تھا تو ایک عبث فعل آپ کے کیوں سپرد ہوا۔ حاصل جواب یہ ہے کہ عبث تو اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب آپ کے حق میں بھی برابر ہوتا اور جب آپ کے حق میں برابر نہ تھا. لترتب الثواب علی الانذار و انتفائه علیٰ عدمه (یہ سبب ثواب مرتب ہونے کے ڈرانے پر اور نہ مرتب ہونا نہ ڈرانے پر) تو یہ فعل عبث نہ رہا۔ غرض اس میں تو شبہ نہیں کہ انبیاءؑ کو تبلیغ وانذار پر ثواب تو ملتا ہے لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ ثواب آپ کی نظر میں بھی انذار سے مقصود تھا یا نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ثواب مقصود نہ تھا کیونکہ اگر آپ کو محض ثواب مقصود ہوتا تو اس قدر دل سوزی کی کیا وجہ تھی۔ ثواب تو صرف تبلیغ پر بھی مرتب ہو جاتا تھا جس کے باب قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شاید آپ اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں اس وجہ سے کہ ایمان لانے والے نہیں ہیں) اور وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (آپ ان پر وکیل نہیں ہیں) اور لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (دوزخ والوں کی نسبت آپ سے سوال نہ ہوگا) ان سب آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بے حد غم تھا ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صاف لفظوں میں ارشاد بھی فرمایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت شفقت:

حدیث شریف میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری تمہاری ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی نے آگ روشن کی ہو اور پروانے گرتے ہوں وہ شخص ان پروانوں کو ہٹاتا ہو لیکن وہ اس پر غالب آجاتے ہوں۔ اسی طرح تم لوگ دوزخ کی آگ میں جان جان کر گرتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر ہٹاتا ہوں لیکن تم مجھ پر غالب آئے جاتے ہو اور اس میں گھسے جاتے ہو۔ ان الفاظ سے ہر زبان دان کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تھا کہ یہ لوگ آگ سے بچیں اور یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی ایسی تجویز آپ کے روبرو پیش کی جاتی جس سے آپ کو اپنے مقصود حاصل ہونے کی امید ہوتی ہو تو آپ اس کو بہت جلد قبول فرما لیتے تھے۔

دربارِ نبوی ﷺ میں مشرکین کی ایک لایعنی درخواست:

اسی سے کفار مشرکین کو ایک شرارت سوجھی اور انہوں نے دق کرنے کے لئے مشغلہ نکالا جیسے آج کل مصلحین کے ساتھ کیا جاتا ہے چنانچہ کفار نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یہ تو کیوں کہا ہوگا یا محمد کہا ہوگا) ہم آپ کے پاس آیا کریں تو کچھ سن لیں لیکن چونکہ آپ کے پاس غرباء کا مجمع رہتا ہے جن کے پاس بیٹھتے ہوئے ہمیں عار آتی ہے اس لئے ہم نہیں بیٹھتے۔ اگر آپ ان کو علیحدہ کر دیا کریں اور ہمارے لئے ایک مستقل مجلس علیحدہ کر دیں اور جس وقت ہم آیا کریں ان کو اٹھا دیا کریں کیونکہ ہمارے پاس بیٹھ کر ان کا حوصلہ بڑھے گا تو ہم حاضر ہوا کریں اور اس سے ان کو یہ ہرگز مقصود نہ تھا کہ ہم مسلمان ہو جائیں گے بلکہ محض دق کرنا منظور تھا کہ تھوڑی دیر احباب میں مفارقت ہی رہے گی۔

صحابہ کرام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت:

کیونکہ صحابہ کرام کو وہ محبت تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کو نہیں ہوئی۔ اور یہی سبب تھا اطاعت کاملہ کا ورنہ اگر کامل محبت نہ ہو تو اطاعت کاملہ ہو نہیں سکتی آج کل اکثر دینداروں میں بھی محض ضابطہ کی محبت ہے۔

محبت کی دو قسمیں:

صاحبو! بہت بڑا فرق ہے ضابطہ کی محبت میں اور جوش کی محبت میں۔ اول میں تو کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے اور اس میں ضرور فرو گذاشت ہو جاتی ہے وہ محض مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور بسا اوقات ایک مصلحت کے قائم مقام دوسری مصلحت ہو جاتی ہے تو نفس کہتا ہے کہ مقصود تو آگ سے بچنا ہے اس گناہ کو کرلو اس کے بعد توبہ کر لینا تو آگ سے تو اس طرح بھی بچ جاؤ گے اور یہی وجہ ہے ہم کو ہمارے نفس نے دلیر کر دیا ہے تو آگ سے بچنے کی مصلحت ایک محرک عقلی ہے جس پر تقاضائے نفس غالب آسکتا ہے اور محبت محرک طبعی ہے کہ اگر یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ ترک اطاعت پر عذاب نہ ہوگا تو بھی مخالفت سے شرماتا ہے کیونکہ وہاں داعی الی الاطاعت (اطاعت کی طرف داعی) طبعی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

صنما رہ قلندر سزدار بمن نمائی　　　　که دراز دور بینم رہ ورسم پارسائی

اے مرشد مجھ کو قلندری کا راستہ بتلا دیجئے کیونکہ پارسائی کا راستہ تو بہت دور دراز کا ہے۔

تو صحابہؓ کا اطوع الخلق (تمام مخلوق سے زیادہ اطاعت کرنے والے) ہونا اسی وجہ سے ہے کہ وہ عاشق تھے نرے مصلحت بین نہ تھے ان کی یہ حالت تھی۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چکار　　　　کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل اور تدبیر چاہئے۔

ان کی اطاعت پر مصلحت بھی مرتب ہو جاتی تھی لیکن محبت اور اطاعت مصلحت پر مبنی نہ تھی ان کی یہ حالت تھی کہ اگر مخالفت کرنا بھی چاہتے تو نہیں ہو سکتی تھی۔

صحابہؓ کی محبت کا ایک قصہ:

صحابہ کی محبت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے پختہ مکان ڈاٹ دار کسی مصلحت سے بنالیا کہ وہ مصلحت ضرورت کے درجے میں نہ تھی گو انہوں نے کسی درجے میں ضروری سمجھا ہوا تفاق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک مرتبہ اس طرف سے ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ صحابہؓ نے

عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں شخص کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا اور واپس تشریف لے آئے۔ جب صاحب مکان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے سلام عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا وہ دوسری طرف سے آئے آپؐ نے ادھر سے بھی منہ پھیر لیا۔ اب تو ان کو بہت فکر ہوئی انہوں نے دوسرے صحابہ سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ کوئی خاص بات ہے تو ہم کو معلوم نہیں ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مکان کی طرف تشریف لے گئے تھے اور تمہارے مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ ہم نے بتلا دیا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فرمایا تو نہیں لیکن اس وقت سے خاموش ہیں۔ دیکھیے اس حدیث میں کہیں تصریح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکان کی بابت کچھ بھی فرمایا ہو اس لئے صاحب مکان کے پاس اس یقین کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کبیدگی کی وجہ یہ مکان ہی ہے۔ آج کل کی عقل کا تو جس کا نسبت کسی قول ہے۔

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو میں نے دیوانہ بنایا)

یہ فتویٰ ہوتا کہ پوچھ لیتے یہی وجہ ناراضی کی ہے یا کچھ اور۔ اگر یہی تو خیر اس کو گرا دیں بلکہ آج کل تو اس پر بھی اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ پوچھا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں خرابی کیا ہے۔ یہ تو فلاں فلاں مصلحتوں پر مبنی ہے۔ جیسا کہ آج کل ورثۃ الانبیا کے ساتھ ان کے احکام خداوندی پہنچانے کے وقت اور منکرات پر تنبیہ کرنے کے وقت معاملہ کیا جا رہا ہے تو صحابہ کرام بھی ایسا کر سکتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حکم کے اسرار دریافت کرتے جیسا کہ آج کل دریافت کئے جاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اسرار کی اطلاع بھی تھی علماء کو تو اسرار کی خبر بھی نہیں یہ تو قانون کے عالم ہیں نہ کہ اسرار قانون کے عالم تو اس صورت میں علماء سے اسرار کا دریافت کرنا ہی غلطی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو صاحب وحی ہیں آپ کو تو اگر بالفرض اسرار کی اطلاع نہ بھی ہوتی تو خدا تعالیٰ سے پوچھ کر بتلا دیتے لیکن ان صحابی نے ان سب کو نظر انداز کر کے وجہ خفگی تعیین کی بھی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ جس میں ذرا

سا بھی احتمال سبب غضب ہونے کا ان کو ہوا اس کو خاک میں ملا دیا یعنی اسی وقت جا کر مکان کو زمین کے برابر کر دیا۔ شاید آج کل کے عقلاء اس حرکت کو خلاف عقل بتلا دیں کہ محض احتمال پر اتنا مال ضائع کر دیا۔ لیکن اگر خلاف عقل ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گرانے پر نا خوش ہوتے۔ غرض انہوں نے فوراً مکان گرا دیا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھی نہیں کی بلکہ اپنی قسمت پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاقاً مکان کو دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح میرے گرانے کی اطلاع بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی میری قسمت میں ہے تو اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاوے گی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ اطلاع تو جب کروں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکان گرانے کا کچھ احسان ہو تو یہ محض اپنی ہی بھلائی ہے۔

قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ ہی تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو ایمان کی ہدایت فرمائی اگر تم سچے ہو غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پھر اس طرف جو گزر ہوا تو فرمایا کہ وہ مکان کا کیا ہوا صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب مکان کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوراً ہی آ کر مکان کو گرا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور زیادتی تعمیر کی مذمت فرمائی۔ اب دوسرا مسئلہ ہے کہ کتنی تعمیر ضروری ہے جو یہاں مذکور نہیں۔

صحابہ کی لغزشیں سب معاف ہیں:

تو صحابہ کرام کی محبت کا یہ عالم تھا اور اس محبت کا مقتضیٰ یہ بھی ہے کہ صحابہؓ کی زلات بالکل معاف ہوں۔ دیکھئے اگر کسی جان نثار خادم سے کبھی کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اس کی پرواہ بھی نہیں کیا کرتے۔ ابھی حال ہی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک صاحب کے بدن میں ایک گہرا زخم ہو گیا تھا ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ اس زخم میں اگر کسی آدمی کا گوشت لے کر بھرا جائے تو یہ برابر ہو جائے۔ اور ان صاحب کا ایک نوکر اس وقت موجود تھا کہنے لگا کہ میری ران میں سے جس قدر گوشت کی ضرورت ہو لیا جاوے۔ اب بتلایئے

کہ اگر اس خادم سے کبھی کوئی سرسری لغزش ہو جاوے تو کیا وہ آقا اس پر مؤاخذہ کرے گا ہرگز نہیں۔ پس یہی وجہ ہے کہ صحابہ پر طعن کرنا جائز نہیں۔

مشاجرات صحابہ کا نہایت قابل اطمینان جواب:

صاحبو! جو مشاجرات صحابہ سے منقول ہیں اور جتنی لغزشیں ہوئی ہیں اگر ان سے دس حصہ زیادہ ہوتیں وہ بھی معاف تھیں۔ غضب کی بات ہے کہ آپ اپنے کو قدرداں سمجھتے ہیں کہ وفادار۔ جان نثار کی لغزش کو قابل معافی سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا بھی قدرداں نہیں سمجھتے اسی لئے ہم بلا تامل کہتے ہیں کہ **الصحابة کلهم عدول** (صحابہ سب کے سب عادل ہیں) اور اس حدیث پر اعتماد رکھیں گے۔ **لا یمس النار من رانی** (جس شخص نے مجھ کو دیکھا اس کو آگ نہ چھوئے گی) اور اگر صحابہ کے بعض افعال ذلت ہیں تو ہم ان کی نسبت کہیں گے۔

خون شہیداں زآب اولیٰ ترست　　　　ایں خطا از صد ثواب اولیٰ ترست

(شہیدوں کا خون پانی سے اولیٰ تر ہے یہ خطا سو ثواب سے زیادہ بہتر ہے)

صحابہؓ کی جان نثاری کا دوسرا حصہؓ:

غرض صحابہ کی یہ شان تھی اور ان کی اس محبت کا علم اور اندازہ ان کفار کو بھی تھا چنانچہ جب حدیبیہ کی صلح ہوئی ہے اور علی سبیل التعاقب روساء کفار مسلمانوں میں آئے ہیں تو ایک رئیس نے جا کر اپنی قوم سے کہا ہے کہ میں نے بڑے بڑے شاہان دنیا کا دربار دیکھا ہے۔ کسریٰ اور قیصر کے درباروں میں شریک ہوا ہوں اور مگر کسی کے حشم وخدم کو میں نے اتنا مطیع نہیں دیکھا جس قدر کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مطیع ہیں۔ یہ حالت ہے کہ اگر آپ تھوک پھینکتے ہیں تو وہ زمین پر نہیں گرتا اور جب وضو کرتے ہیں تو اس کا غسالہ لوگ اپنے ہاتھوں پر لیتے ہیں اور اگر کسی کو نہیں ملتا تو وہ دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مل کر اپنے منہ پر پھیر لیتا ہے گویا وہ حالت تھی۔

مرا از زلف تو موئے بسند ست　　　　ہوس را رہ مدہ بوئی بسند ست

(یعنی اگر محبوب نہ ملے تو اس کا بال ہی کافی ہے اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے)

صاحبو! بتلایئے یہ بھی کہیں قرآن میں یا حدیث میں حکم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کا غسالہ وضو اپنے منہ پر ضرور ملا کرو۔ اللہ اکبر۔ اسوقت بہت جماعتیں صحابہؓ پر طعن کرتی ہیں مگر ان کی اس حالت کو نہیں دیکھتے بھلا نماز روزہ وغیرہ کی بابت تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنت کے شوق میں کرتے تھے لیکن غسالہ وضو کا حکم وجوبی یا استحبابی کہیں آیت میں تھا کہ اس کو منہ پر مل لیا کرو تو فلاں فضیلت ملے گی اس وقت تو واللہ بعضے ایسے مستقل مزاج ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھتے تو کبھی حرکت بھی نہ ہوتی کیا اس وقت سو میں ایک شخص بھی ایسا برتاؤ کر سکتا ہے جو صحابہ کرام نے کیا بلکہ عجیب نہیں کہ اس فعل سے استنکاف کرتے۔

ہمارا زمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعید ہونا رحمت ہے:

صاحبو! ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اس وقت پیدا ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا نہ ہوئے ورنہ ہمارا یہ استنکاف خدا جانے ہم کو کس حد میں داخل کرتا۔ اس وقت جو ہم بہت سی باتوں میں فتویٰ کفر سے بچ جاتے ہیں تو اس لئے کہ علماء تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ استنکاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے نہیں بلکہ فلاں شخص سے ہے جس کے واسطے سے یہ امر اس کو پہنچا ہے۔ نسبت الی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (رسول کی طرف نسبت) میں شبہ ہونے سے یہ اعتراض کیا ہے اور ہم اس وقت ہوتے اور یہ حالت ہوتی تو ہمارے ان افعال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفر کا فتویٰ ہوتا۔

دین کے دسویں حصہ پر عمل کا مفہوم:

یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وہ زمانہ آوے گا کہ دسواں حصہ بھی اگر کوئی عمل کرے گا تو اس کی نجات ہو جاوے گی۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پانچ وقت کی نماز فرض تھی تو اب نصف وقت کی نماز کافی ہوگی۔ یعنی اگر فرض و وتر کا مجموعہ بیس رکعتیں ہوں تو دو رکعتیں کافی ہو جاویں۔ چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا اس لئے میں اس حدیث کی توضیح کرتا ہوں کہ یہ تخفیف کیفیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کمیت کے اعتبار سے یعنی اعمال میں جو خلوص اس وقت تھا اگر اس وقت نو حصہ کم بھی ہو تو نجات ہو جائے گی۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہم پر ہے کہ ہم زمانہ تخفیف میں پیدا ہوئے۔ یہ تو تخفیف کا بیان ہے۔

تاویل کی مثال:

اور تاویل کی مثال یہ ہے کہ مثلاً بیوہ کا نکاح ثانی ہے کہ اس سے عام طور پر قلوب میں تنگی ہے یعنی جیسا اول مرتبہ دل ہوتا ہے دوسری مرتبہ نکاح کرنے میں اتنا دل کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ آگے یہ دیکھ لیجئے کہ خداوند تعالیٰ اسی تنگی کی نسبت کیا فرما رہے ہیں۔

لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

ترجمہ:۔ (تیرے رب کی قسم ہے یہ لوگ مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ کہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بنا دیں جو آپ فیصلہ فرما دیں اس پر اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پوری طرح تسلیم کر لیں)

تو اس پر کیا فتویٰ ہوتا مگر اس وقت ہم ان لوگوں کی اس تنگی کی یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ حکم شرعی سے استنکاف نہیں ہے بلکہ عرف کی وجہ سے طبعی شرم آتی ہے۔

یقینی امر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کفر ہے:

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو فرما دیتے کہ نکاح ثانی کر لو اور اس کے قلب میں اس سے تنگی پیدا ہوتی تو اس وقت کیا بچاؤ ہوتا کیونکہ خطاب خاص خود دلیل ہوتی بطلان عذر کے لئے اور اس کے لئے نظیر موجود ہے کہ حضرت زینبؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے کرنا چاہا اور حضرت زینبؓ بوجہ عالی خاندان کے ہونے کے ذرا رکتی تھیں اور اسی طرح ان کے بھائی بھی فوراً یہ آیت نازل ہوئی

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَةُ

(کسی مومن اور مومنہ کو شایاں نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی امر کا فیصلہ فرما دیں تو اس امر میں ان کو اختیار ہو)

حالانکہ یہ ایک دنیا کا معاملہ تھا لیکن اس میں بھی حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چون و چرا کرنے کی اجازت نہیں ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ خواہ دنیا کا کام بتلا دیں یا دین کا کام بتلا دیں مگر جس کو فیصلہ کر کے فرما دیں اس سے انکار کفر ہے تو اس وقت اگر ہم انکار کرتے تو فوراً

کافر ہوجاتے اور اس وقت تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ مولویوں کے طرز بیان سے استنکاف ہے نہ کہ حکم شریعت سے تو ہمارے لئے اس زمانہ سے بعید ہونا ہی رحمت ہوا۔ یہ صحابہؓ ہی کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے اپنا مال اپنی جان اولاد گھر بار اپنے مصالح سب آپ کے سپرد کردیئے تھے۔

صحابہ کی اطاعت اور انقیاد کی ایک عجیب حکایت:

یہ حالت تھی کہ میں نے ایک مقام پر دیکھا ہے مگر اس وقت یاد نہیں کہ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اس کو دیکھ بھی لیا ہے مقصود یہ تھا کہ کسی تدبیر سے ایک مرتبہ اس کو دیکھ لو یہ مطلب نہ تھا کہ جا کر اس عورت کے ماں باپ کو پیغام دو کہ مجھے اپنی لڑکی دکھلا دیں مگر وہ ایسے بھولے بھالے تھے کہ جا کر اس عورت کے ماں باپ کو پیغام دیا کہ مجھے اپنی لڑکی دکھلا دو۔ اس لڑکی کے ماں باپ کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ پس پردہ لڑکی بھی موجود تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر فوراً پردہ ہٹا دیا اور اپنے ماں باپ سے کہا کہ خبردار حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بعد کچھ نہ بولنا اور اس شخص سے کہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو میں حاضر ہوں تم مجھے دیکھ لو۔ صاحبو! یہ محبت کا خاصہ ہے اس میں مصالح اور ننگ و عار سب بالائے طاق رکھے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خود سودائے ما	اے دوائے جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما	اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق خدا تجھ کو خوش رکھے تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہوجاتے ہیں اور تجھ سے تمام امراض کا علاج ہوجاتا ہے تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہوجاتا ہے تو ہمارے لئے مثل افلاطون اور جالینوس کے ہے) کیا اچھی بات فرمائی کہ اے دوائے نخوت ناموس ما۔

صحابہ کی جانثاری کا ایک اور واقعہ:

صاحبو! یہ حالت تھی کہ کثرت سے صحابیات نے مختلف اوقات میں آ کر حضور میں عرض کیا کہ آپ ہم کو قبول فرمالیجئے اور اپنی کنیزی میں لے لیجئے اور آپ نے فرمادیا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے پھر کیا اس فعل پر ان کی مذمت کی گئی ہرگز نہیں۔ ان کی جو قدر کی گئی اس کو بھی سن لیجئے حضرت انسؓ کی صاحبزادی نے ایک مرتبہ ایسے ہی واقعہ پر یہ کہہ دیا کہ ما[illegible]

حیاء ھا (کیسی بے شرم ہے) حضرت انسؓ بگڑ گئے اور فرمایا کہ وہ تجھ سے ہزار درجہ اچھی تھی کہ اپنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتی تھی۔

ولی کا صحابہ کے برابر نہ ہونے کا راز:

اور یہی راز ہے کہ غیر صحابی خواہ کتنا ہی بڑا ہو جاوے لیکن صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظمؒ سے حضرت امیر معاویہؓ کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر معاویہ گھوڑے پر سوار ہوں اور اس کے پیروں کی گرد اڑ کر اس گھوڑی کی ناک پر جا بیٹھے تو حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی وہ ناک کی گرد عمرو بن عبدالعزیزؒ اور اویس قرنیؓ سے افضل ہے۔ ہم کو اس فتوے کی قدر نہیں ہے مگر اہل محبت جانتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے کیا بات فرمائی۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ (گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری جانتا ہے) تو صحابہ میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ حضرات پورے عاشق تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علمی عملی وہ اصلاح کی کہ نہ کوئی فلسفی اپنی قوم کی کر سکا اور نہ کوئی سلطان اپنی رعایا کی کر سکا کیونکہ ان کے پاس تو نور ہی دوسرا تھا جس کو فرماتے ہیں۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ

(کیا جو مردہ ہو پس اس کو ہم زندگی بخشیں اور اس کے لئے ایک نور کر دیں کہ وہ اس کو لوگوں میں لئے پھرتا ہے) اس کو نور سے تعبیر کیجئے یا برکت صحبت کہئے سب کا خلاصہ ایک ہی ہے۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد وکل الیٰ ذاک الجمال یشیر

(ہمارے عنوانات بیان مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے ہر عنوان اسی حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اگر ہم بھی اس مقام پر پہنچنا چاہیں جس پر صحابہ تھے (یعنی باعتبار عطا کے کیونکہ وہ جاہ تو ہم کو کہاں نصیب)

حضرات صحابہؓ سے وابستگی کی ضرورت:

تو صورت یہ ہے کہ ہم ان سے وابستگی اطاعت کی پیدا کر لیں کہ اس کی بدولت انہی کے ساتھ ساتھ لگے چلے جاویں جیسے ایک انجن پشاور سے چلے اور کلکتہ پہنچے اور ایک ٹوٹی ہوئی گاڑی

بھی کلکتہ پہنچنے کی متمنی ہو تو اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس انجن کے ساتھ اپنی زنجیر ملادے۔ تو اب ہمارا بھی یہی کام ہونا چاہئے کہ ہم صحابہ کے ساتھ تعلق پیدا کریں۔ خیر یہ سب جملہ معترضہ تھے مقصود یہ تھا کہ صحابہ کی محبت کا یہ عالم تھا اور کفار کو بھی اس کا علم تھا اس لئے ان کا مقصود یہ تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ان میں جدائی ہی ڈال دیں تو یہ رنگ لائے مگر دوستی کے پیرایہ میں ۔

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت　　　دام داں گرچہ زدانہ گویدت
زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر　　　تاکہ گیرد مرغ راآں مرغ گیر

(دشمن اگرچہ کوئی بات دوستانہ طریق پر تم سے کہے مگر تم اس کو دھوکہ ہی سمجھو کیونکہ شکاری جانوروں کو پکڑنے کے لئے ان ہی جیسی آوازیں نکالا کرتے ہیں)

بدخواہوں کا ہمیشہ قاعدہ ہے کہ برنگ خیر خواہی بدخواہی کیا کرتے ہیں دنیا میں بہت لوگوں نے مسلمانوں سے ایسا کیا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کفار نے یہی معاملہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست عجیب تھی لیکن احتمال ہے کہ شاید یہ اسی طرح ایمان لے آویں اس شرط کو منظور فرمالیا۔ رہا صحابہ کے رنج کا خیال تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ صحابہ تو اپنے ہیں ان کو تو اگر ساری عمر کے لئے الگ کردیں تب بھی الگ ہوجاویں گے کیونکہ وہ تو طالب رضا ہیں ان کی تو وہ حالت ہے کہ ۔

ارید وصاله ویرید هجری　　　فاترک ماارید لما یرید

(میں اس کے وصال کا خواہشمند ہوں اور وہ فراق چاہتا ہے تو اس کی خاطر میں اپنی خواہش چھوڑ دیتا ہوں)

فرماتے ہیں ۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　کہ حیف باشد از غیر او تمنائے

(کیسا وصال اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہئے اس سے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا)

رضائے محبوب کا اتباع ضروری ہے:

یہاں سے ایک اور جملہ مفیدہ یاد آگیا کہ جب عاشق پر رضائے محبوب کا اتباع ضروری

ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صحابہ عاجل مصلحت پر نظر نہ کرتے تھے گو مصلحت اس پر مرتب ہو جائے تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ احکام شرعیہ میں گو مصلحت ہو مگر اطاعت اس پر موقوف نہ ہونا چاہئے بلکہ اطاعت محض رضا کے لئے ہو۔ دیکھئے اگر کسی عورت سے عشق ہو جاوے اور وہ حکم کرے کہ میں جب ملوں گی جب تم پاجامہ چڑھا کر سر پر ٹوکرا رکھ کر جوتے نکال کر فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک دس چکر لگاؤ تو یہ ہرگز نہیں پوچھے گا کہ اس میں مصلحت کیا ہے۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار الخ

(عاشق کو مصلحت بینی کیا کام)

اگر عاشق ہے تو بیس دفعہ کر دکھائے گا۔ کہاں کی تہذیب اور کس کی عار وہ اس تہذیب کو تعذیب سمجھے گا کیونکہ مانع وصال یار ہے ایسے وقت پر تو مصلحت بینی اس شخص کا کام ہے جو فارغ عن المحبت ہو۔

احکام شرعیہ کی حکمتیں معلوم کرنے کا طریق:

اور میں یہ نہیں کہتا کہ احکام شرعیہ میں حکمتیں نہیں ہیں۔ حکمتیں ضرور ہیں مگر اول تو ہم کو ان کا احاطہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے ادراک کا طریقہ یہ نہیں جو اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ محض موہوب ہیں جن کا اکثر ترتب تقویٰ پر ہوا ہے۔ ذرا تاریخ میں دیکھئے کہ امت میں جو بڑے بڑے لوگ جیسے شاہ ولی اللہؒ ابن العربیؒ عبدالکریم جیلیؒ وغیرہ گزرے ہیں اور انہوں نے حکم واسرار شریعت کے لکھے ہیں تو کیا انہوں نے ان اسرار کو کسی مدرسہ میں سیکھا تھا یا کسی مناظرہ سے حاصل کیا تھا ہرگز نہیں مگر یہ بات کیا تھی کہ مدرسہ سے نکل کر علم پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ خلوص اختیار کیا اس سے ان کے قلب میں ایک نور پیدا ہوا جس کی بدولت ان کو سب کچھ منکشف ہو گیا۔

اسی کو کہتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بے معین اور بغیر استاد و کتاب کے انبیاء جیسے علوم حاصل ہوں گے)

تو اگر اسرار معلوم ہونے کا کوئی طریقہ ہے تو یہ ہے لیکن اس پر بھی طالب حق کو اسرار کی ہوس نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ محبت کے خلاف ہے جب ایک مردار کا عاشق اس کی فرمائش

کا راز دریافت نہیں کرتا اور خواہ بعد میں یہی معلوم ہو کہ اس میں خاک بھی مصلحت نہ تھی۔ مگر اطاعت میں کس طرح دوڑتا ہے تو طالب حق اور عاشق خدا کو ایسی کاوش کب زیبا ہے۔ غرض ایسی کاوش طریق محبت کے بالکل خلاف ہے۔ طریق عشق تو اطاعت میں دیوانہ ہوتا ہے کہ ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد

(وہی دیوانہ ہے جو دیوانہ نہ ہوا)

صاحبو! اگر آپ اس کے نظائر دنیا میں نہ برتتے تو میں آپ سے ہرگز یہ خطاب نہ کرتا لیکن جبکہ آپ محبوبان مجازی کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں کہ ان کے ہر حکم کو بغیر دریافت اسرار پورا بجالاتے ہیں نیز حکام مجاز کے ساتھ بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے کہ اگر صاحب کلکٹر آپ سے یہ کہے کہ ہم کو آج رات کے وقت دو بجے فلاں مقام پر تم سے فلاں امر میں مشورہ کرنا ہے جس کو ہم پرسوں انجام دیں گے تو آپ کے دل میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہ آوے گا کہ جب پرسوں اس کام کو کیا جاوے گا تو دن میں بھی تو اسی کی بابت مشورہ ہو سکتا ہے پھر رات کو مجھے بے چین کرنے سے کیا فائدہ اور اگر وسوسہ آوے گا بھی تو آپ اس کو دفع کر دیں گے کہ خواہ کوئی مصلحت ہو یا نہ ہو ہمیں تو ان کی رضامندی مقصود ہے تو جب اہل محبت اور اہل حکومت کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ ہے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیوں نہیں ہے کیا خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تحقیقات مصالح کی مشق کے لئے تم کو ملے ہیں اور اگر دونوں موقعوں میں کوئی فرق ہے تو بتلائے اور فرق نہیں تو پھر یہاں لم کان کذا اور کیف کان کذا۔ (یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا) کیوں ہے بلکہ خدا تعالیٰ تو محبوب بھی ہیں اور حاکم بھی تو یہاں بدرجہ اولیٰ یہ حالت ہونی چاہئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو جان شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دے دیں تو زہے قسمت جب دل آپ کا عاشق ہو گیا تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

زبان تازہ کردن باقرار تو نیگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں غلطیں نکالنے کو مانع ہے)

کیا معنی چوں وچرا کے اور ہمارا حق ہی کیا ہے ہم کو نسبت ہی کیا ہے کہ ہم چون وچرا

کریں ہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مخالفان اسلام کا منہ بند کرنے کے لئے ہم اسرار پوچھتے ہیں اور
ان کا منہ بند کرنا ضروری تو ہم کو اسرار بتلانا بھی ضروری ۔لیکن اگر میں مخالفین کے لئے اس
سے اچھا جواب آپ کو بتلا دوں اور آپ کے اس جواب کا مخدوش ہونا ثابت کردوں پھر تو یقیناً
اس شبہ کی گنجائش نہ رہے گی اس کا بیان یہ ہے کہ مسلمان دو قسم کے ہیں ایک اہل علم دوسرے
عوام تو اگر آپ عوام میں سے ہیں تب تو سیدھی بات یہ ہے کہ معترض کو عالم کا نام بتلا دیجئے کہ
ان سے پوچھو ہم زیادہ نہیں جانتے اور اگر اہل علم میں سے ہیں یا وہ آپ کو ذی علم سمجھتا ہے
تو اس کے لئے دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ آپ یوں کہیں کہ احکام قوانین ہیں ان کے اسرار اسرار
قوانین ہیں اور ہم قانون کے جاننے والے ہیں اسرار قانون ہم نہیں جانتے نہ ان کا بتلانا
ہمارے ذمہ واجب ہے دیکھئے اگر صاحب جج کسی مقدمہ میں ڈگری دیدیں تو مدعا علیہ یہ نہیں
کہہ سکتا کہ جس قانون کی رو سے آپ نے ڈگری دی ہے میں اس قانون کو تو مانتا ہوں لیکن
مجھ کو خود اس میں یہ کلام ہے کہ یہ قانون مصلحت کے خلاف ہے اس لئے آپ اس کا راز بتلا
دیں ۔اور اگر وہ ایسا کہے بھی تو اس کی توہین عدالت اور جرم سمجھا جاوے گا اور اس پر صاحب جج
کو حق ہوگا کہ توہین عدالت کا اس پر مقدمہ کرے اور اگر مقدمہ بھی قائم نہ کیا تو اتنا ضرور کریگا
کہ کان پکڑ کر اس کو عدالت سے باہر کردے گا ۔اور اگر اس وقت اس کی طبیعت میں حکومت
کے بجائے حکمت غالب ہوئی تو یہ جواب دے گا کہ ہم عالم قانون ہیں ۔واضع قانون نہیں
مصالح واضع سے پوچھو تو کیا کسی عقلمند کے نزدیک یہ جواب نامعقول جواب ہے یا بالکل عقل
کے موافق تو اگر عقل کے موافق ہے تو آپ مولوی بن کر یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ ہم عالم
قانون ہیں ۔واضع قانون خدا تعالیٰ ہے مصالح ان سے پوچھ لینا ۔وہ جواب دیں گے خواہ
اسرار بتلانے سے خواہ دماغ کی اصلاح کرنے سے اور یہ فروغ اسلام کے متعلق جواب ہے ۔
البتہ اگر مخالف اسلام کو نفس اسلام کی حقانیت تحقیق کرنا منظور ہے تو اصول اسلام میں عقلی گفتگو
کریں گے ان میں ہم یہ مذکور جواب نہ دیں گے بلکہ اس کی حقانیت کے دلائل عقلیہ بتلائیں
گے خواہ دس برس تک ہم سے کوئی پوچھ جائے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص
سلطنت سے باغی ہوجائے اور بادشاہ کو بادشاہ نہ مانتا ہو اور آپ اسے منوانا چاہیں اور وہ اس
کے ماننے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرے تو آپ سے ہر قانون کی مصلحت دریافت کرے تو

آپ ہرگز اس کو یہ راہ نہ دیں گے اور اس کو تطویل لا طائل سمجھیں گے اور اس شغل کو فضول قرار دیں گے البتہ یہ کریں گے کہ بدلائل بادشاہ کو بادشاہ ثابت کریں گے اور قانون کو اسکا قانون ثابت کریں گے پھر جس قانون کی نسبت وہ دریافت کرے گا اور اس کی مصلحت پوچھے گا آپ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم اسکی مصلحت نہیں جانتے وہ بادشاہ ہے اور یہ اس کا قانون ہے اور بادشاہ کا قانون واجب العمل ہوتا ہے پس یہ بھی واجب العمل ہے۔ بعینہٖ یہی تقریر خداتعالیٰ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں بھی جاری کریں گے کہ دلائل عقلیہ سے ایک ان کا صادق ہونا دوسرا ان احکام کا ان کی طرف منسوب ہونا ثابت کریں گے۔ اور فروع میں اتنا ہی کہہ دیں گے یہ صادق کے احکام ہیں اور ایسے احکام واجب الامتثال ہیں۔

دوسری نظیر لیجئے حکیم عبدالمجید خان کا حکیم ہونا تو محتاج دلیل ہے لیکن ان کے حکیم مان لینے کے بعد کسی مریض کو یہ اختیار نہیں کہ ان کی تجویز کردہ اوران ادویہ میں چون چرا کرے اور اس کی لم ان سے دریافت کرے پس جب دنیاوی معاملات میں یہ امر مسلم ہے تو شریعت کے احکام میں کیوں چون وچرا کیا جاتا ہے۔ صاحبو! یہ نہ سمجھیں کہ مولوی احکام کے مصالح نہیں جانتے ہیں۔ ان کے پاس سب کچھ ذخیرہ موجود ہے لیکن۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ معلوم نہ ہو)

میرے پاس اگر کوئی دو برس رہے تو میں انشاء اللہ تعالیٰ ثابت کردوں گا کہ ہر حکم شریعت میں حکم عقلیہ ہیں مگر ہم ان کو علوم عظمیہ نہیں سمجھتے کیونکہ وہ سب ظنی ہیں۔ لوگوں نے بہت سے حکم لکھے ہیں اور اب بھی الہام سے ہوتے ہیں مگر یہ سب علوم ظنیہ ہیں اس لئے علماء اس میں مشغول نہیں ہوتے۔

علماء کو احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان نہ کرنی چاہئیں:

دوسرے اس میں بھی یہ خرابی ہے کہ اگر کبھی وہ ظنیت کے سبب مخدوش ہو گئے۔ اور حکم بزعم سامع اسی پر مبنی تھا تو اس کے منہدم ہو جانے سے حکم شریعت بھی منہدم ہو جاوے گا۔ لہٰذا بیان اسرار سے جواب دینا بے غبار رستہ نہیں صاف جواب یہی دینا چاہئے کہ ہم اسرار نہیں

جانتے۔ قیامت میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لینا۔ دیکھو اگر ابھی ایک منادی کرنے والا منادی کرے کہ صاحب کلکٹر کا یہ حکم ہے تو کوئی بھی اس سے گلخپ ہوتا ہے کہ حکمت اس حکم کی بیان کرو ورنہ نری منادی ہے تعصب ہے۔ پس ہم کہیں گے جب منادی کرنیوالے سے گلخپ ہو گئے اور اس کو اس منادی کے مصالح بتلانے پر مجبور کرو گے تو ہم بھی بتلا دیں گے۔ غرض حکم اسرار کا علم ہم کو ہے الحمدللہ ہم جانتے ہیں لیکن وہ ظنی ہیں۔ علم قطعی یہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے اور خدا تعالیٰ حکم قطعی ہے لہذا یہ قطعی بس یہ ہے علم قطعی کہ مگر بات یہ ہے کہ قطعی علم میں مزا نہیں ہوتا اور اختراعات میں لذت ہوتی ہے یہ ہے اس مرض کی اصل وجہ اس پر مجھے حکایت یاد آئی کہ میں شاہ جہاں پور سے سفر کر رہا تھا۔

ایک جنٹلمین اور اس کے سوال کا جواب:

ایک جنٹلمین گاڑی میں بیٹھے تھے ایک اسٹیشن پر ان کے خادم نے آ کر اطلاع دی کہ حضور وہ تو سنبھلتا نہیں کہنے لگے کہ یہاں پہنچا دو یہ سن کر مجھے تعجب ہوا کہ وہ کون چیز ان کے ساتھ ہوگی اور جو خادم سے نہیں سنبھل سکی اور اب یہ گاڑی میں منگا کر اس کو سنبھال لیں گے آخر چند بعد دیکھا کہ خادم صاحب ایک بہت بڑے اونچے کتے کو زنجیر سے باندھے ہوئے لا رہے ہیں اور وہ کتا زور کر رہا ہے آخر وہ ان کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے ریل کی آہنی سلاخوں سے اس زنجیر کو باندھ دیا اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ جناب! کتے کا پالنا کیوں حرام ہوا۔ باوجود یہ کہ اس میں فلاں وصف ہے اور فلاں وصف ہے کتے میں۔ انہوں نے اتنے وصف بیان کئے کہ شاید ان میں بھی نہ ہوں۔ میں سب سنتا رہا۔ جب وہ کہہ چکے تو میں نے کہا کہ جناب میں نے سن لیا اس کے دو جواب ہیں ایک عام کہ وہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے شبہات کا جواب ہے اور ایک خاص کہ وہ خاص اس کے متعلق ہے کونسا عرض کروں فرمانے لگے دونوں کہہ دیجئے۔

کتا پالنا کیوں حرام ہے:

میں نے کہا جواب عام تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے اور یہ جواب عام اس لئے ہے کہ قیامت تک کیلئے شبہات کا جواب ہے البتہ اس میں دو مقدمے

ہیں ایک یہ کہ آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے دوسرے یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ہے اگر ان میں کلام ہو تو ثابت کروں کہنے لگے کہ یہ تو ایمان ہے۔ یہ تو عام جواب تھا اور یہ علمی اور حقیقی جواب تھا لیکن ان کو اس کی قدر نہ ہوئی اور کچھ حظ نہ آیا کہنے لگے کہ جناب اور جواب خاص کیا ہے میں نے کہا کہ وہ یہ ہے کہ کہتے ہیں جس قدر اوصاف آپ نے بیان کیے واقعی وہ سب ہیں لیکن باوجود ان اوصاف کے اس میں ایک عیب اتنا بڑا ہے کہ اس نے تمام اوصاف کو خاک میں ملا دیا وہ یہ کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہوتی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کتا دوسرے کتے کو دیکھ کر کس قدر از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اس جواب کو سن کر وہ بہت ہی محظوظ ہوئے اور وہ اس کو جواب قطعی سمجھے۔ حالانکہ یہ محض ایک نکتہ ہے مجھے تو خبر نہ تھی کہ یہ کون ہیں اتفاق سے جب میں اٹاوہ سے بریلی آیا تو مولوی ظہور الاسلام صاحب تحصیل دار کہنے لگے کہ آپ سے اس قسم کی گفتگو کسی سے ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ ہوئی تو تھی فرمانے لگے کہ علی گڑھ کالج کے طالب علم اس جواب کا تذکرہ کر رہے تھے اور اس جواب سے بہت خوش تھے۔ مجھ کو اس سے گمان ہوا کہ شاید وہاں کے تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے اس کو اس لیے ذکر کیا کہ میں یہ بتلا دوں کہ جس جواب پر وہ اس قدر خوش تھے علاوہ فضول ہونے کے میری نظر میں اس کی کچھ بھی وقعت نہ تھی اور میں اس کو جواب ہی نہیں سمجھتا تھا۔ غرض علت اور حکمت کا دریافت کرنا عشق و محبت کے بھی بالکل خلاف ہے جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے ہاں اگر یہ کہو کہ ہم۔ عاشق ہی نہیں تو دوسری بات ہے لیکن خدا تعالیٰ اس کی بھی نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ والذین امنوا اشد حبا للّٰہ (اور مؤمنین اللہ تعالیٰ کی محبت میں زیادہ شدید ہیں) شدت کو عشق کہتے ہیں۔ عشق چونکہ پامال لفظ تھا۔

قرآن وحدیث میں عشق کا لفظ نہ آنے کی وجہ:

اس لئے قرآن وحدیث میں اس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں عشق کا لفظ استعمال کرنا بے ادبی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص وائسرائے کی تعریف کرنے لگے اور یہ کہے کہ ان کو کانسٹیبل کے اختیارات بھی حاصل ہیں تو اگرچہ واقع کے اعتبار سے یہ صحیح ہے لیکن یہ مدح سخت ہجو اور بے ادبی ہے بلکہ بعض اوقات بعض ایسے امر کی نفی بھی موہم نقص ہو جاتی ہے۔

شاہ راہ گوید کسے جولاہ نیست　　　این نہ مدح است اوگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی شخص کہے کہ وہ جولاہہ نہیں یہ اس کی تعریف نہیں ہے بلکہ وہ بادشاہ کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے)

توجس کی نفی بھی مدح نہ ہو اس کا اثبات کیسے مدح ہو جاوے گا وہ تو اور بھی زیادہ قدح ہوگا تو لفظ عشق کو خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ استعمال کرنا چاہئے۔ قرآن و حدیث میں بھی اس کو استعمال نہیں کیا گیا ہے ہاں شدت حب کا لفظ آیا ہے تو جب خدا تعالیٰ ہی فرما چکے ہیں کہ تم عاشق ہو تو عشق سے انکار کیسے کر سکتے ہو۔ پس عاشق کا مذہب اختیار کرو۔ خوب کہا ہے

یامکن با پیلبانان دوستی　　　یابنا کن خانہ برانداز پیل

(یا تو ہاتھی والوں سے دوستی نہ کرو ورنہ اپنا گھر اتنا بڑا بنواؤ کہ اس میں ہاتھی آسکے)

یامکش بر چہرہ نیل عاشقی　　　یافروشو جامۂ تقویٰ بہ نیل

(یا تو چہرہ پر عاشقی مت گداؤ یا جامہ تقویٰ کو نیل سے دھو ڈالو)

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ زبردستی کھینچ کر ہم کو عاشقین میں داخل کیا گیا ہے گویا ہماری وہ حالت ہے کہ ہم بھاگتے ہیں اور ہم کو پکڑ پکڑ کر بلایا جاتا ہے کہ تم تو ہمارے ہو تم کہاں چلے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بہت تعجب کرتے ہیں یعنی خوش ہوتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت میں کئے جاتے ہیں۔

طریق محبت میں قدم رکھنے سے اسرار کا خزانہ ملتا ہے:

سو صحابہ کرام کا انداز بھی عشق تھا جیسا اوپر مذکور ہوا وہی تم بھی اختیار کرو۔ اور اس کے برکات میں سے ایک یہ بھی ممکن ہے کہ تم کو وہ علوم بھی عطا ہو جاویں جن کے تم طالب ہو یعنی اسرار دیکھو اگر کوئی بادشاہ سے کہے کہ ہم کو اپنا خزانہ دکھلاؤ تو اس کو گستاخ سمجھا جاوے گا۔ البتہ اگر خزانہ دیکھنے کی تمنا ہے تو اس کی اطاعت کرو اس سے بے تکلفی پیدا کرو پھر ممکن ہے کہ ایک دن ایسی عنایت ہو کہ بادشاہ تم کو خود ہی خزانہ پر لے جا کر کھڑا کر دے گا۔ خوب کہا ہے

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ　　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم وخاطر تیز کرنا یہ حق تک پہنچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے بجز شکستہ لوگوں کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا)

یعنی بدوں شکستگی اور پستی کے کچھ نہیں ہوتا اور پستی ہی میں یہ اثر ہے۔

ہرکجا پستی است آب آنجارود ہرکجا مشکل جواب آنجارود

(جس جگہ نیچا ہوتا ہے پانی وہیں گرتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہرکجا رنجے شفا آنجا رود

(جس جگہ بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں رنج ہوتا ہے وہاں شفا پہنچتی ہے)

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں رایک زمانے خاک باش

(تم نے برسوں پتھر کی طرح سخت رہ کر دیکھ لیا اب ذرا آزمانے ہی کو کچھ دن خاک ہو کر دیکھ لو)

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شوتا گل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں خاک ہو جاؤ تو رنگ برنگ کے پھول اگیں گے)

خلاصہ یہ ہے کہ تفویض وتسلیم سے کام چلتا ہے اور بالکل خاک میں مل جانے سے۔ اور جس کو یہ دولت ملی ہے وہ اسی طرح ملی ہے۔ اور جو ساری عمر قیل وقال میں رہے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ پس پہلا طریقہ محمود اور ہدایت اور دوسرا طریقہ مذموم اور ضلالت ہے هدیناه النجدین ہم نے دونوں رستے دکھلا دیئے اب جس کا جدھر جی چاہے چلا جاوے۔ مضمون بہت بڑھ گیا مقصود ہے کہ صحابہؓ کو ایسی محبت تھی کہ اگر کوئی آپؐ سے فرماتے کہ ساری عمر کو نہ دیکھو تو وہ ایسا ہی کرتے چنانچہ دو واقعے ہوئے بھی۔

حضرت اویس قرنیؒ کی اطاعت ومحبت کا قصہ:

ایک اویس قرنیؒ کا کہ انہوں نے باوجود شدت اشتیاق زیارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم شرعی سن کر والدہ کی خدمت نہ چھوڑ نا تمام عمر زیارت نہیں کی۔

زیارت فی المنام سے اطاعت افضل ہے:

مجھے تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جو زیارت فی المنام (سونے میں زیارت) کی تمنا

کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت احکام میں نہیں کرتے۔ حالانکہ زیارت فی المنام (خواب میں زیارت) موخر ہے رتبہ میں زیارت فی الیقظہ (بیداری میں زیارت) سے تو حضرت اویسؒ نے یہاں تک اطاعت کی کہ زیارت فی الیقظہ (بیداری میں زیارت) بھی نہیں کی۔ کیونکہ سمجھتے تھے کہ اطاعت کا تو کچھ بدل نہیں زیارت کا بدل ہے وہ یہ کہ اگر یہاں نہ ہوگی تو آخرت میں ہوجاوے گی کسی نے خوب کہا ہے ؎

کششے کہ عشق دارنگذاردت بدینساں بجنازہ گرنیائی بمزار خواہی آمد

(عشق میں جو کشش ہے وہ تجھے یوں ہی نہ چھوڑ دے گی بلکہ اگر تو جنازہ پر نہ آیا تو مزار پر ضرور آئے گا)

اس میں بھی بدل کا مضمون ہے۔ جب اویس قرنیؒ سے کہ تابعی ہیں ایسا واقعہ ثابت ہے تو صحابہؓ کا کیا کہنا ہے۔

حضرت وحشی کی اطاعت کا قصہ:

دوسری حکایت حضرت وحشیؓ کی ہے اگر چہ یہ صحابی مشہور نہیں ہیں لیکن ہیں صحابی۔ گو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے درجہ کے نہیں ہیں ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود لیک بس عالیست پیش خاک تود

(آسمان اگرچہ عرش کی نسبت پست ہے مگر ایک خاک کے ٹیلہ کے سامنے تو بہت بلند ہے)

تو ان کا واقعہ یہ ہوا کہ انہوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا تھا۔ جب یہ مسلمان ہو کر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **هل تستطيع ان تغيب وجهك عني** (کیا اپنا چہرہ مجھ سے غائب رکھ سکتے ہو)

حضرت وحشی کے قصہ پر ایک شبہ اور اس کا جواب:

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا سے اس قدر محبت تھی کہ ان کی بدولت ایک مسلمان سے ایسے رنجیدہ رہے کہ ان کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں فرماتے تو یہ تو بڑی رنج کی بات ہے کہ آپ خلاف مزاج امر سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں تو اس حالت میں عاصی آپ سے کیا امید کریں خدا جانے آپ کتنے ناخوش ہوں اور ہم کو کہاں

دور پھینک دیں گے مگر ہم کو اس واقعہ ہی سے ایک بہت بڑی بات بشارت کی ہاتھ آئی۔ یہی واقعہ ہے کہ جس سے انشاء اللہ تعالیٰ ہماری تمام مشکلات حل ہوں گی کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے متاثر ہونے والے ہیں کہ منتسب کی دنیاوی تکلیف کی آپ کو سہار نہیں تو قیامت میں اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ کر کھڑے ہو جاویں گے تو یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مصیبت کو دیکھ نہ سکیں گے اور ہماری مدد فرما دیں گے۔

صحابہؓ کے وفور علم کی ایک حکایت:

اور صحابہ کرام نے اسی قسم کی ایک حدیث سے ایک ایسی ہی عجیب بات سمجھی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث بیان فرما رہے تھے صحابہؓ نے اس پر عرض کیا **ھل یضحک ربنا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** یعنی کیا اللہ میاں ہنستے بھی ہیں۔ اور یہیں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ صحابہ کرام کا علم کیسا عمیق تھا کہ اللہ میاں کے ہنسنے کو تو پوچھا لیکن آج کل کے طباعوں کی طرح اس کی کیفیت نہیں پوچھی کیونکہ جانتے تھے کہ جب خدا تعالیٰ ہی کو پوری طرح نہیں پہچانا تو اس کی صفات کیفیت کیسے سمجھ میں آسکتی ہے۔

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

(جب تو نے کبھی سلیمان علیہ السلام کو دیکھا ہی نہیں تو پھر پرندوں کی بولیاں کیسے سمجھے گا)

ایک بزرگ سے کسی نے شب معراج کی مفصل گفتگو کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب میں کیا خوب فرمایا

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(کسی کی ہمت اور حوصلہ ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

غرض صحابہؓ نے اس حدیث کو سن کر عرض کیا کہ انشاء اللہ ایسے رب سے خیر کے ملنے سے محروم نہ رہیں گے جو ہنستا بھی ہے یعنی اب کچھ غم نہیں کیونکہ نہیں معلوم کس بات پر ہنس پڑیں گے اور ہمارا کام بن جاوے گا۔ صاحبو! صحابہ کے یہ علوم ہیں۔ اب ان میں ہمیں اس لئے لطف نہیں آتا کہ ہمارا قلب مثلاً عنین کے ہو گیا ہے۔ اس کو حس نہیں رہی جیسے عنین کو عورت میں لطف نہیں آتا۔ اسی طرح ہم باعتبار قلب کے عنین اور نابالغ ہیں۔

خوب کہا ہے۔

خلق اطفا لند جزمست خدا　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق بچوں کی طرح ہے سوائے اس شخص کے جو حق تعالیٰ کا مست ہے بس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا)

تو صحابہؓ نے جیسے اس حدیث سے سمجھا اسی انداز پر اس وقت خدا تعالیٰ نے حضرت وحشیؓ کے متعلق ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ اگر ہم مچل جاویں گے تو ضرور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہماری مدد فرماویں گے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وحشیؓ سے فرمایا انہوں نے کر کے دکھلا دیا کہ تمام عمر سامنے نہیں آئے۔

ارید وصاله ویرید هجری　　فاترک ماارید لما یرید

(میں اس کے وصال کا ارادہ کرتا ہوں وہ میرے فراق کا ارادہ کرتا ہے بس میں اپنی مراد کو اس کی مراد کی وجہ سے چھوڑتا ہوں)

کیا کیا لہریں ان کے دل میں اٹھتی ہوں گی کہ۔

از فراق تلخ میگوئی سخن　　ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی تلخ باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو مگر یہ نہ کرو)

اگر گردن بھی کاٹ لیتے تو یہ غم نہ ہوتا۔ ایک تو جدائی کا غم دوسرا یہ غم کہ لوگوں کی نظروں میں کیسی ذلت ہوگی مگر عاشق تھے کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ جان و مال و آبرو سب فدا کر دیا۔ اور دوسرے صحابہ بھی کیسے مہذب کہ کسی نے ان کو ذرا نہیں چڑایا بلکہ ان کی زیارت کرنے ملک شام میں جاتے تھے چنانچہ ان سے ایک صحابی ملنے گئے اور ان سے حضرت حمزہؓ کے قتل کا واقعہ پوچھا۔ کہنے لگے خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کا کفارہ بھی ہو گیا کہ میں نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔

بقیہ شان نزول:

تو صحابہؓ جب ایسے تھے کہ اتنے بڑے امر میں اطاعت کر لی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ اگر ہم ایسا کر لیں کہ ان روساء کے آنے کے وقت ان غرباء کو مجلس میں رہنے سے منع کر دیں تو ان کو ذرا بھی ناگوار نہ ہوگا اور شاید روسا ایمان

لے آویں ورنہ اتمام حجت ہی ہو جاوے گا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوچ رہے تھے کہ ایسا کریں یا نہ کریں کہ آیت نازل ہوئی

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا

(اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو اپنے رب کی عبادت صبح وشام محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال حد سے گزر گیا ہے)

یہ شان نزول بیان کیا تھا جس میں بعض اور ضروری مضمون بھی بیان ہو گئے۔ اب ترجمہ بیان کرتا ہوں فرماتے ہیں.

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ الخ.

یعنی (کہو اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت اس طرح کرتے ہیں کہ اس عبادت میں ارادہ کرتے ہیں محض خدا تعالیٰ کی رضا کا یعنی اپنے نفس کو مقید کر کے رکھتے ہیں ان کو اٹھانے کی اجازت تو کہاں ہے خود بھی نہ اٹھئے مثلاً خود ہی اٹھ کر ان رؤسا کو دوسری مجلس میں لے کر بیٹھ جاتے جس میں ان غرباء کی ذلت بھی نہیں تھی دیکھئے وَاصْبِرْ نَفْسَکَ (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ بھی تقاضا ہو قلب میں کہ میں اٹھوں کیونکہ اس اٹھنے کا داعی بھی دین ہی تھا مگر صبر کر کے بیٹھئے اس سے سمجھئے کہ کیا چیز ہیں مساکین محض۔ اس لئے کہ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ (محض اس کی رضا جوئی کا ارادہ کرتے ہیں) خوب کہا ہے

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم | شہاں بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ بے تاج تخت کے بادشاہ ہیں ۱۲)

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں | کہ ناز برفلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستارے پر حکم کرتا ہوں ۱۲)

جب ہی تو یہ بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ دو جہاں کے بادشاہ ہیں فرماتے ہیں ۔ اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین. دیکھئے یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ ہو بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ ہو۔ یعنی وہ لوگ تو اپنی جگہ رہیں میں ان کے ساتھ ہو جاؤں جہاں مسکین ہوں وہیں میں ہوں ورنہ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ جہاں میں ہوں وہاں یہ آجاویں۔

مسکنت کے فضائل:

اور یہ یہاں سے اندازہ ہوگا کہ مسکنت کیا چیز ہے۔ صاحبو! وہ اتنی بڑی چیز ہے کہ ایک ایسے بڑے سخت مرض کا علاج بھی ہے کہ وہ تمام مفاسد کی جڑ ہے اس سے تمدن اور دین دونوں بگڑتے ہیں او وہ مرض کبر کی اور نخوت ہے کہ جتنی متعدی خرابیاں ہوتی ہیں۔ لڑائی غیبت۔ حسد۔ یہ سب تکبر کی بدولت ہوتے ہیں۔

اتفاق عالم کی جڑ تواضع ہے:

ہمارے مرشد حاجی صاحبؒ نے ایک مرتبہ ایک ایسی عجیب اور گہری بات فرمائی کہ جو آج تک کسی رفارمر کی زبان پر نہیں آئی۔ فرمانے لگے کہ لوگ اتفاق کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی جڑ کی خبر نہیں ہے۔ اتفاق کی جڑ ہے تواضع۔ ہر شخص اپنے اندر تواضع پیدا کرے کیونکہ اتفاقی ہمیشہ کبر سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنے کو دوسرے سے بڑا سمجھے گا تو بہت سی باتوں میں اپنے حقوق کی اضاعت بھی سمجھے گا ہر بات میں اپنے کو دوسرے پر بڑھانا چاہے گا اور اس سے نا اتفاقی پیدا ہوگی اور جب ہر شخص میں تواضع ہوگی تو ہر شخص اپنے اوپر دوسرے کے حقوق سمجھے گا اور ان میں اپنے کو قاصر پاوے گا تو سب کے سب ایک دوسرے کے سامنے لچیں گے اور یہی اتفاق ہے۔ ہمارے عقلاء اتفاق کی کوشش کر رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ کبر و نخوت کا بھی اہتمام کر کے اسی کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔

بعینہ وہی حالت ہے۔

یکے بر سر شاخ و بن مے برید   خداوند بستان نگہ کرد دید

(ایک آدمی ٹہنی پہ ہے اور جڑ کاٹ رہا ہے مالک باغ نے نظر کی اور دیکھا)

تو ہم شاخ اتفاق پر بیٹھے ہیں لیکن کبر کے قریب سے اس کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ آج خودداری تکبر کی تعلیم کی جاتی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے اولوالعزمی۔

اولوالعزمی کا مفہوم:

صاحبو! اولوالعزمی یہ ہے کہ سلطنت پر لات ماردی اور حالت یہ ہو کہ لنگی زیر و لنگی بالا۔ (ایک لنگی باندھے ہوئے اور ایک لنگی اوڑھے ہوئے) اولوالعزمی کا حاصل یہ ہے۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش	چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نبا شد زکس	ہمیں است بنیاد توحید وبس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں امید وخوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے ۱۲)

اور وہ حالت ہو

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند	فرزند وعیال وخانماں راچہ کند

جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اسکو جان اور فرزند واسباب کی پرواہ نہیں ۱۲)

حضرت خالدؓ اور ان کے ہمراہیوں کی اولوالعزمی:

صاحبو! اولوالعزمی وہ ہے جو صحابہ نے کر کے دکھلا دی کہ ماہان ارمنی کے دربار میں جب حضرت خالدؓ سو آدمیوں کو ہمراہ لے کر تشریف لے گئے تھے۔ ماہان ارمنی حریر کا فرش بچھایا ہوا تھا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو اٹھا دیا۔ ماہان نے کہا کہ اے خالدؓ میں نے تمہاری عزت کے لئے یہ فرش بچھایا تھا۔ حضرت خالد نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا فرش تیرے فرش سے بہت اچھا ہے۔ اب غور کیجئے کہ حضرت خالد صرف سو آدمیوں کے ساتھ ہیں اور ماہاں ارمنی کے پاس دو لاکھ فوج ہے لیکن حضرت خالدؓ کیا گفتگو کرتے ہیں ماہان ارمنی نے کہا کہ اے خالدؓ میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو بھائی بنالوں خالدؓ نے فرمایا کہ بہتر ہے کہو لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) ماہان ارمنی نے کہا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا تو اس حالت میں ہم نے حقیقی بھائیوں کو بھی چھوڑ دیا تجھ کو کیا بھائی بناتے۔ پھر حضرت خالدؓ نے فرمایا اے ماہان تو

مسلمان ہو جاو رنہ وہ دن قریب نظر آرہا ہے کہ تو حضرت عمرؓ کے سامنے اس طرح حاضر کیا جاوے گا کہ تیرے گلے میں رسی ہوگی اور تجھ کو ایک شخص گھسیٹتا ہوگا۔ اس پر ماہان ارمنی آگ ہو گیا غضب ناک ہو کر کہا کہ پکڑو ان لوگوں کو حضرت خالدؓ فوراً اٹھ کھڑے ہو گئے اور ہمرائیوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ خبردار اب ایک دوسرے کو مت دیکھنا اب ان شاء اللہ تعالیٰ حوض کوثر پر ملاقات ہوگی اور فوراً میان سے تلوار کھینچ لی۔ یہ ہیبت دیکھ کر ماہان مرعوب ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تو ہنسی کرتا تھا۔ جب حضرت خالدؓ درست ہو کر بیٹھے یہ ہے اولوالعزمی نہ یہ کہ غایت کبر و نخوت و تنفر عن المساکین (مساکین سے نفرت) جنگل میں جا بسے کہ (مسلمان ان کو دیکھ سکیں نہ یہ مسلمانوں کو دیکھ سکیں۔ تیز جس کا نام آج اولوالعزمی رکھا گیا ہے وہ وہ ہے جس کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا. (نہیں ارادہ کرتے ہیں بڑائی کا زمین میں اور نہ فساد کا ۱۲)

تو اولوالعزمی صحابہؓ نے کر کے دکھلائی ہے اور وہ توحید سے ہوتی ہے۔ آج کل تکبر کا نام اولوالعزمی رکھا گیا ہے اور اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔

صاحبو! کیسے افسوس اور رنج کی بات ہے آج بچوں کو وہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ان میں بچپن ہی سے اینٹھ مروڑ پیدا ہو جاوے۔

بچوں کی غلط تربیت:

مجھ سے ایک رئیس نے پوچھا کہ اگر بچہ نوکر کی خطا کرے تو کیا کرنا چاہئے۔ یعنی اس حرکت پر اس کو کسی قسم کی تنبیہ کرنی چاہئے یا نہیں۔ میں نے کہا اس بچہ کو کہنا چاہے کہ اس نوکر سے عذر کرے۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی ذلت کی بات ہے اس سے اولوالعزمی میں ضعف ہوتا ہے پھر جب میں نے اس اولوالعزمی کی حقیقت سمجھائی کہ یہ بدخلقی اور تکبر ہے تب ان کی سمجھ میں آ گیا۔ صاحبو! واللہ لوگوں کو پرورش اور تربیت نہیں آتی۔ تربیت یہ تھی کہ جو پہلے اتالیق کرتے تھے۔ ایک شاہزادہ کی حکایت ہے کہ وہ ایک معلم کے پاس پڑھتا تھا۔ ایک روز بادشاہ جو مکتب میں گئے تو دیکھا کہ نہ شاہزادہ ہے اور نہ معلم ہے دوسرے لڑکوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ معلم صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر گئے ہیں اور شاہزادہ ان کے پیچھے ساتھ گیا ہے بادشاہ کو حرکت ناگوار ہوئی اور جس طرف ان کا جانا بنا تھا خود بھی اسی طرف کو چلا۔ آخر ایک

جگہ ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے دیکھا کہ میاں جی گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ گھوڑے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بادشاہ نے معلم سے پوچھا کہ آخر اس کا کیا سبب ہے کہنے لگے کہ جناب آپ کو معلوم ہے کہ یہ شاہزادہ ہے اور خدا تعالیٰ نے کیا تو یہ تخت سلطنت پر بھی متمکن ہوگا اس وقت ایسے بھی مواقع ہوں گے کہ یہ سواری پر ہو اور اس کے ساتھ اس کے حشم خدم بھی ہوں۔ پس میں اسی وقت سے اس گھوڑے کے ساتھ بھگا کر بتلا رہا ہوں کہ خدام کو پیادہ دوڑنے میں ایسی تکلیف ہوا کرتی ہے تاکہ یہ اپنی تکلیف کو یاد کر کے اپنے حشم خدم پر رحم کرے اور وسعت سے زیادہ تکلیف ان کو نہ دے۔ یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہا جزاک اللہ (اللہ تعالیٰ تجھ کو جزا دے) تم نے بہت بڑی اصلاح کی۔ تو یہ ہے تربیت کا طریق۔

تکبر کا علاج:

اب تکبر کا ایسا چرچا ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ کی پناہ اور یہی ہماری تباہی کا سبب ہے اور اس کا علاج ہے مسکنت جو بات دس برس کے مجاہدہ میں بہ دقت حاصل ہو سکتی ہے وہ مسکنت سے ایک دن میں حاصل ہو جاتی ہے اور یہ مسکنت کی وہ منفعت ہے جو میری سمجھ میں آئی ورنہ اصل یہ ہے کہ مسکنت فی ذاتہا بھی محبوب عنداللہ ہے۔ پیا جس کو چاہے وہی سہاگن ہوئے۔

صحبت نیک کی فضیلت:

شاید اس تقریر سے کسی کے دل میں یہ بات پیدا ہو کہ ہم بھی گھر لٹا دیں گے اور مساکین میں داخل ہو جاویں گے صاحبو! ہرگز ایسا مناسب نہیں۔ مساکین میں داخل ہونے کا یہ طریق کہ المرء مع من احب (الصحیح للبخاری ۸: ۴۸) (آدمی اس شخص کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے)

تم ان سے محبت رکھو ان شاء اللہ تعالیٰ انہیں کے درجہ پر پہنچ جاؤ گے۔ اسی لئے فرماتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا عائشۃ قربی المساکین وجالسیھم (البدایۃ والنہایۃ ۲: ۵۹ بلفظ آخر) (نزدیک ہو تو مساکین کے اور ان کے پاس بیٹھ) لفظ قربی (نزدیک ہو تو) میں تو ان کو آنے دینے کے لئے فرمایا اور لفظ جالسیھم بیٹھ تو ان کے پاس میں اس سے بڑھ کر یہ بتلا دیا کہ اگر وہ خود نہ آویں تو جا کر بیٹھو۔ دیکھئے کتنی بڑی عزت

ہے مساکین کی یہ ہی مسکنت ہے جس سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا کہ اصبر نفسک الخ (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) یہ بیان تھا۔ ترجمہ آیت کا۔ اور آیت کا ترجمہ سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مقصود میرا کیا بیان کرنا ہے مگر میں تصریحا بھی کہہ دیتا ہوں سو مدلول لغوی آیت کا تو یہ ہے جو کہ میں نے بیان کیا مگر اس کی ایک غایت ہے اس غایت سے میرا مقصود اچھی طرح سمجھ میں آجاوے گا۔ میں سوچا تھا کہ کوئی صریح آیت سمجھ میں آجاوے مگر جلدی میں سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن خیر اب سمجھئے کہ غایت اس اصبر سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رعایت نفع صحابہ کی کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مساکین کو نفع پہنچتا ہے یا نہیں اگر نہیں پہنچتا تو پھر اس حکم سے کیا فائدہ ہوتا ہے اور اگر کوئی کہے کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع پہنچتا ہو اجر تبلیغ کا تو یہ بالکل غلط ہے کہ صرف اس کو مدار حکم کہا جاوے۔ اس میں صحابی کی کیا تخصیص ہے۔ یہ تو تبلیغ الی الکفار۔ (کفار کی تبلیغ) میں بھی مشترک ہے پس معلوم ہوا کہ ان مساکین کو آپ سے نفع پہنچنا بڑی غایت ہے۔ اس حکم کی یعنی اگر یہ آپ کے پاس بیٹھیں گے تو ان کو نفع ہوگا۔

مقبولان الٰہی کی صحبت سے نفع:

اس سے ثابت ہوا کہ مقبولان الٰہی کے پاس بیٹھنے سے نفع ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا سا جملہ مگر میں اس کی تفصیل کروں گا اور یہ ہی میرا مقصود ہے بیان سے اور یہ مسئلہ سب کے نزدیک مسلم بھی ہے اور قرآن شریف میں منصوص بھی ہے اِتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰادِقِیْنَ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو)

اس آیت میں تو یہ مصرح ہی ہے۔ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں گو مصرح نہیں لیکن حسب تقریر مذکور لازم آگیا۔ پھر یہ کہ اس کا مسلم ہونا ہی کافی ہے۔

صحبت صالحین سے غفلت اور لاپروائی:

لیکن باوجود مسلم ہونے کے افسوس آپ کے دلوں میں درجہ ضرورت میں یہ کبھی نہیں آیا اور یہ ہی ضرورت داعی ہوئی اس کے بیان کی یہ عام خیال ہے کہ نیک صحبت نافع ہوتی ہے لیکن اس کا ضروری ہونا سو عقیدہ کے درجہ میں بھی اس سے غفلت ہے اور عمل کے اعتبار

سے بھی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے لئے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی فلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ان میں جو دین کا مذاق غالب رکھتے ہیں وہ دین کے لئے مولوی بناتے ہیں جو دنیادار ہیں وہ معاش کیلئے تیار کرتے ہیں۔غرض ایک نے دین کی فلاح کی کوشش کی اور ایک نے دنیا کی فلاح کی کوشش کی۔لیکن اس فہرست مساعی میں کہیں یہ فکر نہیں جس کا نام نیک صحبت ہے یعنی بالاستقلال اس کا اہتمام کسی نے بھی نہیں کیا۔جیسے اور کاموں کو ضروری سمجھتے ہیں اس کو کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا مثلاً ہفتہ بھر میں ایک دن یا مہینہ بھر میں ایک دن یا سال بھر میں ایک مہینہ کسی نے اس لئے دیا ہو کہ اس میں صحبت نیک سے مستفید ہوں تو ہمارا یہ عمل اسکی شہادت دے رہا ہے کہ ہم نے اس کو کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں سمجھا۔دیکھئے سارے کاموں کے لئے وقت مقرر ہیں کھانے کے لئے آرام کے لئے بھی سیر کے لئے بھی مگر صحبت نیک کے ذریعہ سے محض تہذیب اخلاق کے لئے بھی کسی نے وقت مقرر کیا ہے؟اس کے جواب میں محض صفر ہے یہ ہے وہ مضمون جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس کی طرف سے غفلت عام اور ضرورت اس کی بیحد کہ دنیا کا یا دین کا کوئی کمال بغیر صحبت کے نہیں ہوسکتا۔ہاں نام کو جو چاہے ہو جاؤ باقی واقع میں وہ حال ہی ایسا ہی ہے کہ

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے　　　حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ کا گمان ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہے خواجہ کو بجز غرور کے کچھ حاصل نہیں)

اس وقت لوگ مطالعہ کتب کمال سمجھتے ہیں۔

حصول کمال کا طریق:

میں بقسم کہتا ہوں کہ کوئی کمال بدوں ماہر سے حاصل کئے نہیں آسکتا اور ماہر سے حاصل کرنا موقوف ہے صحبت پر۔اور دنیاوی کمالات کو جانے دیجئے اس کا مجھے تجربہ نہیں نہ مجھے اس کے متعلق گفتگو کرنے کی ضرورت۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(میں نہ شب ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں محبوب ہی کی باتوں کو مجھ سے سنو)

گو مولویوں پر بھی یہ اعتراض ہے کہ دنیا کی اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں بتلاتے مگر میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ یہ اعتراض ایسا ہے کہ جیسے حکیم محمود خان کے پاس کوئی مدقوق جاوے اور وہ نبض دیکھ کر ایک نسخہ لکھ دیں جب وہ نسخہ لے کر باہر آیا تو دروازہ پر ایک چمار ملا کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے کیا بتلایا۔ مریض نے نسخہ دکھلا دیا دیکھ کر کہنے لگا کہ تمہاری جوتی ٹوٹی ہوئی ہے اس کے متعلق بھی کچھ بتلایا۔ مریض نے کہا کوئی نہیں کہنے لگا کہ حکیم محمود خان بھی دنیا کی ضرورت سے بالکل ہی غافل ہیں۔

صاحبو! اس مشیر کو کیا جواب دیجئے گا بجز اس کے کہ یہ حکیم صاحب کا منصب ہے اور یہ تیرا کام ہے۔ اسی طرح ہم دق روحانی کا نسخہ بتلاتے ہیں اور دنیاوی مقاصد کو جوتی سینے کے درجہ میں سمجھتے ہیں۔ تو پھر ہمارے خلاف منصب کیوں الزام دیا جاتا ہے۔ صاحبو ! غضب ہے کہ سنارے کے پاس کھرپا لے جاؤ کہ اس کو بنا دے یا قاضی شہر سے چارپائی بنواؤ۔ ہاں اگر حکیم محمود خان جوتی بنوانے سے منع کریں وہ تو مجرم ہیں۔ لیکن اگر جوتا اس طرح سے سلوایا جاوے کہ کھال میں کوستالی نکلنے لگے تو حکیم محمود خان پر فرض ہے کہ منع کریں اور کہیں کہ اس زخم سے تمہارا سارا بدن سڑ جاوے گا۔

ترقی دنیا سے شریعت کب منع کرتی ہے:

بس اس طرح اگر مولوی جائز طریقوں سے دنیا میں کمانے کو منع کریں تو بیشک مولویوں پر الزام ہے لیکن اگر دین میں ستالی نکالنے لگے گی تو وہ ضرور منع کریں گے اور یہ منع کرنا واقع میں ترقی سے روکنا نہیں ہے۔ صاحبو! اگر ایک شخص جیب میں اشرفیاں بھرے اور جب جگہ رہ جاوے تو اوپر سے کوڑیاں بھرنے لگے اور کوڑیوں کو ٹھونس کر بھرنے کے بوجھ سے جیب پھٹنے لگے کہ اشرفیاں نکلنے لگیں اور یہ حالت دیکھ کر کوئی شخص اس کو اس طرح کوڑیاں بھرنے سے منع کرے تو اس کو مانع ترقی کہا جاوے گا۔ ہرگز نہیں وہ کوڑیاں کس کام کی جو اشرفیاں کھو کر حاصل کی گئیں ہوں۔ پس جب آپ کا دین کہ اشرفیوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ برباد ہو رہا ہے تو دنیا کی چند کوڑیاں جمع کر کے آپ کو کیا فلاح ہوگی تو اس حالت میں مولوی ضرور منع کریں گے اور اگر یہ امر آپ کی سمجھ میں آ جاوے گا تو آپ بھی کہنے لگیں گے۔

مبادا دل آں فرومایہ شاد   کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد
(وہ کمینہ خوش دل نہ رہے جس نے دنیا کی وجہ سے دین کو خراب کیا)

ہم کو گو یہ بھی جائز ہے کہ ہم آپ کو آپ کے دنیاوی نقصانات سے بھی بچاویں لیکن ہم اس کو اپنا منصب نہیں سمجھتے اس لئے دوسرے مشاغل دینیہ کے غلبہ سے قصداً ایسا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ۔

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم   الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم
(جو کچھ ہم نے پڑھا سب کو فراموش کر دیا بجز محبوب کی باتوں کے کہ ان ہی کا تکرار کرتے ہیں)

دیکھئے انگریزوں کا فتویٰ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک جماعت ہونی چاہیے تو اس فتوی کے مطابق مولویوں کو صرف دین کے کام کے لئے رکھو۔ مگر آج کل عجب اندھیر ہے کہ سارے کام ایک ہی جماعت کے ذمے سمجھے جاتے ہیں اور سارے کاموں کے الزام مولویوں ہی پر ہیں۔ اور اگر مولوی کچھ کرتے بھی ہیں اور روپیہ کی نسبت ان حضرات سے کہتے ہیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں وہ جمع کیجئے تو جواب ملتا ہے کہ تم ہی چندہ بھی کرلو۔

اکبر اور ایک بھانڈ کی حکایت:

مجھے ایسے لوگوں کی حالت پر اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ یاد آیا کرتا ہے کہ اکبر نے کسی خوشی میں اپنے بھانڈ کو ایک ہاتھی دے دیا تھا وہ کھلاوے کہاں سے آخر اس نے ایک ڈھول اس کے گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا۔ اکبر شاہ نے اتفاقاً اس ہیئت میں دیکھا۔ پوچھا۔ اس نے کہا حضور جب مجھ سے کھلایا نہ گیا میں نے ڈھول گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا کہ بھائی مانگ اور کھا۔ تو گویا مولوی اکبر کے بھانڈ کے ہاتھی ہیں۔ کیوں صاحب مولویوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ روپیہ مانگیں ہمارا کام ہاتھ اور زبان کا ہے۔ باقی روپیہ دینا یا جمع کرنا یہ آپ کا کام ہے۔ بیان اس کا تھا کہ دنیاوی اصلاحات میں دخل دینا مولویوں کا کام نہیں بلکہ ان کا حسن تو یہ ہے کہ اس سے یہ واقف بھی نہ ہوں۔ بچہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بالکل بھولا ہو۔

مولویوں کے دنیا دار ہونے کی خرابی:

دوسرے ایک بڑی خرابی ان کے دنیا سے باخبر ہونے میں یہ بھی ہے کہ اگر ان کو دنیا کا کام آوے تو نفس ان کے بھی ساتھ ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر چند روز میں شکر فروش اور چاول

فروش ہوں گے۔دیکھو اگر ڈرائیور کو سیکنڈ کی سواری ملے تو وہ کبھی انجن میں نہ بیٹھے گا تو مولوی دنیا سے ناواقف ہی رہنے چاہئیں۔اور صاحبو! غضب ہے کہ ایک تو ہم تکلیف کے انجن میں بیٹھ کر آپ کی راحت رسانی کے لئے اپنا بدن اور کپڑے سیاہ کریں اور پھر یہ اعتراض ہم پر ہوگا کہ تم گارڈ کیوں نہیں بنتے۔اس لئے میں دنیا کی اصلاح کا ذکر ہی نہیں کرتا گو وہ بھی موقوف صحبت ہی پر ہے مگر میں صرف دینی اصلاح کا ذکر کرتا ہوں کہ۔

دین کی اصلاح محض کتب بینی سے نہیں ہوتی:

دین کی اصلاح محض کتابیں دیکھ کر نہیں ہوسکتی۔یہ صحبت ہی سے ہوسکتی ہے۔مطالعہ کتب سے اس کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسے طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص بیوی کو مسہل دینے لگے اور حکیم محمود سے نہ پوچھے محض اس لئے کہ قرابادین اعظم ہمارے پاس ہے جس کسی سے بھی ایسا کہنے کو کہو وہ یہی کہے گا کہ صاحب ہر فن کے کچھ دقائق ہوتے ہیں جن کو صاحب فن ہی سمجھ سکتا ہے میں بدوں حکیم کے مسہل دینے کی جرات نہیں کرتا۔پس اسی طرح اس فن کو دین میں بھی کچھ غوامض ہیں لہٰذا کتابوں پر اکتفا کرنا سخت غلطی ہے ہرگز کتابوں پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ صحبت اختیار کیجئے چونکہ وقت کم رہ گیا ہے اس لئے مختصر کرکے ختم کرتا (سامعین نے التجا کی کہ مختصر نہ کیا جاوے اس کے بعد پھر فرمایا)

بدوں صحبت کوئی شئے حاصل نہیں ہوتی:

غرض صحبت نیک کی سخت ضرورت ہے مگر اس کی طرف لوگوں کو مطلق توجہ نہیں۔حالانکہ بدوں صحبت معمولی کام کا بھی سلیقہ نہیں ہوتا۔دیکھئے رسالہ خوان نعمت کو دیکھ کر کبھی گلگلے نہیں پکا سکتا۔تو جب حرف دنیویہ بھی بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتے تو فنون شرعیہ تو کیسے حاصل ہوسکتے ہیں مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک وکیل صاحب میرے مہمان ہوئے میں نے ان سے ترجمہ قانون لے کر دیکھا اور اپنے نزدیک اسکو سمجھا پھر میں نے وکیل صاحب سے پوچھا کہ آیا اس کے معنی یہی ہیں جو میں نے سمجھے ہیں کہنے لگے کہ نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں۔اور ان کے بیان کرنے کے بعد وہی معنی صحیح معلوم ہوئے جو انہوں نے بتلائے تھے۔تو دیکھئے اردو مادری زبان ہے مگر چونکہ اس فن سے واقفیت نہ تھی اس لئے

صحیح معنی سمجھ میں نہ آئے تو اگر کسی دوسری زبان کی کتاب ہو یا اس سے ترجمہ کر کے آئی ہو تو
چونکہ غیر زبان کے دقائق پر تو بدوں مہارت اطلاع علیٰ وجہ الکمال نہیں ہوتی۔ اور ترجمہ میں
وہ خصوصیات محفوظ نہیں رہتیں جو اصل زبان کے الفاظ میں تھیں۔ اس لئے محض کتاب دیکھ کر
کبھی کوئی شخص اصل بات کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ دیکھو اگر ذوق کا ایک شعر لے کر فارسی میں
اس کا ترجمہ کر دو تو ہرگز وہ لطف نہ آوے گا۔ بس یہی حالت قرآن وحدیث کی ہے تو اول
زبان سیکھو پھر ماہر فن کے متعلق اہل فن سے اس کے احکام سیکھو تب وہ فن حاصل ہوگا۔ ورنہ
قرآن بدوں مفسر کے اور حدیث بدوں محدث کے ہرگز حل نہیں ہو سکتی اور علماء کو اسکا اندازہ
ہوگا کہ باوجود اس کے وہ دن رات اس میں رہتے ہیں مگر پھر بھی ان کو گاہے پوچھنے کی
ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے بعض اوقات اپنے اساتذہ کے سامنے ان کے مطلب بیان
فرمانے پر اس کے خلاف اس مقام کی تقریر کی اور انہوں نے اس کو قبول کیا۔ تو جب شاغلین
کی یہ حالت ہے تو جن لوگوں کو یہ مشغلہ ہی نہیں وہ محض اپنے فہم پر کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔
بعض دفعہ ایک مسئلہ کے ساتھ دوسری قیود جو اس مقام پر مذکور نہیں ملحوظ ہوتی ہیں جس میں
نہایت ماہر کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے میں نے ایک طالب علم شافعی المذہب کی
درخواست پر اس کو فقہ شافعی پڑھانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کبھی ایک مسئلہ
میں ایک قید معتبر ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس میں خاص مذکور نہیں ہوتی بلکہ دوسری جگہ مذکور ہوتی
ہے۔ تو ایسے مقام پر بوجہ عدم استحضار وعدم مہارت مجھے فروگذاشت ہوتی۔

طلاق کا ایک اہم مسئلہ:

میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ لفظ اختاری (اختیار کر تو) کنایات میں سے اس
کو باب الکنایات میں دیکھ کر بعض لوگوں کو ہی لغزش ہوئی کہ وہ یہ سمجھے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو بہ
نیت طلاق یہ لفظ کہہ دے تو طلاق ہو جاوے گی۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایک تو باب تفویض طلاق
سے متعلق ہے اور دوسرے باب کنایات سے تو باب کنایات میں تو یہ لکھا ہے کہ کنایہ ہے
اور باب تفویض میں یہ لکھا ہے کہ وقوع کی شرط یہ ہے کہ عورت اخترت نفسی (میں نے
اپنے نفس کو اختیار کیا) بھی کہے اور اگر عورت کچھ نہ کہے تو مرد کے صرف اختیاری کہنے سے

طلاق واقع نہیں ہوتی اسی لئے میں نے ان شافعی المذہب سے انکار کر دیا۔ اور مولوی طیب صاحب عرب شافعی کا نام بتلا دیا تھا کیونکہ دیانت کی بات یہی تھی اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں کہ جب تک کامل شیخ اس کے غوامض پر مطلع نہ کرے اس وقت تک وہ حل نہیں ہو سکتیں اس لئے صحبت کی حاجت ہوئی۔ سو ایک ضرورت تو صحبت کی اصلاح علمی کے لئے ہے۔

دین کی اصلاح عمل سے ہے:

اور دوسری اصلاح دین کی عمل ہے جس کے لئے ضرورت ہے تربیت کی اور وہ بھی موقوف ہے صحبت پر اور عمل کا موقوف ہونا تربیت پر اور محض علم کا اس کے لئے کافی نہ ہونا اس سے ظاہر ہے کہ عمل میں علماء بھی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسوں کی یہ حالت ہے کہ

واعظاں کیں جلوہ برمحراب و منبر میکنند　　چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

مشکلے دارم زدانشمند مجلس باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

(واعظ لوگ محراب و منبر پر جلوہ فرما ہوتے ہیں جب خلوت میں جاتے ہیں دوسرا کام کرتے ہیں۔ ایک اشکال مجھ کو پیش آیا ہے دانشمندی مجلس سے دریافت کر توبہ کا حکم کرنے والے خود توبہ نہیں کرتے ۱۲)

آخر کیا وجہ ہے کہ غیبت کی برائی جانتے ہیں مگر مبتلا ہیں۔ جانتے ہیں کہ کینہ رکھنا برا ہے مگر سینکڑوں اہل علم اس میں مبتلا ہیں۔ سو وجہ یہی ہے کہ تربیت نہیں ہے اور اس کی وجہ سے عمل کمزور ہے تو عمل کے لئے فقط علم اور ارادہ کافی نہیں تربیت کی بھی حاجت ہے لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ عمل ارادی چیز ہے تو اس کے لئے ارادہ کافی ہو گیا ہوگا مگر اس میں غلطی یہ ہوئی کہ خود ارادہ کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہے اس پر نظر نہیں کی گئی یا یوں کہئے کہ ارادہ جب ہی کافی ہے کہ موانع موثر نہ ہوں اور بدوں تربیت موانع ہوتے ہیں۔

منازعات نفس مجاہدہ سے باطل نہیں ہوتے:

مثلاً منازعات نفس بھی موانع ہیں کہ آپ سردی میں اٹھ کر نماز پڑھنا چاہتے ہیں لیکن نفس آپ کو روکتا ہے تو اس کے لیے ضرورت ہے تربیت کی اس سے منازعات ضعیف الاثر ہو جاتے ہیں گو بالکل ان کے مواد کا استیصال نہیں ہوتا۔ بعض

لوگوں کو اس میں یہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ مجاہدات سے منازعات بالکل باطل ہو جاتے ہیں لیکن یہ غلط ہے ہاں ضعیف ہو جاتے ہیں ؎

نفس اژدہاست او کے مردہ است ۔۔۔ از غم بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ نہیں مرا ہاں غم بے آلتی سے افسردہ ہے)

مولانا نے یہ حکایت لکھی ہے کہ ایک اژدہا سردی میں ٹھٹھرا پڑا تھا اس کو ایک مار گر نے مردہ سمجھ کر رسوں میں جکڑ لیا اور گھسیٹ کر شہر میں لایا لوگ جمع ہو گئے اور شیخی بگھار رہا تھا میں نے اس طرح اس کو گرفتار کیا ہے اور اس طرح اس کو مارا ہے لوگ بھی تعجب کر رہے تھے اتنے میں دھوپ جو نکلی وہ اس کی حرارت سے جنبش کرنے لگا معلوم ہوا کہ زندہ ہے مخلوق بھاگی اور ساری شیخی اس کی کرکری ہو گئی اسی کو ذکر کر کے مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

نفس اژدہاست او کے مردہ است ۔۔۔ از غم بے آلتی افسردہ است

یعنی نفس تو ایک اژدہا ہے وہ مرا نہیں ہاں غم بے آلتی سے افسردہ ہو رہا ہے تو افسردگی کے اسباب کو نہ چھوڑنا چاہیے اور وہ مجاہدت واشغال اور تدبیر خاصہ ہیں اس لئے تعلیم اصلاح کے ساتھ تدابیر کی تعلیم بھی ضروری کرنا چاہیے۔ اکثر ہمارے مصلحین اوامر ونواہی اور وعدہ وعیدہ کو ہمیشہ ذکر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ تدابیر نہیں بتلاتے حالانکہ اس کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس میں سخت دشواری پیش آتی ہے ہم چاہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں مگر نفس کہتا ہے کہ اب فلاں مصلحت ہے بول ہی لینا چاہئے اور ہم نفس سے مجبور ہو جاتے ہیں دیکھو اگر بدن میں صفرا بہت بڑھ جاوے تو نرے مسکنات (تسکین دینے والی دوائیں) سے تسکین نہیں ہوتی بلکہ مزیل (زائل کرنے والی ادویہ) کی ضرورت ہوگی تو محض نصیحت بمنزلہ مسکن ہے اور تدبیر بمنزلہ مزیل۔ غرض ان منازعات کے لئے تربیت کی حاجت ہوئی۔

علم وعمل کے لئے نیک صحبت کی ضرورت:

حاصل تقریر یہ ہوا کہ دو چیزوں کی ضرورت ثابت ہوئی۔ ایک علم دوسرا عمل جو موقوف ہے تربیت پر۔ اول کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے۔ پس علم وعمل دونوں موقوف ہوئے صحبت

پر مگر ہم لوگ اس سے غافل ہیں چونکہ میں نے کہا تھا جس کی ضرورت ہو اور اس سے غفلت ہو اس کے بتلانے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی لئے میں اس کو بتلانے کو عرض کرر ہا ہوں کہ صحبت وہ چیز ہے کہ علم اور عمل کا کمال دونوں اس پر موقوف اور علم وعمل دونوں ضروری اور موقوف علیہ ضروری پس کس قدر ٹھہری۔

علم وعمل کی کمی سے دنیوی خرابی بھی ہوتی ہے:

اب یہ بات کہ علم اور عمل دونوں ضروری ہیں سو اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ جو خرابی دنیوی یا اخروی واقع ہوتی ہے یا اخلال علم سے ہوتی ہے یا اخلال عمل سے اخروی خرابی کا ترتب تو ظاہر ہے اور اس کے واسطے نصوص وعید دلیل کافی ہیں اور دنیوی خرابی کا ترتب اس طرح ہے کہ جس کا جی چاہے دیکھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کر کے ہر پریشانی سے نجات ہوتی ہے اور اسی طرح مخالفت کرنے سے پریشانی کا ہجوم ہوتا ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ عمل کرنے سے ہر تعب سے نجات ہوتی ہے مگر پریشانی سے ضرور نجات ہوتی ہے۔ اور اصل کلفت یہی ہے اور اگر پریشانی نہ ہو تو خود تعب ومشقت میں بالذات کو کلفت نہیں۔ اسی پر حکایت یاد آئی کہ مولوی غلام مصطفیٰ جو میرے ایک دوست ہیں وہ ایک رئیس کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پانچوں وقت پڑھواتے تو ان لڑکوں کی ماں کوستی تھی کہ اس مولوی نے میرے بچوں کو زکام میں مبتلا کر دیا صبح کو وضو کرواتا ہے۔ سو صاحب ایسی مشقت تو دین میں ہوتی ہے۔

اسلام میں حرج نہیں:

مولانا فضل الرحمٰن صاحب علیہ الرحمۃ سے ایک شخص نے آ کر پوچھا کہ ایک عورت کا شوہر گم ہو گیا ہے۔ مولوی صاحبؒ نے فرمایا کہ مرد کی نوے برس کی عمر تک انتظار کرو۔ کہنے لگا کہ جناب اس میں تو بڑا حرج ہے اور دین میں حرج نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر یہ حرج ہے تو جہاد میں بھی حرج ہے۔ سو حرج کے یہ معنی نہیں۔ حرج کہتے ہیں پریشانی اور الجھن کو سو اسلام میں یہ نہیں۔ ہاں تعب ومشقت ہے تو کیا دنیا کے کاموں میں تعب اور مشقت نہیں ہے۔

عامل شریعت کو پریشانی نہیں ہوتی:

واللہ جو شخص شریعت پر عمل کرے گا تمام پریشانیوں سے نجات میں رہے گا۔ اس پر شاید

کوئی یہ کہے کہ ہم بہت دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر تکلیف میں رہتے ہیں مثلاً ان کی آمدنی کم ہوتی اور خرچ تنگی سے ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تکلیف جسم پر ہے روح پر نہیں اور پریشانی ہوتی روح کی تکلیف سے پس اس کی مثال دلدادگان شریعت کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے کسی عاشق سے کوئی مدت کا بچھڑا ہوا محبوب ملے اور دور ہی سے دیکھ کر یہ محب اس کو سلام کرے اور اس کے گلے سے لگا لینے کا متمنی ہو اور اس کی عین تمنا کے وقت وہ محبوب دوڑ کر اس کو گلے سے لگا لے اور اس قدر زور سے دبا دے کہ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں۔ اب میں اہل وجدان سے پوچھتا ہوں کہ اس دبانے سے عاشق کو کچھ تکلیف ہوگی یا نہیں۔ یقیناً یہ تکلیف ہوگی لیکن یہ ایسی تکلیف ہے کہ ہزاروں راحتیں اس تکلیف پر قربان ہیں۔ اگر عین اسی تکلیف کی حالت میں محبوب کہے کہ اگر تجھ کو کچھ تکلیف ہو تو چھوڑ دوں اور جو تیرا رقیب سامنے موجود ہے اس کو اسی طرح دبالوں تو وہ کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے یہ جواب دے گا کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

اور یہ کہے گا کہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی زبند شکارت نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار جال سے رہائی نہیں ڈھونڈتا۔۱۲)

غرض اگر عشق و محبت ہے تو اس تکلیف کی اس کو ذرا پرواہ نہ ہوگی بلکہ اس میں ایک گونہ لذت ہوگی۔ یہ تجربہ کی بات ہے آپ اہل اللہ کی حالت کو مشاہدہ کر لیجئے کہ ان کو اس قلت مال و تنگی خرچ سے ذرا روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ جس طرح آپ کو ان کی ناداری پر رحم آتا ہے ان کو آپ کی مالداری پر رحم آتا ہے۔ حضرت شبلی صاحبؒ کسی متنعم کو دیکھتے تو فرماتے **الحمد لله الذی عافانی مما ابتلاک به وفضلنی علیٰ کثیر ممن خلق تفضیلا** ط (خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اس چیز سے عافیت میں رکھا جس میں تجھ کو مبتلا کیا ہے مجھ کو اپنی مخلوق میں بہتوں پر فضیلت دی) تو آپ اہل اللہ پر ان کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر رحم کرتے ہیں مگر ان کو اپنے اوپر رحم نہیں آتا اس واسطے کہ وہ اس کو پریشانی

ہی نہیں سمجھتے اور واقع میں یہ پریشانی نہیں ہے۔ میں پھر دعویٰ کرتا ہوں کہ متبع سنت کو بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اس کی ہر وقت یہ حالت ہوتی ہے۔

کوے نومیدی مرو کامید ہاست　　سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو)

اور امید وہ چیز ہے کہ جن لوگوں نے بی۔اے پاس کیا ہے ان سے پوچھئے کہ امتحان کی تیاری میں کیا کیا مشقتیں اٹھائی ہیں محض امید کامیابی پر کسی نے خوب کہا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم　　کہ شاید دست من بار دگر جاناں من گیرد

(اگرچہ میں محبوب سے دور پڑا ہوں اس امید میں خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا دوبارہ ہاتھ پکڑ لے)

خاص کر جو لوگ ایک دو مرتبہ فیل بھی ہو گئے ہیں ان پر تو یہ شعر خوب چسپاں ہے ان کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ روٹی کی پرواہ نہ آرام کا خیال ہر وقت کتاب ہے اور وہ ہیں تو تعجب کی بات ہے کہ دس روپیہ کی ہوس میں روٹی اور آرام چھوڑنے والا تو عالی ہمت سمجھا جاوے اور کوئی اس کو مصیبت زدہ نہ سمجھے اور خدا تعالیٰ کا طالب اگر نعم چھوڑ دے تو وہ پریشانی میں مبتلا سمجھا جاوے غرض وہ دعویٰ ثابت رہا کہ ان لوگوں کو پریشانی نہیں ہوتی (یہاں تک کرنے کے بعد نماز عصر کے لئے سب مجمع اٹھا۔ بعد نماز عصر پھر بیان شروع ہوا تو فرمایا کہ)

متبع شریعت کو پریشانی نہ ہونے کا راز:

میں نے تقریر کو اس مسئلہ پر چھوڑا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے والا ہر قسم کی پریشانی سے محفوظ رہتا ہے اور اس پر جو شبہ ہوا تھا اس کو بھی زائل کر دیا تھا۔ اب اگر اس کی وجہ بھی سمجھ لی جاوے تو بہتر ہے۔ سو اس کی ایک وجہ تو عقلی ہے اور ایک وجہ عشقی ہے عقلی وجہ تو یہ ہے کہ اس تعلیم میں ہر مفسدہ کی اصلاح ہے اور اس کو اہل انصاف نے گو وہ دوسری قوم کے ہوں تسلیم کیا ہے اور اگر کسی نے تعصب سے کام لے کر نہیں مانا ہے تو دوسروں نے اس پر رد کیا ہے۔ دوسری وجہ ایک عشقی ہے کہ وہ دیوانوں کے سمجھنے کی ہے (اور اگرچہ واقع

میں یہ درجہ بھی عقلی ہے مگر چونکہ اس کو عقلاء نے کم سنا ہے اس لئے اس کو عقلی نہیں کہا) اور وہ یہ ہے کہ عقلی قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی صاحب اقتدار کا مطیع ہوتا ہے وہ اس کو پریشانی سے بچاتا ہے تو خدا تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب اقتدار ہوگا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے سے جو چونکہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان کو ہر قسم کو پریشانی سے بچادیں گے۔ ہاں اگر کوئی ایسی پریشانی ہوتی کہ وہ خدا تعالیٰ کے اختیار سے خارج ہوتی تو دوسری بات تھی مگر ساری دنیا کا مسلم مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اختیار سے کوئی چیز خارج نہیں البتہ اگر کوئی امر بظاہر پریشانی کا ہو لیکن واقع میں پریشانی نہ ہو تو اس سے حفاظت کا دعویٰ نہیں جیسے بچہ کی حفاظت ماں باپ کرتے ہیں لیکن اگر کسی عضو میں مادہ فاسد جمع ہو جاتا ہے تو اس کے اخراج کے لئے ماں باپ نشتر بھی دلواتے ہیں بچہ سمجھتا ہے کہ ماں باپ میری بالکل حفاظت نہیں کرتے اور روتا ہے مگر بچہ اور مادر مشفق کی رائے میں فرق یہ ہے کہ

طفل مے لرزد زنیش احتجام   مادر شفق ازاں غم شاد کام

(بچہ نشتر لگانے سے لرزتا ہے مگر مشفق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے۔)

تو یہ تکلیف واقع میں راحت ہے اور ایسی پریشانی تو کسی مدعا کی طلب میں کوئی بچ نہیں سکتا اور نہ بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ عشقی وجہ یہ ہے جو واقع میں عقلی بھی ہے اور میں محض عقلی وجہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ قرآن کریم سے بھی اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا(۲) وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ.

(جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے واسطے کوئی راہ کر دیں گے اور اس کو اسی جگہ سے روزی دیں گے کہ اس کا گمان بھی نہ ہوگا)

یہ وعدہ ہے خدا تعالیٰ کا غرض یہ دعویٰ اور عقل ہر دو سے ثابت مؤید ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے والا کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا۔

نافرمانی کا اثر:

اور جیسا اتباع میں یہ اثر ہے نافرمانی میں بھی یہ اثر ہے کہ نافرمان ہر دم پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور گو یہ اس کو راحت سمجھتے ہیں مگر واقع میں وہ پریشانی ہے۔

پریشانی کی حقیقت:

اس لئے ضروری ہوا کہ میں اول پریشانی کی حقیقت بتلا دوں۔ سو سمجھئے کہ پریشانی کس کو کہتے ہیں پریشانی کہتے ہیں تشویش قلب کو نہ کہ مشقت ظاہری کو پس آپ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ نافرمانی میں مبتلا ہیں ان کا قلب ہر وقت مکدّر اور مظلم رہتا ہے اور جس کا نام جمعیت ہے وہ ان کو ہرگز میسر نہیں ہوتی اور جس قدر بھی تعلقات دنیا زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں پریشانی بڑھتی چلی جاتی ہے اور اگر کسی کو اس کی بھی حس نہ رہے تو وہ امتحان کرے۔

جمعیت کی حقیقت:

اور وہ امتحان یہ ہے کہ یہ شخص ایک ہفتہ بھر کے لئے فارغ ہو کر خلوص کے ساتھ ذکر اللہ کرے جب ایک ہفتہ گزر جاوے تو دیکھئے کہ قلب میں کوئی نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے یا نہیں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور محسوس ہوگی۔ اب اس کیفیت کو محفوظ رکھے اور خلوت کو چھوڑ دے اس کے بعد غفلت کے آثار میں تو خود ہی مبتلا ہو جاوے گا۔ پھر اس کے ایک ہفتہ بعد اس پہلی محفوظ کیفیت اور اس کے ابتلاء کے بعد کی کیفیت کو موازنہ کر کے دیکھے تو مقابلہ ہوگا کہ واقعی میں اس وقت پریشانی میں ہوں اور حالت کے سامنے ظلمت اور پریشانی نظر آوے گی اور حالت محفوظہ جمعیت اور نورانیت معلوم ہوگی یہ ہے اس کا امتحان اس سے انشاء اللہ تعالیٰ معلوم ہو جاوے گا کہ اہل دنیا سب پریشانی میں مبتلا ہیں اور بدوں امتحان اکثر کو اس کی حس نہ ہوگی کیونکہ جس نے کبھی جمعیت کو نہیں دیکھا وہ پریشانی کو کیا سمجھے وہ تو پریشانی ہی کو جمعیت سمجھے گا مگر اس کو جمعیت سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک سرحدی دیہاتی نے اپنی ذلت کو عزت سمجھا تھا مشہور ہے ایک صاحب ہندوستان آئے حلوائی کی دوکان پر پہنچے تو دیکھ کر جی للچایا دام وام پاس نہ تھے آپ نے بغیر پوچھے اس سے بہت سا اٹھا لیا اور کھا گئے۔ حلوائی نے نالش کر دی قاضی شہر نے یہ تعزیر تجویز کی کہ ان کو گدھے پر سوار کر کے لڑکوں کو اس کے پیچھے پیچھے کر دو کہ ڈھول بجاتے چلیں اور تمام شہر میں اسی حالت سے گشت کراؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب وطن واپس گئے تو اہل وطن نے پوچھا۔ آغا ہندوستان رفتہ بودی ہندوستان راچہ طور یافتی (آغا ہندوستان گئے تھے ہندوستان کیسا پایا) آپ جواب دیتے ہیں آغا ہندوستان خوب

ملک است انجا حلوا خوردن مفت است ۔ سواری خر مفت است ۔ فوج طفلاں مفت است ۔ ڈم ڈم مفت است (آغا ہندوستان اچھا ملک ہے حلوہ کھانا مفت ہے گدھے کی سواری مفت ہے بچوں کی فوج مفت اور ڈم ڈم مفت ہے) تو جیسا ان ۔ صاحب کو اس کیفیت میں لطف آیا تھا ویسا ہی اس وقت تنعم پرستوں کو ہے کہ آج یہ حشم و خدم عزت اور سامان جمعیت معلوم ہوتا ہے ایک دن حقیقت کھلے گی کہ گدھا ران کے نیچے ہے لیکن سمجھ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں کیونکہ گھوڑے پر سوار ہونا نصیب نہیں ہوا اگر کبھی گھوڑے پر سوار ہوں تو معلوم ہو کہ پہلے گدھے پر سوار تھے یا گرد و غبار میں گدھے گھوڑے میں امتیاز نہیں ہوا اسی کو کہتے ہیں

فسوف تریٰ اذا نکشف الغبار افرس تحت رجلک ام حمار

(عنقریب دیکھے گا تو جب غبار کھلے گا کہ تیرے قدم کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا)

تو جب یہ غبار غفلت کھلے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ ران کے نیچے کیا چیز تھی ۔ بہر حال مخالفت میں بھی کبھی جمعیت نہیں ہوتی ۔ تو اس تمام تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ عمل کتنی ضروری چیز ہے اور بے عمل کتنی پریشانی میں ہیں پس عمل کی ضرورت تو اس سے ظاہر ہوگئی اور علم موقوف علیہ ہے عمل کا سووہ بھی اسی سے ضروری ٹھیرا ۔

دو چیزوں کی ضرورت:

غرض دو چیزوں کی ضرورت متحقق ہوئی علم کی اور عمل کی اور علم کیلئے تعلیم کی ضرورت ہے اور عمل کے لئے تربیت کی ضرورت ہے اور ان دونوں کے لئے صحبت کی ضرورت ہے ۔ پس صحبت اس درجہ کی ضروری ٹھیری ۔

نیک صحبت بغیر اصطلاحی علم کے بقدر ضرورت کافی ہے:

بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کتابی علم نہ ہو اور محض صحبت ہو تو بقدر ضرورت کفایت ہو جاتی ہے ہاں اصطلاحی مولوی نہیں ہوگا ۔ کیونکہ یہ کمال علمی تو بدون درس و تدریس کے نہیں ہوسکتا مگر ہاں بقدر ضرورت حاصل ہوسکتا ہے بلکہ اگر حافظہ اور تدوین کامل ہو تو علم بھی صرف صحبت سے بدون درس و تدریس کے حاصل ہوسکتا ہے چنانچہ اکثر صحابہ کرام کا علم زیادہ تر خالی صحبت سے بدون کتب و درس ہی کے تھا بعد کو چونکہ حالت بدل گئی اس لئے اس

کی حفاظت کی غرض سے مدون کرنے کی ضرورت ہوئی کہ اگر مدون نہ ہوگا تو لوگ محفوظ نہ رکھیں گے یا ان کے دعویٰ حفظ یا صحت نقل پر اعتماد نہ ہوگا تو تدوین اور تدریس کی ضرورت لغیرہ ہے لعینہ نہیں ہے تو تعلیم والا تو صحبت سے مستغنی نہیں اور صحبت والا تعلیم کتابی سے مستغنی ہوسکتا ہے۔ یہ تو گفتگو تھی تعلیم کے موقوف ہونے میں صحبت پر۔

تربیت بھی صحبت پر موقوف ہے:

اب دوسرا جز تربیت جس کی ضرورت تعلیم سے بھی زیادہ ہے سو وہ بدون صحبت کے کسی درجہ میں بھی حاصل نہیں ہوسکتی حتی کہ غیر اہل ملت نے بھی اس کی ضرورت سمجھی چنانچہ کالجوں میں جو بورڈنگ بنائے جاتے ہیں اور شہر کے بچوں کو بھی ان میں رکھا جاتا ہے محض اس لئے اساتذہ کے خواص طبعیت ان میں پیدا ہو جاویں اور یہ میں نے اس لئے نقل کیا کہ آج کل کے مذاق والے لوگ بھی مطمئن ہو جاویں ورنہ ہم کو غیر ملی لوگوں کے طرز عمل کے نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم تو اس کو ایسا یقینی سمجھتے ہیں کہ جس میں ذرا بھی شک نہیں کیونکہ ہم کو تو روز مشاہدہ ہوتا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ذی علم لوگ میرے پاس اصلاح کے لئے آتے ہیں اور ان کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اور وہ چاہتے ہیں کہ کچھ ذکر و مشاغل پوچھ کر چلے جاویں لیکن میں بجائے ذکر و شغل سکھلانے کے ان کو وہاں رہنے کا مشورہ دیتا ہوں اور وہ رہتے ہیں۔ چند روز تک اس مجمع میں رہنے سے کسی نہ کسی کی برکت سے ان کی حالت درست ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ برکت کسی چھوٹے ہی کی ہو۔ اور اسی لئے بڑوں کو بھی ضرورت ہے۔ چھوٹوں کی کیونکہ ان کی برکت سے بڑوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم چھ ماہ یا سال بھر تک ہمارے پاس رہو اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی مگر پھر جب رہتے ہیں اور پہلی حالت میں تغیر شروع ہوتا ہے اور بات بات پر ان کو روکا ٹوکا جاتا ہے تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی اس کی ضرورت تھی تو چونکہ ہم کو ایسے واقعے ہمیشہ پیش آتے ہیں اس لئے ہم کو تو اہل تمدن کے قول کے نقل کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ آج کل لوگوں کو بدون اس کے تسلی نہیں ہوتی اس لئے ان کی حکایت بھی نقل کر دی پس ہم کو دونوں جماعتوں کی ضرورت ہے ایک تو وہ جماعت جس سے تعلیم حاصل کریں دوسری وہ جماعت جس سے تربیت ہو۔

ہر طبقہ کے لئے علم وعمل کی تحصیل کا دستور العمل:

اب اس کے متعلق دستور العمل بتلاتا رہا کہ سو اس دستور العمل میں تفاوت ہوگا۔ کیونکہ دو قسم کے لوگ ہیں۔

ناخواندوں کا دستور العمل:

ایک تو وہ جو کہ پڑھے لکھے نہیں ہیں تو ان کے لئے تو اور دستور العمل ہوگا اور وہ یہ ہے کہ اگر ان کو فراغ ہو تو اول درس کتابی کے ذریعہ سے علوم کی تحصیل کرائی جاوے۔ اگر پورا عالم بھی نہ بنے تو کم از کم دو چار برس تک اسی کام میں لگا رہے اور ان چار برسوں میں کوئی دوسرا کام نہ ہو (یہ میری رائے ہے) شغل علم میں یہ حالت رہے کہ چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد۔ (جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

اب یہ آپ کو اختیار ہے چاہے جتنی مدت تجویز کریں مگر کم از کم ایک سال ضرور ہو اور ایک سال کے بعد اگر علوم معاشیہ کی بھی حاجت ہو تو تعلیم دین و دنیا مخلوط رہے اور ان میں جو لوگ تکمیل کر سکیں ان کی تکمیل بھی کرائی جاوے کہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے جس کو لوگ بیکاروں کا کام سمجھتے ہیں۔ میرے پاس کلانور کے ایک شخص آئے میرے بھتیجے کے متعلق پوچھنے لگے وہ کیا کرتا ہے؟ میں نے کہا عربی پڑھتا ہے۔ کہنے لگے اس کے بعد انگریزی کا بھی ارادہ ہے میں نے کہا نہیں کہنے لگے تو اس کو ترقی نہ کرائی جاوے گی کہ انگریزی پڑھ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کرے۔ میں نے کہا کہ اگر سب اسی میں مشغول ہوں تو پھر دین کا خادم کون بنے گا آخر اس کی بھی تو ضرورت ہے کہنے لگے کہ اس کے لئے مدرسہ دیوبند سے ہر سال بہت لوگ نکلتے ہیں میں نے کہا کہ سبحان اللہ کیا انصاف اور خیر خواہی ہے اگر مولوی ہونا تو ترقی کی بات ہے تو میرے بھتیجے کے لئے کیوں نہ تجویز ہو اور اگر تنزل اور ذلت کی بات ہے تو دیوبند کے طالب علموں کے لئے کیوں تجویز ہو کیا وہ قوم کی اولاد نہیں غرض جو لوگ فارغ ہو سکیں ان کو پورا مولوی بنایا جاوے اور اس کے امراء کے بچے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ غرباء معاش سے مستغنی نہیں ہو سکتے پس یا تو وہ دوسرے کام میں لگ کر علم کو ضائع کریں گے اور بعضے علم کو ذریعہ کسب بناویں گے جس کے بعد نہ ان

کے وعظ میں اثر ہوگا نہ ان کے فتوے معتبر سمجھے جاویں گے اور امراء مستغنی ہیں اس لئے ان کی اصلاحات کا اثر زیادہ ہوگا اس لئے امراء پر لازم ہے کہ اپنے بچوں میں سے ایک دو کو ضرور تکمیل علوم دینیہ کے لئے منتخب کریں مگر انتخاب کا وہ قاعدہ نہ ہو جو اب تک ہوتا چلا آرہا ہے یعنی جو سب سے زیادہ غبی اور کودن ہو اسی کو عربی کے لئے تجویز کرلیا۔ اور پھر خود ہی مولویوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بے وقوف ہوتے ہیں۔ صاحبو! مولوی تو بے وقوف نہیں ہوتے لیکن بے وقوف مولوی بنا دیئے جاتے ہیں۔ اب تم انتخاب اس طرح کرو کہ جو ذہین اور ذکی ہو اس کو مولویت کے لئے تجویز کرو پھر دیکھو کہ مولوی کیسے عقلمند اور ہوشیار ہوتے ہیں مگر لوگوں کی تو حالت عام طور سے یہ ہوگئی ہے کہ جو چیز کسی کام کی نہ ہو وہ اللہ میاں کے نام پر چڑھائی جاتی ہے۔ اللہ میاں کو جانے لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ جو چیز کسی کے کام کی نہ ہو اللہ میاں کے نام پر اسی لئے کودن و غبی اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے تو اس انتخاب سے معاف کیجئے کیونکہ اس انتخاب میں پڑھنے والے کا تو نفع ہے لیکن قوم کا کوئی نفع نہیں۔ قوم کو ایسے لوگوں سے نفع ہوسکتا ہے کہ جو سیر چشم اور ذہین ہوں ۔ یہ دستور العمل تو ان ناخواندہ لوگوں کے لئے ہوا جو کہ خواندہ ہوسکتے ہیں اور جو ناخواندہ لوگ بوجہ فراغ نہ ہونے کے باقاعدہ نہ پڑھ سکیں وہ کبھی کبھی علماء کے پاس جایا کریں اور ان سے علم دین کی باتیں پوچھا کریں اور آج کل لوگ علما سے ملتے ہیں لیکن بہت ہی بری طرح یعنی ان کو اپنے مذاق کے تابع کرتے ہیں کہ اخبار میں یوں لکھا ہے اور وطن میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ صاحبو! ان کو تو وطن اور وکیل کی ضرورت نہیں تم اپنے وطن کی خبر لو اور اپنے وکیل بنو یعنی ان کے پاس جا کر اپنے افعال اور امراض سے ان کو مطلع کرو اور اس کی اصلاح پوچھو۔ یہ تعلیم کی صورت ہے غیر فارغین کے لئے جب اس مختلف طریق سے علوم حاصل ہو جاویں پھر صحبت صالحہ کی تدبیر کرو۔ خود بھی صلحاء کے پاس جاؤ اور اپنے بچوں کو بھی علماء کے پاس لے جاؤ اور ان کو وہ باتیں سناؤ دیکھو اب بچے چھٹی میں آتے ہیں لیکن محض فٹ بال اور کرکٹ میں سارا وقت صرف ہوتا ہے کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ اس کے لئے ضرور دو کہ وہ کسی عالم کے پاس جا کر بیٹھا کریں۔ یہ سب تفصیل ہوئی ناخواندوں کے دستور العمل کے متعلق۔

خواندہ حضرات کا دستور العمل:

اب دوسرے وہ لوگ ہیں کہ وہ بقدر کافی لکھے پڑھے ہیں اور علوم ضرورہ میں معتدبہ استعداد رکھتے ہیں کہ ان کو اصطلاحی مولوی کہہ سکتے ہیں اور وہ اس واسطے اپنے لئے ضرورت تعلیم کی یا تربیت کی بھی نہیں سمجھتے۔ میں ان کے لئے یہ کہتا ہوں کہ گو وہ خود فاضل ہونے کے سبب علوم بدرجۂ اعتماد علماء کے معتقد نہ ہوں مگر علوم میں علماء سے مراسلت ضرور رکھیں۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ فلاں عالم سے پوچھو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ سب سے پوچھو اور بہتر تو یہ ہے کہ مسائل علمیہ میں ہر ہفتہ چار مولویوں کے پاس خط بھیج دیا کرو اور ان کے جوابوں کا مقابلہ کر کے دیکھا کرو ہم کسی خاص مولوی کا مقید نہیں کرتے اور مقابلہ کے وقت بدون رائے قائم کئے ہوئے دونوں کے جواب کو انصاف سے دیکھو اور اگر خدشہ رہے تو بدون اظہار نام ایک کے دلائل کو دوسرے کے سامنے پیش کرو اسی طرح اگر آپ کیا کریں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ تمام مسائل میں حق واضح ہو جاوے گا اور اگر بفرض محال کسی مسئلہ کی حقیقت واقعیہ مخفی بھی رہ گئی تب بھی آپ پر قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا ورنہ سخت اندیشہ ہے اور جن کو مناسبت علوم سے اس درجہ کی نہیں اور وہ موازنہ اور مقابلہ نہیں کر سکتے ان کے لئے یہ طریق ہے کہ وہ کسی ایک کو اختیار کر لیں جیسے کسی شخص کو طب سے مناسبت نہ ہو تو وہ اختلاف اطباء کے وقت کیا کرے گا اور اس کے لئے کیا مناسب ہے آیا دونوں کے نسخوں کو دیکھ کر ترجیح دینا یا اجمالی دلائل سے کسی ایک کو انتخاب کر لینا۔

دلا رامے کہ داری دل درو بندہ   دگر چشم زہمہ عالم فروبند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے اس کے لئے تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو ۱۲)

اور یہیں سے یہ بھی حل ہو گیا ہوگا کہ اگر مولویوں میں آپس میں اختلاف ہو تو کیا کریں اور کس کے قول پر عمل کریں تو جواب یہی ہے کہ اطباء میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہے پھر وہاں کیا کرتے ہو یہی کرتے ہو کہ جو سب میں بڑا ہو اسی سے رجوع کرتے ہو بڑا ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس نے کسی ماہر سے حاصل کیا ہو مدت سے کام کر رہا ہو اس کے ہاتھ سے اکثر لوگ شفایاب ہوتے ہوں تو جب علماء میں اختلاف ہو تو یہی دیکھو کہ کس کے شاگرد ہیں کتنے دنوں سے دین کی خدمت کرتے ہیں لوگوں کو ان سے کیسا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اگر ایک کا استاد دین میں بڑا

ماہر تھا اور یہ مدت سے دین کی خدمت بھی کر رہا ہے جو علامت ہوگئی مہارت کی۔ اس کے اصحاب دین کا پہلو بھی زیادہ لئے ہوئے ہیں جو بجائے دست شفائے طبیب کے ہے اور دوسرے میں یہ بھی بات نہیں تو پہلے کو لے لو۔ اور دوسرے کو چھوڑ دو علماء میں انتخاب کا طریقہ ہے مگر یہ طریقہ ان کے لئے ہے جو قوت فیصلہ نہیں رکھتے باقی جو لوگ قوت فیصلہ رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ مفصل دونوں جگہ تحقیق کریں اور پھر موازنہ کریں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا یہ تو تعلیم کی بابت تھا۔

شیخ کامل کی علامات:

اب رہ گئی تربیت اس میں خواندہ ناخواندہ سب کا ایک ہی دستور العمل ہے وہ یہ کہ اس شخص کے لئے ایسے شخص کو انتخاب کریں جس نے اپنے اخلاق درست کر لئے ہوں ۔اور اس کا اندازہ مشاہدہ علامات سے ہوسکتا ہے کہ متعدد مشائخ کو جا کر دیکھیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ دیکھئے دنیا کے ایک سودے کے لئے شہروں میں مارے مارے پھرتے ہیں تو اگر بزرگوں کی تلاش میں بھی دو چار جگہ ہو آویں تو کیا مشکل ہے اور وہ علامات یہ ہیں کہ دیکھیں کون بزرگ ایسا ہے جو علم دین بقدر ضرورت رکھتا ہو اور علم پر عمل کرتا ہو اپنے متعلقین پر شفقت کے ساتھ احتساب کرتا ہو اور اس کی صحبت میں لوگوں کو دنیا سے دلبستگی نہ رہتی ہو اسکے پاس رہنے والے غالب دیندار ہوں جو شخص ایسا ملے کہ اس کے پاس آمدورفت رکھے اور جب موقع ملے چند روز تک اس کے پاس رہے اس کے اخلاق درست ہو جائیں گے کیونکہ جب پاس رہے گا تو دیکھے گا کہ اس نے چار موقع پر غصہ کو ضبط کیا ہے تو ایک جگہ خود بھی ضرور ضبط کرے گا۔ اور اسی طرح عادت ہو جاوے گی۔ اور اگر پاس رہنا ممکن نہ ہو تو ایسے شخص سے مراسلت ہی رکھو اپنے امراض لکھ کر بھیجو کہ مجھے حرص ہے طمع ہے بے استقلالی ہے پھر وہاں سے جو کچھ لکھ کر آوے اسپر عمل کرو۔ وہ حضرات تہذیب اخلاق کے لیے وظیفہ نہ بتلاویں گے بلکہ تدابیر بتلاویں گے اور گو وہ کتابوں میں بھی ہیں لیکن وہ مبتدی کو مفید نہیں ہوتیں اس لئے کہ کتابوں میں کلیات ہیں باقی اپنے حالات جزئیہ کا منطبق کرنا ان کلیات پر اس کے لئے فہم کافی نہیں تو یہ تو تربیت کا طریق ہے خواہ مجالست سے ہو یا مراسلت سے ہو اور یہ طریقہ جیسا کہ آپ کے لئے ہے آپ کے بچوں کے بھی ہے اگرچہ وہ انگریزی وغیرہ ہی میں مشغول ہوں اس حالت میں ایسا ہونا چاہئے کہ چھٹی میں کم سے کم

ایک چوتھائی چھٹی کا ان بزرگوں کے پاس گزاریں۔خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔اگر سال بھر میں ایک ماہ بھی آپ کسی ایسے شیخ کی صحبت میں رہ لیں گے تو ان کو نہ سائنس مضر ہوسکتا ہے نہ انگریزی۔یہاں تک مردوں اور بچوں کی تربیت کا دستوالعمل مذکور ہوا۔

عورتوں کا دستورالعمل:

اب رہ گئیں عورتیں تو عورتوں کے لئے ایک تو یہ صورت ہے کہ اگر خاندان میں کوئی بزرگ عورت ہو تو ان کے پاس جا کر بیٹھیں اور اگر نہ ہو تو ان کو بزرگوں کے ملفوظات سناؤ اور زندہ بزرگوں کے حالات سناؤ اور ان کو ایسی کتابیں دو تا کہ وہ ان کو پڑھا کریں۔علامہ غزالی علیہ الرحمتہ کی کتابیں سناؤ۔میں نے اس کا تجربہ کیا ہے بہت نافع ہوتی ہیں یہ دستور العمل ہوا تعلیم وتربیت کا جن میں ایک کا تعلق علماء سے ہے دوسرے کا مشائخ سے۔

علماء ومشائخ میں عوام کی عیب جوئی کا جواب:

اب ان دونوں جماعتوں کے متعلق لوگ ایک غلطی کرتے ہیں وہ غلطی یہ ہے کہ ایک عیب تو علماء میں نکالا جاتا ہے کہ باعمل نہیں اور اس لئے ان سے علم بھی اخذ نہیں کرتے اور اسی طرح ایک عیب مشائخ میں نکالا جاتا ہے کہ عالم محقق نہیں اور اس لئے ان سے اپنی تربیت کا طریق نہیں حاصل کرتے۔آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی جامع شخص ملے تو ایسے جامع تو اب کم ملیں گے۔صاحبو! اگر ابوحنیفہ علیہ الرحمتہ کی برابر جامع نہ ملے تو کیا حرج اور اگر دین کی تحصیل میں ایسا ہی کمال شرط ہے تو پھر تحصیل دنیا میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔پس نوکری بھی نہ کیا کرو کیونکہ سلطنت نہ ملی تو نوکری کیا ہوگی اور اس کے جواب میں کہو کہ وہ نہیں یہی سہی تو یہاں بھی میں یہی کہوں گا کہ ابوحنیفہؒ نہیں تو آج کل کے مولوی ہی سہی۔اس طرح مشائخ میں جنید بغدادیؒ کی تلاش ہوتی ہے وہاں بھی یہی جواب ہے نیز اگر جنید کو تلاش کرتے ہو تو تم بھی ان ہی کے مستفیدین جیسی طلب بھی تو پیدا کرو۔

صاحبو! یہ غنیمت سمجھو کہ تمہاری طلب کے موافق تو بزرگ مل گئے۔غرض علماء میں تو یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ علماء میں عمل نہیں ہوتا اور بعض کے اعتبار سے یہ سچ بھی ہے مگر اول تو سب علماء کو بے عمل سمجھنا غلطی ہے۔بہت علماء باعمل بھی ہیں اور میں ان کا نام بھی بتلا دیتا مگر جب لوگ

پوچھتے ہی نہیں تو میں کیوں بتلا کر بے قدری کروں اور اگر باعمل لوگوں میں بھی عیوب نکالے جائیں کہ فلاں عالم میں یہ عیب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود (کسی بشر کا نفس خطا سے خالی نہیں ہے) دوسرے اگر وہ بے عمل بھی ہوں تو دیکھو اگر حکیم محمود خان بد پرہیز ہوں کیا ان سے نسخہ نہ لکھواؤ گے۔ ضرور لکھواؤ گے سو تعلیم میں ان کے عمل کو کیا دخل ہے ہاں تربیت اگر ان سے نہ کراؤ تو گنجائش ہے مگر تعلیم علم کیلئے تو وہ کافی ہیں مثلاً اگر آپ ان سے رویہ الٰہیہ یا جبر وقدر کا مسئلہ پوچھئے تو اس میں ان کے عمل کو کیا دخل۔ اور اسی قبیل کا شبہ علماء کے متعلق بھی ہے کہ علماء میں اختلاف ہے ہم کس کی مانیں تو میں کہہ چکا ہوں کہ قواعد سے ایک کو ترجیح دے کر اس کو مانو جیسے اگر مختلف وکلاء کے پاس جاؤ اور وہ مقدمہ میں مختلف رائیں دیں تو اخیر ایک کو ترجیح دو گے جب ہر امر میں یہی قاعدہ ہے تو دین میں ہی سارے شبہات کیوں کئے جاتے ہیں۔ اور ان قواعد ترجیح کا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ غرض علماء چاہے بدعمل ہوں مگر ان سے علم حاصل کرو۔ اسی طرح مشائخ میں یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ پورے مولوی نہیں اور اس لئے شیوخ ایسے ڈھونڈتے ہیں جو پورے عالم بھی ہوں یعنی ان کی درسی کتابیں کل ختم ہوں۔

صاحبو! جس طرح تعلیم علوم میں پورے باعمل ہونے کی ضرورت نہیں اسی طرح تربیت میں پورے ہونے کی ضرورت نہیں البتہ بقدر ضرورت علم ہونا ضروری ہے ایسا نہ ہو جیسے ایک فقیر کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے مجاہدہ کرنے کے لئے ایک نتھنے میں گوہ کی بتی دے رکھی تھی اور ایک آنکھ پر موم کی ٹکیا رکھ لی تھی کہ جب ایک آنکھ سے کام چلتا ہے تو دوسری کی کیا ضرورت اور ایک نتھنے سے پھولوں کی خوشبو سونگھتے ہیں تو دوسرے سے غلیظ سونگھ کر اس کی مکافات ہونی چاہئے گویا اللہ میاں کو بھی آپ نے رائے دی تھی کہ دو آنکھیں فضول بنائی ہیں۔ اتفاق سے کوئی صحبت یافتہ علماء کا اس کے پاس جا پہنچا اور اس کو اطلاع دی کہ تمہارا تو وضو نماز سب غارت ہے آخر وہ بہت رویا اور اپنی اصلاح کی۔ اس لئے علم بقدر ضرورت تو ہونا ضروری ہے مگر کمال علم کی ضرورت نہیں پس علماء کے علم کو دیکھو عمل کو مت دیکھو اور مشائخ میں عمل کو دیکھو اور کامل علم کی تلاش کرو۔ البتہ اگر اتفاق سے کوئی ایسا مل جاوے کہ وہ عالم بھی ہو اور شیخ بھی سبحان اللہ اس کی تو وہ حالت ہے ۔

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

(اس عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

تو پھر اسی ایک ہی سے تعلق رکھو اور اگر ایسا نہ ملے تو دو سے تعلق رکھو اور دو کچھ زیادہ نہیں دنیا کے لئے ہزاروں سے تعلق رکھتے ہو تو اگر دین کے لیے دو کے ناز اٹھا لو تو کیا تعجب ہے اس تعلق دینی سے جو اصل مقصود ہے یعنی حق تعالیٰ وہ تو ایسا ہے کہ اگر اس کے لئے ہزار سے بھی تعلق رکھا جاوے اور ان کی ناز برداری کی جاوے تو کم ہے ؎

کشند از برائے دلے بارہا خورند از برائے گلے خارہا

طلبگار باید صبور وحمال کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(ایک دل کے لئے بہت سی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ ایک پھول کے لئے بہت سے کانٹے کھاتے ہیں طالب چاہئے صبر کرنے والا اور مشقت برداشت کرنے والا میں نے کسی کیمیا گر کو ملول نہیں دیکھا)

اور اسی میں بات بھی آگئی کہ اگر ایک سے ناکامی ہوئی تو دوسرے سے رجوع کرو جیسے کوئی مریض کہ معالجہ میں اس کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(طلب سے باز نہ رہوں گا جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے یا تو تن محبوب حقیقی کے پاس پہنچ جائے یا جان تن سے نکل جاوے ۱۲)

اسی کو کہتے ہیں ؎

طلب گار باید صبو ر وحمول کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(طلب گار صبور وحمول چاہئے کہ ہم نے کیمیا گر کو ملول نہیں دیکھا)

عمر بھر اسی دھن میں رہو پھر ممکن نہیں کہ محروم رہو ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(ایسا کوئی نہیں کہ عاشق ہوا ہو محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو اے صاحب درد ہی نہیں ورنہ طبیب ہے)

اور اسی دھن باقی رکھنے کے لئے فرماتے ہیں ؎

اندریں راہ می تراش دمی خراش تادم آخر دمی فارغ مباش
تادم آخری دمی آخر بود کہ عنایت باتو صاحب سربود

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخر وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو۔ آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز ورفیق بن جاوے گی)

یعنی کوئی وقت ایسا ضرور ہوگا کہ مقصود تک رسائی ہوگی۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور ہر چند کہ میں نے کہا تھا کہ میں ان علماء باعمل کے نام نہ بتلاؤں گا مگر یہی رائے ہوئی کہ بتلا دوں لیکن اس لئے نہیں کہ خواہ مخواہ ان کے معتقد ہو جاؤ۔ میرے کہنے سے تو اس وقت معتقد ہو کہ میرے معتقد ہو سو میں کہتا ہوں کہ آپ ہرگز میرے معتقد نہ ہوں میں خود قابل اعتقاد نہیں صرف مسائل بتلانے والا ہوں اور یہ کہنا میرا تواضعاً نہیں نہ اس میں مجھے تواضع کرنے کی ضرورت ہے جو چیز اپنے پاس ہے اس کو ظاہر کرتا ہوں۔ میں بحمد اللہ علم ضروری جانتا ہوں اس کے بتلانے کے لیے تیار ہوں۔ گو وہ کامل نہیں ہے چنانچہ بہت سی باتیں مجھے معلوم بھی نہیں اور اگر مجھ سے کوئی ایسی بات پوچھی جاوے کہ اس کے متعلق میں یہ کہہ دوں گا اور کہہ دیتا ہوں کہ میں نہیں جانتا۔ پس علم ضروری کا انکار نہیں اور قابل اعتقاد ہونے کا دعویٰ نہیں اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ میرے کہنے سے ان بزرگوں کے معتقد ہو جاؤ۔ خود جانچو دیکھو سو اس غرض سے نام نہیں بتلاتا بلکہ محض اطلاع مقصود ہے سو وہ بزرگ یہ ہیں۔

چند مشائخ کاملین:

ایک مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری جو اسی جلسہ میں تشریف فرما ہیں۔ یہ تو تربیت کے لئے کافی ہیں (۲) دوسرے بزرگ حضرت مولانا محمود حسن صاحب کہ وہ افادہ علم اور تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ (۳) تیسرے بزرگ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کہ وہ بھی تعلیم تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ اور نام اس وقت میں نے نہیں لئے۔ میں نے ایک تنبیہات وصیت لکھی ہے اس میں چند بزرگوں کے نام لکھ دیئے ہیں آپ خود ان کا امتحان کر لیں۔ لیکن امتحان ایک دو دفعہ کے ملنے سے نہیں ہوتا۔ (۴) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو اکثر لوگ خشک مزاج بتلاتے تھے کیونکہ یا تو کبھی ملے نہیں اور یا اگر ایک دو دفعہ ملے تو اتفاق سے ایسے وقت ملے کہ مولانا کسی دوسرے شغل یا احتساب میں مشغول ہوئے۔ بس اس ایک جلسہ میں دیکھ

کر عمر بھر کیلئے ایک غلط حکم کر دیا اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص سنے کہ فلاں جج صاحب بڑے خوش خلق ہیں اور یہ سن کر ان سے ملنے کو عدالت میں جاوے اور اتفاق سے ایسے وقت پہنچے کہ صاحب جج دو آدمیوں کو حبس دوام کا حکم سنا رہے ہوں اور دو کو پھانسی کا حکم سنا رہے ہوں تو یہ شخص یقیناً اس جج کو نہایت درجہ خونخوار سمجھے گا لیکن عقلمند آدمی کہے گا کہ بھائی تم نے عدالت میں دیکھا کہ پھر اتفاق سے اس وقت سنگین مقدمات پیش تھے ذرا ان کے بنگلہ پر جا کر تو دیکھو اسی طرح گوں کے پاس ایک وقت جا کر دیکھا اور کہہ دیا کہ نہایت خشک ہیں۔صاحبو! کم از کم ایک ایک ہ تک رہ کر تو دیکھو۔اور اگر پھر بھی سوائے اپنے کوئی پسند نہ آوے تو ہم اس کا علاج نہیں کر سکتے یداس فہرست سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ اپنے ہی سارے بزرگوں کا نام دے دیا۔معلوم ہوتا ہے کہ ملی بھگت ہے تو اول تو خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ ملی بھگت ہے یا کیا۔دوسرے میں نے تو بیعت کرنا چھوڑ دیا ہے پھر ملی بھگت کا احتمال رہا۔صرف جو مجھ کو معلوم تھا بتلا دیا۔ہاں یہ شبہ تو اب بھی رہا کہ بزرگوں کی تعریف کرنا در حقیقت اپنی تعریف ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں کہ بزرگوں کو پہچانتے ہیں۔

مادح خورشید مداح خود است   کہ دو چشم و نامرد است

(آفتاب کی تعریف کرنے والا خود اپنی تعریف کرنے والا ہے اس لئے کہ دونوں آنکھیں اس سے روشن ہیں)

سو اس کا جواب یہ ہے کہ خیر یہی سہی آپ یوں ہی سمجھیں اس سے ہم کیونکر بچیں۔دوسرے آپ کو کیا خبر ہے کہ میں نے خود پہچان کر ہی کہا ہے تا کہ وہ شبہ ہو ممکن ہے کسی بزرگ سے سن کر ہی کہا ہو اور اس کی بزرگی انتم شهداء الله فی الارض کے قاعدے سے محقق ہوئی ہو بہر حال آپ ان سب کو دیکھئے اور سب کا امتحان کیجئے۔

مانصیحت بجائے خود کردیم   روزگارے دریں بسر بردیم

گر نیاید بگوش رغبت کس   بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(ہم نے نصیحت بجائے خود کی ہے اور ایک زمانہ اس میں گزارا ہے اگر کسی کو سننے کی رغبت نہ ہو تو رسول پر بس پہنچا دینا ہے کوئی عمل کرے یا نہ کرے)

پس اس صحبت کے نافع ہونے کی بنا پر فرماتے ہیں کہ اپنے صحابہ کو محروم نہ کیجئے اور اپنے نفس کو ان کے ساتھ جمائیے۔اب میں آیت کا خالی ترجمہ کر کے ختم کیے دیتا ہوں۔

آیت متلوکا ترجمہ وتفسیر:

ترجمہ یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کو ایسے لوگوں کے ساتھ جما کر بٹھلایئے جو اپنے پروردگار کو صبح وشام پکارتے ہیں۔اور آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پاویں۔(یعنی آنکھیں بھی ادھر ہی متوجہ رہیں)اس سے بھی میں ایک دوسرا مسئلہ استنباط کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بزرگوں کی توجہ سے بھی نفع ہوتا ہے تو گویا اول جملہ میں تعلیم کا بھی اشارہ ہوا کہ پاس بیٹھنے سے احکام بھی حاصل ہوں گے اور دوسرے میں تربیت کا آگے فرماتے ہیں

تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا . (دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے)اس کو کسی نے مستقل جملہ کہا ہے۔یعنی کیا آپ دنیا کی زینت چاہتے ہیں مگر میں نے اس کو جملہ حالیہ سمجھا ہے اور لا تعد میں منفی کو اس کا عامل اور عیناک کو بوجہ اقامت عین مقام ذات ذوالحال اور مقید کی نفی یہاں قید اور ذی قید دونوں کے ارتفاع سے ہے یعنی جو عدوان بارادۃ زینت حیٰوۃ دنیا ہوتا وہ متروک ہے۔اس طرح سے کہ عدوان ہے نہ ارادہ زینت پس اس سے وقوع زینت کا لازم نہیں آتا آگے دوسری نہی ہے ۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا

یعنی ان کا کہنا نہ مانو جن کو ہم نے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور اس نے اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اس کا کام حد سے نکلا ہوا ہے۔یہاں سے ایک تیسری بات بھی معلوم ہوئی کہ مشورہ بھی ایسے شخص کا قبول کرے جسکی یہ حالت نہ ہو۔

اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ الخ (ہم نے اسکے دل کو غافل کر دیا ہے) کیونکہ بے دین کے مشورہ میں بھی برکت نہیں ہوتی ۔چنانچہ رؤساء کفار کے اس مشورہ تخصیص مجلس کے قبول سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ممانعت فرمادی۔خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ اس میں تعلیم اور تربیت دونوں کا بذریعہ صحبت نافع ہونا بتلایا ہے اور شیوخ کا بھی علاج کر دیا ہے کہ آپ بھی بے پروائی نہ کریں سبحان اللہ کیا عجیب جامع جملہ ہے۔اب میں ختم کر چکا۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے وہ فہم سلیم اور توفیق عمل کی بخشیں۔آمین ثم آمین